

جنت کی تلاش

"۔۔نت کی تلاش" ایک بے چین روح کا سفر ہے۔

اس [illegible] کا موضوع ایسا تھا کہ مجھے پورے پاکستان کی سیاحت کرنا پڑی۔ پیدل، بس کے ذریعے، جیپ سے، گھوڑوں پر، ہوائی جہاز سے، جہاں جیسی ضرورت پڑی سفر کرتا رہا۔۔۔۔۔
[illegible] بے تحاشا روپیہ خرچ ہوا۔

میں نے اپنا مسودہ بار بار پڑھا ہے اور ہر بار یہی محسوس کیا ہے کہ جن مناظر میں بیٹھ کر لطف لیتا رہا ہوں کہیں خواب میں تو نہیں دیکھے۔۔۔۔۔۔ حقیقتاً یہ خوابوں سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں۔

یہ ناول چھ سال میں تکمیل ہوا اور یہی چھ سال میری زندگی کے بہترین سال ہیں۔
مجھے اپنے ناول کے کرداروں سے بے پناہ انس ہو گیا تھا۔ ان کے ساتھ رہتے، جیتے، مرتے، چلتے، سوچتے اور بسر کرتے ہوئے ایک ناقابلِ بیان مسرت در آئی تھی میری زندگی میں۔

امل کے مضطرب کردار نے مجھے بے حد ستایا لیکن اس کے اضطراب نے بے حد تقویت بھی بخشی۔۔۔۔۔ یہ جو تخلیق کا کرب ہوتا ہے نا، زندگی کی سب سے انمول شے ہوتی ہے۔

قبل ازیں جتنے ناول لکھے ان کا ایک ہی منظر تھا لیکن جب "جنت کی تلاش" کا [illegible]

کیا تو گویا خلاء میں چھلانگ لگا دی' دھیرے دھیرے خدوخال ابھرنے لگے اور بتدریج شکل بنتی چلی گئی۔

جیسے سنگلاخ چٹان سے مجسمہ نکل آتا ہے۔

جس بے ساختگی سے اس ناول کا آغاز ہوا تھا' اسی بے ساختگی سے اس کا اختتام ہوا۔ جب ناول کا آخری باب لکھا جا رہا تھا تو میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ یہ آخری باب ہے اور یہ کہ بس اب ناول ختم ہونے والا ہے' لیکن بیس اگست کی رات کو جو کچھ لکھا اکیس اگست کی رات کو دوبارہ پڑھا تو شدید حیرت ہوئی کہ ناول تو ختم ہو چکا ہے اور کافرستان کا سفر ابھی باقی ہے۔

مگر میں کیا کر سکتا تھا' ناول کے آخری فقرے نے میرا سفر ختم کر دیا تھا اور میرے کردار مجھ سے بچھڑ گئے تھے۔

قارئین کرام......

یہ ایک بے چین روح کی کہانی ہے۔ میں نے جو کچھ اس زمین پر پایا' وہی آپ کو لوٹا رہا ہوں مگر.....

پھر بھی انسان سے انسان کی نفرت کی مذمت کرتا ہوں!

رحیم گل

دیباچہ

"جنت کی تلاش" اردو زبان کا پہلا ناول ہے جس میں وہ گہری اور گمبھیر الجھنیں موضوع بنی ہیں جنہوں نے صدیوں سے بڑے بڑے حکیموں' داناؤں اور دانشوروں کو [illegible] مسلسل میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو کچھ اس ناول میں کہا گیا ہے' وہ مصنف رحیم گل کے برسوں کے وسیع مطالعے اور گہری سوچ کا نتیجہ ہے' مگر کسی ایک مقام پر بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ ناول نگار نے جو کچھ پڑھا یا سوچا ہے' اسے جا و بے جا [illegible] ہے۔ اس نے حیرت انگیز فن کاری اور مسحور کن سلیقے سے ان افکار کو ناول [illegible] کرداروں۔۔۔ امل' وسیم اور عاطف میں بانٹا ہے۔

[illegible] کے [illegible] کے تانے بانے سے قاری پر کتنے بہت سے اسرار حیات و کائنات [illegible] ہے۔ اس جیسے بڑے اور پھیلے ہوئے موضوع کو رحیم گل نے ایک "ماسٹر [illegible] کی طرح شروع سے آخر تک اپنی [illegible] گرفت میں رکھا ہے اور ایک ایسا [illegible] ہے جو اپنے موضوع اور نوعیت اور ہیئت کے لحاظ سے کم سے کم اردو زبان [illegible] قرار دیا جا سکتا ہے۔

"[illegible]" کردار اس ناول کا محور ہے یا پھر اس کی مثال اس آفتاب کی سی ہے جس [illegible] پورا "نظام شمسی" اپنی معین رفتار اور مقررہ زاویوں سے رواں دواں ہے [illegible]۔ جس بھی نئے کردار کی مڈبھیڑ ہوتی ہے' وہ اس کی شخصیت کے طلسم اور [illegible] کی درازی اور اس کے خیالات کی "پُراسراریت" کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ [illegible] "[illegible]" کے مقابلے میں وسیم اور عاطف کی مثال آفتاب کے گرد' دائروں میں

رواں سیاروں کی سی ہے کہ وہ اسی سے روشنی اور قوت اور نمو حاصل کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اس کی تمازت سے اپنے اندر آگ کے شعلے بھڑکتے ہوئے محسوس کرتے ہیں' مگر آفتاب کے گرد گردش کرتے رہنا ان کا مقدر ہے۔ اس لحاظ سے اصل ایک مثالی کردار ہے۔ یہ ایک علامت ہے اس "یوٹوپیا" کی' جسے رحیم گل کے مزاج کی بنیادی نیکی نے تخلیق کیا ہے' مگر رحیم گل کا کمال یہ ہے کہ وہ اس "یوٹوپیا" کو قاری پر مسلط نہیں کرتا بلکہ اسے الہام کی طرح اس پر نازل کرتا ہے۔ وہ خود اپنی بنائی ہوئی مثالی اقلیم کے بعض تاریک گوشوں کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ امکانات کے ساتھ ناممکنات کا بھی جائزہ لیتا چلا جاتا ہے اور آخر میں انسانی فطرت اور جبلت کی فتح کا پرچم اپنی روح میں' اپنے لہو میں پھڑپھڑاتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ یہ انسانی جبلت کے ساتھ ہی ناول نگار کی فتح بھی ہے۔

میں یہاں ناول کا پلاٹ درج نہیں کروں گا' نہ فرداً فرداً سب اہم کرداروں کی خوبیوں اور خامیوں کی فہرستیں مرتب کروں گا اور نہ ناول سے اقتباسات پیش کروں گا۔ یہ میں رسمی دیباچہ نہیں لکھ رہا ہوں۔ قارئین کو اپنے ایک لطیف تجربے میں شریک کر رہا ہوں۔

ناول کا قریب قریب تین چوتھائی حصہ اصل اور دوسرے کرداروں کے درمیان مکالموں پر مشتمل ہے اور باقی حصے پر بلوچستان' کاغان' ناران' گلگت' سکردو' دیوسائی اور ملتر وغیرہ وغیرہ کے وہ مناظر چھائے ہوئے ہیں جو ہمارے خوبصورت وطن کا حصہ ہیں' مگر ہم نے صرف ان کی تصویریں دیکھی ہیں اور ہم ان کے مقابلے میں نیویارک' لندن' برلن' پیرس' روم' جینوا اور ماسکو وغیرہ کے بارے میں زیادہ وسیع معلومات رکھتے ہیں' مگر ہمارے قومی کردار و مزاج کے اس پہلو کا ذکر آگے آئے گا۔

کہانی بالکل اس رفتار سے آگے بڑھتی ہے جیسے اصل کی گفتگو آگے بڑھتی ہے۔ کہانی اور اصل کے کردار کا یہ سفر بالکل ناران کے اس گلیشیئر کا سفر ہے جسے اصل' وسیم اور عاطف' جھیل سیف الملوک کی طرف جاتے ہوئے' گرتے پڑتے عبور کرتے ہیں' فرق صرف اتنا ہے کہ گلیشیئر فراز سے نشیب کی طرف سرک رہا ہے اور "جنت کی تلاش" کے کرداروں کا رخ نشیب سے فراز کی طرف ہے۔ اصل کسی ایک موضوع کی پابند تھیں

ہے۔ خود مصنف بھی' وسیم کی زبانی ایک جگہ کہلواتا ہے کہ رلی نہیں کرتی تو اس غصے میں اس کی دستبرد سے بچا ہوا تھا مگر اصل ہر موضوع کو اپنے ڈھب پر رکھنا چاہیے اور سائنس کو اپنا منفیت اور بے معنویت کا فلسفہ پیش کرنے لگتی ہے۔ وہ انسان کے جبلی اسباب تلاش کرنے یقین نہیں رکھتی۔ انسان اس کے نزدیک خیر کی بجائے شر کا نمائندہ ہے کہیں دور تمیں کر انسان سے کوئی امید وابستہ کرنا اسے آتا ہی نہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کوئی بڑا لے نہایت گہری چوٹ کھائی ہے اور اس چوٹ کے اثرات اتنے شدید ہیں کہ اس کے نزدیک پوری انسانی جدوجہد' اس کی تہذیب اور اس کی نظریہ سازی بے معنی اور بے وقعت ہے۔

متعدد کردار نیکی' معصومیت' بے غرضی اور انسان دوستی کی تجسیم بن کر اصل کے سامنے آتے ہیں مگر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بظاہر وہ ان سے متاثر نہیں ہو رہی ہے' محض محظوظ ہو رہی ہے۔ اوگی کا تھانیدار' بلوچستان کا سہراب خان' سوات کا وزیر خان' سکردو کا ڈاکٹر اور اس کی نرس بیوی' ناران کی مائی حوا' یہ سب کردار مجسم انسانیت ہیں۔ اصل ان کی معترف ہے' مگر اس کے باوجود زندگی کی بے معنویت کے موقف پر قائم رہتی ہے۔ اس کی یہ استقامت' اس کے مزاج کی ضد کی وجہ سے نہیں ہے' اپنی اس منطق کی وجہ سے ہے جو اس کے بھائی عاطف اور اس کے دوست وسیم کو جگہ جگہ لاجواب کر دیتی ہے۔ اطالوی سیاح اور سکردو کے ڈاکٹر اور دوسرے بیچ کرداروں سے وہ اپنے موقف کے لئے تقویت حاصل کرتی ہے مگر اس استقامت' اس ضد میں بھی جب وہ اپنے بھائی عاطف کے ایثار کا اور اپنے چاہنے والے وسیم کے کردار کی کشش کا اعتراف کرتی ہے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ناقابل علاج نہیں ہے اور کہیں اندر سے زندگی کے حسن اور وطن کی خوبصورتی سے متاثر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ناول نگار کے لئے ایسے مشکل کردار کو سنبھالنا اور آخر تک سنبھالے رکھنا بے حد صبر آزما رہا ہوگا۔ مصنف نے اصل کی صورت میں ان گنت ذہنی آزمائشوں میں سے گزر کر اردو ادب کو ایک ایسا کردار دیا ہے جو ہر زمانے میں بیسویں صدی کے نصف آخر کی نوجوان نسل کے آشوب کی نمائندگی کرتا

رواں سیاروں کی سی ہے کہ وہ ارتقائی کردار تخلیق کیا ہے۔

اوقات وہ اس کی تمازت ہے۔ ظاہر ہے کہ جب وہ بحث کرتی ہے تو زیادہ تر انسان کی بے مگر آفتاب کے گرد گردش۔ یہ بحث ناول کے آغاز سے انجام تک چلتی ہے۔ اس صورت ہے۔ یہ ایک علاقہ میں یکسانیت آ جانی چاہیے تھی اور یکسانیت سے اکتاہٹ پیدا ہو جاتی کیونکہ ہو اس طرح کے گہرے اور گمبھیر موضوعات کے ناولوں کو زیادہ مقبول نہیں ہونے دیتی۔ مگر رحیم گل کا کمال یہ ہے کہ وہ اصل کے نقطہ نظر کو گزند پہنچائے بغیر اس نقطہ نظر کے اظہار میں ایسا تنوع پیدا کر دیتا ہے کہ قاری کے ذہن میں اکتاہٹ کی بجائے کرید جنم لیتی ہے اور اصل کا کردار غیر متحرک اور جامد نہیں رہنے پاتا۔ محض مثال کے طور پر یہ نکتہ قابل غور ہے کہ اصل زیارت میں جو باتیں اپنی سیاح سے کرتی ہے' یہی باتیں وہ وسیم سے ایک سے زیادہ مرتبہ کر چکی ہوتی ہے' مگر قاری کو یہ سب باتیں نئی لگتی ہیں۔ اسے رحیم گل کے قلم کے اعجاز کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

اصل کا کردار اس لیے بھی جامد نہیں رہنے پاتا کہ وہ محض فرار کا پرچار نہیں کرتی' وہ انسانی فطرت کے شر کو زیر کرنے کے ارادے سے بلوچستان' کاغان' ناران اور بلتستان کی بلندیوں میں بھٹکتی پھرتی ہے۔ وہ اس شر کو زیر نہیں کر سکتی کیونکہ اس کے ذہن پر مسلط انسان کی بے لحاظی اور بے وفائی کا خوف اسے ایسا نہیں کرنے دیتا' مگر اس کے کردار میں جدوجہد کا چراغ روشن رہتا ہے۔ یقیناً وہ یہ نہیں دیکھ پاتی کہ جنہیں وہ انسانی فطرت کی کمزوریاں قرار دے رہی ہے' ان میں سے بیشتر انسانی فطرت کی خوبصورتیاں ہیں' مگر جب وہ ناران کی شاکر اور قانع "مائی حوا" سوات کے وزیر خان کی سیدھی سادی بیوی اور سکردو کے ڈاکٹر کی سیاہ فام محبوبہ کو اپنے سینے سے لگاتی ہے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر کبھی کبھی زندگی کا حسن اسے مسحور کر لیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اندر کا چراغ بجھنے نہیں پایا۔

"جنت کی تلاش" کے محور اصل کا فرار مکمل فرار نہیں ہے کیونکہ جب وہ کہتی ہے کہ دنیا میں روپے کی بجائے پیار کو معیار ہونا چاہیے یا جب وہ سائنس پر اس لئے برستی ہے کہ وہ کائنات کو سمجھنے نکل ہے' مگر انسان کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتی تو اس غصے میں اس کی یہ امنگ پوشیدہ ہوتی ہے کہ پیار کو افراد اور اقوام کا معیار بننا چاہیے اور سائنس کو اپنا پورا زور انسان کی تفہیم پر صرف کرنا چاہیے اور اس حقیقت کے اسباب تلاش کرنے چاہئیں کہ آخر بڑے بڑے ولی' رشی اور پیغمبر بھی انسان کی نیزہ کو کیوں دور نہیں کر سکے۔ اصل کی یہ آرزوئیں ہی اسے ناامیدی کے اندھیروں میں تحلیل ہونے سے بچا لے جاتی ہیں اور ناول میں ایک نئے انسان کی پیدائش اس کے اندر کے انسان کو اور اس انسان کے اندر کی عورت کو پوری طرح بیدار کر دیتی ہے۔ اس کے فلسفے کے مطابق تو نئے انسان کی پیدائش نئے شر کی پیدائش کے مترادف ہونی چاہیے' مگر ناول کے ریسٹ ہاؤس کے غریب چوکیدار کے نومولود بچے کو اصل جب سینے سے لگاتی ہے تو جیسے وہ پوری زندگی' پوری انسانیت کو سینے سے لگا رہی ہے۔

وسیم کا کردار مصنف کا اپنا نمائندہ ہے۔ یہ اس ترازو کا دوسرا پلڑا ہے۔ مقابل کے پلڑے میں اصل کا وزن اس دوسرے پلڑے کو ہمیشہ اوپر اٹھائے رکھتا ہے' مگر وسیم کی منطق کا وزن اس اٹھے ہوئے پلڑے کو آہستہ آہستہ' بتدریج نیچے لاتا رہتا ہے۔ تاآنکہ ناول میں نئی صبح کے طلوع کے ساتھ ہی ترازو کے دونوں پلڑے برابر ہو جاتے ہیں۔ وسیم کی غیر موجودگی میں اصل کے چٹان کے سے کردار میں تبدیلی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اصل کے بھائی عاطف کے پاس اپنی بہن کے لئے صرف محبت' غیر مشروط محبت ہے۔ وہ اصل کے ساتھ بحث میں حصہ تو بار بار لیتا ہے' مگر ایک خاص حد پر جا کر اس کی منطق جواب دے جاتی ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ اسے بہن سے جو بے اندازہ محبت ہے' وہ بحث کو اس رخ پر نہیں لے جانا چاہتی جہاں اصل کے ماتھے پر بل نمودار ہونے کا امکان ہو۔ فیصلہ کن کردار وسیم کا ہے اور مصنف بیشتر اسی وسیم کی وساطت سے بولتا ہے۔ یوں وسیم کا کردار بھی اصل کے کردار کی سی تکمیل رکھتا ہے۔

مصنف' اصل کو اپنی انفعالیت پسندانہ آراء کی تائید کرنے والے بہت سے لوگوں سے ملاتا ہے اور یوں مشرق و مغرب کی نئی نسل کے مجموعی طرز فکر کو بڑی رسیلی وضاحت سے

بیان کرتا چلا جاتا ہے' اگر وسیم کا' خارج میں حائل نہ ہوتا یا وسیم کے مقابلے میں عاطف کا، کوئی راضی برضا سا کردار ابھرتا (کیونکہ کسی سے قُرب حاصل کرنے کے لئے اس کی ہم خیالی لازمی شرط ہے) تو شاید امثل کا کردار بھی سپاٹ ہو کر رہ جاتا' مگر وسیم سب انتہا پسند کرداروں کے خیالات و تصورات کی تیز دھاروں کو کُند کرتا چلا جاتا ہے۔ امثل کبھی جذبے کو رد کرتی ہے' کبھی شعور کو رد کرتی ہے اور اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ نئی نسل کا سارا آشوب اس کے تعلیم یافتہ اور باشعور ہونے کا نتیجہ ہے۔ وہ سوات کے وزیر خاں کی خوبصورت بیوی کے بارے میں ایک جگہ کہتی ہے کہ وہ اپنے شوہر سے اس لیے محبت کرتی ہے کیونکہ وہ "خالی الذہن" ہے۔ اسی طرح جب امثل سکردو کے ڈاکٹر کو بتاتی ہے کہ وسیم صاحب میرے اور آپ کے برعکس انسان سے مایوس نہیں ہیں اور اس پر ڈاکٹر کہتا ہے "تو پھر یہ درویش نہ ہوئے نا" تو امثل اس ہم خیالی سے بہت خوش ہوتی ہے۔ سوچنے کا یہ انداز انسان کو اس بند گلی میں لے جاتا ہے جہاں پہنچ کر اسے موت کے سوا کوئی راہِ فرار نظر نہیں آتی۔ امثل بھی دو بار خودکشی کی کوشش کر چکی ہے اور تیسری بار بھی کر سکتی ہے' مگر وسیم جو شروع شروع میں اس طرح کے نظریات سے ایک حد تک متفق بھی تھا جب امثل کی محبت کے نور سے اپنے دل و دماغ کو جگمگا لیتا ہے' تو وہ اپنے اثبات سے امثل کی نفی کی ایک نہیں چلنے دیتا اور یوں یہ فیصلہ کرنا خاصا دشوار ہو جاتا ہے کہ امثل اور وسیم میں سے کون سا کردار زیادہ وقیع ہے۔ شاید دونوں ہی وقیع ہیں۔

امثل کا کردار امیر خاندان کی کسی بھی پڑھی لکھی اور حساس لڑکی کا کردار ہو سکتا ہے' مگر یہ حیرت ضرور ہوتی ہے کہ اس عمر میں وہ دنیا جہان کے فلسفوں پر اتنی آسانی اور روانی سے گفتگو کیسے کر لیتی ہے۔ آخر میں جب سمیع سے امثل کی بھرپور مگر آلودہ محبت کا واقعہ سامنے آتا ہے تو امثل کی بے پناہ حساسیت کا سبب تو بالکل واضح ہو جاتا ہے' لیکن اس طرح کی جذباتی شکست کسی کو اتنا علم نہیں دے سکتی جتنا امثل کے پاس ہے' مگر پھر یوں بھی تو ہوتا ہے کہ دل و دماغ پر ایک چوٹ پڑنے سے بعض غیر تعلیم یافتہ افراد کے ہاں بھی' اپنے ان گھڑ انداز میں سہی' مسائلِ حیات پر فکر کرنے کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے (بصورتِ دیگر

ہمارے لوک گیتوں میں دنیا جہان کی اتنی بہت سی سچائیاں جمع نہ ہوتیں) اور پھر امثل تو ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔

ناول کا ماحول امارت کا ہے۔ جتنے بھی نمایاں کردار ہیں' وہ طبقہ امراء سے تعلق رکھتے ہیں۔ غریب غرباء بھی نظر آتے ہیں مگر صرف اس حد تک کہ امراء محض منہ کا مزا بدلنے کے لئے ان کی مکئی کی روٹی اور ساگ یوں کھاتے ہیں جیسے عیاشی کا ایک نیا تجربہ کر رہے ہیں۔ بیشتر کردار' غربا سے جیسے کھیل رہے ہیں اور اوگی کے تھانیدار نے شاید اسی لئے انہیں "بے فکرے" قرار دیا ہے۔ "بے فکرے" اس لحاظ سے کہ ان کا کوئی معاشی مسئلہ ہے ہی نہیں۔ انہیں اگر کوئی فکر ہے تو یہ کہ زندگی میں کوئی چیز اہم نہیں ہے اور انسانی فطرت سراسر شر ہے۔ میرے خیال میں رحیم گل نے امراء کی نئی نسل کا یہ فلسفہ پیش کر کے دراصل اس فلسفے کے کھوکھلے پن کا راز فاش کیا ہے۔ وہ ایک سلیقہ مند ناول نگار کی طرح کسی مرحلے پر اپنی اس نیت کا اظہار نہیں کرتا مگر ناول کے آخر میں جب امثل اور وسیم' تلتر کے ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار کے غریبانہ گھر میں پہنچتے ہیں' اور وہاں' امثل اس چوکیدار کی نوجوان بیوی کو اس کا پہلا بچہ جنم دینے میں مدد دیتی ہے اور ناول نگار کے مطابق وہاں امثل کی روح میں گلاب کا پھول کھِل جاتا ہے تو رحیم گل اس صدی کے پورے آشوب پر ایک فیصلہ کن اور مثبت وار کرتا ہے۔

اس ناول کی ایک اور بے مثال خصوصیت اس کا وہ پاکستانی پس منظر ہے جس کے حسن و لطافت سے لذت یاب ہوئے بغیر جنت کا تصور بھی محال معلوم ہوتا ہے۔ رحیم گل نے "جنت کی تلاش" میں سفرنامے کی ایک نئی صنف متعارف کرائی ہے۔ یہ سفرنامہ اعلیٰ معیار کے ایک ناول میں یوں رچا بسا ہوا ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا' گوشت کو ناخن سے جدا کرنے کے مترادف ہے۔ حال ہی میں اردو ادب میں نہایت خوبصورت اور جیتے جاگتے سفرناموں کا حوصلہ افزا آغاز ہوا ہے۔ میں نے سفرنامہ نگاری کے اس رجحان کو کھلے دل سے سراہا ہے مگر ساتھ ہی اپنے نوجوان سیاحوں سے یہ مطالبہ بھی کیا ہے کہ وہ اپنے وطن کی بھی سیاحت کریں کہ ان کا جینیئس اس پس منظر میں کنول کے پھول کی

طرح کھلتا چلا جائے گا۔ چند برس پہلے مشہور ادیب محمد خالد اختر نے سوات اور کاغان کے دل آویز سفرنامے لکھ کر پاکستانی سیاحوں کو ایک مثبت جہت مہیا کی تھی۔ اب رحیم گل نے سوات اور کاغان کے علاوہ ناران اور بلتستان اور بلوچستان کی بھرپور سیاحتوں کے مشاہدات و تاثرات اپنے ناول میں سمو کر ایک تخلیقی کارنامہ انجام دیا ہے۔ ساتھ ہی رحیم گل نے اس ناول میں پاکستانی علاقوں کے ناقابلِ یقین حد تک خوبصورت اور پراسرار مناظر کو جس طلسم کاری سے پیش کیا ہے' وہ شاید فی الحال اردو ناول نگاروں میں صرف اسی کا حصہ ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر اہلِ نقد نے دیانت سے کام لیا تو "جنت کی تلاش" کو ایک ایسا ناول تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے جو اپنے موضوع اور برتاؤ کے لحاظ سے منفرد حیثیت کا حامل ہے اور جو مستقبل کی اردو ناول نگاری کی ایک مضبوط بنیاد قرار پا سکتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی

اگست 1977
لاہور

یہ کہانی مانسہرہ کے ڈاک بنگلے سے شروع ہوتی ہے۔
دریائے سرن اور کنہار کو عبور کرتی ہے۔
دریائے پولان اور وادی کاغان میں پروان چڑھتی ہے۔
جھیل سیف الملوک کے ٹھنڈے پانیوں سے پیاس بجھاتی ہے اور گلگت کے سربفلک پہاڑوں اور سبزہ زاروں میں ختم ہو جاتی ہے۔

مانسہرہ ایبٹ آباد سے پندرہ میل آگے ضلع ہزارہ کا مشہور قصبہ ہے۔ مانسہرہ کا ڈاک بنگلہ دو چار فرلانگ پر قصبے سے باہر اس سڑک پر واقع ہے' جو مظفر آباد اور کاغان کو نکل جاتی ہے۔ ڈاک بنگلے کے شمال مشرقی جانب سڑک کے ساتھ ساتھ پہاڑوں کا سلسلہ ہے' جس پر خوبصورت چیڑ کے درختوں کے جھنڈ ہیں۔

غربی جانب قصبہ ہے۔ جنوب کی طرف سرسبز و شاداب کھلی وادی' تاحد نظر اونچے اونچے پہاڑوں کے سلسلے اور ان پر چیڑ اور دیودار کے جنگل۔

ڈاک بنگلہ ایک اونچے ٹیلے پر واقع ہے۔ یہاں سے وادی کا نظارہ نہایت طمانیت بخش اور سکون پرور ہے۔

ڈاک بنگلے میں پانچ کمرے ہیں۔ سارے کمرے ایک ہی قطار میں ہیں۔ سڑک کی

جانب پہلا کمرہ میرے پاس تھا' جو متعلقہ محکمہ نے مجھے پندرہ دن کے لئے دے رکھا تھا۔ دوسرے کمرے میں چیکو سلواکیہ کا کوئی سیاح تھا۔ تیسرے کمرے میں متعلقہ محکمے کا کوئی افسر ٹھہرا ہوا تھا۔ چوتھا کمرہ خالی تھا۔ پانچویں اور آخری کمرے میں ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی رہتے تھے' جن کو میں پہلی نظر میں میاں بیوی سمجھا تھا' لیکن بعد میں خانساماں کی زبانی معلوم ہوا کہ دو بہن بھائی ہیں۔ مجھے وہاں ٹھہرے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا' مگر ڈاک بنگلے کے کسی آدمی سے تعارف نہیں ہوا تھا۔ میں صبح جیپ لے کر کسی سمت نکل جاتا۔ دن بھر کچی پکی سڑکوں پر بے مقصد آوارہ گردی کرتا اور شام کو واپس آ جاتا۔

مختلف مناظر دیکھنے کے سوا میرا کوئی مقصد نہ ہوتا۔

چیکو سلواکیہ کا سیاح شام کو لوٹتا تو اس کے پاس مختلف قسم کے پتھر ہوتے۔ برآمدے میں کرسی بچھا کر مختلف زاویوں سے مختلف آلات کی مدد سے ان پتھروں کو دیکھتا رہتا۔

آخری کمرے میں جو بہن بھائی رہتے تھے' ان کو میں نے قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ شام واپس آتے اور اپنے کمرے کے سامنے فوکس ویگن سے اترتے تو ان کی ایک آدھ جھلک نظر آ جاتی۔ لڑکی بھائی کی طرح شرٹ اور پتلون پہنتی۔ دونوں کا قد میانہ تھا اور دونوں کا رنگ گورا تھا۔

ایک دن شام کو نہا دھو کر میں بیٹھا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور دوسرے لمحے پانچ نمبر کا وہی نوجوان مسکراتا ہوا اندر آ گیا۔ میں نے خوش آمدید کہا اور وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ بال سیاہ اور گال ہلکے گلاب کی طرح سرخ تھے۔ اگر وہ صاف اردو نہ بولتا تو میں اسے یقیناً یورپین یا امریکن سمجھتا۔ وہ مجھے بہت اچھا لگا۔

اس نے بتایا۔۔۔۔

"میں ایرانی النسل ہوں۔ میرے ماں باپ تقریباً پچاس برس ہوئے کراچی میں مستقل طور پر آباد ہو گئے تھے۔ میں کراچی میں ہی پیدا ہوا۔ وہیں پلا بڑھا اور تعلیم حاصل کی۔ ابھی میری عمر چھ برس سے کم ہی تھی کہ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ایک سال بعد میرے والد

نے ایک پاکستانی لڑکی سے شادی کر لی۔ جس کے بطن سے میری یہ بہن پیدا ہوئی جو دنیا میں مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے اور جسے ایک لمحے کے لئے آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔"

میں دلچسپی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس نے بات جاری رکھی۔

"ہمارا باپ لاکھوں کی جائیداد چھوڑ کر مرا ہے۔ ہم دونوں نے ایم اے کر لیا ہے۔ فی الحال ہمارا ارادہ پہاڑوں پر گھومنے کا ہے۔"

اس کی باتیں سن کر میں ہنس پڑا۔

"ہماری کہانی بہت ملتی جلتی ہے۔ ہمارے ابا لاکھوں کی جائیداد چھوڑ کر مرے ہیں۔ ہم چار بھائی ہیں۔ ہر ایک کے حصہ میں سوا سوا لاکھ روپیہ نقد اور دو دو لاکھ کی جائیداد آئی ہے۔ ہمارے ابا بہت کنجوس تھے۔ پہلے بہت غریب تھے۔ پائی پائی اکٹھی کر کے انہوں نے اتنی جائیداد بنائی تھی' مگر انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کے بیٹے کس بے تابی سے ان کی موت کا انتظار کر رہے ہیں۔

ہمارا بڑا بھائی تو باپ کے نقش قدم پر چل رہا ہے اور خوب نام پا رہا ہے۔ لوگ اسے بڑا قابل سمجھتے ہیں۔ دوسرا بھائی تارک الدنیا ہو گیا۔ تیسرا طوائف کے کوٹھے اور شراب کی بوتل میں ڈوب گیا ہے۔ خوب آدمی ہے۔ مست قلندر' مجھے تینوں میں سے یہی بھائی پسند ہے۔ چوتھا میں ہوں۔ آپ کی طرح ایم اے کر چکا ہوں۔ میں رشتوں ناطوں کا کچھ زیادہ قائل نہیں ہوں۔ گو ابا مجھے بہت پیار کرتے تھے' مگر خود مجھے وہ بس واجبی واجبی لگتے تھے۔ تعلیم انہوں نے دلوائی' مگر پیسے پیسے کو محتاج رکھا۔ اس لئے ان کی موت سے مجھے کوئی خاص صدمہ نہیں ہوا۔ ایم اے کرنے کے بعد میں ملازمت کر کے پیسہ کما سکتا تھا' لیکن جب باپ کی دولت کا خیال آتا تو نوکری کو دل نہ چاہتا۔ پیسے پر سانپ بن کر بیٹھنے کا میں قائل نہیں تھا' جیسا کہ میرے ابا کا کردار تھا۔ انہوں نے جائیداد تو بہت بنائی۔ نقد روپیہ بھی جمع کیا' لیکن خود زندگی کی آسائشوں سے محروم ہی رہے۔ نہ اچھا کھایا' نہ اچھا پہنا اور نہ اس صدی کی دوسری سہولتوں سے فائدہ اٹھایا۔۔۔۔ افسوس! وہ یہ نہ جان سکے

کہ ان کی اولاد ان کی طرح نہ سوچے گی اور وہ لوگ ان کی چھوڑی ہوئی دولت کو اپنی اپنی سمجھ کے مطابق استعمال کریں گے' ورنہ بے چارے چار دن تو آرام سے گزارتے!!"

نوجوان نہایت غور سے میری باتیں سن رہا تھا اور برابر مسکرا رہا تھا۔ وہ بڑے تجسس سے کرسی کھینچ کر میرے اور زیادہ قریب ہو گیا۔

"اچھا پھر......؟"

"پھر کیا بھی۔ روپیہ تو میرے ہاتھ آ گیا ہے۔ نقد روپے کے لئے میں نے پلان بنا لیا ہے۔ پچیس ہزار روپے اپنے ملک کی سیاحت پر خرچ کروں گا۔ ملک کا گوشہ گوشہ دیکھوں گا۔ باقی ایک لاکھ روپے سے میں ساری دنیا کی سیر کروں گا۔ جب یہ ختم ہو جائے گا تو پھر جائداد بیچوں گا۔ اس میں سے ایک لاکھ روپیہ کسی ہسپتال کے لئے وقف کر دوں گا۔ باقی کا بھی کوئی مصرف نکال لوں گا۔ تعلیم یافتہ آدمی ہوں۔ بھوکا تو مر نہیں سکتا۔ ملازمت' تجارت ہر کام کر سکتا ہوں۔ میرے خیال میں ہر آدمی کو اپنی زندگی خود بنانی چاہیے' کیوں آپ کا کیا خیال ہے----؟"

نوجوان ہنس کر بولا۔

"میرا خیال محفوظ رہے تو اچھا ہے۔ البتہ میری بہن آپ کے خیالات سن کر بہت خوش ہو گی۔"

"کیوں----! کیا میں نے کوئی عجیب باتیں کی ہیں----؟"

"اگر میں اپنی بہن کے خیالات نہ جانتا' تو شاید آپ کی باتوں کو عجیب ہی سمجھتا' مگر اس کے ساتھ رہ کر مجھے کوئی چیز عجیب نہیں لگتی' کیونکہ اس سے زیادہ عجیب و غریب چیز روئے زمین پر دوسری نہیں ہو گی!"

میں نے حیرت و استعجاب سے اور کچھ شوق سے اپنے نئے دوست کی طرف دیکھا۔ اس نے نہایت تسلی اور ٹھہراؤ سے اپنی بات جاری رکھی۔

"ہاں.... میں سچ کہتا ہوں۔ میری بہن کو بعض لوگ پاگل سمجھتے ہیں' مگر یہ غلط ہے۔ وہ پاگل نہیں ہے۔ دراصل وہ انسان کی شعوری سطح سے بہت زیادہ باشعور ہے۔ اس کی غیر معمولی ذہانت کے سامنے ذہین سے ذہین آدمی بھی خود کو بے بس پاتا ہے۔ اس لئے اسے پاگل یا نیم پاگل کہہ کر ایک طرح سے اپنے آپ کو مطمئن کرتا ہے۔ یہ تو خیر جس وقت آپ اس سے ملیں گے تو خود ہی فیصلہ کر لیں گے کہ وہ کیا چیز ہے۔ اس وقت میرا آپ کے پاس آنے کا مقصد یہ ہے کہ میں دو روز کے لئے ایک ضروری کام سے راولپنڈی جا رہا ہوں۔ وہ ساتھ نہیں جانا چاہتی۔ اس لئے آپ کو تکلیف دے رہا ہوں' کیونکہ ڈاک بنگلے میں آپ کے سوا کوئی آدمی ایسا دکھائی نہیں دیتا جو اسے جتائے بغیر اس کا دھیان رکھے۔ وہ ہر وقت اپنے آپ کو محفوظ سمجھتی ہے' کیونکہ وہ موت سے ذرا بھی خائف نہیں ہے۔ اگر وہ آپ سے خود بات نہ کرے تو آپ اس سے ہرگز بات نہ کریں۔ البتہ میں اسے بتا کر جاؤں گا کہ آپ سے میری شناسائی ہو گئی ہے---- وہ من موجی لڑکی ہے۔ شاید آپ سے بات کرے نہ کرے۔ بہرکیف میں آپ سے امید رکھتا ہوں کہ اسے احساس کرائے بغیر آپ اس کا خیال رکھیں گے-----؟"

"بہت بہتر جناب"----- میں نے اپنے نئے دوست سے وعدہ کیا------ "مگر میں تو صبح صبح نکل جاتا ہوں اور شام کو واپس آتا ہوں۔ میں اپنی غیر موجودگی میں کس طرح ان کا خیال رکھ سکوں گا؟"

"اس کی ذمہ داری میں آپ پر نہیں ڈالتا۔ آپ اپنی مصروفیات میں بالکل خلل نہ کریں۔ جب آپ ڈاک بنگلے میں موجود ہوں' تو اس سے باخبر رہیں-----"

"ٹھیک ہے-----" میں نے اس سے دوبارہ وعدہ کیا' لیکن میرا ذہن متذبذب تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"آخر اس کی اتنی خبر گیری کیوں کی جا رہی ہے-----؟"

"اصل چیز اس کی زندگی ہے"۔ وہ بولا"۔ وہ بہت غیر معمولی لڑکی ہے' مگر اسے اپنی اہمیت کا احساس نہیں۔ وہ دو بار خودکشی کی کوشش کر چکی ہے۔ آج کل وہ بہت ہشاش بشاش رہتی ہے۔ مجھے ایسا کوئی شبہ بھی نہیں ہے' مگر میں اس سے بے پناہ پیار کرتا ہوں۔ اس لئے اس سے غافل نہیں رہتا۔"

اب میں کسی حد تک اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ یہ نوجوان اپنے اظہار میں مخلص تھا' لیکن یہ عجیب و غریب لڑکی...... یکبارگی میرے دل میں اس سے ملنے اور دیکھنے کی زبردست خواہش پیدا ہوئی۔

صبح میں تیار ہو کر باہر آیا' تو ان کی فوکس ویگن موجود نہیں تھی...... یقیناً عاطف پنڈی چلا گیا ہوگا۔—— میں نے جیپ کا تیل پانی چیک کیا۔ پانی کم تھا۔ خانساماں کو آواز دی۔ وہ تھوڑی دیر بعد پانی کا جگ لے آیا۔ ریڈی ایٹر میں پانی ڈال کر میں نے خانساماں کو رات کے کھانے کے متعلق ہدایات دیں اور پھر جیپ سٹارٹ کرنے لگا۔

اچانک سفید پتلون اور سرخ شرٹ پہنے' سیاہ چشمہ لگائے اور کندھے پر ہلکا سا جھولا لٹکائے وہ لڑکی تیز تیز آئی۔—— اور اس نے ہنستے ہوئے گڈ مارننگ کہا۔ میں نے حیرت اور شوق سے اس کی طرف دیکھا۔

سب سے پہلے میری نظر اس کی ننھی سی خوبصورت ناک پر پڑی۔—— اس کا رنگ گورا تھا لیکن ہلکا زردی مائل۔ بھائی کی طرح اس کے گال سرخ نہیں تھے۔ میں نے گڈ مارننگ کا جواب دیا تو وہ بولی۔

"اگر آپ محسوس نہ کریں تو آج مجھے بھی سیر کے لئے ساتھ لے جائیں۔"

میرے لبوں پر شریر سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا' وہ ذرا بھی نہ گھبرائی۔ اس کا نچلا ہونٹ بیچ میں ہلکا سا دبا ہوا تھا۔ دباؤ کے دائیں بائیں ہلکے ہلکے ابھار تھے۔ ان ابھاروں میں چھوٹی چھوٹی عمودی لائنیں تھیں۔

یہ عجیب و غریب ہونٹ تھا۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ کو میرے ساتھ ڈر نہیں لگے گا......؟"

"ڈر......!" وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔...... "کس بات سے؟ آپ میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟"

"بیٹھ جائیں۔" میں اس کے جواب سے مطمئن ہو گیا۔

وہ لپک کر میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔—— میں نے ہڑاسی جانے والی سڑک پر جیپ ڈال دی۔ چار پانچ میل تک ہم نے کوئی بات نہ کی۔

سڑک پیچیدہ تھی۔ ہم خاموشی سے موڑ مڑتے رہے۔

اترائی کے بعد اب چڑھائی شروع ہو گئی تھی۔ میں نے گیئر بدلا۔ جیپ نے معمولی سی سپیڈ پکڑی...... تو میں نے انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ سامنے دیکھ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ اس کے بال جو کندھوں تک لمبے تھے ہوا میں اڑ رہے تھے۔ کبھی کبھی ایک آدھ لٹ اس کے رخساروں اور گردن سے لپٹ جاتی۔

اس کے بال سیاہ تھے اور اس کی گردن گول اور خوبصورت تھی۔ سیاہ بالوں اور سرخ شرٹ کے کالروں کے درمیان سفید گردن کو میں کسی چیز سے تشبیہ نہیں دے سکتا تھا۔ لیکن یہ منظر دیدنی تھا۔

اچانک ایک موڑ پر بس سامنے آ گئی۔ میں نے گھبرا کر سٹیرنگ گھمایا اور بمشکل جیپ کو قابو کیا۔ میں نے دیکھا لڑکی کے چہرے پر خطرے کا معمولی تاثر بھی نہیں تھا۔ ہنس کر بولی۔

"مجھے ہی دیکھنا ہے تو میں سارا دن آپ کے ساتھ رہوں گی۔ جی بھر کر دیکھ لینا۔ یوں اپنی زندگی خطرے میں کیوں ڈالتے ہیں——؟"

مجھے اس کی یہ بات اچھی نہ لگی۔

"آپ خواہ مخواہ خود کو اہمیت دے رہی ہیں۔"

وہ زور سے ہنس پڑی۔—— اور بولی۔

"لوگ ہمیشہ حقیقت سے چڑتے ہیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ بات آگے بڑھنے والی ہے۔ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ "پہلے یہ بتایئے کہ حقیقت ہوتی کیا ہے۔ میں کسی حقیقت وقیقت کو تسلیم نہیں کرتا۔"

"چلو چھٹی ہوئی......" اس نے میری طرف دیکھا...... "کیا آپ واقعی میری طرف

دیکھ نہیں رہے تھے؟"

"ہاں دیکھ رہا تھا۔ ہر نئی چیز کی طرف آدمی دیکھتا ہی ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے"

جیپ اب پے در پے موڑوں سے نکل گئی تھی۔ آگے سڑک دور تک صاف تھی۔

"لیجئے اب تو کھلی سڑک آگئی۔" وہ بولی۔۔۔۔ "ہمیں ایک دوسرے سے تعارف کر لینا چاہیے۔"

"ہاں۔۔۔۔ مجھے وسیم کہتے ہیں۔"

"میرا نام اچل ہے۔ نام صرف پہچاننے کے لئے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ بہت گڑبڑ کرتے ہیں۔ بڑا غلط تاثر دیتے ہیں۔ اس لئے ناموں کی طرف زیادہ توجہ نہیں دینا چاہیے۔"

ایک گھنٹے کے بعد ہم ہزارہ پہنچ گئے۔

جیپ سے اترے' تو ڈاک بنگلے کا چوکیدار تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ہماری طرف آیا۔ اس نے فوجی انداز میں سلیوٹ کیا۔ میں نے اسے پانچ روپے کا نوٹ دیا اور چائے کے لئے کہا۔

ایک بار پہلے بھی میں یہاں آچکا تھا۔

اچل نے چاروں اطراف کا جائزہ لیا' تو بے اختیار بولی۔

"کیسا بے پناہ منظر ہے۔ بھائی جان اس طرف آئے ہی نہیں۔"

ڈاک بنگلے کی طرف پشت کر کے آدمی کھڑا ہو تو نہایت ہی خوبصورت مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ ذرا سا بائیں بالکل نزدیک چیڑوں کا گھنا جنگل' سامنے بہت دور' سیاہ اور سبز اونچا پہاڑ' بالکل نیچے بل کھاتی ہوئی سڑک' سات میل تک ڈھلانوں سے ہوتی ہوئی دریائے کنہار میں ڈوب جاتی ہے۔ دریا کے اس پار گڑھی حبیب اللہ کا قصبہ ہے۔

دائیں ہاتھ کے پہاڑ بالکل خشک تھے۔ میں نے اچل سے کہا۔

"اس سڑک کی طرف دیکھئے۔ ایسا لگتا ہے' جیسے بہت بڑے اژدہے نے پیاس بجھانے کے لئے اپنا سر دریائے کنہار میں ڈال دیا ہو۔۔۔۔!"

اچل نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک دل کش مسکراہٹ

پھیل گئی۔ اس نے سیاہ چشمہ اتار لیا۔ میں نے پہلی بار اس کی سیاہ اور گول گول حیرت زدہ آنکھوں کو دیکھا۔ یہ بچوں کی طرح حیران حیران آنکھیں تھیں' جن میں بلا کا تجسس ہوتا ہے۔

میں نے ایسی آنکھیں آڈرے ہیپ برن' ملکہ فرح دیبا اور شہزادی ثروت کے چہروں پر دیکھی تھیں۔۔۔۔ ہو بہو یہ وہی آنکھیں تھیں۔ منفرد اور غیر معمولی۔

"کیا دیکھ رہے ہیں آپ۔۔۔۔؟"

اس نے میری محویت دیکھ کر پوچھا۔

"آپ کی آنکھیں۔۔۔۔!"

"ارے۔۔۔۔!" وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔۔۔۔ "یہ تو بٹن ہیں بٹن۔ عاطف بھائی بھی یہی کہتے ہیں اور ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ کتنی چھوٹی چھوٹی تو ہیں۔۔۔۔!"

"نہیں۔۔۔۔!" میں نے پرزور تردید کی۔۔۔۔ "سبھی احمق ہیں۔ ایسی آنکھیں شہزادیوں کی ہوتی ہیں اور اگر وہ شہزادیاں نہیں ہوتیں' تو ایک نہ ایک دن شہزادیاں بن جاتی ہیں!!"

وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی اور ایک چٹان پر جا بیٹھی۔ اس نے ایک خاص ادا سے بالوں کو جھٹکا دے کر پیچھے پھینکا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔

"شاید آپ کا مشاہدہ بہت گہرا ہے یا پھر آپ علم قیافہ جانتے ہوں گے اور یا پھر پچھلے جنم میں شہزادیوں کے ساتھ صحبت رہی ہوگی؟"

"جی نہیں۔ میں پچھلے اور اگلے جنم کا قائل نہیں ہوں۔ میں اس دور کی بات کر رہا ہوں۔ آج کے اپنی دور کی شہزادی ثروت' ملکہ فرح دیبا اور آڈرے ہیپ برن آج کے دور کی شہزادیاں ہیں۔"

"اوہ۔۔۔۔!" وہ چٹان سے اتر آئی۔۔۔۔ "آپ نے واقعی اتنا باریکی سے جائزہ لیا ہے۔۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔۔ یہ میری ہابی ہے۔ میں دانتوں' ناکوں اور آنکھوں کی لاکھوں قسمیں آپ کو

بتا سکتا ہوں اور اپنے اس تجربے میں شاذ و نادر ہی غلطی کرتا ہوں۔"

"واہ------!" اس کی آنکھیں جلد جلد پھڑکنے لگ گئیں۔ "یہ تو بہت اچھا ہوا۔ بہت ہی اچھا۔"

یہ فقرے جیسے اس نے مجھ سے نہیں، اپنے آپ سے کہے ہوں اور بے خیالی میں آگے نکل گئی۔ اب اس کی میری طرف پشت تھی۔ اس کا جسم نہایت ہی نازک اور متناسب تھا۔ اس کے ذہن سے بالکل مختلف۔

اب وہ ایک ڈھلان پر کھڑی تھی اور پتھر اٹھا اٹھا کر نیچے کسی چیز کو نشانہ بنا رہی تھی۔ میں خاموشی سے اس کے جسم کے دل لبھا دینے والے زاویوں کو دیکھ رہا تھا، جو پتھر اٹھاتے اور پتھر پھینکنے سے پیدا ہو رہے تھے۔

دنیا چاہے نامکمل ہی ہو، لیکن دنیا میں ایک چیز مکمل ہوتی ہے۔

اور وہ ہوتا ہے جوان عورت کا جسم-----

اتنے میں چوکیدار آگیا۔ چائے تیار تھی۔ میں نے امل کو آواز دی اور ہم ڈاک بنگلے کے ڈرائنگ روم میں آگئے۔

امل نے بڑے سلیقے سے چائے بنائی۔ میں اسے غور سے دیکھتا رہا۔ جب اس نے کپ میری طرف بڑھایا، تو میں نے مسکرا کر دوبارہ وہی سوال کیا۔

"آپ کو میرے ساتھ اکیلے آنے میں ڈر نہیں لگا؟"

"واہ صاحب----- میں آخر آپ سے کیوں ڈرتی۔ آپ کوئی جن بھوت یا روایتی قسم کے دیو تو ہیں نہیں کہ مجھے ڈر لگے۔"

"مگر آپ ایک کمزور لڑکی ہیں اور میں ایک طاقت ور مرد!"

اس نے چائے کا گھونٹ بھرا اور ہنس پڑی۔

"گویا آپ کا [illegible] ہے کہ آپ میری عزت لوٹ سکتے ہیں----- ہرگز نہیں۔ آپ طاقت کے ذریعے [illegible] ایسا کر سکتے ہوں، لیکن جس حرکت میں میری مرضی شامل نہیں ہوگی اسے آپ ہرگز مکمل نہیں کہہ سکتے۔ یکطرفہ کارروائی سے میرا کچھ نہیں بگڑتا۔ چونکہ میں نے اپنی خوشی سے آپ کو کچھ نہیں دیا----- میں روپیہ تو ہوں نہیں کہ آپ مجھے چھین لیں گے اور بازار میں اسے خرچ کر سکیں گے۔ میں ایک وجود ہوں۔ ایک ٹھوس تحریک ہوں۔ میں اپنی مرضی سے تو سب کچھ دے سکتی ہوں، مگر طاقت اور زبردستی سے آپ کچھ بھی حاصل نہیں کر سکیں گے!"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔" میں بے ساختہ بولا۔

میں اس کی باتوں سے متاثر ہو چکا تھا۔ اس کے بھائی نے اس کے متعلق ٹھیک کہا تھا۔ وہ عام لڑکی نہیں----- یقیناً میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

میں نے خالی پیالی پرچ میں رکھ دی۔ تو وہ بولی۔

"اور بنا دوں-----؟"

"ہے تو اچھی!" میں نے کہا۔

"تو اور لیجئے۔"

وہ دوسری پیالی بنانے لگی۔ میں اس کے خوبصورت بالوں کو دیکھ رہا تھا۔ جو اس کی مرمریں گردن پر کھیل رہے تھے۔ وہ پیالی میں چمچ ہلا رہی تھی۔ اچانک اس نے اپنی متجسس آنکھیں اوپر اٹھائیں۔

"بھائی جان نے کہا تھا آپ عجیب و غریب آدمی ہیں۔ اس لئے آپ کے ساتھ چلی آئی۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ عجیب و غریب آدمی کیسے ہوتے ہیں؟"

میں ہنس پڑا۔

"آپ کا کیا خیال ہے۔ میں عجیب و غریب تو نہیں ہوں۔ سیدھا سادہ آدمی ہوں۔"

"لگتا تو ہے۔ آپ کی آنکھوں میں بڑا حجاب ہے، مگر کیا پتہ آپ کے دل میں کیا ہو۔ کون اندر کے بھیدوں کو پا سکتا ہے؟"

"لوگ تو پا لیتے ہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"بیوقوف پا لیتے ہیں۔" وہ بولی۔ "جن کو سوجھ بوجھ ہوتی ہے وہ کبھی کچھ نہیں پاتے۔ بھٹکتے رہتے ہیں۔ تلاش میں رہتے ہیں۔ زندگی کے معنی کبھی ان کی سمجھ میں نہیں

آتے۔ بس اس دنیا میں احمق لوگوں کے مزے ہیں۔ وہ ہمیشہ پا لیتے ہیں کیونکہ وہ پانے کا مطلب ہی نہیں سمجھتے۔۔۔۔۔!")

بجلی کے کوندے کی طرح اس کی باتیں میرے شعور میں اتر گئیں۔۔۔۔۔ وہ بچوں کی طرح حیران حیران آنکھیں۔

اور وہ ننھی سی ناک۔

مجھے اس کی عمر اٹھارہ انیس برس سے زیادہ نہ لگی' لیکن اس کی باتیں! میں نے اس سے پوچھا۔

"آپ کی عمر کیا ہوگی۔۔۔۔۔؟"

"اٹھائیس برس۔۔۔۔۔"

اس نے ایک لمحہ بھی نہ سوچا اور فوراً جواب دیا۔

"اٹھائیس برس۔۔۔۔۔!" میں نے حیرت سے کہا۔ "یہ تو میری عمر ہے۔ آپ کا رنگ تو بہت کچا سا ہے۔ مجھے تو آپ اٹھارہ انیس برس سے زیادہ کی نہیں لگتیں۔"

"یہی تو فریب نظر ہے۔ زندگی ہر پل دھوکہ دیتی ہے۔ پچھلے لمحوں کی یاد اور آنے والے لمحوں کا انتظار سب بے کار باتیں ہیں۔ جو لمحہ گزر رہا ہے' وہی حیات ہے۔ اٹھائیس کی ہوں یا اٹھارہ کی۔ مجھے اس سے کوئی فائدہ کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اصل بات یہ ہے کہ میں موجود ہوں اور آپ کے سامنے ہوں۔ بس یہی لمحے زندگی ہیں۔۔۔۔۔!"

ہاں۔۔۔۔۔ یہ ہے وہ لڑکی!

جس کی زندگی کا فلسفہ کو بڑا خیال ہے۔

اور یہی ہے وہ ہستی جو اپنے آپ سے بے خبر ہے اور جو موت سے نہیں ڈرتی۔

چوکیدار نے ہلکی سی دستک دی۔ میں نے کہا۔

"ہاں بھئی۔۔۔۔۔ آجاؤ اندر۔"

چوکیدار گھبرایا ہوا تھا۔

"صاحب جی۔۔۔۔۔ ہمارے بنگلے کا بڑا صاحب آگیا ہے۔ ہم نے اجازت کے بغیر آپ کو

گول کمرے میں بٹھایا ہے۔ صاحب ہم پر ناراض ہوگا۔ شاید ہمارا نوکری بھی چلا جائے۔۔۔۔۔!"

"فکر نہ کرو۔" امل نے اسے تسلی دی۔ "صاحب ناراض نہیں ہوگا' اور اگر ناراض بھی ہو گیا تو ہم تمہیں اس سے اچھی نوکری دلا دیں گے۔"

چوکیدار جلدی سے باہر چلا گیا۔ ہم دونوں بھی باہر نکل آئے۔ ایک بھاری بھرکم گورا چٹا آدمی کار سے باہر نکلا۔ چوکیدار نے سلیوٹ کیا۔ امل اس کی طرف بڑھی اور نہایت فصیح انگریزی میں اپنے تعارف کے بعد ڈاک بنگلے میں چائے کے لئے ٹھہرنے پر معذرت کا اظہار کیا۔

محترم' امل کے نسوانی وقار سے اس قدر مرعوب ہوئے کہ ایک لمحے کے لئے بھی ان کی پیشانی پر بل نہ آیا۔ الٹا اس نے چوکیدار سے کہا۔

"یہ ہمارے مہمان ہیں۔ جب بھی ڈاک بنگلے آئیں' ان کی پوری خاطر مدارات کرنا۔"

چوکیدار کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے ایڑی ملا کر ایک اور سلیوٹ کیا۔۔۔۔۔ امل نے ان کا شکریہ ادا کیا اور پھر میری طرف متوجہ ہوئی۔

"وسیم صاحب' کیا خیال ہے نیچے دریا تک ہو آئیں؟"

میں نے کہا۔۔۔۔۔ "چلئے۔"

ہم نے ڈاک بنگلے کے افسر سے اجازت لی اور جیپ میں بیٹھ گئے۔ اب سات میل تک اترائی ہی اترائی تھی۔

امل نے پوچھا۔۔۔۔۔

"آپ کو زندگی میں کیا چیز پسند ہے؟"

میں نے کہا۔

"میری خواہش تھی کہ شاعر بنوں' لیکن ہزار کوششوں کے باوجود ایک شعر نہ کہہ سکا۔ کتاب لکھنے کا سوچا' لیکن یہاں بھی بات نہ بنی۔ موسیقی کو سمجھنے کی کوشش کی' مگر کچھ پلے نہ پڑا۔ دراصل میں فطری طور پر فنکار تھا ہی نہیں۔ دولت ہاتھ آئی تو سیاحت کی سوجھی۔

یہ کام میں آسانی سے کر سکتا تھا۔ میرا خیال ہے' اس کام میں میرا جی لگ جائے گا۔"

"گڈ......!"

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ سوچ رہی ہے۔ دیر تک وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ میں اس خاموشی کے معنی بالکل نہیں سمجھا...... حتیٰ کہ ہم پہنچ گئے۔

جیپ سے اتر کر ہم دریا کے کنارے چلے گئے۔ دوسرے پہاڑی دریاؤں کی طرح دریائے کنہار بھی اپنی مستی اور سرکشی کے جھاگ اگل رہا تھا۔

سامنے پہاڑ کے دامن میں گڑھی حبیب اللہ کا چھوٹا سا ریسٹ ہاؤس تھا۔ اس سے ذرا آگے گڑھی حبیب اللہ کو جانے والی سڑک کا پل عبور کر کے داہنے ہاتھ کو ایک سڑک مظفر آباد نکل جاتی تھی۔ ہمارے بائیں ہاتھ والی سڑک بالاکوٹ اور وادی کاغان جاتی تھی۔

امل دریا میں پتھر پھینک رہی تھی۔ میں نے وادی کاغان کا نام لیا' تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"بھائی جان آ جائیں تو کاغان چلیں گے۔ کتنا خوشگوار اور دلکش تاثر ہے اس نام میں اور جھیل سیف الملوک تو میں ضرور دیکھوں گی......"

میں جیپ سے لنچ اٹھا لایا' تو امل بھی لپک کر اپنا جھولا لے آئی۔ میرے لنچ میں بھونی ہوئی مرغی اور پراٹھے تھے۔ امل نے سینڈوچز نکالے۔ اس میں تکلف اور بناوٹ کا شائبہ تک نہیں تھا۔

وہ دانتوں سے کاٹ کاٹ کر مرغی کھا رہی تھی اور ہڈیاں دریا میں پھینک رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مجھ سے جنم جنم کی شناسائی ہے۔

پانی پینے کے لئے گلاس پڑا تھا' مگر وہ دریا سے اوک بھر بھر کر پیتی اور خوش ہوتی۔

"ہائے...... کتنا ٹھنڈا اور میٹھا پانی ہے۔ وسیم صاحب آپ بھی اوک بھر بھر کر پئیں۔ بڑا مزا آتا ہے۔"

جب لنچ سے فارغ ہوئے' تو میں نے اس سے کہا۔

"گڑھی حبیب اللہ چلنا ہے؟"

"ارے نہیں۔" اس نے فوری تردید کی...... "ذرا نیچر کو سٹڈی کریں گے۔ اس دریا کو ہی دیکھئے۔ کس طرح چٹانوں سے سر پٹخ کر مار رہا ہے۔ اس کی سرمستی دیکھو۔ شور سنو۔ اس کا گھمنڈ اور غرور دیکھو' لیکن جب یہ سمندر کے پانیوں میں داخل ہوتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ کتنا کمتر ہے...... وہاں پہنچ کر یہ اپنی اصل نسل بھی بھول جاتا ہے۔ اپنی فطرت تک بدل دیتا ہے۔ پھر آپ اوک بھر کر اس کا پانی نہیں پی سکتے!"

میں حیرت اور پیار سے اس ذہین لڑکی کو دیکھ رہا تھا' مگر وہ میری حیرت سے بے خبر تھی۔ اپنی لہر میں بولی۔

"شاید آپ نے وہ منظر نہیں دیکھا' جب دریا سمندر میں ملتا ہے؟"

"ہاں...... میں نے دیکھا ہے......"

"ارے صاحب' سمندر اسے ذرا بھی محسوس نہیں کرتا اور دریا خاموشی سے اس کے سینے میں گم ہو جانے میں عافیت سمجھتا ہے۔ میں نے بڑے بڑے دریاؤں کا گھمنڈ ٹوٹتے دیکھا ہے۔ بس ایسے ہی جیسے بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے۔ بڑے بڑے لوگ' چھوٹے چھوٹے آدمیوں کو ہڑپ کر جاتے ہیں۔ عجیب ہیں قدرت کے اصول بھی۔ ایک کی موت دوسرے کی زندگی' مجھے یہ سب غلط لگتا ہے' اس لئے تو مجھے موت سے ڈر نہیں لگتا۔ کیوں آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں نے اسے چھیڑنے کے لئے کہا۔

"مجھے تو یہ زندگی اس لئے حسین لگتی ہے کہ اس میں موت کا خوف شامل ہوتا ہے۔"

"بالکل غلط...... یہ تو زندہ رہنے کا ایک بہانہ ہے۔ زبان کی لذت اور بوسے کی لذت کے سوا اس میں رکھا ہی کیا ہے۔ اور پھر یہ دونوں لذتیں بھی بالکل عارضی ہیں۔ ایک عرصے کے بعد یہ اپنی اہمیت کھو دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس دنیا میں کیا ہے۔ دھوکہ' فریب' جھوٹ' نفرت۔ انسان نہ کبھی انسان کے کام آیا ہے اور نہ آئے گا۔ یہ چاند پر

اترے گا۔ کیونکہ زمین میں کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ یہ ہمیشہ تلاش میں رہے گا۔ کیونکہ اس کی فطرت میں قناعت لکھی ہی نہیں گئی!"

میں خود بھی زندگی میں مثبت رویے کا کچھ زیادہ قائل نہیں تھا' مگر اس کا انتہائی منفی انداز نظر مجھے کچھ زیادہ اچھا نہ لگا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کی باتوں سے ایک مخفی قوت مدافعت میرے سینے میں ابھر رہی ہے۔ میں نے اس سے کہا۔

"آپ زندگی کو منفی انداز میں دیکھتی ہیں۔"

"آپ کون ہوتے ہیں مثبت اور منفی انداز کا تعین کرنے والے!"

اس کی بے قرار آنکھیں اور زیادہ بے قرار ہو گئیں۔

"وسیم صاحب----- ہم آپ مثبت اور منفی کا تعین نہیں کر سکتے۔ آپ جسے مثبت کہتے ہیں' میں اسے منفی کہتی ہوں اور میں جسے منفی کہتی ہوں' آپ اسے مثبت کہتے ہیں۔ اس طرح فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ ہر مذہب مثبت باتیں کہتا ہے۔ اس میں نیکی اور بھلائی کی تلقین ہوتی ہے' لیکن ہر دوسرا مذہب اس کی نفی کرتا ہے اور اسے تسلیم نہیں کرتا۔ کوئی بھی مذہب اٹھا لیجئے۔ وہ دوسرے سے نفرت سکھاتا ہے۔ پھر بتایئے سچائی کا تعین کیسے ہو سکتا ہے؟ میں تو کہتی ہوں خود اللہ میاں بھی ہمیشہ متذبذب رہے ہیں۔ پہلے ایک کتاب بھیجی پھر دوسری' پھر تیسری اور پھر چوتھی۔ ہر کتاب والے خود کو سچا کہتے ہیں اور دوسرے کو جھوٹا۔ پھر بھلا کیسے فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ فلاں بات مثبت ہے اور فلاں منفی-----!"

میری قوت مدافعت دم توڑ رہی تھی' مگر وہ کوئی بات اس خیال سے نہیں کہتی تھی کہ میں مرعوب ہو جاؤں' بلکہ وہ اپنی ترنگ میں بولتی جاتی تھی۔

میں نے تھرماس سے کافی انڈیلی۔ ایک کپ خود لیا۔ ایک اسے دیا۔ اس نے گرم کافی کا گھونٹ بھرا اور بولی۔

"مذاہب نے انسان میں جتنا تفرقہ ڈالا تھا' کارل مارکس نے اسے اور زیادہ پھیلا دیا۔ اس نے روٹی کا انتظام تو کر لیا' مگر روح کی آزادی چھین لی۔ روٹی کی دیواریں کھڑی کر کے اس میں کوئی دروازہ نہ چھوڑیں اور انسان کو اس میں بند کر دیں' تو انسان روٹی کی دیوار میں نقب لگا کر باہر بھاگنا پسند کرے گا۔ دراصل یہاں کوئی کسی کو نہیں مانتا۔ ہر مثبت بات جھوٹی ہو سکتی ہے اور ہر منفی بات سچی ہو سکتی ہے۔"

کافی پی کر پلاسٹک کا خالی کپ اس نے میری طرف پھینکا اور بولی-----

"نہیں یہ دنیا ایسی ہی ہے۔ سب سچائی کی تلاش میں ہیں' مگر وہ کہیں نہیں ملتی۔ دراصل ہمارے سینے ہی خالی ہیں۔ جو کچھ ہم ڈھونڈ رہے ہیں' وہ ہمارے اندر موجود ہی نہیں۔ حیوان اور انسان میں بس اتنا فرق ہے کہ انسان میں تھوڑی بہت عقل ہے۔ وہ اس عقل کے واسطے سے اپنے آپ کو پہچاننا چاہتا ہے' مگر یہ کیسے ممکن ہے کیونکہ بنیادی طور پر اس کی جبلت حیوانی ہے!"؟

میں مسکرایا تو وہ اٹھ کر بولی۔

"شاید آپ میری باتوں کو اوٹ پٹانگ سمجھتے ہوں' ہو سکتا ہے یہ اوٹ پٹانگ ہی ہوں۔ بعض لوگ میری باتوں کو بے حد غور سے سنتے ہیں اور آخر میں ہنس دیتے ہیں۔ شاید مجھے پاگل سمجھتے ہوں' مگر میں کسی کے ہنسنے کی پروا نہیں کرتی۔ میں نے انجیل پڑھی تھی۔ بہت اچھی کتاب ہے۔ میں اس سے متاثر ہوئی ہوں' مگر آدھی سے زیادہ دنیا اس کتاب کو نہیں مانتی۔ میں نے قرآن مجید بھی پڑھا ہے۔ میں اس کتاب سے بھی زیادہ متاثر ہوئی ہوں' مگر ایک بڑی دنیا اس کتاب کا بھی اعتراف نہیں کرتی۔ میں تو خیر کوئی چیز نہیں ہوں۔ اگر لوگ میری باتوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں یا ان پر مسکرا دیتے ہیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔"

"نہیں امی-----!" میں نے پہلی بار اسے نام سے پکارا----- "آپ کی باتیں تو دنیا کو سننا پڑیں گی۔ ہر آدمی آپ جیسی باتیں نہیں کر سکتا۔ کم از کم مجھ میں تو اتنی ہمت ہے کہ آپ کی باتیں سنتا چلا جاؤں۔ حالانکہ میں سننے کا نہیں سنانے کا عادی تھا' مگر آج میں نے محسوس کر لیا ہے کہ میں آپ کو کچھ نہیں سنا سکتا۔ بس میری اہلیت یہ ہے کہ آپ کو سنتا رہوں۔" وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئی اور خلا میں گھورنے لگی۔ پھر اس نے اچانک نگاہیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ ایک دو لمحے پلکیں جھپکاتی رہی اور پھر بولی۔

"میرے ابا کو میری ماں سے بہت پیار تھا' مگر میری ماں میرے ابا سے پیار نہیں کرتی تھیں' لیکن شادی ہو گئی تھی اور کسی نہ کسی طرح نبھ رہی تھی۔ جیسے ہمارے ملک میں ہوا کرتی ہے...... ظاہر ہے میں جن دنوں ماں کے جسم میں پل رہی تھی' ماں کی اعصابی اور نفسیاتی کیفیت کیا ہو گی۔ وہ ایسے مرد کی اولاد کو خون دے کر جنم دینے والی تھی جس کی تخلیق میں قلبی اور روحانی طور پر شریک نہیں تھی۔ چنانچہ میں ایسے نفسیاتی الجھنوں کے ماحول میں پروان چڑھی .... بالکل واضح بات ہے کہ میرا کردار مکمل نہیں ہو سکتا۔ کم از کم میں اسے مکمل نہیں سمجھتی۔ کیونکہ میرے وجود میں باپ کی محبت اور ماں کی نفرت ایک ساتھ رچی بسی ہوئی ہیں۔ اس لئے اگر میرے کردار میں تضاد ہے اور میں باقی لوگوں سے مختلف ہوں' تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں نفرت اور محبت کی پیداوار ہوں۔ یہی میری اصلیت ہے اور لوگوں کو میری یہی صورت قبول کرنا پڑے گی!"

"ٹھیک ہے......!"

میرا دل ایک انجانی خوشی سے بھر گیا...... جیسے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سے آدمی تروتازگی محسوس کرتا ہے' بس اسی طرح کے احساس سے میری روح وجد میں آ گئی۔ امثل نے سر کو جھٹکا دیا اور آگے آئے ہوئے بالوں کو پیچھے پھینک دیا اور آہستہ سے بولی۔

"کیا خیال ہے۔ اب واپس نہ چلیں؟"

"ہاں چلیے......"

سامان اٹھا کر ہم جیپ کی طرف آئے' تو وہ نہایت میٹھے لہجے میں بولی۔

"وسیم صاحب...... ڈرائیونگ آہستہ کیجئے۔ میں ان خوبصورت مناظر کو اپنے آپ میں جذب کرنا چاہتی ہوں......!"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور دل ہی دل میں مسکرایا۔ جب جیپ روانہ ہو گئی' تو میں ایک انجانی سی سرشاری محسوس کر رہا تھا۔

میری روح پرواز کے لئے بے تاب تھی۔

یہ بات نہیں تھی کہ امثل سے پہلے کوئی لڑکی میری زندگی میں نہیں آئی تھی۔ کالج کے

زمانے میں اور اس کے بعد بھی اکثر لڑکیوں سے میری شناسائی رہی تھی۔

مگر امثل کی بات ہی اور تھی۔ اتنی ذہین اور غیر معمولی لڑکی میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ میں نے تو کوئی مرد بھی اتنا ذہین نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ اپنے پروفیسروں سے بھی ایسی چونکا دینے والی باتیں نہیں سنی تھیں۔

امثل بلاشبہ جینئس لڑکی تھی۔ اس نے ایک ہی ملاقات میں مجھ پر اتنا اثر ڈالا تھا کہ پچھلے اٹھائیس برس کا مطالعہ اور مشاہدہ ہیچ نظر آنے لگا۔

رات کو حسب عادت مطالعے کے بجائے میں اسی کے متعلق سوچتا رہا۔ مجھے یہ خوف ستا رہا تھا کہ اس لڑکی سے یہ آخری ملاقات نہ ہو۔ وہ تو عجیب و غریب سمجھ کر میرے ساتھ باہر گئی تھی' مگر میں سارا دن اس کے سامنے نکو بنا رہا۔

واپسی پر راستے میں بھی وہ چپ چاپ بیٹھی رہی اور مختلف مناظر میں کھوئی رہی...... ڈاک بنگلے پہنچنے پر گڈ ایوننگ کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

اس کی وہ چھوٹی سی ناک جو نگینے کی طرح اس کے چہرے پر سجی تھی' اور اس کی وہ بچوں جیسی حیران حیران آنکھیں اور وہ شانوں کو چھوتے ہوئے خوبصورت سیاہ بال اور اس کی مرمریں گردن اور اس کے نچلے ہونٹ کی عمودی لائنیں اور سرخ قمیص میں لپٹا ہوا حسین جسم...... ان سب چیزوں کی اپنی اہمیت تھی۔ اتنی اہمیت کہ انسان اسے حاصل کرنے کے لئے زندگی داؤ پر لگا دے' لیکن میری زبردست خواہش تھی کہ ان میں سے کوئی چیز نہ ملے تو نہ سہی' لیکن امثل کی قربت میسر ہو۔ صرف باتوں کی قربت۔

رات کو میں نے کوئی غیر معمولی خواب نہ دیکھا' لیکن صبح آنکھ بہت دیر سے کھلی۔ کیونکہ میں دیر سے سویا تھا۔

شیو کر رہا تھا۔ خانساماں نہانے کے لئے گرم پانی لایا' تو رازدارانہ لہجے میں بولا "پانچ نمبر والی مس صاحب پوچھ رہی تھیں کہ وسیم صاحب تیار ہو گئے ہیں یا نہیں؟"

میں نے چونک کر خانساماں کی طرف دیکھا۔ بوڑھا خانساماں مجھے بے حد پیارا لگا...... جلدی جلدی شیو کی اور غسلخانے کی طرف لپکا۔ ٹب میں بالٹی کا گرم پانی انڈیلا اور اسے نیم

گرم کرنے کے لئے ٹھنڈے پانی کا نلکہ کھول دیا۔

جلدی سے برش کیا اور ٹب میں غوطہ لگا کر باہر نکلا۔ تولیہ لپیٹ کر غسل خانے کا دروازہ کھولا، لیکن اگلے ہی لمحے دوبارہ بند کر دیا...... میرے کمرے میں اشل بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔

میں نے جلدی سے جسم خشک کیا اور رات کے کپڑے جو اسٹینڈ پر پھینک دیئے تھے، پہن لیے۔ دروازہ کھول کر اشل کو گڈمارننگ کہا...... اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا......

"آج آپ بہت دیر سے تیار ہوئے ہیں؟"

"ہاں......" میں سوٹ کیس کھول کر کپڑے نکالنے لگا...... "آج میری آنکھ دیر سے کھلی۔ کیونکہ رات دیر سے سویا تھا۔ میں آپ ہی کے متعلق سوچتا رہا تھا کہ کل آپ میرے ساتھ باہر جائیں گی یا نہیں......؟"

"اچھا......" وہ ہنس پڑی۔ آج وہ سفید پتلون اور سفید قمیص پہنے ہوئے تھی۔ میں کپڑے نکال کر دوبارہ غسل خانے میں گیا۔ وہ بیٹھی کتاب پڑھتی رہی۔ کپڑے بدل کر نکلا تو میں نے اس سے کہا۔

"اچھا ہوا آپ آگئیں۔ ورنہ میں ہی آپ کے پاس آتا۔"

اس نے کتاب بند کر کے میری طرف دیکھا۔

"میں نے آپ کو تکلیف سے بچالیا نا......!"

"شکریہ، بے حد شکریہ۔" میں نے مسرت بھرے لہجے میں کہا...... "آج کس طرف جانے کا پروگرام ہے؟"

"یہ تو آپ پر موقوف ہے۔"

"ڈاؤر کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"ہاں...... وہاں سنی نوریم بھی تو ہے نا۔ شنکیاری تک گئی ہوں۔ چلئے ڈاؤر چلتے ہیں۔"

میں نے اسے بتایا۔

"شنکیاری سے ڈاؤر تقریباً سات میل آگے ہے۔ سنی نوریم کے بائیں جانب دریائے سرن بہتا ہے۔ دائیں طرف چیڑ اور جھاڑ سے اٹا ہوا پہاڑ ہے۔ اس پہاڑ کے دامن میں سڑک گزرتی ہے۔ آہستہ آہستہ یہ سڑک خوبصورت موڑ کاٹتی ہوئی اور پہاڑ سے لپٹتی ہوئی اوپر نیچے جاتی ہے۔"

اشل کو یہ تفصیل اچھی لگی۔ اس کی بے قرار آنکھوں کی روشنی اس کے سفید زرد چہرے پر پھیل گئی اور یہ صبح اور زیادہ حسین ہو گئی۔

"اچھا چلیئے وہیں چلتے ہیں"...... وہ بہت نرمی سے بولی۔

حسب معمول تمام ضروری چیزیں لے کر ہم جیپ میں بیٹھ گئے۔ ڈاؤر کو جانے والی سڑک مانسہرہ کے بازار سے گزرتی ہے۔ جب ہماری جیپ بازار سے گزر رہی تھی تو ہر راہگیر اور ہر دکاندار کی نظریں ہمارا تعاقب کر رہی تھیں۔

میں نے ہولے سے کہا۔

"ہر آدمی آپ ہی کو دیکھ رہا ہے۔"

"بے چارے لوگ......!" وہ ذرا بھی نہ اترائی۔ "ہمارے معاشرے کے کیا کیا المیے ہیں؟"

ہماری جیپ اب بازار سے نکل چکی تھی۔

مانسہرہ کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے اتر کر جب ہم کھلی وادی میں داخل ہوئے تو میں نے اس سے کہا۔

"آپ کو سفید لباس میں دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی ننھا سا فرشتہ یا خوبصورت سی حور میرے پہلو میں آگئی ہے۔"

اس نے ہنس کر میری بات کاٹ دی۔

"بے فکر رہیے۔ میں آپ کے لئے کوئی آسمانی پیغام نہیں لائی۔ میں آپ سے زمین والوں جیسا سلوک کروں گی۔"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔"

"ہاں۔۔۔ یہ تو ہے۔"

وہ خاموش ہو گئی اور دھان کے لہراتے ہوئے پیلے کھیتوں کے نظارے میں محو ہو گئی۔

دریائے سرن نے اس وادی کو شاداب اور خوبصورت بنا دیا تھا۔

شنکیاری سے گزر گئے' تو پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا۔ نیچے دریائے سرن ہمارے مخالف سمت بہہ رہا تھا۔۔۔۔ یہاں سے سڑک' پہاڑ کے پہلو کو کاٹ کر بنائی گئی تھی۔ ڈاڈر تک سڑک اور دریا پہلو بہ پہلو رہتے ہیں۔ یہ تنگ سی وادی ہے۔ دونوں طرف سربفلک پہاڑ ہیں۔ جگہ جگہ باغات اور چھوٹے چھوٹے کھیت ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھاڑ اور چیڑ کے گھنے جنگل ہیں۔ اترائیوں میں سرسبز چراگاہیں ہیں۔

یہ وادی نہایت ہی دلکش اور خوبصورت ہے۔

ڈاڈر پہنچے تو امثل بولی۔

"کیا ہمیں سینی ٹوریم دیکھنے کی اجازت مل سکتی ہے؟"

"اجازت کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "آپ جیسی لڑکی کے لئے کسی اجازت نامے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ حسن کے سامنے قانون اور اصول سب دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں!"

اس نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ اس کے سیاہ بالوں کی سیدھی لٹیں اس کے گالوں پر آ پڑی تھیں۔۔۔۔ ایک لمحہ کے لئے خاموش رہی۔ ایسا لگا جیسے کچھ کہتے کہتے اس نے بات کا رخ بدل دیا ہو۔

"تو چلئے پھر سینی ٹوریم دیکھتے ہیں۔"

"نہیں۔۔۔۔!" میں نے پہلی بار اس کی رائے سے اختلاف کیا۔۔۔۔

"ابھی بہت سویر ہے۔ یہ لوگ ناشتے وغیرہ کر رہے ہوں گے۔ شام کو واپسی پر ذرا پہلے آ جائیں گے اور سینی ٹوریم دیکھ لیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔۔" اس نے فوراً میری تائید کی۔

دراصل میں عمداً اسے نہیں لے گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ سینی ٹوریم جا کر وہ اداس ہو جائے اور اس کی شگفتگی قائم نہ رہے۔ ہم دوبارہ جیپ میں بیٹھ گئے۔ کوئی آدھ پون گھنٹے میں ہم اوپر پہنچ گئے۔ اب سینی ٹوریم ہمارے نیچے تھا۔ ہسپتال کے بڑے بڑے وارڈ' چھوٹے چھوٹے ماڈل لگ رہے تھے۔ جس وادی سے ہم ہو کر آئے تھے' بلندی سے اس کا نظارہ اور زیادہ دلفریب لگ رہا تھا۔۔۔۔ دریائے سرن چاندی کی ٹیڑھی لکیر کی طرح چمک رہا تھا۔

پہاڑ کے دوسری طرف اس سے بھی زیادہ دلکش منظر تھا۔ اس طرف وادی زیادہ پھیل گئی تھی۔ دونوں اطراف دھان کے لہلہاتے کھیت تھے اور ان کے درمیان دریائے سرن کی لہراتی چمکتی بل کھاتی ہوئی سفید لکیر۔۔۔۔

دائیں بائیں اسی طرح اونچے اونچے پہاڑ' سامنے حد نگاہ پر بھی پہاڑوں کے لامتناہی سلسلے اور ان کے پیچھے برفانی چوٹیاں'۔۔۔۔

امثل تو بے خود ہو کر رہ گئی۔۔۔۔ ایک چٹان سے ٹیک لگائے نیم مدہوشی کے عالم میں دور برفانی چوٹیوں میں گم ہو گئی تھی۔۔۔۔ ٹھنڈی ہوا کیا چل رہی تھی' خوشی اور مسرتوں کے جام انڈیل رہی تھی۔ روح میں گدگدی ہو رہی تھی۔ شاید میں اس عجیب سی مسرت کو امثل کے بغیر بھی محسوس کر لیتا۔

"ہاں۔۔۔۔ میں اسے حاصل کر سکتا تھا۔۔۔۔!"

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور شمال کی طرف سے آنے والی ہواؤں کے لئے سینہ وا کر دیا۔

تو یہ ہوتی ہے خوشی۔۔۔۔!

کچھ دیر بعد امثل آئی اور چپ چاپ میرے قریب کھڑی ہو گئی۔ میرے وجدان نے اس کی خوشبو کو محسوس کیا اور بڑی لگن اور نرمی سے اس کی طرف دیکھا۔

اس کی سیدھی خوبصورت لٹیں اس کی گردن اور رخساروں سے کھیل رہی تھیں۔ وہ بظاہر پرسکون تھی' مگر اس کی بے قرار آنکھوں میں وہی اضطراب تھا۔

"وسیم صاحب......!" وہ بے حد جذبے سے بولی "یہ حسین منظر کیوں ہوتے ہیں' کس لئے ہوتے ہیں اور اگر ہوتے ہیں' تو انہیں احساس کیوں نہیں ہوتا کہ وہ ہیں اور لافانی ہیں...... ہم ان سے محظوظ ہوتے ہیں' مگر خود یہ اپنے آپ کو محسوس کیوں نہیں کرتے...... بے حسی دیکھو کہ نوازشوں کی بارش برساتے ہیں' دوسروں کو بے خود اور سرشار کر دیتے ہیں' لیکن اپنی نوازشوں کی خبر نہیں رکھتے...... اپنی نیاز اور بے نیازی کا عرفان ہی نہیں رکھتے!"

میں نے بے حد عقیدت سے اس لڑکی کی طرف دیکھا جس نے ان مناظر کے حسن کو مجھ سے زیادہ خوبصورتی سے جذب کیا تھا۔

میں نے اس سے کہا۔

"جو لوگ خدا کو نہیں مانتے' فطرت کے اس روپ سے کیسے انکار کریں گے؟"

"ہاں......!" وہ خاموش ہو گئی اور دور برفانی چوٹیوں پر اس کی نگاہیں جم گئیں۔ دو دن کی قربت میں میں نے یہ دیکھا کہ جب کوئی بات اس کے دل کو لگتی تھی' وہ خاموش ہو جاتی تھی اور سوچوں میں ڈوب جاتی تھی۔

مجھے اس کا یہ انداز اچھا لگا۔

تھوڑی دیر بعد وہ چونکی۔ کہنے لگی......

"اس پہاڑ کو دیکھئے۔ بائیں طرف' سامنے کے پہاڑ سے ملا ہوا نظر آتا ہے۔ آیئے دیکھیں دریائے سرن نے اسے کاٹ کر کس طرح اپنا راستہ بنایا ہے؟"

تھوڑی دیر بعد ہم اس مقام پر پہنچ گئے' جہاں پہاڑوں کا یہ سلسلہ دونوں طرف سے آڑے ترچھے انداز میں کٹا ہوا تھا اور تقریباً پچاس' ساٹھ گز نیچے دریائے سرن بہہ رہا تھا۔

"ہاں......" اس نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کی...... "کبھی یہ پہاڑی سلسلہ ایک ہوگا' لیکن دریا نے ٹکریں مار مار کر اپنا راستہ بنا لیا۔"

"ہاں......!" میں نے اس کی تائید کی۔

نیچے دریائے سرن کا پانی اچھلتا کودتا' چٹانوں سے سر پٹختا' مچلتا اور لرزتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ میں نے پتھر اٹھا کر مارا...... پتھر مچلتی لہروں میں غائب ہو گیا۔ میں نے کہا......

"اگر ہم یہاں سے کود پڑیں تو ظاہر ہے مر جائیں گے۔"

امل بولی...... "شاید۔"

"لیکن یہ جو پچاس ساٹھ گز کا فاصلہ ہے' کیسا محسوس ہوگا۔ دیکھنے کی بات تو یہ ہے۔"

امل کی گول گول آنکھیں یکبارگی چمک اٹھیں۔

"اگر آپ یہ تجربہ کریں گے تو میں آپ کا ساتھ دوں گی!"

میں ہنس پڑا......

"لیکن اس تجربے کا تجزیہ کرنے کے لئے ہم دونوں میں سے ایک بھی باقی نہیں رہے گا۔ پھر فائدہ؟"

"میں جانتی تھی آپ پیچھے ہٹ جائیں گے......" اس کی آنکھوں کے دیئے بجھ سے گئے۔

"مگر یہ تو خودکشی ہے اور وہ بھی کسی مقصد کے بغیر......" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"مقصد......! کیسا مقصد؟ آپ کے پاس زندہ رہنے کے لئے کیا مقصد ہے؟"

"مگر مجھے یوں مر کر کیا ملے گا؟"

"آپ کو جی کر کیا ملے گا؟ سانپ کو زندہ رہ کر کیا ملتا ہے؟ شیر چیر پھاڑ کے سوا کیا کرتا ہے۔ اس کی زندگی کا کیا مقصد ہے؟ چیونٹی کے ہونے نہ ہونے سے کائنات کا کون سا کام ادھورا رہ جاتا ہے......؟ آپ بتایئے۔ آپ کے نہ ہونے سے اس دنیا میں کیا کمی محسوس ہوتی......؟ اور اگر آپ موجود ہیں تو بھی یہ زمین آپ کو محسوس نہیں کرتی۔ چنگیز اور ہلاکو کے مظالم اس دنیا کو ختم نہ کر سکے اور مہاتما بدھ کا غیر معمولی پیغام اس دنیا میں امن اور شانتی پیدا نہ کر سکا...... پھر بھلا میں کیا ہوں' آپ کیا ہیں کہ کسی مقصد کا دعویٰ کریں؟"

"مقصد نہ سہی' امنگ تو ہے۔" میں نے ایک طرح سے لاجواب ہو کر کہا۔

"میں ابھی جینا چاہتا ہوں----- شاید میں زندگی کو کچھ نہ دے سکوں' لیکن میں زندگی سے کچھ حاصل کرنا چاہتا ہوں----- کچھ ہے جس کی میں کمی محسوس کرتا ہوں اور اس کے لئے تگ و دو میں خوشی محسوس کرتا ہوں----- جب تک یہ امنگ میرے سینے میں موجود ہے' میں اسے حاصل کرنے کے لئے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"

وہ تڑپ کر بولی۔

"جس دن یہ امنگ پوری ہو جائے گی' آپ کے پاس کیا باقی رہ جائے گا۔ پھر زندہ رہنے کے لئے کونسے بہانے ڈھونڈیں گے-----؟"

"امنگ تو پوری ہو لینے دو امل' تجربے سے گزرنے کے بعد ہی انسان فیصلہ کر سکتا ہے کہ زندگی میں چاشنی ختم ہو گئی ہے-----؟"

وہ ہنس پڑی-----

"آیئے نیچے چلیں۔ وہاں دریائے سرن کے کنارے ٹھنڈے پانیوں میں پاؤں ڈالیں گے اور پھر وہاں موت کا خطرہ بھی اتنا زیادہ نہیں-----؟"

میں نے اس کے خوبصورت طنز کو پوری طرح محسوس کیا----- ہم واپس چلے آئے۔ کچھ فاصلہ جیپ میں طے کیا' لیکن جیپ دریا تک نہیں جا سکتی تھی۔ ایک لمبی ڈھلان سے ہم نے نیچے اترنا تھا----- امل بولی۔

"بہت لطف رہے گا۔ یہاں سے دوڑ کر اتریں گے۔ لیجئے میرا ہاتھ پکڑ لیجئے۔"

میں نے وہ پھول سا ہاتھ پکڑ لیا' اور ہم ایک دوسرے کے سہارے ایک دوسرے کا توازن برقرار رکھتے ہوئے نیچے پہنچ گئے۔ ناوانستہ ہمارے ہاتھ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ ہم دونوں ہنس رہے تھے اور بے حد خوش تھے۔

آگے دھان کے کھیت تھے۔ ان میں ننھے ننھے پانی تھا۔ امل نے چپل اتار دیئے۔ میں نے بھی بوٹ اتار کر وہیں رکھ دیئے۔ اب ہم دھان کے کھیت میں ننگے پاؤں جا رہے تھے----- میں نے احتیاطاً پتلون کے پائنچے دوہرے کر کے سرکا لئے تھے۔ مگر امل ہنستی کھیلتی' بے نیازی سے کیچڑ اچھالتی جا رہی تھی----- اس کی سفید پتلون پنڈلیوں تک مٹی

اور کیچڑ میں لت پت ہو گئی تھی۔

دریا پر پہنچے تو وہ لپک کر ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گئی اور دونوں پاؤں پیٹتے ہوئے پانی میں ڈال دیئے اور دائیں ہاتھ سے پانی اچھالنے لگی۔

اس لمحے وہ زندگی سے بھرپور لڑکی لگ رہی تھی۔

میں نے بھی کنارے پر بیٹھ کر پاؤں دریا میں ڈال دیئے۔ امل نے ہاتھ سے تھوڑا سا پانی میری طرف اچھالا۔

"دیکھئے۔ کتنا ٹھنڈا اور شفاف پانی ہے----- ہے نا؟"

"ہاں----- یہ برف کا پانی ہے۔ اس موسم میں برف بڑی تیزی سے پگھلتی ہے۔"

امل نے پوچھا----- "آپ نے قدرتی برف دیکھی ہے؟"

"ہاں----- کئی بار----- جب تازہ تازہ برف گرتی ہے' تو بہت نرم ہوتی ہے' لیکن ٹھنڈی ہوائیں چلنے کے بعد جم جاتی ہے۔"

"کاغان چلیں گے تو دیکھ لوں گی۔ اچھا بتایئے یہ آؤٹنگ آپ کو اچھی لگ رہی ہے نا؟"

"آؤٹنگ مجھے ہمیشہ اچھی لگتی ہے' لیکن میں اکیلا ہی گھومتا رہا ہوں۔ اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا ہے کہ دنیا میں اکیلا آدمی کچھ نہیں ہوتا۔ میں تب بھی خوبصورت مناظر سے متاثر ہوتا تھا اور مسرت حاصل کرتا تھا' لیکن دو دن میں جو کچھ دیکھا ہے اور جو کچھ محسوس کیا ہے' وہ یہ کہ آدمی کو آدمی کے ساتھ چلنا چاہیے۔"

وہ چپ ہو گئی-----اور اس کی نظریں چاندی کی طرح مچلتے ہوئے پانی پر جم گئیں۔

میں نے بات جاری رکھی-----

"اگر میں اکیلا ہوتا تو دھان کے کھیتوں کو پار کر کے یہاں تک کبھی نہ آتا اور نہ مجھے پہاڑ کے اس حصے تک جانے کا خیال آتا' جہاں سے دریائے سرن نے پہاڑ کو کاٹ دیا ہے----- اب مجھے ساری زندگی یہ بات یاد رہے گی کہ ایک خوبصورت لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر میں ڈھلان سے دوڑ کر اترا تھا اور دھان کے کھیت کے کنارے ہم نے بوٹ اتارے

تھے ----- ایسی خوشی مجھے اکیلے کب میسر آ سکتی تھی۔"

وہ ہنس پڑی......

"ہم سے غلطی ہوئی۔ جیپ سے تھرماس ساتھ لاتے تو یہاں گرم گرم کافی کا بہت لطف آتا۔"

"آپ بیٹھئے' میں دوڑ کر لے آتا ہوں۔"

"نہیں......!" مجھے اٹھتا دیکھ کر وہ بھی کھڑی ہو گئی...... "میں بھی چلتی ہوں۔ وہیں جیپ میں بیٹھ کر پی لیں گے۔"

دھان کے کھیت پار کر کے ہم وہاں آ گئے' جہاں اس نے چپل اور میں نے بوٹ اتارے تھے۔ میں بوٹوں کی طرف بڑھا تو وہ بولی۔

"رہنے دیجئے۔ کوئی آدمی بوٹ اور چپل دیکھے گا تو حیران ہو گا۔ بلکہ پریشان ہو گا۔ کئی قسم کے خیال اس کے دل میں آئیں گے..... بس انہیں یہیں رہنے دیجئے۔ لوگوں کو ایک نیا موضوع ہاتھ آ جائے گا!"

"اچھا----!" میں ہنس پڑا۔

اور ہم ننگے پاؤں اوپر آ گئے۔ شاید اصل کو بھوک لگی تھی۔ کافی کی بجائے اس نے لنچ نکالا---- آج وہ قیمہ اور پراٹھے بنا کر لائی تھی۔ میرے لنچ میں صرف بھنا ہوا گوشت تھا۔ قیمہ بے حد لذیذ تھا۔ میں نے پوچھا۔

"قیمہ خانساماں نے بنایا ہے؟"

"نہیں میں نے خود پکایا ہے۔ کیوں کیسا ہے؟"

"بے حد لذیذ...... میں تو آپ کو بس یونہی سمجھ رہا تھا!"

وہ ہنس پڑی.....

"آپ نے ٹھیک سمجھا ہے۔ میں واقعی بس یونہی سی ہوں۔ صرف قیمہ اچھا بنا لیتی ہوں۔"

"آپ سیکھ کیوں نہیں لیتیں۔ اس میں کوئی برائی تو نہیں؟"

"برائی اچھائی کی بات نہیں۔ میں لوگوں کی باتوں کی پروا نہیں کرتی۔ کوئی میرے متعلق کیا رائے رکھتا ہے' مجھے اس سے غرض نہیں۔ جو من میں آئے کرتی ہوں۔ جو مل جائے کھا لیتی ہوں۔ کام و دہن کے مزے کو میں اتنی اہمیت نہیں دیتی۔"

"آخر آپ کسی چیز کو تو اہمیت دیتی ہوں گی......؟"

"نہیں کسی چیز کو بھی نہیں۔ دنیا میں کوئی چیز اہم نہیں ہے۔ ہم نے اپنی بیوقوفیوں سے کچھ باتوں کو اہمیت دی ہے اور یہی المیہ ہے!"

میں نے ایک بار پھر چونک کر اس کی طرف دیکھا' مگر اس نے میرے چونکنے کو کوئی اہمیت نہ دی۔

"وسیم صاحب۔ کسی چیز کو یا کسی بات کو اہمیت دے کر اپنی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ خود آگہی نہ رہے' تو آدمی اہمیتوں کا غلام بن جاتا ہے۔"

"سچائی کو بھی آپ اہمیت نہیں دیں گی-----؟"

"کونسی سچائی' کیسی سچائی---- ہندو کی سچائی یا مسلمان کی سچائی یا عیسائی کی سچائی یا کارل مارکس کی سچائی----- سچائی کی اتنی قسمیں ہیں۔ آپ جانے کونسی سچائی کی بات کرتے ہیں؟"

"میں اس سچائی کی بات کرتا ہوں' جو ہمارے من میں ہے۔"

"کچھ نہیں' ہمارے من میں کچھ نہیں۔ وہاں کوئی سچائی نہیں ہوتی۔ خود ساختہ آدرشوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا وہاں! بنائے ہوئے اصول اور سوچی ہوئی قدریں۔ نہیں سچائیاں نہیں ہوتیں۔ یہ قلبی نہیں ذہنی اختراعیں ہیں۔ ذہانت سارے فساد کی جڑ ہے!!!"

"پھر یہ خود آگہی کیا چیز ہے اصل؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"یہی کہ انسان اپنے آپ کو کبھی نہیں پہچان سکتا۔ حالانکہ خود آگہی کے معنی پہچاننا ہے۔ دراصل انتشار ہی زندگی ہے۔ خود آگہی کا میں یہی مطلب سمجھتی ہوں۔ زندگی کا ہر ڈسپلن مصنوعی ہے!"

ہاں---- یہ وہی لڑکی ہے جو کل سرخ قمیص میں لپٹی ہوئی تھی اور آج سفید قمیص

پہنے ہوئے ہے۔ اس کی سفید پتلون کے پائنچے ابھی تک گیلے ہیں۔ اس کے خیال کا تند و تیز دھارا اسی طرح رواں دواں ہے۔

دریائے کنہار اور سرن کی تندی اور تیزی ایک مقام پر پہنچ کر ختم ہو جائے گی' جب وہ ایک بڑے دریا کے سینے میں گم ہو جائیں گے' لیکن یہ سرکش لڑکی' جو زندگی کی قدروں' اہمیتوں' اصولوں اور آدرشوں کو روندتی کچلتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے' کسی منزل پر آکر دو گھڑی آرام بھی کرے گی یا سرے سے منزل کے مفہوم ہی سے ناآشنا رہے گی!؟"

کافی پی کر جیسے وہ تازہ دم ہو گئی۔ سر کو جھٹکا دے کر اور بالوں کو پیچھے پھینکتے ہوئے بولی.....

"ذرا ان پہاڑوں کو دیکھئے۔ ان درختوں' ندی نالوں' کھائیوں' گھاٹیوں اور چوٹیوں کو دیکھئے..... فطرت کے نظام میں کوئی ترتیب' کوئی ڈسپلن نہیں ہے۔ سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں' لیکن فطرت کی یہ بدنظمی' یہ نشیب و فراز کس قدر حسین ہیں۔"

میں نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

"آپ انسانی زندگی میں بھی شاید ایسی ہی بدنظمی کو پسند کرتی ہیں.....؟"

"پسند ناپسند کا سوال نہیں ہے۔ دراصل بدنظمی ہمارے خون میں موجود ہے۔ ہماری خواہشیں اتنی بے شمار ہیں کہ ہم کسی ایک مرکز پر آکر سوچ ہی نہیں سکتے۔ شعور نے ہمیں غیر فطری طور پر اکٹھا کر دیا ہے' مگر ہمارے دلوں میں یگانگت نہیں ہے۔ یہ سارا اجتماع غیر فطری ہے۔ اغراض و مقاصد نے ہمیں یکجا کر دیا ہے۔ کمزور انسان اس لئے طاقتور انسان کے زیر اثر آگیا کہ اسے اپنے جان و مال کے تحفظ کی ضرورت تھی۔ ورنہ انسان..... انسان کا دشمن ہے..... ہمارے دل مواخات سے خالی ہیں۔ ہمارے سب جذبے عارضی اور وقتی ہیں۔ انسان زندہ رہتا ہے' لیکن یہ جذبے ایک معین مدت کے بعد مرجاتے ہیں!!"

اس کی باتیں سیدھی میرے دل میں جا بیٹھتی تھیں..... میں خود ایسے ہی خیالات کا داعی تھا۔ اگرچہ اس کی طرح اپنے مافی الضمیر کے اظہار پر قادر نہیں تھا' لیکن اب میں

سوچ رہا تھا کہ اس طرح کا انداز فکر تو انسان کو انسان سے بالکل الگ کر دے گا۔ ہمارا اجتماع مصنوعی سہی' سارا سماج بھی غیر قدرتی سہی' لیکن تنہا رہ کر بھی آدمی کیا مقصد حاصل کر سکتا ہے۔ معاشرے سے کٹ کر رہنے سے آخر کیا حاصل کیا جا سکتا ہے.....؟

جب میں خود اس انداز میں سوچتا تھا تب مجھے ان باتوں کا احساس نہیں ہوتا تھا' لیکن اب..... جب اس طرح کی سوچ کا اپنے سے بہتر ترجمان سامنے آیا تو میں اپنی سوچ اور فکر پر شبہ کرنے لگا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ میں اس لڑکی سے محبت کرنے لگا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ تباہ ہو جائے اور زندگی میں تنہا رہ جائے۔

مجھے خاموش پا کر وہ آہستہ سے بولی۔

"کیا اور آگے نہیں چلیں گے؟"

میں نے چونک کر کہا.....

"کیوں نہیں۔ چلئے جبوڑی تک چلتے ہیں۔"

وہ ہنس پڑی.....

"آپ جگہ کا تعین کیوں کر دیتے ہیں۔ جہاں تک مرضی ہو گی چلیں گے۔ پابندی تھوڑی ہے۔ آپ یہ احساس کیوں پیدا کرتے ہیں کہ آپ کا بستر مانسہرہ کے ڈاک بنگلے میں پڑا ہے؟"

میں نے بھی ہنس کر کہا.....

"جہاں آپ بور ہو جائیں گی' واپسی کے لئے کہیں گی..... شاید میری مرضی اور آگے جانے کی ہو۔ پھر کس کی مرضی کو ترجیح دی جائے گی؟ فیصلہ کیسے ہو گا؟"

وہ اسی موڈ میں بولی.....

"یعنی آپ مجھ سے کہلوانا چاہتے ہیں کہ سفر میں اشتراک خیال ضروری ہے؟"

"کسی حد تک لحاظ ضروری ہے۔ اس سے زندگی میں ایک دوسرے کا احترام جنم لیتا ہے۔ بالکل نفی کے معنی تو کچھ نہیں ہوتے۔"

وہ کِھل کِھلا کر ہنس پڑی۔۔۔۔۔

"نفی کے معنی کچھ نہیں ہوتے۔ خوب۔۔۔۔! یعنی آپ انکار کو کوئی معنی نہیں دیتے؟"

"میں ہربات میں انکار کو کوئی معنی نہیں دیتا۔"

"آہاہا۔۔۔۔!" اس نے قہقہہ لگایا۔۔۔۔ "ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ میں بھی حسین منظر کو دیکھ کر انکار نہیں کرتی۔ چنبیلی کی خوشبو کو میں بھی محسوس کرتی ہوں۔ معصوم بچے کی مسکراہٹ سے میں بھی محظوظ ہوتی ہوں اور بہت سی باتیں ہیں' جن سے میں بھی انکار نہیں کرتی۔"

میں نے مسکرا کر جیپ سٹارٹ کر دی۔

کچھ دیر بعد ہم جبوڑی پہنچ گئے۔۔۔۔ پہاڑ کے دامن میں ایک چھوٹا سا گاؤں' نمک مرچ اور ضروریات کی دوچار دکانیں' یہاں چیڑ کے علاوہ چنار کے اونچے اونچے درخت تھے۔

ایک دوکان میں ہم نے قہوہ پیا اور تازہ دم ہو گئے۔ میں نے اس سے کہا۔

"اب بتایئے کیا پروگرام ہے۔ آگے جانا ہے یا پیچھے۔۔۔۔؟"

"میں پیچھے جانے کی قائل نہیں ہوں۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"تو چلئے۔ آگے چلتے ہیں۔ میں ہرقدم پر آپ کا ساتھ دوں گا۔"

"گڈ۔۔۔۔!" وہ بچوں کی طرح کِھل گئی۔ "لیکن مجھے آپ پر رحم آتا ہے۔ چلئے واپس چلتے ہیں۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ جیپ کی طرف جاتے ہوئے میں نے اس سے کہا۔

"سب کام کیجئے مگر ایک بات یاد رکھیے۔ مجھ پر رحم نہ کیجئے۔ مجھے مظلوم بننا ہرگز پسند نہیں۔"

"خوب خوب۔۔۔۔" وہ اچھل کر جیپ میں بیٹھ گئی۔۔۔۔ "اچھی بات ہے۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔۔۔۔ اگر آدمی مظلوم بننے سے انکار کر دے' تو ظالم پنپ ہی نہیں سکتا

کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک ہی ہو گی" میں نے گیئر لگا کر کہا۔۔۔۔ "آپ کی باتیں ٹھیک ہی ہوتی ہیں۔ لیکن بہت زیادہ ٹھیک ہونے کی وجہ سے کھلتی بھی ہیں!"

"آہاہا۔۔۔۔!" اس نے اپنے ننگے پاؤں ایک دوسرے پر ملتے ہوئے کہا۔۔۔۔ "آپ بھائی جان کے بعد دوسرے آدمی ہیں جو میری باتوں کو ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس لئے تو میں آپ کا خیال رکھتی ہوں اور جبوڑی سے واپس آ رہی ہوں؟"

"شکریہ انیل صاحب' شکریہ۔۔۔۔ غالباً وہ لوگ آپ کو اچھے نہیں لگتے جو آپ کو نہیں سمجھتے؟"

"نہیں۔۔۔۔ مجھے کسی سے پرخاش نہیں ہے۔ جو سمجھتے ہی نہ ہوں' ان سے ناراضگی کیسی۔ میرا کوئی دشمن نہیں ہے اور دوست بھی کہاں ہیں۔ مجھ میں دوست و دشمن بنانے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ لوگ مجھ سے جلدی بور ہو جاتے ہیں۔"

"اتنی بڑی دنیا ہے۔ شاید کوئی راستہ روک لے' یا آپ کے ساتھ ساتھ چل پڑے۔"

"نہیں۔۔۔۔!" وہ دور۔۔۔۔ آگے اور اوپر جاتی ہوئی سڑک اور افق کی طرف دیکھ رہی تھی۔۔۔۔ "میرا راستہ کوئی نہیں روک سکتا' اور میرے ساتھ ساتھ چلنے والا بھی ایک دن تھک جائے گا کیونکہ میری تو کوئی منزل نہیں ہے!"

"ہوں۔۔۔۔!" میں نے اس کی طرف دیکھا۔۔۔۔ "آپ زندگی کا صرف ایک رُخ کیوں دیکھتی ہیں؟"

"زندگی کا رُخ ہی ایک ہے وسیم صاحب۔۔۔۔ اس کے دو چار رُخ نہیں ہیں۔ ہم خواہ مخواہ اپنے آپ کو فریب دیتے ہیں۔"

"آپ نے کل مجھ سے سوال کیا تھا کہ میں زندگی میں کیا چیز پسند کرتا ہوں۔ آج میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ آپ زندگی میں کیا چیز پسند کرتی ہیں۔۔۔۔؟"

"میرا تصور عجیب و غریب ہے۔ میں زندگی کو دوسرے لوگوں سے بہت مختلف دیکھتی ہوں۔ میری بچپن میں شدید خواہش تھی کہ ہوا میں اڑتی پھروں۔ مجھے مافوق الفطرت ہستی

بننے کی آرزو تھی۔ پھر میں ایسی دنیا تخلیق کرتی جس میں کوئی بالغ نہ ہوتا۔ کوئی بالغ نظر بھی نہ ہوتا۔ میرے چاروں طرف معصوم بچے ہوتے۔ ان کی مسکراہٹیں ہوتیں۔ ان کے قہقہے ہوتے۔۔۔۔۔ میری دنیا میں کوئی فساد نہ ہوتا۔ کوئی کینہ اور بغض نہ ہوتا۔ کبھی جنگ نہ ہوتی۔ کبھی بیماری نہ آتی۔۔۔۔۔ میری دنیا میں کسی جنت کا تصور نہ ہوتا۔ کیا زمین ہی جنت ہوتی۔ میں بدی اور برائی کی سوچ ہی پیدا نہ کرتی۔ میری مخلوق بدی کے معنی ہی نہ جانتی۔ مجھے ضرورت ہی نہ پڑتی کہ لوگوں کو تلقین کرتی اور نیکی اور اچھائی کی ترغیب دیتی۔ وسیم صاحب۔۔۔۔۔ میری دنیا ایسی نامکمل ہرگز نہ ہوتی!"

میں مسکرا کا خاموش ہو گیا۔ میں نے سوال اس لئے کیا تھا کہ زندگی کا کوئی پہلو تو ہوگا جو تشنہ ہوگا' جس پر اس کے خیالات واضح نہیں ہوں گے اور وہ لاجواب ہو جائے گی۔

مگر نہیں۔۔۔۔۔ وہ زندگی کی بے رحم سرجن تھی۔

اس کا خدائی کا تصور ایک معصوم بچے کا خواب سہی' مگر کتنا سہانا خواب تھا۔۔۔۔۔ ایک لمحے کے لئے سہی۔۔۔۔۔ مگر میں نے سوچا۔۔۔۔۔ کاش! زندگی ایسی ہی ہوتی۔۔۔۔۔ بالکل ایسی۔۔۔۔۔ جیسی امل نے سوچی ہے۔۔۔۔۔!

"امل۔۔۔۔۔!" میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی میری طرف دیکھا۔ اس کی گول گول بچوں کی طرح متجسس' حیرت زدہ آنکھیں ہمیشہ کی طرح بے قرار تھیں۔۔۔۔۔ میں جانے کیا کہنا چاہتا تھا' لیکن ان متلاشی آنکھوں نے مجھے اپنی طرف راغب کر لیا۔۔۔۔۔

"یہ آپ کی آنکھیں کیا ڈھونڈتی ہیں۔ کیا تلاش کر رہی ہیں۔ کیوں بے قرار' کیوں بے چین ہیں۔ کونسا عقدہ ہے' جس کے لئے یہ مضطرب ہیں؟"

وہ ہنس پڑی۔۔۔۔۔

"یہ تو آپ کا مضمون ہے۔۔۔۔۔ مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں۔ آپ نے لاکھوں آنکھوں کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کا تجزیہ کر لیجئے۔۔۔۔۔ کیا کھو گیا ہے۔ کیا ڈھونڈ رہی ہیں؟ کیوں پریشان ہیں۔۔۔۔۔؟"

اب ہم اوپر آ گئے تھے۔ نیچے ڈاڈر کا ہسپتال نظر آ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"اچھا۔۔۔۔۔ اگر آپ نے یہ ذمہ داری مجھ پر ڈال دی ہے تو میں ان کا دکھ ڈھونڈوں گا مگر کچھ انعام تو رکھیے اس کے لئے۔" ۔۔

"لالچی نہ بنئے۔ اپنے شوق کے لئے کام کیجئے۔ آپ نے مجھے قائل کر دیا' تو بہت کچھ مل جائے گا۔ پہلے سے وعدہ کیوں لیتے ہیں۔۔۔۔۔!"

میرا دل یکبارگی اچھل پڑا۔۔۔۔۔

میرے جسم کے ہر حصے نے اس کی بات کو محسوس کیا۔ حتیٰ کہ میری ہڈیوں کے گودے میں بھی خوشی سرایت کر گئی۔ میں کوئی بات نہ کر سکا۔

مگر نیچے اترتے ہوئے اور موڑ کاٹتے ہوئے اسٹیئرنگ پر میرے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ سرمستی اور سرخوشی میں گھبراہٹ' میں نے زندگی میں پہلی بار محسوس کی تھی۔

ہسپتال کے قریب سڑک کے کنارے دکانوں کے نزدیک جیپ کھڑی کر کے ہم نیچے اترے' تو مجھے اپنے ننگے پاؤں کا خیال آیا۔ امل کو بھی احساس ہوا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے۔ میں نے پوچھا۔

"کیا خیال ہے۔ جانا ہے۔۔۔۔۔؟"

"عجیب سا لگے گا۔" اس کے لہجے میں حجاب تھا۔

میں اس کا مطلب سمجھ گیا اور مجھے خوشی بھی ہوئی کہ مشرقی تہذیب و حجاب کی ایک اور روایت ابھی باقی ہے۔

"چلئے پھر آ جائیں گے۔ ابھی تو ہم یہیں ہیں۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔۔۔۔۔" وہ راضی ہو گئی اور جیپ میں بیٹھ گئی۔ ڈاڈر سے دو میل ادھر آئے تو ایک سیاح نظر آیا جو پیدل جا رہا تھا۔ اس کی پشت پر کٹ بیگ بندھا ہوا تھا اور اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ امل نے کہا۔۔۔۔۔

"اسے لفٹ آفر کر دیجئے۔۔۔۔۔"

میں نے اس کے قریب آ کر جیپ روک لی اور بیٹھنے کو کہا۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور لپک کر جیپ میں بیٹھ گیا۔ وہ بلجیئم کا رہنے والا تھا اور پیدل ایشیا کی سیاحت کے لئے نکلا

تھا۔۔۔۔۔ امل نے اس سے پوچھا

"ہمارا ملک آپ کو کیسا لگا۔۔۔۔۔؟"

وہ بڑے تاثر سے بولا۔۔۔۔۔

"میں سارا یورپ گھوم چکا ہوں' لیکن پاکستان کا یہ حصہ بلاشبہ یورپ سے زیادہ خوبصورت ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگر سیاحت کے نقطہ نگاہ سے اس پر توجہ دی جائے تو سوئٹزرلینڈ بھی اس کے مقابلے میں پیچھے رہ جائے۔۔۔۔۔!"

ہم اس کی باتیں سن کر بہت خوش ہوئے۔

شنکیاری سے آگے بڑھے' تو سورج دائیں ہاتھ کے بلند پہاڑوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا۔ سورج کی آخری کرنیں شنکیاری کی وادی میں دھان کے لہلہاتے کھیتوں پر پڑ رہی تھیں۔۔۔۔۔ دھان کی بعد میں لگائی ہوئی فصل ہری تھی۔ جو پہلے لگائی گئی تھی' وہ پک رہی تھی اور اس کا رنگ زعفران کی طرح زرد تھا۔ سورج کی ان آخری کرنوں نے اس پر سنہری لیپ کر دیا تھا۔

امل نے سیاح کو اس منظر کی طرف متوجہ کیا۔۔۔۔۔ وہ پہلے ہی اس منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ بے ساختہ بولا۔

"لاثانی۔۔۔۔۔! لاثانی!!"

اس سیاح کی خواہش کے مطابق اسے مانسہرہ کے بازار میں اتار دیا۔۔۔۔۔ جب ہم ڈاک بنگلے میں پہنچے تو ہلکا ہلکا اندھیرا ہو چکا تھا۔ باہر کی لائٹ جل رہی تھی۔

عاطف لان میں ٹہل رہا تھا۔ امل دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ میں نے بھی اس سے ہاتھ ملایا۔ بہن کو خوش پا کر اسے بہت خوشی ہوئی۔۔۔۔۔ اس کے بعد ہم اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔۔۔۔۔ میں آج مطمئن تھا اور مجھے تسلی تھی کہ آج رات' گزشتہ رات کی طرح بے چینی سے نہیں گزرے گی!

صبح میں ناشتہ کر رہا تھا کہ عاطف آ گیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ وہ اس لئے خوش تھا کہ امل خوش تھی۔ اس نے کہا۔

"امل بہت خوش ہے۔ وہ آپ کی بہت تعریف کر رہی تھی۔ وہ بہت کم لوگوں کی تعریف کرتی ہے۔ بلکہ سرے سے کرتی ہی نہیں۔"

"امل!"۔۔۔۔۔ اس کا یہ پیار کا منا سا نام مجھے بہت اچھا لگا۔ میں نے اس سے کہا۔ "لیکن اس نے تو ان دنوں مجھے بولنے ہی نہیں دیا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں اس کے سامنے بول ہی نہیں سکا۔۔۔۔۔ حیرت ہے کہ وہ میری تعریف کر رہی تھی۔"

"یہ بات نہیں۔۔۔۔۔" عاطف رازدارانہ لہجے میں بولا۔۔۔۔۔

"دراصل لوگ اسے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے اور اگر کرتے ہیں' تو سمجھ نہیں پاتے۔۔۔۔۔ آپ نے کسی حد تک اسے سمجھا ہے۔ اس لئے آپ کی تعریف کر رہی ہے۔"

"میں تو اس سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ وہ بہت قیمتی لڑکی ہے۔ بہت ہی غیر معمولی! ویسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ آپ اس کی ٹھیک حفاظت کر رہے تھے۔ اگر وہ لڑکی نہ ہوتی' تو پیغمبری کا دعویٰ کر سکتی تھی۔ میری طرح اور بہت سے لوگ اس کے پیچھے لگ جاتے۔"

عاطف ہنس پڑا۔

"ایمان لانے والوں میں پہلا آدمی میں ہوتا۔"

"میں سوچتا ہوں' وہ موت سے کیوں نہیں ڈرتی۔ ابھی تو اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ زندگی کی تمام امنگیں' سارے ولولے' ساری امیدیں اس کے سامنے ہیں اور اسے ان کی ذرا بھی پروا نہیں۔ آخر موت میں کیا راز پوشیدہ ہے' جس کی اسے اتنی جستجو ہے؟"

"موت میں بھی کیا دھرا ہے!" وہ اچانک اندر آ گئی۔۔۔۔۔ "زندگی کی طرح موت بھی بے معنی ہے۔ لوگ جس طرح زندگی میں ایک دوسرے سے بیگانے ہیں' مرنے کے بعد بھی ایک دوسرے کو بھول جاتے ہیں۔ ہم نے کبھی بھولے سے بھی اپنے ماں باپ کو یاد نہیں کیا۔ آخر فائدہ بھی کیا ہے۔ یاد کر کے ہم انہیں کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ ہمارے ماں باپ بھی اسی طرح اپنے ماں باپ کو بھول گئے ہوں گے اور ہمارے بعد آنے والے اسی طرح ہمیں حرفِ غلط کی طرح مٹا دیں گے۔۔۔۔۔ کوئی آئے گا۔۔۔۔۔ کوئی جائے گا۔ تاریخ

ختی رہے گی۔ نہ دارا رہے گا نہ سکندر۔۔۔۔ نہ آج ان کے اصولوں کا کوئی نام لیوا ہے اور نہ ان کے نصب العین زندہ ہیں۔ جو بات کل سچی تھی' آج جھوٹی ہے اور جو بات آج سچی ہے' کل جھوٹی ہو جائے گی۔ کل تک چاند خواب تھا۔ آج ہمارے پاؤں تلے سسک رہا ہے۔ کروڑوں سال کا طلسم ٹوٹا ہے۔ ہم مختصر سی زندگی میں حقیقت کو کیونکر چھو سکتے ہیں!!!؟"

عاطف اور میں نے مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔۔۔۔

آج وہ سفید پتلون اور ہلکے آسمانی رنگ کی قمیص پہنے ہوئے تھی۔

"چائے پئیں گی آپ؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"نہیں' میں پی کر آ رہی ہوں۔ غالباً آپ لوگ میرے متعلق باتیں کر رہے تھے!"

"کوئی حرج تو نہیں۔۔۔۔" میں ہنس پڑا۔

"حرج تو خیر کیا ہے۔ بس بھائی جان خواہ مخواہ مجھے سر چڑھاتے ہیں۔ میں انہیں کہتی ہوں میرے معاملے میں نارمل رہا کریں' مگر ان کا اپنا ہی زندگی کا ایک رویہ ہے۔"

میں نے کہا۔

"آپ کسی پر پابندی عائد نہیں کر سکتیں۔"

"میں کب پابندی عائد کرتی ہوں۔ بھائی جان مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ یہ تو خیر ٹھیک ہے' لیکن یہ میرے لئے ہمیشہ امتحان میں رہیں' یہ اچھا نہیں لگتا۔"

"امتحان میں رہنا انتہائے محبت کی دلیل ہے۔ جو لوگ آپ سے محبت کرتے ہیں' انہیں امتحان دیتے رہنے پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔"

"نہیں صاحب نہیں۔۔۔۔ ہر آدمی کو اپنا ہی بار اٹھانا چاہیے۔ میں دوسروں کی مرضی اور پسند کے لئے اپنا راستہ نہیں چھوڑ سکتی اور نہ دوسروں سے یہ توقع رکھتی ہوں کہ وہ میرے لئے کچھ کریں۔"

"کیا انسان کا یہی فرض ہے؟" میں نے پوچھا۔

"انسان کی یہی فطرت ہے؟" اس نے جواب دیا۔

"آپ انسان سے اتنی مایوس کیوں ہیں؟"

"میں آپ کو ایک چھوٹا سا واقعہ سناتی ہوں۔ امریکہ دنیا کا سب سے امیر ملک ہے۔ ظاہر ہے وہاں کی تہذیب بھی عروج پر ہو گی۔ وہاں ایک شہر میں بوڑھے لوگوں کے لئے ایک ہاسٹل بنا ہوا ہے۔ شاید ہر شہر میں ہو۔ نہایت ہی صاف ستھرے اور زندگی کی تمام سہولتوں سے آراستہ کمرے' باغ اور پارک الگ' جن میں بڑے بوڑھے چہل قدمی اور سیر کرتے ہیں۔ انہیں غذائیت سے بھرپور خوراک مہیا کی جاتی ہے۔ میری ایک دوست مطالعہ کی غرض سے امریکہ گئی تھی۔ وہ وہاں بھی گئی۔ اس نے یہ سب کچھ دیکھا' تو بہت حیران ہوئی' بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بہت مرعوب ہوئی۔ وہ بڑے شوق اور تجسس سے ادھر ادھر گھوم پھر رہی تھی کہ اس کی نظر ایک بڑھیا پر پڑی' جو باغیچے میں ایک بنچ پر تنہا اور اداس بیٹھی تھی۔ محترمہ اس کے پاس جا پہنچی اور بڑھیا سے چند منٹ گفتگو کی اجازت چاہی۔ بڑھیا نے بڑی خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہا۔۔۔۔ باتوں باتوں میں اس نے کہہ دیا کہ آپ لوگ بڑے خوش قسمت ہیں کہ ریٹائر زندگی اتنے شاندار طریقے سے گزارتے ہیں' لیکن خوش ہونے کی بجائے بڑھیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔۔۔۔ بڑھیا نے کہا۔۔۔۔ "بے شک ہمیں ہر آرام میسر ہے' لیکن اس بے رحم تنہائی کا کیا کریں۔ ہم تو دلوں بات کرنے کو ترس جاتے ہیں۔ ریڈیو' ٹی وی' سینما آخر کب تک آدمی اکیلا دیکھتا رہے۔" میری دوست نے حیرت سے پوچھا' کیا تمہارے لڑکے لڑکیاں نہیں ہیں؟ بڑھیا نے حسرت سے کہا۔۔۔۔ "خدا کے فضل سے سب کچھ ہے۔ پوتے پوتیاں ہیں۔ تین لڑکوں اور دو شادی شدہ لڑکیوں کی ماں ہوں' لیکن وہ بے چارے بھی کیا کریں۔ ملازمت یا کاروبار کے بعد اپنے بیوی بچوں کو وقت دیتے ہیں۔ لڑکیاں گھر اور بچوں کو سنبھالتی ہیں۔ ہمارے لئے وقت کہاں سے نکلیں۔ کبھی دو چار مہینوں میں ایک آدھ گھنٹے کے لئے ان کی صورتیں نظر آ جاتی ہیں' تو اس سے ہم تشنہ کاموں کی پیاس کہاں بجھتی ہے' بلکہ اور تیز ہو جاتی ہے۔ تو اے معزز پاکستانی خاتون' یہ ہے ہمارا المیہ۔۔۔۔!" تو جناب وسیم صاحب' یہ ہے آپ کا مہذب انسان۔۔۔۔!! پانچ جوان شادی شدہ لڑکے لڑکیوں کی ماں

اکیلی ہے۔ اپنوں کے پیار کے لئے ترستی ہے۔ حقیقت میں یہاں ہر آدمی اک
ہے------!!!"

"ہاں------!" میں نے اس کی تائید کی------ "یورپ اور امریکہ میں واقعی یہ بہت بڑا
مسئلہ ہے۔ خاندانی اور گھریلو زندگی انسان کے لئے بے حد ضروری ہے۔"

"ضروری ہوتی' تو آپ اپنے باپ کی موت کا انتظار نہ کرتے۔ مشرق محض روایاتی
طور پر کنبے کا قائل ہے۔ ورنہ ہماری سرشت بھی مغرب والوں سے مختلف نہیں۔"
عاطف مسکرا رہا تھا۔ میں بھی ہنس پڑا۔ میں جان گیا تھا کہ باپ کی موت کے انتظار والی
بات عاطف نے اسے بتادی ہے۔ میں نے خفیف ہو کر کہا۔

"ہو سکتا ہے میرے خیالات میری ذات تک محدود ہوں۔ باقی دنیا میری طرح خود غرض
نہ ہو۔"

"وسیم صاحب------" اس نے زور دے کر کہا------ "آپ اپنے آپ سے انکار کیوں
کرتے ہیں۔ آپ اپنی فطرت پر شرمندہ کیوں ہیں۔ اگر آپ کی خو بو آپ کو وراثت میں
ملی ہے' تو اس میں آپ کا کیا قصور۔ آپ اصل میں وہی ہیں جس کا اظہار آپ کر چکے
ہیں۔"

"تو پھر میں اس پر شرمندہ ہوں۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ میں نے انسانوں کے ساتھ
رہنا ہے۔ اگر یہ فطرت کے خلاف ہے تو خلاف سہی۔ اگر یہ دنیاداری ہے تو یہ تہمت
بھی قبول' مگر میں تنہا نہیں رہوں گا۔ میں ساتھیوں کی تلاش جاری رکھوں گا۔"
امل ہنس پڑی۔

"بالآخر تنہائی آپ کے لئے مقدر ہو چکی ہے۔ ساتھی ملیں گے۔ بچھڑ جائیں گے۔
جوں جوں سفر طویل ہو گا' توں توں مایوسی بڑھے گی۔ ایک دن آئے گا آپ کی آس بالکل
ٹوٹ جائے گی۔"

عاطف نے اسے ٹوکا۔

"تم پہلے سے کیوں ان کے دل میں ہوا بٹھانا چاہتی ہو۔ آدمی اپنی سمجھ کے مطابق راہ
[illegible] رہا ہے۔ اگر ان کے سینے میں امنگ ہے' تو انہیں زندگی کو پوری طرح برتنا
چاہیے۔"

"بعض لوگوں کے سینے میں کسی کو قتل کرنے کی امنگ ہوتی ہے۔ بھائی جان! کیا ہم
بھی داد دیں گے------؟ رہا ہوا بٹھانے کا سوال' تو لوگ خدا کی باتیں نہیں مانتے' میری
[illegible]ں کا کیا اثر لیں گے۔"

میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"آپ کی باتوں کا میں اب اتنا اثر لینے لگا ہوں۔ پہلے میں واقعی تنہا تھا' مگر اس کا اتنا
احساس نہیں تھا۔ آپ نے تو اس کا اتنا شدید احساس کرا دیا ہے کہ اب میں تنہا رہنا نہیں
چاہتا۔ میں تنہائی کے خلاف بغاوت کروں گا' کیونکہ یہ انسان کی سب سے بڑی دشمن
ہے۔"

عاطف بولا۔

"آج کیا ارادے ہیں۔ بحث ہوتی رہے گی یا کچھ اور پروگرام بھی ہے؟"

"ہاں ہاں چلئے۔ کدھر چلیں گے------؟" امل نے پوچھا۔

"اوگی کا ٹھیکیدار میرا بڑا دوست بن گیا ہے۔ راولپنڈی سے ایبٹ آباد تک اکٹھے سفر
کیا۔ بہت مزے دار آدمی ہے۔ اوگی آنے کے لئے بہت اصرار کر رہا تھا۔ میں نے وعدہ
بھی کر لیا تھا۔"

"تو چلئے اوگی چلتے ہیں------" میں نے تائید کی------ "میں اس طرف گیا بھی نہیں۔"

"واہ بھائی جان------" امل بے دلی سے مگر ہنستے ہوئے بولی۔ "تو آج ہمارا ایک
خوبصورت دن ایک بدذوق ٹھیکیدار کی نذر ہو جائے گا۔"

"ارے نہیں بھئی' بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ بور ہوں گے تو چائے پی کر آ جائیں گے۔"

"اچھا چلئے------" امل اٹھ کھڑی ہوئی۔

باہر نکلے تو امل بولی۔

"بھائی جان آج فوکسی میں چلیں گے اور واپسی پر ڈرائیونگ میں کروں گی۔"

"اچھا۔۔۔۔" عاطف اپنی فوکس ویگن سٹارٹ کر کے سنبھلا۔ اشل اور میں نے کھانے پینے کا سامان رکھا۔ موٹر کا دروازہ کھول کر اشل نے میری طرف دیکھا۔

"آپ پیچھے بیٹھیں گے یا آگے۔۔۔۔؟"

میں نے ایک لمحہ سوچا اور پھر کہا۔

"میں پیچھے بیٹھ جاتا ہوں۔۔۔۔"

اگلی سیٹ پیچھے دبا کر میں پچھلی سیٹ پر چلا گیا۔ اشل اگلی سیٹ پر بیٹھ کر بولی۔

"فوکسی میں یہی نقص ہے۔ اگلی سیٹ پر دو آدمی نہیں بیٹھ سکتے۔"

ہمیشہ کی طرح اس کی یہ بات بھی مجھے اچھی لگی۔

شنکیاری روڈ پر چند میل کے بعد بائیں ہاتھ ہم اوگی کی طرف مڑ گئے۔۔۔۔ اشل نے سیاہ عینک لگا رکھی تھی۔ وہ کبھی کبھی پیچھے مڑ کر مجھ سے بات کرتی۔ اس کی پراسرار آنکھیں نظر نہیں آ رہی تھیں' لیکن اس کا وہ نچلا رسیلا ہونٹ' جو بیچ سے تھوڑا سا دبا ہوا تھا اور دائیں بائیں ہلکے ہلکے ابھار تھے اور جس میں چھوٹی چھوٹی لائنیں تھیں' جب وہ بات کرتی تو آدمی کی ساری توجہ اس کے ہونٹ پر مرکوز ہو جاتی اور کچھ دیر کے لئے اس کی ساری ذہانت بھول جاتا۔

اس کے سیدھے اور سیاہ بال برابر ادھر ادھر لہرا رہے تھے اور اس کے ہلکے آسمانی رنگ کی قمیص میں چھپے ہوئے شانوں کو چوم رہے تھے۔

دریائے سرن کا پل عبور کر کے اب ہم سامنے کے پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئے۔ یہ پہاڑی راستہ بے حد پیچیدہ لیکن نہایت خوبصورت تھا۔۔۔۔ موٹے تنوں والے اونچے اونچے دیودار کے درختوں میں ہوا سرسرا رہی تھی اور ایک عجیب پراسراریت پیدا کر رہی تھی۔ دیوداروں کی مخصوص خوشبو چاروں طرف رچی بسی ہوئی تھی۔

عاطف بولا۔

"کیا سماں ہے۔ کیا علاقہ ہے۔ کتنے خوش نصیب ہیں یہاں کے باسی۔"

میں نے کہا۔

"لیکن ان لوگوں کو اس علاقے کی اہمیت کا احساس نہیں۔"

"جس طرح ان کو اپنی زندگی کا احساس نہیں۔۔۔۔" اشل نے میری بات کاٹی۔

"ہاں۔۔۔۔ یہ بھی اور وہ بھی۔۔۔۔" میں نے تائید کی۔۔۔۔ "یہ سیدھے سادے لوگ ہیں۔ بالکل یہاں کے دیوداروں کی طرح سیدھے۔ یہ داؤ پیچ نہیں جانتے۔ بھیڑوں کی طرح معصوم ہیں۔ جدھر ہانکو' جہاں چاہو' ان کے گلوں پر چھری پھیر دو۔"

اشل نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔

"تو بس پھر ٹھیک ہے۔ یہی لوگ زندگی بتانا بھی جانتے ہیں۔ ہماری تمہاری طرح احساس کی آگ میں نہیں جلتے۔"

اس کا وہ خوبصورت ہونٹ میرے سامنے تھا۔۔۔۔ انگور کے سرخ دانے کی طرح رس بھرا ہونٹ۔ میں نے سوچا۔ کچھ لوگ بہت ہی باخبر ہوتے ہیں' لیکن کچھ باتوں کی انہیں بھی خبر نہیں ہوتی۔

ایک بات اشل بھی نہیں جانتی تھی۔۔۔۔ کہ اس کے نچلے ہونٹ میں دنیا کا آدھا فساد چھپا ہوا ہے!

موٹر اچانک رک گئی۔ ہم اوپر پہنچ گئے تھے۔ تینوں نیچے اتر آئے۔ یہ جگہ بالکل گھوڑے کے زین جیسی تھی۔ دائیں اور بائیں اونچے اونچے پہاڑ' گھنا جنگل' ہم جہاں کھڑے تھے' یہاں سے سڑک نیچے جا رہی تھی۔ دور۔۔۔۔ نیچے اوگی کا قصبہ نظر آ رہا تھا اور اس سے آگے دور دور تک اوگی کی سطح مرتفع پھیلی ہوئی تھی۔۔۔۔

اشل نے تھرماس نکال کر ہمیں کافی دی۔۔۔۔ یہ گھوڑے کے زین جیسا درہ بیچ ہوا کا درہ تھا۔ یہاں تیز اور ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔

گرم کافی اور ٹھنڈی ہوا' بس [illegible] آ گیا۔۔۔۔

اشل سامنے وادی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے خوبصورت بال اڑ رہے تھے اور اس کی خوبصورت گردن زیادہ واضح نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنے آپ میں مگن تھی۔

عاطف اس سے ذرا پرے ایک چٹان پر بیٹھا' کافی کی چسکیاں لے رہا تھا۔

امل نے دائیں بائیں دیکھا اور بولی۔

"کبھی کبھی دل چاہتا ہے' آدمی چلتا چلا جائے۔ ایک پہاڑ آئے پھر دوسرا آئے' پھر تیسرا آئے۔۔۔۔۔۔ نہ پہاڑ ختم ہوں اور نہ آدمی کے پاؤں تھمیں!"

"ہاں۔۔۔۔۔۔ یہی تو ہے۔۔۔۔۔۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔۔۔۔۔۔ "یہی ہوتا ہے سفر' مقصد' بہتا ہوا پانی ہمیشہ صاف رہتا ہے اور بڑھتے ہوئے قدم منزل کی علامت ہوتے ہیں۔"

امل نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

"آپ ہمیشہ اپنے مطلب کی بات کرتے ہیں۔"

"ہاں میں زندگی کی طرف لوٹ رہا ہوں۔ اس لئے مطلبی ہوتا جا رہا ہوں۔ آپ مجھے خود غرضی کا طعنہ دے سکتی ہیں' مگر مجھے شرم نہیں آئے گی!"

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔۔۔۔۔۔

"بہت خوب! بہت خوب!" اس نے مجھے داد دی۔۔۔۔۔۔ "جوشیلی کی بھی کیا شان ہوتی ہے۔ ہاں ٹھیک ہے۔ انتہا پسند لوگ تباہ ہو جاتے ہیں۔ یا پا لیتے ہیں!" عاطف ہنس رہا تھا اور میں امل کے انوکھے جواب پر حیران ہو رہا تھا۔ وہ اسی موڈ میں بولی۔

"یہ حیرت کی نہیں بالکل سیدھی بات ہے۔ دنیا میں ہمیشہ انتہا پسندوں نے حکومت کی ہے۔ یہ لوگ عقلمند نہیں ہوتے' لیکن عملی ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔ تخت یا تختہ' پچاس فیصد دونوں طرف برابر مواقع ہوتے ہیں' لیکن دانشور سوچتے رہ جاتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پڑھاتے ہیں یا کتابیں لکھ کر چھوڑ جاتے ہیں' مگر حکومت نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ روشن اور تاریک پہلوؤں کا تجزیہ کرتے کرتے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں!"

عاطف ہنس کر بولا۔۔۔۔۔۔

"کیوں الجھنیں ڈال رہی ہو امتی۔ دنیا کو اپنے ڈھنگ سے سوچنے دو۔"

"نہیں عاطف نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔۔۔۔۔۔ "یہ مجھے الجھا نہیں سکتیں بلکہ یہ تو الزام ہے۔ انہوں نے مجھے کبھی نہیں الجھایا۔۔۔۔۔۔ میں خود الجھا ہوا تھا۔ اب دام سے

نکل رہا ہوں۔ شاید خود یہی مجھے نکال رہی ہیں۔۔۔۔۔۔!"

"میں۔۔۔۔۔۔!" وہ عینک اتار کر ہنسی۔۔۔۔۔۔ "نہیں صاحب نہیں' میں دنیا میں کوئی کام نہیں کر سکتی۔ مجھ میں نہ بدی کی جرأت ہے نہ نیکی کی استطاعت ہے۔ نہ ان باتوں کو سمجھتی ہوں' نہ ان پر یقین رکھتی ہوں۔ میری باتیں بالکل فضول ہیں۔ میں کسی کے لئے کچھ نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔۔!!"

"نہ سہی۔" میں نے جواب دیا۔۔۔۔۔۔ "آپ ہمیں کچھ نہ دیں۔ ہم اپنے طور پر جو حاصل کر سکتے ہیں' اس سے ہمیں کوئی نہیں روک سکتا۔ اپنی اہلیت کے مطابق حسین منظر سے ہر آدمی محظوظ ہو سکتا ہے۔ ہم وجدانی طور پر جو بات محسوس کریں گے' اسے اپنی روح میں محفوظ کر لیں گے۔"

"مجبوری یہ ہے کہ انسان میں عقل ہے۔ روح نہیں ہے۔۔۔۔۔۔!" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔۔۔۔۔۔ اس نے کافی کا خالی کپ ہوا میں اچھالا۔۔۔۔۔۔ "بکرا ذبح ہو جاتا ہے۔ اس کی روح آدمی یا بھیڑیئے کی جون میں چلی جاتی ہے۔ یہ فلسفہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ لہو بہہ گیا یا جسم میں جم گیا اور آدمی مر گیا۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے' لیکن اس کی روح کی تلاش جاری رہے۔ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔۔۔۔۔۔ میری سوچ یہیں رک جاتی ہے۔۔۔۔۔۔!"

"میں یہاں نہیں رکتا امل۔ میں آگے جانا چاہتا ہوں۔ انسان کچھ پائے نہ پائے تلاش میں کیا حرج ہے۔ پہاڑ کے اس طرف کیا ہے' اس آرزو کو آدمی نہیں دبا سکتا۔"

وہ ہنس پڑی۔

"پریوں کی تلاش گھٹی کی طرح ہمارے خون میں رچ بس گئی ہے' مگر اب وہ کوہ قاف سے کسی اور دیس منتقل ہو گئی ہیں۔۔۔۔۔۔ شاید انسانی عفریت کے خوف سے۔۔۔۔۔۔!"

"آپ انسان سے اتنی خوفزدہ ہیں۔۔۔۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"ارے میں کیا چاند تک خالی ہو گیا' انسان کے خوف سے' بے چارے چاند والے جانے کس سیارے میں بھاگ گئے ہیں۔ اپنے انجام کا کسی کو علم نہیں۔"

"اچھا بھئی آپ چلیں۔ تھانیدار صاحب انتظار کر رہے ہوں گے۔" عاطف اٹھ کھڑا

ہوا۔ ہم لوگ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ عاطف نے گاڑی اسٹارٹ کی' تو امثل ہنس کر بولی۔

"وسیم صاحب' آپ جانتے ہیں بھائی جان کے دوست کس طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ تھانیدار' وکیل' ہیڈ کلرک' میر منشی' ناظر بس کیا بتاؤں کیا حلقہء احباب ہے ان کا۔"

عاطف ہنس رہا تھا۔ جھینپ کر بولا۔

"بھائی کیا کروں۔ میں تو دنیادار آدمی ہوں۔ ابا سے ورثہ میں ملی ہے مقدمہ بازی۔"

"میں انہیں کہتی ہوں جو لوگ کرایہ نہیں دیتے' نہ دیں۔ مکان پر زبردستی قابض ہیں' تو انہیں ضرورت ہوگی۔ اتنی بڑی جائداد ہے۔ چند آدمی بغیر کرایہ کے رہیں' تو کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم مرنے کے بعد مکان اور زمینیں اپنے ساتھ قبر میں تو لے جا نہیں سکتے۔"

"ٹھیک کرتے ہیں بھائی جان آپ کے' یہ ڈسپلن کی بات ہے۔ اس زمین پر فرشتے نہیں' اچھے برے سبھی قسم کے لوگ رہتے ہیں۔ کوئی زیادتی کرے' تو چپ نہیں رہنا چاہیے۔ ورنہ اگلے دن گلا دبانے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔"

موٹر اترائی میں موڑ کاٹ رہی تھی۔ امثل کی دائیں کہنی سیٹ پر ٹکی ہوئی تھی اور چہرہ ہتھیلی پر' اس کا آدھا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ میری بات سن کر بولی۔

"انسان نے جینے کے لئے کیا کیا اصول وضع کر رکھے ہیں اور کتنی سادگی سے ان پر یقین رکھتا ہے۔"

عاطف نے جواب دیا۔۔۔۔۔۔

"جس موٹر پر آپ سفر کر رہی ہیں' یہ بھی چند اصولوں کے تحت چلتی ہے۔ اگر اصول بیکار ہوتے' تو یہ زندگی اتنی متحرک ہرگز نہ ہوتی۔"

"واہ۔۔۔۔ یعنی آپ مشین کی بات کرتے ہیں۔ مشین تو ایک فارمولا ہے۔ انسانی عقل کا ایک بے جان اظہار' مگر میں انسانی محسوسات کی بات کر رہی ہوں۔ احساس اور اصول کا کیا تعلق۔۔۔۔ احساس کا آپ گلا گھونٹ دیں۔ کیونکہ آپ نے جو اصول بنا رکھے

ہیں' ان کا تقاضا یہی ہے۔ واہ صاحب۔۔۔۔۔۔ یہ اچھا انصاف ہے!!"

عاطف نے میری طرف دیکھا' جس کے معنی یہ تھے۔

"ہاں بھئی کوئی اور سوال۔۔۔۔۔؟"

"ٹھیک ہے۔" میں اس کی طرف جھک گیا۔۔۔۔ "تو آپ احساس کو عزت دے رہی ہیں۔ یہ بڑی اچھی بات ہے' لیکن اگر احساس موجود ہے' تو پھر روح کیوں نہیں ہے۔۔۔۔۔۔؟"

"احساس ہماری اپنی چیز ہے۔۔۔۔۔" وہ میری طرف پلٹی۔۔۔۔۔ "احساس ہمارے اندر موجود ہے۔ ایک چیز ہمیں اچھی نہیں لگتی۔ ہم اس سے نفرت کرتے ہیں۔ یہ احساسِ نفرت ہے۔ ایک چیز ہمیں اچھی لگتی ہے۔ خوبصورت لگتی ہے۔ یہ احساسِ جمال ہے۔ کسی مظلوم کو دیکھ کر دل بھر آتا ہے۔ یہ احساسِ ہمدردی ہے۔ اسی طرح اور بہت سے احساسات ہیں۔۔۔۔ لیکن روح کی تعریف کس طرح کریں گے۔ کیا ہے روح؟ نہ آنکھ اور ناک کی طرح وجود رکھتی ہے اور نہ احساس کی طرح غیر مرئی کیفیت رکھتی ہے۔ پھر آخر کیا ہے روح۔۔۔۔۔؟"

"آپ ہوا کو کس طرح محسوس کرتی ہیں۔۔۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"ہوا تو غیر مرئی وجود رکھتی ہے وسیم صاحب۔۔۔۔ باقاعدہ جسم ہے۔ ہوا کی تعریف تو ایک بچہ بھی کر سکتا ہے۔"

اس وقت ہم دونوں کے چہروں کے درمیان بہت کم فاصلہ تھا۔ میں اس کے بدن کی خوشبو محسوس کر رہا تھا۔ میرے دل میں ایک خیال آ رہا تھا۔ اس سے پوچھوں۔۔۔۔۔ کہ یہ سانس کیا چیز ہے۔ ہوا ہے' احساس یا روح ہے۔۔۔۔۔۔؟

لیکن پھر سوچا۔ زندگی میں اسرار کا بھی ایک مقام ہے۔ کچھ چیزیں پردے میں رہیں تو زیادہ خوبصورت لگتی ہیں۔۔۔۔ ہاں امثل کی بات دوسری تھی' وہ جس قدر بے نقاب ہوتی جا رہی تھی' اتنی ہی خوبصورت ہوتی جا رہی تھی۔۔۔۔۔۔

جب ہم ادگی کے قصبے میں داخل ہو رہے تھے تو ایک نکڑ پر شلوار قمیص میں ملبوس

ایک آدمی نے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا۔ کار رک گئی' تو اس نے پوچھا۔

"کیا آپ تھانیدار صاحب کے مہمان ہیں......؟"

ہم نے اثبات میں جواب دیا' تو اس نے بڑھ کر نہایت گرمجوشی سے عاطف اور مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"تھانیدار صاحب آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔ موٹر یہیں کھڑی کر دیں۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔"

ہم تینوں کار سے نکل آئے۔ کار دیکھ کر گاؤں کے لوگ ادھر ادھر سے نکل آئے تھے اور بڑے تجسس اور شوق سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ آپس میں سرگوشیاں بھی کر رہے تھے۔

"یہ تھانیدار صاحب کے مہمان ہیں۔"

تھانیدار کا مکان دور نہیں تھا۔ ایک دو گلیاں عبور کر کے ہم ایسے نکڑ پر پہنچ گئے' جہاں کچے مکانوں سے ذرا ہٹ کر ایک پکا مکان تھا...... ہمارے گائیڈ نے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اس دروازے کی بجائے اسی دیوار کے دوسری طرف دو کھڑکیوں کے درمیان کا دروازہ کھلا۔ شلوار قمیص میں ملبوس' سرخ و سفید' چھوٹی بھوری مونچھوں والا ایک بھاری بھر کم شخص نظر آیا۔ عاطف اسے دیکھ کر مسکرایا۔ تھانیدار بھی زور سے ہنس پڑے۔

"واہ صاحب واہ...... ہم تو سمجھتے تھے ہم پٹھان لوگ ہی وعدے کے پکے ہوتے ہیں' مگر اب تو کراچی والے بھی وعدہ نبھا لیتے ہیں۔"

تھانیدار صاحب نہایت تپاک سے ملے......

ڈرائنگ روم سادہ' مگر صاف ستھرا تھا۔ کارنس پر تھانیدار صاحب کی باوردی تصویر رکھی ہوئی تھی۔ فرش پر دری اور درمیان میں ایک خوبصورت نمدہ بچھا ہوا تھا۔ صوفہ نہیں تھا' مگر شیشم کی کرسیاں نئے ڈیزائن کی تھیں۔ وسط میں ایک گول تپائی رکھی ہوئی تھی' جس پر پانی سے بھرا ہوا نیلا جگ اور شیشے کے چار گلاس پڑے تھے۔

تھانیدار صاحب ہنس کر بولے۔

"دیکھو بھائی۔ ہم آپ کو چائے نہیں پلائیں گے۔ کیونکہ چائے پی کر آپ کی بھوک مر جائے گی۔ البتہ کھانے کے بعد قہوہ پلائیں گے۔"

میں نے ہنس کر کہا...... "پانی تو پی سکتے ہیں نا؟"

"ہاں ہاں ضرور......" تھانیدار صاحب نے اٹھ کر گلاسوں میں پانی انڈیلا اور باری باری سب کو دیا......

"دراصل ہمارا دستور ہے کہ ہم مہمان سے پوچھتے نہیں کہ آپ کیا کھائیں گے۔ مہمان تو ہمیشہ شرم کرتا ہے۔ پٹھانوں میں مہمان کو میزبان کی مرضی سے چلنا پڑتا ہے' مگر میزبان کی نہیں چھوڑتے۔"

انیل کو شاید تھانیدار کی باتیں اچھی لگ رہی تھیں۔ کیونکہ وہ مسکرا رہی تھی اور بڑی دلچسپی سے سن رہی تھی۔

عاطف نے تعارف نہیں کرایا تھا۔ اس لئے تھانیدار صاحب نے پوچھا۔

"عاطف صاحب' یہ تو آپ کی بہن ہیں۔ آپ نے ذکر کیا تھا لیکن ان صاحب کے متعلق آپ نے کچھ نہیں بتایا تھا...... ان کی تعریف کیا ہے......؟"

"مجھے افسوس ہے۔ میں تعارف کرانا بھول گیا۔" عاطف نے معذرت کی۔ "یہ وسیم صاحب ہیں۔ ہمارے دوست۔ ہمارے ساتھ ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ انہیں بھی سیاحت کا شوق ہے۔"

"تھانیدار صاحب۔" انیل نے ایک لمحہ کے لئے میری اور پھر تھانیدار صاحب کی طرف دیکھ کر کہا...... "باپ نے بہت جائداد چھوڑی ہے۔ غم روزگار سے بے نیاز ہیں۔ اس لئے نئی نئی سوجھتی ہیں۔ ہمارا اور ان کا مسئلہ تقریباً ایک جیسا ہے!"

مجھے انیل کی بات اچھی لگی اور تھانیدار صاحب زور سے ہنس پڑے۔

"بہت دلچسپ لوگ ہیں آپ' واقعی بے فکروں کی ایک الگ زندگی ہوتی ہے۔ یہ دنیا سے کٹے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔"

میں نے چونک کر تھانیدار صاحب کی طرف دیکھا۔ انیل مسکرا رہی تھی۔ اتنے میں

تھانیدار صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اچھا بھائی کھانا تیار ہے۔ ہم نے زیادہ تکلف نہیں کیا' لیکن کھانا آپ کو پسند آئے گا۔"

تھانیدار صاحب اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد نوکر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں چلمچی اور دوسرے ہاتھ میں لوٹا تھا اور کندھے پر صاف تولیہ۔ ہم نے ہاتھ دھوئے تو اتنے میں تھانیدار صاحب خود ٹرے اٹھائے آگئے۔ نوکر سے پشتو میں کچھ بولے۔ نوکر اندر چلا گیا اور تھانیدار صاحب نے تپائی ہٹا کر نیچے دری پر دستر خوان بچھا دیا اور ہنس کر بولے۔

"جیسا دیس ویسا بھیس' آج تو آپ سب کو پتلون سمیت نیچے بیٹھ کر کھانا پڑے گا......"

اصل لپک کر نیچے آگئی۔ میں اور عاطف بھی نیچے بیٹھ گئے۔ تھانیدار صاحب نے چار پلیٹیں دستر خوان کے چاروں کونوں پر رکھ دیں...... ٹرے میں ایک اور پلیٹ پڑی تھی۔ رومال اٹھایا تو اس میں چار مرغ روسٹ کئے ہوئے تھے۔ یہ بالکل مینڈک کی طرح چپٹے اور چوڑے تھے۔ ہم نے حیرت سے دیکھا تو تھانیدار صاحب نے بتایا......

"کچے مرغ کو صاف کرنے کے بعد شکنجے میں دبا دیا جاتا ہے اور اس کی یہ شکل بن جاتی ہے۔ بعد میں روسٹ کر لیا جاتا ہے۔"

نوکر ایک اور ٹرے لے آیا۔ اس میں مکئی کی روٹیاں تھیں اور گھر کے مکھن سے بھرے ہوئے چار پیالے' میں کیا بتاؤں یہ سب کچھ کتنا لذیذ تھا۔ ہم نے بڑی بڑی دعوتیں کھائی تھیں۔ چینی' جاپانی اور ولائتی' لیکن یہاں تو بات ہی اور تھی۔ اصل جو کھانے کے سلسلے میں بڑی بے پرواہ تھی' بڑے مزے لے لے کر کھا رہی تھی اور تعریفیں کئے جا رہی تھی۔

یہ دعوت ہمیں ہمیشہ یاد رہے گی۔

سہ پہر کو تھانیدار صاحب سے اجازت لے کر موٹر تک آئے تو اصل نے عاطف سے کہا۔ "بھائی جان' اب ڈرائیونگ میں کروں گی۔" عاطف خاموشی سے پیچھے ہو گیا۔ میں

اگلی سیٹ پر اصل کے ساتھ بیٹھ گیا۔ قصبے سے باہر نکلے تو اصل بولی۔

"تھانیدار صاحب روائتی قسم کے تھانیدار نہیں۔ بڑے اچھے اور کھرے آدمی تھے۔"

عاطف بولا......

"دراصل یہ پٹھان لوگ دل کے بڑے اچھے ہوتے ہیں۔ دوست تو بہت ہی اچھے ہوتے ہیں۔ اب دیکھئے زندگی میں دوبارہ شاید ہی ملاقات ہو...... آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی دعوت کس قدر بے لوث تھی۔"

پہاڑ کے دامن میں پہنچے۔ ہمارے دائیں طرف بھیڑ بکریوں کا ریوڑ چر رہا تھا۔ ایک نوجوان چرواہن چٹان پر بیٹھی گنگنا رہی تھی۔ موٹر دیکھ کر ہماری طرف دیکھنے لگی۔ اصل نے ہاتھ باہر نکالا اور لڑکی کو متوجہ کرنے کے لئے ہاتھ ہلانے لگی۔ لڑکی چٹان سے پھسل کر کھڑی ہو گئی اور ہنسنے لگ گئی...... اصل نے کہا۔

"یہ سب کتنا اچھا لگتا ہے۔"

عاطف نے کہا...... "اکیلی ریوڑ چرا رہی ہے۔"

"ہاں......" اصل بولی...... "جوان کیسی ہے اور خوبصورت کتنی ہے۔"

میں نے اصل کی طرف دیکھ کر کہا......

"جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا۔"

اصل بولی......

"اسے خبر ہی نہیں کہ وہ کیا ہے اور جس کے ساتھ اس کی شادی ہو گی' اسے بھی خبر نہیں ہو گی کہ فطرت نے اسے کیا بخشا ہے۔ فطرت کی یہ غلط بخشی عجیب لگتی ہے۔"

مجھ سے نہ رہا گیا۔

"لیکن جن کو خبر ہے کہ وہ کیا ہیں' وہ بھی اپنے آپ سے بے خبر رہتے ہیں۔ فطرت کی بے نیازی' فطرت کی اس غلط بخشی سے کیا کم ہے؟"

اصل ہنس پڑی......

"کبھی کبھی آپ اچھی بات کہہ جاتے ہیں۔"

"ہاں ---- مگر کبھی کبھی" میں نے بھی ہنس کر جواب دیا ----

"اتنا ہی کافی ہے ---- آٹے میں نمک کے برابر۔"

عاطف مسکرا رہا تھا۔ اب ہم آدھی چڑھائی چڑھ چکے تھے۔ امثل کے ملائم اور خوبصورت ہاتھ اسٹیئرنگ پر اِدھر اُدھر ہو رہے تھے اور اس کے حسین بال اس کی گردن اور رخساروں کو چھو رہے تھے......

عاطف نہ ہوتا تو میں اس سے کہتا۔

"فطرت کی یہ غلط بخشی کتنی عجیب ہے کہ یہ بے جان بال بار بار اس خوبصورت گردن کو چھو رہے ہیں، مگر ان کو خبر نہیں ہے کہ ان کی تقدیر کیا ہے؟"

اوپر پہنچ کر اس نے کار روک دی اور ہم باہر نکل آئے۔ اب ہم دوسری طرف مانسہرہ کی خوبصورت وادی دیکھ رہے تھے۔ صبح ہماری توجہ اوگی کی وادی کی طرف تھی۔ اگر کوئی اجنبی اوگی کی طرف سے آتا اور پہلی بار مانسہرہ کی حسین وادی کو دیکھتا اور پھر اس کی نظر وادی کے اس طرف دور، اونچے سرسبز و شاداب پہاڑوں پر پڑتی، تو اس شخص کا بھی بالکل وہی ردعمل ہوتا، جو صبح اوگی کی وادی اور سطح مرتفع کو دیکھ کر ہمارا ہوا تھا۔

گھوڑے کی زین جیسے پہاڑ کے اس سلسلے میں ہوا اس طرح چل رہی تھی جیسے قدرت نے شمالی ہواؤں کے لئے دروازہ رکھ چھوڑا ہو۔

ہم تینوں الگ الگ چٹانوں پر بیٹھ گئے تھے، اور اپنے اپنے طور پر سرشار ہو رہے تھے۔ یہی وہ لمحے ہوتے ہیں کہ امنگوں اور ولولوں کے ہجوم کے باوجود آدمی تنہائی میں مسرت محسوس کرتا ہے اور من میں ایسی گدگدی ہوتی ہے کہ پروں کے بغیر اڑنے کو جی چاہتا ہے۔ یہاں چاروں طرف چیڑ کے بڑے بڑے تناور درخت تھے۔ سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے بجھی ہوئی آگ کی راکھ پڑی تھی۔ شاید کسی راہگیر نے چائے بنائی تھی یا کسی چرواہن نے اپنی بھیڑ کا تازہ دودھ گرم کر کے پیا تھا۔

ویرانے میں بجھی ہوئی آگ کو دیکھ کر انسان کو انسان کی خوشبو آ جاتی ہے۔

امثل پہلے دن کی طرح پھر پتھر اٹھا اٹھا کر نشانہ مار رہی تھی۔ اس دن وہ سرخ قمیص پہنے

ہوئے تھی۔ آج اس کا خوبصورت بدن آسمانی رنگ کی قمیص میں چھپا ہوا تھا، لیکن پتھر مارنے کا انداز وہی تھا اور اس کے متناسب جسم کے زاویے بھی وہی تھے۔

ان ساعتوں میں میں عاطف سے بے خبر تھا، مگر عاطف مجھ سے بے خبر نہیں تھا۔ میرے قریب آ کر بولا۔ "دیکھئے کتنی خوش ہے یہ لڑکی۔ میں اس کی آنکھوں میں ایسی مسرت بہت کم دیکھتا ہوں۔"

"تین دن سے اس کی یہی کیفیت ہے۔ پہلے دن میں اس کی ذہانت سے خائف ہو گیا تھا، لیکن اب دھیرے دھیرے اسے سمجھتا جا رہا ہوں۔"

"مجھے بہت خوشی ہوگی وسیم صاحب، اگر آپ اس میں زندگی سے لگن پیدا کر دیں۔ میں اس سے بے پناہ پیار کرتا ہوں۔ میں اس کے لئے اپنی جان قربان کر سکتا ہوں۔ اپنی ساری دولت نچھاور کر سکتا ہوں۔ محض اس کی خوشنودی کی خاطر لاکھوں کا کاروبار چھوڑ کر اس کے ساتھ گھوم رہا ہوں، تاکہ اس کی آنکھوں میں مسرت دیکھ سکوں۔ دنیا میں شاید میری طرح بہت کم بھائی ہوں گے، جو بہنوں سے اتنا والہانہ پیار کرتے ہوں گے---- شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ دنیا میں میرا اپنا، بالکل اپنا صرف میری بہن ہے---- میرا باپ قبر سے دوبارہ نہیں اٹھ سکتا کہ مجھے ایک بہن دے دے۔ میں اس کی جدائی کا متحمل نہیں ہو سکتا اور اس کی موت کے خیال سے تو میری روح لرز جاتی ہے۔ اس لئے میرے پیارے دوست ---- اگر امثل زندگی کی طرف لوٹ آئے، تو میں سدا کے لئے آپ کا غلام بن جاؤں گا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بک جاؤں گا......!"

"عاطف ......! میرا اور امثل کا ساتھ صرف تین دن کا ہے۔ تین دن میں اس سے اتنا متاثر ہو چکا ہوں، جیسے تین صدیوں سے اسے پوج رہا ہوں۔ آپ کے دکھ کو میں سمجھ رہا ہوں۔ کیونکہ آپ تو اسے اٹھائیس سال سے پوج رہے ہیں!"

عاطف کی نیلی آنکھوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور ٹپ ٹپ آنسو گر پڑے۔

شاید وہ یہ حقیقت جان گیا تھا کہ خود اس کے علاوہ امثل کا ایک اور سچا دوست موجود ہے۔

عین اس لمحے امثل لپکتی ہوئی آئی' لیکن بھائی کو آنسو پونچھتے دیکھ کر تڑپ اٹھی۔

"کیا ہوا بھائی جان' کیا ہوا۔۔۔۔۔؟"

عاطف بچوں کی طرح ہنس پڑا۔

"کچھ نہیں امثی' کچھ نہیں۔"

"یہ خوشی کے آنسو ہیں!"

وہ حیرت سے بولی۔ "کیسی خوشی' کونسی خوشی' سچ سچ بتایئے۔ آپ کیوں روئے ہیں۔۔۔۔۔؟"

"میں سچ کہتا ہوں امثی۔۔۔۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔"

"آپ بتایئے۔" امثل نے میری طرف دیکھا۔۔۔۔ "وسیم صاحب' آپ کو سچ سچ بتانا ہو گا۔"

"میں سچ ہی کہوں گا۔ یہ بھی سچ کہہ رہے ہیں۔۔۔۔ بات دراصل یہ ہے کہ آپ کا بھائی آپ سے بے پناہ پیار کرتا ہے۔ آپ کو ہنستا کھیلتا دیکھ کر خوشی سے ان کے آنسو نکل آئے ہیں۔"

"اوہ۔۔۔۔!" اس نے دبا سا احتجاج کیا۔۔۔۔ "ہزار بار کہا ہے بھائی جان سے' مجھے اتنی اہمیت نہ دیں۔ میں رہوں نہ رہوں کیا فرق پڑتا ہے۔ نہ میری خوشی کی جستجو کریں اور نہ میرے غم کی پروا کریں۔ بس اپنے آپ میں مست رہیں۔"

"ساری دنیا آپ کی طرح نہیں سوچ سکتی امثل۔ اگر کوئی آپ سے پیار کرتا ہے تو اس کا یہ حق آپ اس سے نہیں چھین سکتیں۔ اگر بھائی آپ کی خاطر شدید جذبے کا اظہار کرتا ہے تو یہ اس کا موروثی حق ہے۔ اس کے خون میں یہ سچائی موجود ہے کہ وہ آپ کے مستقبل اور آپ کی خوشی کے لئے سوچے۔"

"اچھا۔۔۔۔!" وہ مسکرائی۔۔۔۔ "تو آپ دونوں نے محاذ بنا لیا ہے کہ ہر بات میں میری تردید کریں۔"

"ہرگز نہیں"۔۔۔۔ میں نے پہلے عاطف اور پھر اس کی طرف دیکھا۔۔۔۔ "ہم محاذ

کیوں بنائیں۔ آپ کو شکست دینے میں ہمارا کیا فائدہ ہے اور پھر ہم جانتے ہیں کہ آپ کو شکست دینا آسان نہیں ہے' لیکن اگر کوئی یہ خواہش کرے کہ آپ ہنستی کھیلتی رہیں تو پھر ضرور محاذ بنتا ہے۔ کیونکہ ایسی خواہش تو میرے دل میں بھی ہے۔"

"اوہ۔۔۔۔ تو یہ بات ہے۔ بھائی جان نے آپ کو بھی اپنے دام میں لے لیا ہے۔ ارے صاحب۔ بھیا تو سرکار کے اہلکاروں کو اعتماد میں لے لیتے ہیں۔ آپ کو ساتھ ملا لیا تو کیا تعجب ہے؟"

عاطف ہنس پڑا۔ میں بھی ہنسنے لگا۔ وہ اسی موڈ میں بولی۔

"زندگی اور موت کے چکر میں رکھا ہی کیا ہے۔ آپ لوگ دنیا دار آدمی ہیں۔ اس لئے لوگوں کی خوشیوں اور غموں کو تولتے رہتے ہیں۔ ورنہ یہ سب کچھ ہے کیا۔ آپ لوگ زندگی پر بڑا مان کرتے ہیں۔ کوئی بتائے کبھی کوئی کام ہماری مرضی سے ہوتا بھی ہے۔۔۔۔ بیس بائیس برس پڑھنے میں گزر جاتے ہیں۔ اس کے بعد بیس بائیس برس کا عرصہ ایسا ہوتا ہے جس سے آدمی لطف اندوز ہو سکتا ہے' لیکن یہاں تو سماجی اور معاشی مجبوریاں ایسا جکڑ دیتی ہیں کہ پتہ بھی نہیں چلتا ہے اور یہ دور گزر جاتا ہے۔ اس کے بعد پندرہ بیس سال میں آدمی کھانستا کھانستا ختم ہو جاتا ہے۔۔۔۔ ہاں تو یہ ہے زندگی!"

"لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں امثل۔۔۔۔ جنہیں سماجی اور معاشی مجبوریاں نہیں ہوتیں۔ کیا وہ زندگی کو برتنے کا حق نہیں رکھتے؟"

"مثلاً ہم اور تم۔۔۔۔! کیا برتو گے؟ اچھی خوراک' اچھا لباس' اچھی عورت۔ پھر اس کے بعد کیا ہو گا۔۔۔۔؟ ایک دن اچھے لباس سے جی بھر جائے گا۔ اچھی خوراک میں بھی لذت نہیں رہے گی اور اچھی عورت سے بھی طبیعت بھر جائے گی۔۔۔۔ اگر آپ کا ذہن سطحی نہیں ہے تو ایک دن آپ کو ہر چیز بے معنی لگے گی۔۔۔۔ آپ اس دنیا میں خود کو بالکل تنہا محسوس کریں گے۔"

"تنہائی کیا بہت بڑا عذاب ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں کہتی ہوں' زندہ رہنے کا جواز کیا باقی رہ جاتا ہے۔"

"لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ موت کے بعد سکون میسر ہوگا" میں نے پوچھا۔

"میں کب کہتی ہوں کہ موت منزل ہے' لیکن لوگ مذہب پر یقین رکھتے ہیں اور پھر بھی موت سے ڈرتے ہیں۔ میں کہتی ہوں یہ دوہرا کردار ہے۔ زندگی سے پیار کرنے والوں کے پاس بھی کچھ نہیں ہوتا۔ وہ بھی ہماری طرح خالی ہاتھ ہوتے ہیں۔"

"امل!" میں نے بے اختیار ہو کر کہا...... "پھر انسان کو پیدا کرنے کا مقصد کیا ہے؟"

"ماؤنٹ ایورسٹ کو پیدا کرنے کا کیا مقصد ہے؟ بحر منجمد شمالی اور جنوبی کو پیدا کرنے کا کیا مقصد ہے؟ صحرائے اعظم کو پیدا کرنے کا کیا مقصد ہے؟ کسی بات میں بھی کوئی مقصد نہیں ہوتا وسیم صاحب۔ سکندر اعظم کے دنیا کو فتح کرنے کا کیا مقصد تھا؟ کیا یہ بتانا مقصود تھا کہ فاتح اعظم ملیریا کے ایک معمولی مچھر سے ہار جائے گا......! واہ...... پھر تو یہ خوب مقصد تھا اور اب تو آپ یہ بھی پوچھ سکتے ہیں کہ چاند کے عظیم ویرانے کا کیا مقصد ہے؟"

عاطف خاموش تھا اور میں ہمیشہ کی طرح حیران اور لاجواب اور امل معمول کی طرح بے نیاز' جیسے آدمی کھانا کھاتا ہے۔ پانی پیتا ہے' روزانہ کا معمول...... اسے احساس ہی نہیں تھا کہ میں نے کسی پر اثر ڈالا ہے' یا حیران کیا ہے۔

یہ چھوٹی سی خوبصورت ناک والی عجیب و غریب لڑکی......!

اس سے آدمی پیار کرے یا پوجا کیا کرے......؟

ہمارے دائیں ہاتھ کی پہاڑی پر گھٹا پھیل رہی تھی اور اس کا رنگ سفیدی سے سرمئی ہوتا جا رہا تھا۔ عاطف بولا۔

"اب چلنا چاہیے۔ پہاڑ کے بادل برسنے میں دیر نہیں لگاتے۔"

"ہاں چلو......" میں نے بھی تائید کی...... شام ہونے سے پہلے ہم ڈاک بنگلے پہنچ گئے۔ کار سے اتر کر امل بولی۔

"آیئے میں چائے بناتی ہوں۔ ابھی آپ کمرے میں اکیلے کیا کریں گے۔"

میں پہلی بار ان کے کمرے میں گیا۔ مجھے خوشی ہوئی۔ امل جیسی بے نیاز لڑکی کو یہ احساس تو ہے کہ اس وقت میں اکیلا کمرے میں کیا کروں گا۔

مگر دعویٰ سے نہیں کہہ سکتا کہ غیر معمولی لڑکی مجھ سے پیار بھی کرتی ہے!

صبح دونوں بہن بھائی تیار ہو کر میرے کمرے میں آ گئے۔ عاطف نے نیلی جین اور ملتمنی رنگ کی چیک کی قمیص پہن رکھی تھی۔ امل نے سفید پتلون اور گہرے زرد رنگ کی قمیص پہنی ہوئی تھی۔

ہر روز ایک نیا رنگ......

اگر کوئی قیافہ شناس رنگوں کے تضاد کو بنیاد بنا کر اس کی شخصیت کا تجزیہ کرتا' تو امل کے کردار کے متعلق نہایت ہی غلط نتیجے پر پہنچتا۔ وہ بظاہر جو کچھ نظر آتی تھی' حقیقت میں اس سے بالکل مختلف تھی......

وہ اپنی سفید پتلون کی طرح بے رنگ تھی۔

میں نے مذاقاً کہا......

"آپ ہر روز نئے رنگ کی قمیص پہن کر آتی ہیں۔ ویسے آپ کو کونسا رنگ پسند ہے؟"

"بھائی جان نے ہر رنگ کی قمیص میرے لئے خرید رکھی ہے۔ صرف پتلون کے رنگ میں میری مرضی شامل ہے۔"

"آپ لڑکیوں کا لباس نہیں پہنتیں......؟"

"کیوں نہیں پہنتی۔ دل چاہتا ہے تو پہن لیتی ہوں' مگر میں اس تخصیص کی قائل نہیں ہوں کہ میں کوئی دوسرا لباس پہن ہی نہ سکوں۔"

"اس لئے آپ ضد سے مردوں کا لباس پہنتی ہیں۔"

"آپ عورتوں کا لباس پہنئے' ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں۔"

"لوگ تو ہنسیں گے۔"

"لوگوں کو ہنسانا تو بڑے ثواب کا کام ہے۔"

عاطف اور میں دونوں ہنس پڑے۔ خود وہ بھی ہنسنے لگی۔ عاطف بولا۔

"بھئی یہ بڑا ای سائیڈ پر میں نہیں گیا۔ امی بہت تعریف کر رہی تھی۔ آج ادھر کو

چلیں۔"

"ٹھیک ہے سامان تیار کر لیجئے۔ بٹراسی سے ہوتے ہوئے آگے کاغان نکل جائیں گے۔"

"نہیں۔" عاطف نے مخالفت کی۔۔۔۔ "کاغان اس وقت جائیں گے جب ہماری بانسو ڈاک بنگلے کی بکنگ ختم ہو رہی ہوگی۔ فی الحال ہیڈکوارٹر یہیں رکھتے ہیں۔ ابھی تو ادھر ادھر دیکھنے کی بہت سی جگہیں ہیں۔"

"وسیم صاحب۔" امثل بولی۔۔۔۔ "آپ اس دن بتا رہے تھے' گڑھی حبیب اللہ سے ایک سڑک مظفر آباد آزاد کشمیر نکل جاتی ہے۔ بٹراسی ہوتے ہوئے آج ادھر کیوں نہ جائیں؟"

"ہاں جاسکتے ہیں۔"

تینوں جیپ کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ امثل ہم دونوں کے درمیان تھی۔ آج وہ میرے بہت قریب تھی اور اس کا جسم کبھی کبھی میرے جسم سے ٹکرا جاتا تھا۔ موڑ کاٹتے ہوئے تو ایسا ضرور ہو جاتا تھا۔ اس سے میری روح میں ایک عجیب سی گدگدی ہوتی تھی۔

عورت میرے لئے عجوبہ ہرگز نہ تھی۔ میں عورت کے وجود کی گرمی کئی بار محسوس کر چکا تھا' لیکن امثل' جس سے میں نفسیاتی طور پر مرعوب تھا' اس کے جسم کے لمس کی کیفیت ہی اور تھی۔ اس کیفیت میں جنسیت کے بجائے ایک لطیف سی روحانیت تھی۔

اٹھائیس سال کے تجربے اور مشاہدے کے بعد پہلی بار میں اس طرح کی انوکھی راحت سے دوچار ہوا تھا۔

یہ لافانی لمحے تھے۔

بٹراسی کا چوکیدار ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ حسب معمول سلیوٹ کے بعد میں نے اسے چائے کے لئے پانچ روپے کا نوٹ دیا۔ عاطف کو بھی بٹراسی کے ڈاک بنگلے کا محل وقوع بہت پسند آیا۔ کہنے لگا۔۔۔۔

"اگر میں شاعر ہوتا تو یہاں دیوان لکھ کر واپس جاتا۔"

چوکیدار چائے لے کر آیا۔ ہم ڈرائینگ روم میں بیٹھ گئے۔ چوکیدار کہنے لگا۔

"اس دن آپ لوگ چلا گیا تو ہمارا صاحب پوچھنے لگا کہ یہ میم صاحب کون ہے؟ ہم نے بولا۔۔۔۔ ہم نے میم صاحب کو پہلی بار دیکھا ہے۔ دوسری بار دیکھنے کا آسرا ہے۔ ہم میم صاحب کو نہیں جانتا' مگر ہمارا دل اس کو جانتا ہے۔ وہ بہت اچھا ہے!"

عاطف حیرت سے چوکیدار کی طرف دیکھ رہا تھا' لیکن امثل میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔۔۔۔ مجھے چوکیدار کی باتیں نہایت اچھی لگیں۔ وہ اپنے احساسات کی اس سے بہتر ترجمانی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ امثل ہی کی شان تھی کہ انسان اس قدر جلد اس سے متاثر ہو جاتا تھا۔

چوکیدار کی آنکھوں میں وہ عقیدت تھی جو ایسے لوگوں کی آنکھوں میں پیرو مرشد کے لئے ہوتی ہے۔

وہ چائے رکھ کر چلا گیا تو عاطف بولا۔

"کس قدر بے باک آدمی ہے!"

میں نے عاطف سے کہا۔۔۔۔

"نہایت ہی کھرا آدمی ہے۔ اس کی نیت میں ذرا بھی کھوٹ نہیں۔ یہ محض اظہار عقیدت تھا۔ اس کی آنکھوں میں سچائی صاف دیکھی جاسکتی تھی۔"

امثل ہنس پڑی۔۔۔۔ وہ چائے بناتے ہوئے بولی۔

"وسیم صاحب ٹھیک کہتے ہیں بھیا۔ یہ ناکوں اور آنکھوں کے تجزیے کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ اس بارے میں آپ ان کے مشاہدے کو جھٹلا نہیں سکتے۔ کیونکہ انہوں نے ان گنت آنکھوں اور ناکوں کا نہایت غور سے مطالعہ کیا ہے۔"

عاطف ہنس پڑا۔۔۔۔

"مجھے ان کی اس کوالیفکیشن کا علم نہیں ہے۔ پھر تو کسی وقت ہماری آنکھوں کا تجزیہ بھی کیا جاسکتا ہے۔"

امثل چائے کا کپ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"میری آنکھوں کا تجزیہ تو کر چکے ہیں۔ آپ انہیں ہرن کہتے ہیں۔ وسیم صاحب کہتے ہیں ایسی آنکھیں شہزادیوں کی ہوتی ہیں۔ جیسے شہزادی ثروت' فرح دیبا اور آڈرے ہیپ برن!"

"گڈ۔" عاطف خوش ہو کر بولا...... "ہاں...... کچھ یاد آ رہا ہے۔ آڈرے ہیپ برن کی آنکھیں واقعی کچھ کچھ تم جیسی ہیں۔ حیرتوں سے بھری ہوئی' شہزادی ثروت اور ملکہ فرح دیبا کی آنکھوں کو غور سے نہیں دیکھا' مگر وسیم صاحب میری آنکھوں کے متعلق بھی تو کچھ بتایئے؟"

"خوبصورت آنکھیں ہیں آپ کی' مگر ان میں کوئی راز نہیں ہے۔ سیدھی اور سادہ" آپ کا ایکسپریشن آنکھ میں نہیں چہرے پر ہوتا ہے!"

"خوب بہت خوب——!" اسمٰی نے تالی بجائی—— "کیا کہا تھا میں نے بھائی جان! بالکل تصدیق ہوئی ہے میری بات کی——!!"

عاطف ہنسنے لگا۔ اتنے میں چوکیدار پھر اندر آ گیا۔

"چائے اور لاؤں صاحب——؟"

"نہیں' بس ہے۔" میں نے جواب دیا—— "تم یہ بتاؤ چوکیدار' جب تم نے میم صاحب کے متعلق اپنے صاحب کو سب کچھ بتا دیا تو پھر تمہارے صاحب نے کیا کہا تھا——؟"

"کچھ نہیں صاحب۔ وہ تو کچھ نہیں بولا تھا۔ ہمارا منہ کو دیکھتا رہ گیا تھا۔ بالکل خاموش' ادھر باہر پتھر کے بنگلے پر دو گھنٹے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ بہت سگریٹ پیا تھا اور پھر ہم سے بات کئے بغیر چلا گیا تھا۔ ہم کو خود بہت حیرانی ہوا تھا صاحب!"

"اچھا ٹھیک ہے تم جاؤ۔"

چوکیدار چلا گیا۔ میں نے اسمٰی کی بے تاب آنکھوں کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ اداس اور گمبیر ہو گئی تھی۔ جیسے بچہ غلطی کے بعد پچھتا رہا ہو۔

جب ہم جیپ میں بیٹھ گئے تو چوکیدار نے معمول کے مطابق فوجی سلیوٹ کیا۔ عاطف

نے اسے دس کا نوٹ انعام دیا تو اس نے ایک اور سلیوٹ دے مارا۔ اسمٰی نے اس سے کہا۔

"اگر تمہیں اچھا لگتا ہے تو پھر آئیں گے تمہارے ڈاک بنگلے۔"

"اوہ......! سر آنکھوں پر میم صاحب' دل و جان سے' ہمارا باپ کا ڈاک بنگلہ نہیں ہے۔ مگر جب تک ہم ادھر نوکری کرے گا' آپ کے پاؤں میں آنکھیں بچھائے گا۔ خدا کی قسم' ہم سچ بولتا ہے!!"

وہ واقعی سچ بول رہا تھا—— اسمٰی نے گمبیر مسکان کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ میں نے گیئر لگا کر کلچ سے پاؤں اٹھا لیا۔ جیپ چل پڑی۔ سڑک کا پہلا موڑ مڑتے ہوئے میں نے ڈاک بنگلے کی طرف دیکھا۔ چوکیدار پتھر کے بنگلے کے پاس سنگ میل کی طرح کھڑا تھا۔ وہ ہماری جیپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے مرشد سے بچھڑ گیا تھا!

گڑھی حبیب اللہ کے پاس دریائے کنہار کا پل پار کر کے' ہم دائیں جانب مظفر آباد جانے والی سڑک کی طرف مڑ گئے۔ اب دریائے کنہار ہمارے ساتھ ساتھ دائیں طرف ذرا گہرائی میں بہہ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک چیک پوسٹ پر ہماری جیپ روک لی گئی۔ یہاں سے آزاد کشمیر کی سرحد شروع ہوتی تھی۔ معمولی پوچھ گچھ کے بعد ہمیں آگے جانے کی اجازت مل گئی۔

ہمارے دائیں بائیں اونچے اونچے پہاڑ تھے۔ سڑک اور دریائے کنہار پہلو بہ پہلو اس تنگ گھاٹی میں سے گزر رہے تھے۔ جوں جوں آگے بڑھتے گئے' توں توں ہم اوپر ہوتے گئے اور دریائے کنہار نیچے رہتا گیا اور ہر میل پر فاصلہ زیادہ ہوتا چلا گیا۔ فطرت اپنی مرضی پوری کر رہی تھی اور انسان اپنا مقصد——

حتیٰ کہ ہماری جیپ آزاد کشمیر کی ایک اور چوکی پر آ کر رک گئی۔ اس چوکی پر چڑھائی ختم ہو جاتی تھی۔ یہاں سے تقریباً ایک میل نیچے دریائے نیلم بہہ رہا تھا۔ یہ دریائے کنہار سے بڑا دریا تھا۔ ہم بہت بلندی پر تھے۔ نیلم کے اس پار مظفر آباد کا خوبصورت شہر نظر آ رہا تھا—— ہمارے بائیں طرف بلند و بالا پہاڑ تھا' جس کے پہلو میں مظفر آباد کی

طرف سڑک اتر رہی تھی۔۔۔۔ سڑک اور دریائے نیلم کی بیچ کی ڈھلان تقریباً عمودی تھی اور بعض جگہ یہ ڈھلان نصف میل اور ایک میل تک چلی گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا' اگر آدمی غلطی سے لڑھک جائے تو سیدھا نیلم میں جا کر دم لے گا۔

اس کا تصور ہی ہولناک تھا۔

آزاد کشمیر کی اس چوکی پر ہمارے نام اور ایڈریس کے علاوہ مظفر آباد جانے کا مقصد بھی پوچھا گیا اور اس کا اندراج بھی کیا گیا۔ اس کے بعد ہمیں جانے کی اجازت مل گئی۔

مگر اسی لمحے امثل نے تھرماس نکالی اور ہمارے علاوہ چوکی کے انچارج کی طرف کافی کا کپ بڑھایا۔۔۔۔ میں نے دیکھا ایک لمحے کے لئے تو انچارج بالکل گھبرا گیا۔ وہ حیرت سے امثل کو دیکھ رہا تھا۔۔۔۔ بے چارے کو شاید زندگی میں پہلی بار ایسی پیش کش سے واسطہ پڑا تھا۔

امثل اس کی گھبراہٹ کو سمجھ گئی اور بڑی نرمی سے بولی۔

"لیجئے۔۔۔۔ لیجئے۔۔۔۔ کوئی حرج نہیں۔"

خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے امثل سے کپ لے لیا۔ اس کے دستے کے سپاہی فخر اور شوق سے امثل کی طرف دیکھ رہے تھے۔

کافی پی کر ہم روانہ ہو گئے۔ اب اترائی ہی اترائی تھی اور موڑ پر موڑ آ رہے تھے۔ امثل کا جسم کبھی کبھی مجھ سے ٹکرا جاتا اور میرے ہاتھ اسٹیرنگ پر سخت ہو جاتے اور نادانستہ ایکسیلیٹر پر پاؤں دب جاتا۔ میں اپنے اس رد عمل کا تجزیہ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ سب کچھ پلک جھپکتے ہی ہو جاتا تھا' مگر اس سب کے باوجود میں امثل کے رد عمل سے بے خبر تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرتوں کے سوا ابھی تک میں نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ دل میں جھانکنا تو خیر دور کی بات تھی۔

کچھ دیر بعد امثل بولی۔

"کیا اچھا ہوتا' سرینگر بھی ہمارے پاس ہوتا۔ جھیل ڈل دیکھنے کا مجھے کتنا شوق ہے۔"

عاطف نے جواب دیا۔

"امن کے نام پر ہم نے ہمیشہ نقصان اٹھایا۔ سیز فائر نہ ہوتا تو سرینگر ہمارا تھا۔"

"یہ تو سیاست ہوئی نا۔۔۔۔" امثل بیزاری سے بولی۔۔۔۔ "سیاست کی باتیں نہ کریں۔ یہ سیاست ہی ہے نا جس نے زمین کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے۔ جغرافیائی حدود کھڑی کر دی ہیں۔ دریاؤں کے حصے بخرے کر دیئے ہیں۔ قومیت در پیش آلاپا ہے۔ کتنا غیر قدرتی ہے یہ سب کچھ' اپنی سرحدوں سے باہر نکلو' تو پاسپورٹ بناؤ۔ انسان کو انسان سے ملنے سے روکا جاتا ہے۔۔۔۔ کیسی کیسی حماقتوں کی بھرمار ہے یہاں!"

اب ہم کافی نیچے آ گئے تھے۔ سامنے دریا کا پل اب بالکل واضح نظر آ رہا تھا۔ عاطف نے کہا۔

"یہ بلند و بالا پہاڑ اور ان کے سینے میں یہ کھلی ہوئی سڑکیں انجینئرنگ کے شاندار کارنامے ہیں۔"

میں نے کہا۔۔۔۔ "انسان ان سب سے زیادہ شاندار ہے۔"

امثل نے میری طرف دیکھا۔

"جی ہاں۔۔۔۔ انسان ان راستوں پر ٹینک چلاتا ہے۔ بارود اور بموں سے بھری ہوئی فوجی گاڑیاں چلاتا ہے اور اس سے انسان کے پرخچے اڑاتا ہے۔ واقعی انسان دوسروں کے پرخچے اڑانے میں نہایت شاندار ہے!"

"امثل ہر بات کے دو رخ ہوتے ہیں۔" میں نے اسے جواب دیا۔ "اب سامنے پل کو دیکھ لیجئے۔ بے شک اس پر ٹینک گزرتا ہے' مگر اس پر ہماری جیپ بھی گزرے گی۔ تلوار ظالم کے ہاتھ میں آتی ہے تو سر کاٹتی چلی جاتی ہے' لیکن مظلوم کے ہاتھ میں آتی ہے تو دفاع بھی کرتی ہے۔ ہر بات میں اچھے اور برے دونوں پہلو ہوتے ہیں۔"

"جی ہاں۔۔۔۔" امثل طنز سے بولی۔۔۔۔ "ایٹم بم نے پلک جھپکتے میں ناگاساکی اور ہیروشیما سے لاکھوں آدمی صفحہ ہستی سے مٹا دیئے' لیکن جنگ تو بند ہو گئی۔ اس لئے ایٹم بم امن قائم رکھنے کے لئے بے حد اہم پہلو رکھتا ہے۔۔۔۔ ہٹلر جرمنی کے سوا دنیا کی ہر قوم کو نیچا دکھانا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں اس کے اس عزم کا دوسرا رخ آپ کیا تعین کرتے

ہیں۔۔۔۔ لاکھوں من روئی جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ جانے اس کا روشن پہلو کیا ہوگا۔ شاید یہی کہ شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے اور سارا شہر روشن تھا!"

جیپ اب پل پر سے گزر رہی تھی۔ نیچے دریائے نیلم جھاگ اگل رہا تھا۔ اعلیٰ کی باتوں کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔

وہ ہمیشہ ایسی باتیں کرتی تھی جن کا واقعی ایک ہی رخ ہوتا تھا۔۔۔۔ جیسے وہ خود تنہا تھی' اس کی بات بھی منفرد ہوا کرتی تھی۔

شکر ہے کہ اسے خدائی کا دعویٰ کرنے کا خیال نہیں۔ کم از کم جون آف آرک بننے کی تو اس میں صلاحیت تھی بلکہ اس سے بہت زیادہ تھی۔

اس کی چال ڈھال' اٹھنے بیٹھنے میں جو رکھ رکھاؤ اور وقار تھا' وہی انداز اس کی باتوں میں بھی تھا۔۔۔۔ بس اس کے نچلے ہونٹ اور خوبصورت گردن میں ایک مخصوص قسم کی ترغیب تھی ورنہ تو آدمی اسے دیوی ہی سمجھتا۔

مظفر آباد' مانسہرہ کی نسبت گرم تھا۔ یہاں سے مری اور سرینگر کو سڑکیں جاتی تھیں۔۔۔۔ مظفر آباد شاید ہمیں اس لئے اچھا لگا کہ یہ آزاد کشمیر کا دارالحکومت تھا اور اس سے کچھ جذباتی وابستگی تھی۔

سامنے کا پہاڑ جس سے ہم اترے تھے' سیاہ دیو کی طرح کھڑا تھا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ ہم اس عظیم پہاڑ سے ہو کر آئے ہیں۔۔۔۔ آج ہم لنچ ساتھ نہیں لائے تھے۔ ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں بیٹھ کر تکوں اور کباب کا انتظار کر رہے تھے۔ ہوٹل کے ملازم آپس میں کشمیری زبان بول رہے تھے۔ عاطف بولا۔

"تھوڑے سے فاصلے کے بعد زبان بدل جاتی ہے۔ اس منطق کی سمجھ نہیں آتی۔"

"اس میں منطق کی کیا بات ہے۔" اعلیٰ نے جواب دیا۔ "پتھر کے زمانے میں جب انسان غاروں میں رہتا تھا' اسے یہ پتہ نہیں تھا کہ اس پہاڑ کی دوسری طرف کیا ہے یا دریا کے اس پار کیسے جایا جا سکتا ہے۔ اس کا شعور کند تھا۔ اس کی تگ و دو بھی محض پیٹ بھرنے تک محدود تھی۔ اس لئے وہ ایک مخصوص علاقے سے باہر نہیں جاتا تھا۔ چنانچہ

[illegible] علاقے میں جتنے انسان بستے تھے' اسی کو دنیا سمجھتے تھے۔ اس زمانے کے شعور کے [illegible]ابق یہ لوگ آپس میں سماجی تعلق بھی رکھتے ہوں گے۔ جنسی تعلق تو خیر فطری چیز ہے۔ [illegible] ان تعلقات کو قائم رکھنے کے لئے مفہوم اور اظہار کی ضرورت بھی پڑی ہوگی اور [illegible] مختصر اور محدود سی زبان نے جنم لیا ہوگا اور پھر آہستہ آہستہ ان میں الفاظ کا اضافہ ہو [illegible]ا ہوگا۔۔۔۔ بالکل اس طرح' جیسے پتھر کے بعد دھات کا زمانہ آیا۔۔۔۔ جوں جوں شعور [illegible]ھتا چلا گیا' زبان بنتی گئی اور پیٹ بھرنے کے ذرائع بھی بدلتے چلے گئے۔۔۔۔ صدیاں گزر [illegible]ئیں۔ زبان بن گئی' مگر انسان پہاڑ کے اس طرف نہ جھانک سکا اور نہ دریا کے اس پار جا [illegible]۔ وہ جہاں تھا' اپنی ضرورت' اپنے ماحول اور آب و ہوا کے مطابق الفاظ گھڑتا چلا گیا اور [illegible] طرح چھوٹی چھوٹی علاقائی زبانیں جنم لیتی چلی گئیں۔ پھر ایک زمانہ آیا انسان کو پتہ چل [illegible]ا کہ پہاڑ کے اس طرف بھی کچھ ہے اور دریا کے اس پار بھی۔ ان میں سے کچھ باہمت [illegible]وں نے سوچا کہ دیکھیں تو سہی' دریا کے اس پار کیا ہے اور پہاڑ کے اس طرف کیا راز ہے؟ یہ بالکل اس طرح ہوا ہوگا جس طرح آج کچھ لوگ ہمت کر کے چاند سے ہو آئے [illegible]' مگر میں سمجھتی ہوں کہ جو لوگ چاند سے ہو کر آگئے ہیں' ان سے زیادہ حوصلہ مند [illegible]ہیں' جو پہاڑ کے اس طرف سے ہو کر آئے تھے۔ کیونکہ وہ آدمی جو پہاڑ کے اس [illegible] جھانک کر آیا تھا' خالی الذہن تھا۔ موجودہ آدمی کی طرح ہزاروں سال کا شعور اس کی [illegible] پر نہیں تھا' اس لئے تلاش کا سہرا بھی اسی کے سر بندھتا ہے۔۔۔۔!"

میں نے عاطف کی طرف دیکھا۔ وہ فخر سے اپنی بہن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ مطمئن [illegible] اسے مکمل جواب مل چکا تھا۔۔۔۔ چھوٹی سی خوبصورت ناک والی یہ لڑکی اتنا کچھ کہنے [illegible] باوجود بالکل اپنے آپ سے بے خبر تھی۔ شاید اسے بھوک لگ رہی تھی۔

"اب کشمیری میں ان لوگوں کو کون سمجھائے کہ کھانا جلدی سے لاؤ۔ شاید اردو سے [illegible]م چل جائے۔ بھیا انہیں کہو وہ ذرا جلدی کریں۔"

عاطف اور میں دونوں ہنس پڑے' تو وہ بولی۔

"یہ بھی بنیادی غلطی ہے کہ بنی نوعِ انسان کی زبان ایک نہیں۔ اجنبیت کی بنیاد زبان

ہی ہے۔۔۔۔۔ ہاں اصل فساد یہی ہے۔ اگر دنیا شعوری کوشش کا نتیجہ ہوتی تو یہ بنیادی غلطی کیوں سرزد ہوتی!"

اتنے میں کھانا آگیا۔ تکوں اور کباب کی خوشبو اپنا کام کر رہی تھی۔ میں نے ہنس کر کہا۔

"فساد تو کباب کی خوشبو میں بھی ہے۔ آدمی بے قرار ہو جاتا ہے۔"

"روٹی کی خوشبو!" امل نے کباب منہ میں ڈال کر کہا۔۔۔۔ "روٹی سے کبھی دل نہیں بھرتا۔ ہر چیز سے دل بھر جاتا ہے۔ حتیٰ کہ انسان محبت سے بیزار ہو جاتا ہے' مگر روٹی کی خوشبو سے کبھی بیزار نہیں ہوتا!"

"ٹھیک ہے امل' مگر انسان محبت سے بھی بیزار ہو جائے' یہ ہم کیسے مان لیں؟"

"کر کے دیکھ لیں' وسیم صاحب' محبت کر کے دیکھ لیں۔ ایک دن آئے گا' آپ محبت سے ہار جائیں گے اور روٹی کی طرف لوٹ آئیں گے۔"

"تو لوں گا یا آگے بڑھ جاؤں گا یہ وقت ہی بتائے گا جب محبت میری آتما کو چھوئے گی۔ ابھی تو میں محبت کا پیچھا کر رہا ہوں۔ ابھی تو پایا ہی نہیں۔ گنواؤں گا کیا!"

وہ ہنس پڑی۔۔۔

"پاؤ گے تو گنوا لو گے۔ اس گلی میں یہی ہوتا ہے۔۔۔۔ روٹی پہلو میں رکھ کر ہم ساری دنیا کی سیاحت کر سکتے ہیں' لیکن محبت کا روگ پال کر آپ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے!"

"آپ جگ بیتی کہہ رہی ہیں یا آپ بیتی۔۔۔۔۔؟"

"جگ بیتی بھی اور آپ بیتی بھی' مگر حیرت کی بات ہے' آپ اٹھائیس سال میں ایک آدھ محبت بھی نہیں کر سکے۔"

"میرا خیال تھا' میں زندگی بھر محبت نہیں کر سکوں گا۔ میں بہت خود غرض آدمی تھا۔ مجھے اپنی ذات کے سوا ہر چیز ہیچ نظر آتی تھی' لیکن میں بالکل اچانک بدل گیا ہوں۔ مجھے محسوس ہوا ہے کہ مجھ میں ایک آدھ صلاحیت موجود ہے۔ کم از کم میں محبت تو کر سکتا

ہوں۔"

"ہو سکتا ہے۔ آپ کو علم نہ ہو اور اس میں بھی آپ کی خود غرضی شامل ہو؟"

"ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو' مگر فی الحال تو مجھے یقین ہے کہ میں مخلص ہوں۔ یہ میں دعویٰ سے کہہ رہا ہوں۔"

"میں آپ کے دعوے کو نہیں جھٹلاتی' لیکن مجھے آپ سے ہمدردی ہے کہ آپ دھوکے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔"

"میں یہ دھوکہ ضرور کھاؤں گا امل' مجھ میں جو ایک آدھ صلاحیت ابھری ہے' میں اس کا مظاہرہ ضرور کروں گا۔ میں روٹی کی خوشبو کی طرح اس سے بھی ناطہ نہیں توڑ سکتا۔ میں کوشش کروں گا کہ میری اس صلاحیت کو کبھی شکست نہ ہو۔"

"آپ ایسا ضرور کریں گے۔ آپ ایسا ضرور کریں گے۔۔۔۔۔" اس نے گلاس اٹھا کر پانی پیا۔

"ہاں وسیم صاحب' آپ ایک کام اور کریں۔ بھائی جان سے کہیں' شادی کر لیں۔ یہ مجھ سے چھ سال بڑے ہیں۔ ان کی عمر چونتیس سال ہو گئی ہے۔ مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے جب مجھے یہ احساس ستاتا ہے کہ بھیا میری وجہ سے شادی نہیں کرتے۔"

عاطف مسکرا رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"کوئی دوسروں کے لئے جینا چاہتا ہے تو اس کی مذمت کون کر سکتا ہے۔ عاطف کو آپ دنیا دار آدمی کہتی ہیں' مگر وہ کتنے استقلال سے بہن کی حفاظت کر رہا ہے۔ میں ایسے آدمی کو کیا مشورہ دے سکتا ہوں۔"

امل سٹپٹا گئی۔۔۔۔۔

"نہیں نہیں۔ وہ اپنے لئے جئیں تاکہ میں اپنے لئے جی سکوں۔ انہوں نے میری خاطر اپنے آپ پر جبر کیا ہے۔ یہ زیادتی ہے۔ میں اپنے تئیں مرنا اور جینا چاہتی ہوں۔ میں لاابالی فطرت کی لڑکی ہوں۔ میں کسی کے ساتھ کیسے چل سکتی ہوں؟"

"وسیم صاحب۔۔۔۔۔" عاطف سنجیدہ ہو گیا۔ "میں شادی کرنے کے لئے تیار ہوں۔

دنیا میں کونسی بات ہے جو میں اس کے لئے نہیں کر سکتا' لیکن میں اس کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ فرض نہیں میری محبت ہے' جو اس کو اکیلا نہیں چھوڑے گی۔ میں شادی کے لئے تیار ہوں۔ بشرطیکہ یہ بھی زندگی کا ساتھی چن لے!"

"نہیں نہیں!" وہ تڑپ اٹھی۔۔۔۔ "میں شادی کی اہل نہیں ہوں۔ میں کسی کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی اور نہ میں کسی کو خوش رکھ سکتی ہوں۔ میں اپنی مرضی سے چلتی ہوں۔ مرضی سے سوتی ہوں اور اپنی مرضی سے اٹھتی ہوں اور سب سے بڑی بات' مجھے کسی سے عشق ہی نہیں ہوتی۔۔۔۔۔۔ میرا مزاج ہی ایسا ہے۔۔۔۔۔ بھلا بیویاں ایسی ہوتی ہیں ہمارے معاشرے میں بیویوں کے لئے کچھ قاعدے اور روایات ہیں۔۔۔۔۔ توبہ توبہ' میں ایسی فضول پابندیاں کیسے برداشت کر سکتی ہوں اور پھر یہ کہ میں محبت پر یقین نہیں رکھتی!"

"تو پھر مجھے بھی شادی کے لئے نہ کہا کرو۔" عاطف فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

"میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ تم محبت پر یقین نہیں رکھتیں' مگر میں تمہاری محبت میں سرشار ہوں۔ تم خوش رہو تو میں اپنی زندگی میں کوئی کمی محسوس نہیں کرتا۔"

"بھیا۔۔۔۔!" امثل روہانسی سی ہو گئی۔۔۔۔۔ "آپ عجیب ہیں' مگر میں کیسی بدقسمت ہوں کہ اتنے اچھے بھائی کے لئے کچھ نہیں کر سکتی۔ بھیا مجھ سے ناراض نہ ہونا۔ میری فطرت ہی گھٹیا ہے!"

عاطف نے اسے پیار سے اپنی طرف کھینچا۔ ہوٹل کے ملازم ہمیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ شاید انہیں پہلی بار ہم جیسے گاہکوں سے واسطہ پڑا تھا۔

"تین چار روز سے میں نے امیدوں کے جو محل کھڑے کئے تھے' وہ گرتے نظر آ رہے تھے۔ میں نے خیال کیا تھا کہ امثل کے مزاج میں کسی حد تک دخل پا لیا ہے' مگر نہیں۔۔۔۔۔ میں تو اس سے کوسوں دور کھڑا تھا۔ وہ محبت پر یقین ہی نہیں رکھتی۔۔۔۔ ہاں' میں اسے اپنے طور سے چاہتا رہوں' لیکن اس سے کوئی توقع نہ رکھوں۔ وہ تو اپنے اچھے اور پیارے بھائی کے لئے کچھ نہیں کر سکتی۔ پھر میں کیوں توقع رکھوں۔۔۔۔؟"

ہم تینوں ایک دوسرے کے اچھے دوست تھے' مگر تینوں کے کردار میں کتنا تضاد تھا۔

ملازم برتن اٹھا کر لے گیا تھا۔۔۔۔ عاطف کی بغل میں' امثل ننھی منی بچی نظر آ رہی تھی۔ اس لئے کون کہہ سکتا تھا کہ یہ بھائی جو اس وقت بزرگ بن کر اس سے پیار کر رہا ہے' اس منی سی بچی سے کس قدر مرعوب ہے۔

لڑکا بل لے آیا۔ میں نے اسے قہوے کے لئے کہہ دیا۔ اچانک امثل ہنس پڑی۔

"وسیم صاحب! کیا کہیں گے بھائی جان۔ کیسے اوٹ پٹانگ لوگ ہیں۔ کیا سیر و تفریح ایسی ہوتی ہے؟"

"ہاں۔ سیر و تفریح ایسی ہی ہوتی ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔۔۔۔۔ "نئے روپ' نئے مشاہدے' ہر قدم ایک تجربہ ہوتا ہے۔ آج ہم نے آپ کا ایک نیا روپ دیکھا ہے۔"

"کونسا روپ۔۔۔۔؟" وہ چونکتے ہوئے بولی۔

"یہی کہ آپ کی آنکھوں میں آنسو بھی ہیں۔ آپ کسی کی مجبوری پر رو بھی سکتی ہیں۔"

"کیوں۔۔۔۔؟" وہ سوالیہ لہجے میں بولی۔۔۔۔ "کیا میں انسانی جذبات نہیں رکھتی۔۔۔۔؟ کیا میں پتھر ہوں۔۔۔۔؟ اور کیا میں کوئی صلاحیت نہیں رکھتی۔۔۔۔؟"

"صلاحیتیں تو خیر از حد ہیں۔ بس مجھے تو خوشی ہوئی ہے۔ آپ کو روتا دیکھ کر' یقین جانیے آپ کے آنسوؤں سے مجھے یک گونہ مسرت ہوئی ہے۔ آپ اگر اس کی وجہ پوچھیں گی' تو شاید میں نہ بتا سکوں۔"

"میں بتا دیتی ہوں۔ آپ ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوئے۔ ٹھیک ہے۔ میں آپ کی آس کیوں توڑوں۔ آپ اگر امیدوں کے سہارے جینا چاہتے ہیں تو ضرور جئیں' مگر یہ ایسا ہے' جیسے بچہ چاند کے لئے ہمکتا ہے۔"

"مگر اب تو چاند۔۔۔۔ کی خواہش کرنا خواب نہیں رہا۔"

"لیکن وہاں رکھا ہی کیا ہے۔ غاریں' پہاڑ اور مردہ چٹانیں' بالکل انسانی ذہن کی طرح ویران!"

لڑکا قہوہ لے آیا۔ قہوے کا ذائقہ اور خوشبو نہایت نفیس تھی۔ عاطف تعریف کرنے لگا۔۔۔۔۔۔

"پھولوں کی خوشبو اور مختلف ذائقوں سے خدا پر میرا یقین اور پختہ ہو جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ دنیا سوچ سمجھ کر بنائی گئی ہے۔"

امثل ہنس پڑی۔۔۔۔۔۔

"بھائی جان اپنا مافی الضمیر بیان کرنے میں ہمیشہ تامل سے کام لیتے ہیں۔ ورنہ ان میں اچھی باتیں کہنے کی بہت صلاحیتیں ہیں۔"

"جو بات انہوں نے کہی ہے' آپ اس کی کئی بار تردید کر چکی ہیں۔ پھر ان کی بات کو اچھا کس طرح کہتی ہیں؟"

"میں نقطہ نظر کی نہیں' بات کرنے کے انداز کی بات کر رہی ہوں۔"

قہوے کی دوسری پیالی پی کر عاطف بولا۔

"مزا آگیا' مگر اب چلنا چاہیے۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔"

"دیر کا ہے کی بھائی جان' دیر کبھی بھی نہیں ہوتی۔ یہی تو بات ہے۔ آپ لوگوں نے جلدی اور دیر کے پیمانے بنا لئے ہیں اور گھڑی کی سوئی کی مانند چلتے ہیں۔۔۔۔ خوشی کے چند لمحے آتے ہیں' تو دیر کہہ کر آپ ان کی عمر مختصر کر دیتے ہیں۔۔۔۔ میں کہتی ہوں' سفر جاری رہنا چاہیے۔ اس پر دیر اور جلدی کے بوجھ نہ لادیں۔ بس چلتے جائیں۔ تھک جائیں تو بیٹھ جائیں۔ دم لے کر پھر چل پڑیں۔ اس میں دیر کی کیا بات ہے اور جلدی کیا ہے۔ رات ضرور آتی ہے اور صبح بھی ضرور ہوتی ہے۔ جب یہی روز مرہ ہے تو پھر کیسی دیر۔ عجیب بات ہے۔ چونکہ ڈاک بنگلے میں ہمارے ٹرنک پڑے ہیں۔ اس لئے دیر ہو رہی ہے!"

"احمق۔۔۔۔۔!" عاطف اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔۔۔ "ساری دنیا تمہاری طرح سوچتی تو ہم تمہارے اصول اپنا لیتے' لیکن جس دنیا میں ہم بستے ہیں' وہ ایک خاص نظام اور ڈسپلن کے تحت چل رہی ہے۔ اس میں دیر اور جلدی کے کچھ معنی ہیں۔ ہم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔"

امثل بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔۔۔۔۔

"یہی تو عذاب ہے کہ ہم اپنی خوشی سے کوئی کام نہیں کر سکتے۔ حتیٰ کہ بیٹھ بھی نہیں سکتے کیونکہ دیر ہو رہی ہوتی ہے۔ میں سوچتی ہوں' ہم پرندوں کی طرح آزاد کیوں نہیں ہیں۔۔۔۔۔؟"

ہماری جیپ پٹرول پمپ کے پاس کھڑی تھی۔ ہم ہوٹل سے نیچے اتر آئے۔ پٹرول' پانی اور تیل چیک کر کے اسی طرح اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔۔۔۔۔ پل عبور کر کے اس پار پہنچے تو شمال کی طرف کالے بادل منڈلاتے نظر آئے۔ دوسری طرف وہ سیاہ پہاڑ دیو کی طرح ہمارے سروں پر کھڑا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ دو عفریت ایک دوسرے کو ٹکر مارنے کے لئے بڑھ رہے ہیں۔

جب ہم آدھی چڑھائی چڑھ چکے تو اچانک زوروں کی بارش شروع ہو گئی اور تیز ہوا چلنے لگی۔ بارش کے چھینٹے ہمارے جسم اور چہروں پر پڑ رہے تھے۔ کچھ کچھ خنکی کا احساس ہونے لگا تھا۔ امثل کے بازوؤں کے روئیں کھڑے ہو گئے تھے۔

اچانک جیپ رک گئی۔۔۔۔ انجن سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ میں بریک لگا کر نیچے اترا۔ بونٹ کھول کر دیکھا۔ فین بیلٹ ٹوٹ گیا تھا۔ انجن بہت گرم ہو گیا تھا۔ ریڈی ایٹر میں سے پانی کے بجائے دھواں نکل رہا تھا۔ میں پلک جھپکتے میں بھیگ گیا۔

امثل نے شیشے پر ہاتھ مار کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ میں قریب گیا تو وہ بولی۔

"بالکل بھیگ گئے ہیں آپ۔ چلئے بیٹھ جائیے۔"

میں سیٹ پر بیٹھ گیا اور انہیں فین بیلٹ ٹوٹنے کی "خوشخبری" سنائی۔ عاطف نے گھبرا کر کہا۔۔۔۔۔

"اب کیا ہو گا۔۔۔۔۔؟"

میں نے کہا۔۔۔۔

"انجن ذرا ٹھنڈا ہو جائے تو ہم چیک پوسٹ تک پہنچ سکتے ہیں۔ آہستہ آہستہ چ
جائیں گے۔"

"اور اس کے بعد------؟" امثل نے پوچھا۔

"فین بیلٹ کے بغیر ہم منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔ البتہ چیک پوسٹ سے فون کرکے ہم گڑھی حبیب اللہ سے فین بیلٹ منگوا سکتے ہیں۔"

"چیک پوسٹ یہاں سے کتنی دور ہوگی.....؟"

"یہی ڈھائی تین فرلانگ۔"

"چلئے بھائی جان-----" امثل بولی----- "وسیم صاحب آپ یہیں ٹھہریں۔ انجن ٹھنڈا ہو جائے تو اوپر آجائیے۔ ہم چیک پوسٹ پہنچ کر ٹیلی فون کرتے ہیں۔"

میں نے ٹوکا۔

"بارش بہت تیز ہے امثل' ابھی آپ نہ جائیں۔"

مگر وہ نیچے اتر گئی۔

"آپ بھی تو بھیگ گئے ہیں۔ آئیے بھائی جان آئیے۔"

پلک جھپکتے میں دونوں بھیگ گئے----- عاطف اکیلا ہوتا تو شاید ایسا نہ کرتا مگر امثل کے سامنے کس کی چلتی تھی۔ وہ اسے کھینچے لئے جا رہی تھی۔ جیپ کے سامنے کے شیشے پر پانی بہہ رہا تھا۔ ان دونوں کے لرزتے مدھم سائے اوپر کو جاتے نظر آ رہے تھے-----

تیز بارش اور ہوا کی وجہ سے چیک پوسٹ کا ٹیلی فون خراب ہو گیا تھا۔ لیکن چیک پوسٹ کے انچارج کو صورتِ حال کا علم ہوا تو اس نے اپنے اختیارات سے تجاوز کر کے فین بیلٹ کے لئے ایک سپاہی موٹر سائیکل پر گڑھی حبیب اللہ بھیج دیا تھا۔

میرا خیال ہے' اس کارروائی میں ہمدردی سے زیادہ امثل کی غیر معمولی شخصیت کو دخل تھا اور کافی کا وہ کپ بھی میں نہیں بھولا تھا' جو مظفر آباد جاتے وقت امثل انچارج دستہ کو پلا گئی تھی-----

چیک پوسٹ کے چھوٹے سے کمرے کے ایک کونے میں آگ جل رہی تھی۔ ایک سپاہی المونیم کی پتیلی میں چائے کے لئے پانی گرم کر رہا تھا۔ ہم تینوں آگ کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ امثل کی ٹھوڑی کپکپا رہی تھی۔

انچارج دستہ اور اس کے ساتھی خاموشی سے چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر میں چائے تیار ہو گئی----- سپاہی پتیلی اٹھا کر اپنے ساتھیوں کی طرف چلا گیا۔ سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس لئے وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہی اپنا مطلب سمجھا سکتے تھے۔

دراصل ان کے پاس چائے کی پیالیاں نہیں تھیں اور وہ متذبذب تھے۔ آخر انچارج بولا۔

"صاحب----- ہم لوگ تو سولجرز ہیں۔ مگوں میں چائے پیتے ہیں۔ آپ-----" مگر امثل نے اس کی بات کاٹ دی-----

"کوئی حرج نہیں بھئی۔ ہم مگ میں بھی پی لیں گے۔"

ان کی مشکل آسان ہو گئی----- سپاہیوں کی اس سادہ سی چائے نے ہمیں انتہائی تقویت پہنچائی----- میں سوچ رہا تھا' اس دستے نے اتنا شاندار سلوک اس سے پہلے کسی سے نہ کیا ہوگا----- ہم تو انہیں یاد رکھیں گے ہی' مگر سپاہیوں کو اس طرح کا رومانی ماحول زندگی میں شاید پہلی اور آخری بار نصیب ہوا ہوگا۔ ہمارے بعد وہ اس واقعہ کا بار بار ذکر کریں گے بلکہ زندگی میں اکثر کرتے رہا کریں گے کہ گیلے کپڑوں میں ملبوس ایک بے مثال لڑکی ان کی چوکی میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ٹھہری تھی اور وہ چوری چوری اس خوبصورت جسم کو دیکھتے رہے تھے' جس سے گیلے کپڑے چپک گئے تھے اور اس سے چاندنی پھوٹی پڑتی تھی۔

"ہاں----- وہ اس حادثہ کو ضرور یاد رکھیں گے۔"

موٹر سائیکل پر گیا ہوا سپاہی واپس آ گیا تھا۔ وہ فین بیلٹ لے آیا تھا۔ بارش اب تھم چکی تھی۔ مگر ٹھنڈی ہوا برابر چل رہی تھی۔ ہمارے کپڑے کچھ گیلے گیلے اور کچھ سوکھ گئے تھے۔ امثل بظاہر خوش تھی اور ہنس رہی تھی مگر اسے سردی لگ رہی تھی۔ کیونکہ اس کی

گردن کارواں رواں کاٹنے ہو رہا تھا۔ دریائے نیلم برابر جھاگ اگل رہا تھا۔ سفید بادل گھاٹیوں میں اتر گئے تھے۔ کالے بادل کی کچھ کچھ ٹکڑیاں ابھی تک آسمان پر اِدھر اُدھر تیر رہی تھیں۔

ہم جیپ میں بیٹھ گئے تو سپاہیوں نے ہمیں فوجی سلیوٹ کیا۔ ان کی آنکھوں میں خوشی مسرت اور حسرت کی ملی جلی کیفیت تھی۔ ہم سب نے بھی الوداعی سلام کیا اور چل پڑے۔

یہاں سے اترائی شروع ہوتی تھی۔ دریائے نیلم پیچھے رہ گیا تھا۔ اب سامنے اور بائیں ہاتھ دریائے کنہار نظر آرہا تھا۔ میں نے امل کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میں سپاہیوں کے سلوک سے بہت متاثر ہوا ہوں۔"

امل بولی——

"تھوڑی دیر کی دوستی میں ہمیشہ خلوص ہوتا ہے۔ جس طرح اوگی کے تھانیدار نے ہماری خدمت کی تھی—— انسان کا اصلی روپ کچھ عرصہ کے بعد سامنے آتا ہے!"

ہوا کی تیزی اور خنکی ہم محسوس کر رہے تھے۔ امل کی کہنیوں تک ننگے بازوؤں پر بھی کانٹے ابھر آئے تھے۔ میں نے کہا۔

"آپ کو سردی لگ رہی ہے؟"

وہ ہنس پڑی—— "ہاں لگ تو رہی ہے۔"

میں نے رومال نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"لیجئے اسے کانوں کے گرد لپیٹ لیجئے۔ گڑھی حبیب اللہ پہنچ کر چائے یا قہوہ پئیں گے تو جسم گرم ہو جائے گا۔"

اس نے رومال لپیٹ لیا تو میں نے پوچھا۔

"خلوص کی عمر اتنی مختصر کیوں ہوتی ہے امل——؟"

"خوشی ہمیشہ مختصر ہوتی ہے۔ بلکہ میں کہتی ہوں، غم بھی مختصر ہوتا ہے۔ کوئی بھی جذبہ مستقل طاری نہیں رہتا، محبت اور خلوص سے زیادہ عمر تو نفرت کی ہوتی ہے۔"

"مگر ایسا کیوں؟ اس کا علاج کیوں نہیں کیا جاتا؟"

"اس کا علاج نہیں ہے۔ اس کا علاج نہیں ہو سکتا۔ کوئی ازم، کوئی طاقت ہمارے جسم میں خون کی روانی کو نہیں روک سکتی۔ یہ غلت ہمارے خون میں ہے۔ فطرت انسانی میں شر کا جزو نسبتاً زیادہ ہے۔"

"آپ کے اس اعتقاد کی بنیاد کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اسے وجدانی اعتقاد کہہ لیجئے۔ میں اس کا پرچار نہیں کرتی اور نہ مجھے کسی کو قائل کرنا ہے—— لوگ اسے غلط بھی کہہ سکتے ہیں، مگر میرا یہی ایمان ہے۔ چھٹی حس کبھی غلط نتیجہ اخذ نہیں کرتی۔"

میں کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ اس کے نازک جسم کی گرمی میرے جسم میں سرایت کر رہی تھی—— غیر شعوری طور پر جیپ کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی—— اب ہم نیچے اتر آئے تھے۔ دریائے کنہار ہمارے ساتھ ساتھ، پہلو بہ پہلو مخالف سمت بہہ رہا تھا۔

عاطف خاموش تھا اور سامنے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"آج کا دن کیسا رہا——؟"

اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا پڑا——

"بارش نے کسی حد تک خراب کیا ورنہ——"

"ورنہ یہ بھی عام دنوں کی طرح ایک دن ہوتا۔" امل اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "بھائی جان بارش ہی کی وجہ سے تو آج کا دن یادگار دن بن گیا۔ سردی لگی، بھیگ گئے اور سپاہیوں نے چائے پلائی۔"

عاطف ہنس پڑا——

"تمہارا نقطہ نظر تو ہمیشہ انوکھا ہی ہوتا ہے۔ کپڑے بھیگ گئے۔ برا حال ہو گیا مگر تمہارے لئے اس میں بھی نیا پن ہے۔"

"اچھا—— ذرا سامنے دیکھئے۔" امل نے بادل کی سفید ٹکڑیوں کی طرف اس کی توجہ مبذول کرائی—— جو بالکل ہماری جیپ کے قریب آگئی تھیں۔ "ایسا نظارہ آپ نے کبھی

دیکھا ہے؟---- اب ہماری جیپ بادلوں میں سے پاس ہو رہی ہے اور ہم خود بھی اس دودھیا دھند میں سے گزر رہے ہیں---- کبھی آپ اس کا تصور بھی کر سکتے تھے----؟ بتایئے آپ----؟ کیا یہ خواب کی سی کیفیت نہیں ہے----؟ اور بارش کے بغیر آپ کو یہ سماں میسر آ سکتا ہے----!"

تھوڑی ہی دیر میں ہم اس حسین پردے سے باہر آ گئے۔

"واہ واہ----!" اس خوشی سے چلائی---- "دیکھئے بھیا آپ کے کان پر جو ننھے ننھے بال ہیں ان پر پانی کے قطرے جم گئے ہیں۔ بادل اپنی نشانی چھوڑ گئے ہیں۔"

پھر یک لخت میری طرف دیکھ کر بولی۔

"ارے آپ بھی----! آپ کے کانوں کے رووں پر بھی ننھے ننھے قطرے جمے ہوئے ہیں!"

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے سیاہ بالوں کے چاروں طرف ہلکی ہلکی پھوار کا ایک ہالہ سا بنا ہوا تھا---- میں ہنس پڑا۔ وہ سمجھ گئی۔ اس نے جلدی سے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اپنی گیلی ہتھیلی دیکھ کر وہ بچوں کی طرح حیران اور خوش ہوئی۔

"ارے واہ---- ہم تو گھٹاؤں سے غسل کر کے نکلے ہیں۔ چٹانوں اور درختوں کی طرح دھل گئے ہیں---- شاید ہمارے گناہ بھی دھل گئے ہوں----؟"

میں نے کہا----

"اگر ایسا منظر کسی کتاب میں پڑھتے تو شاید مشکل سے یقین کرتے۔"

"تمام لکھنے والے بند کمروں میں بیٹھ کر لکھتے ہیں۔" وہ میری بات کے جواب میں بولی۔ "بھلا ایسے مناظر دیکھنے کے نصیب کہاں؟"

میں نے موقع مناسب جان کر کہا۔

"اگر زندگی میں ایسے مناظر دیکھنے متوقع ہوں تو جینے میں کوئی حرج نہیں۔"

وہ ہنس پڑی----

"آپ زندگی کی برتری ثابت کرنے کے لئے ہمیشہ تاک میں رہتے ہیں۔ یہ کوشش

اتنی بری بھی نہیں ہے' لیکن وہ لمحہ ضرور آتا ہے جب انسان خود کو تنہا محسوس کرتا ہے"

"تو پھر کیا کیا جائے؟" میں نے پوچھا---- "اگر تنہائی کا احساس ہو جائے تو پھر انسان کیا کرے۔ مر جائے یا زندہ رہے----؟"

"ارے صاحب---- میں بھی تو زندہ ہوں۔ لیکن کیا فائدہ' میرے ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ زندہ رہنے کا مقصد ہی کیا ہے؟ اور مرنے میں کیا دھرا ہے۔ زندگی کا نام ہی کوئی نہیں بتا سکتا!"

"خدا کی عبادت کرو۔ کیا یہ زندگی کا مقصد نہیں ہے؟" عاطف بولا---- "نیکی کرو۔ دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہو جاؤ۔ کسی کا حق نہ چھینو۔ کیا یہ زندگی کے مقاصد نہیں ہیں؟"

"اچھا----" وہ ہنس پڑی---- "چلو یہی سہی۔ نیکی کریں گے۔ اس کے بعد کیا کریں گے اور اگر ساری دنیا نیک ہو گئی تو پھر کسے حق دلوائیں گے اور کس کے دکھ دور کریں گے شاید پھر تو نیکی کی ضرورت ہی نہ پڑے---- ہاں تو پھر ہم کیا کریں گے----؟ کھائیں گے پئیں گے اور سو جائیں گے---- ہاں---- یہی رہ جائے گا نا زندگی کا مفہوم---- ٹھیک ہے۔ یہ مفہوم تو گیدڑ بھی جانتا ہے' بھیڑیا بھی اور بھیڑ بھی!"

عاطف مسکرایا اور خاموش ہو گیا---- میں نے پوچھا----

"پھر یہ دنیا ہے کیا؟ یہ بے پایاں وسعتیں' غیر محدود جسامتیں' یہ نہ ختم ہونے والے فاصلے' آخر یہ کائنات ہے کیا چیز----؟"

وہ ایک لمحہ کے لئے خاموش ہو گئی---- پھر چونک کر بولی۔

"وہ کسی نے کہا ہے ناکہ اس کائنات کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا' ہر چیز شروع ہے اور ہر چیز آخر ہے!"

وہ پھر خاموش ہو گئی---- تھوڑی دیر بعد جیسے اپنے آپ سے بولی۔

"کائنات ناقابلِ فہم ہونے کے باوجود انتہائی مربوط اور منظم ہے' مگر سوال یہ ہے کہ یہ

ہے کیوں ــــــ؟ اس کی ضرورت کیا تھی ــــــ؟ ہم پتھر کیوں نہیں؟ ہمارے اندر احساس کیوں موجود ہے کہ ہم اس کے پیچ و خم کو سمجھیں ــــــ؟"

"امل!" اس کی باتوں سے مجھے پھر ایک راہ مل گئی ــــــ "دراصل یہ احساس زندگی ہے۔ یہ احساس ہی ہمیں آگے بڑھاتا ہے۔ حرکت ہی حیات ہے۔ یہ احساس ختم جائے گا تو ہر چیز ختم ہو جائے گی۔ توقف' موت ہے۔"

امل نے کوئی اثر نہ لیا۔ بولی۔

"آپ کتنے ہی دوڑتے رہیں۔ سب بے کار ہے۔ چاند کا طلسم ٹوٹنے کے بعد میں ا زیادہ مایوس ہو گئی ہوں۔ انسان آخر ڈھونڈ کیا رہا ہے۔ چاند کی ویرانی کی خبر کو اگر آ حرکت ملتے ہیں تو اس سے بڑی بدقسمتی انسان کی اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ بالکل ہی تھا گیا ہے۔ کیا یہ بات آپ کی سمجھ میں نہیں آتی کہ مریخ کے ویرانے کی خبر پا کر آپ بالکل تہی دامن ہو جائیں گے!"

اللہ ــــــ میں اس عجیب و غریب لڑکی کا کیا کروں۔ اب چاند سے پیت لگتے سکتی ــــــ؟ میں اس کو رد بھی نہیں کر سکتا۔ چاند ویرانہ سہی' مگر اس کی چاندنی اب دلفریب ہے ــــــ!

میں کیا کہوں اس لڑکی سے ــــــ!

اس لمحے اس نے اچانک میری طرف دیکھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں۔ وسیم صاحب ــــــ؟"

میں ہنس پڑا' اسٹیرنگ پر میرے ہاتھوں کی گرفت مضبوط ہو گئی ــــــ

"میں سوچ رہا ہوں ــــــ کاش' میں ایک بار چاند پر جا سکوں' میں اس ویرانے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں اس پر چہل قدمی کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے مہیب غاروں میں جھانکنا چاہتا ہوں۔ ہر چہ بادا باد ــــــ اس کے بعد مرنے کا افسوس نہ ہو گا!"

"آپ وہی ہیں جو آپ ہیں ــــــ!" وہ ہنس کر بولی ــــــ "پہاڑ اپنی جگہ سے ہل سکتا ہے' مگر انسان اپنی غرض سے نہیں ہٹ سکتا ــــــ اسی بے خبری کا نام زندگی ہے۔ لوگ

کتنے بیوقوف ہوتے ہیں!"

"تم ایک سانس میں دوسروں کی دل آزاری کر دیتی ہو امتی۔" عاطف نے اسے ٹوکا ــــــ "تم کیوں اپنے نتیجہ اور تکلیف دہ بحث و مباحثے میں الجھ کر دوسروں کے اعصاب ناکارہ کر دیتی ہو ــــــ؟ ہر آدمی کو اپنے طور پر سوچنے کا حق ہے۔ تم دوسروں کی سوچ و بچار تک کو شل کر دیتی ہو اور لوگوں کو خواہ مخواہ شک و شبہ کے ویرانوں میں چھوڑ آتی ہو ــــــ!"

"لیجئے ــــــ لوگ اتنے بیوقوف ہیں کہ میری باتیں مان جاتے ہیں۔ پھر تو ٹھیک ہے۔ بہت اچھی بات ہے ــــــ مگر بھیا' آپ میری سوچوں پر قید کیوں لگاتے ہیں۔ میں دل کی بات دل میں نہیں رکھتی۔ رکھ ہی نہیں سکتی۔ یہ میری فطرت ہے۔ وسیم صاحب جس انداز میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کریں گے' میں تو برابر سنوں گی۔ برا کیوں مانوں گی۔ کیوں وسیم صاحب' میری باتوں سے آپ کے اعصاب ناکارہ ہو گئے ہیں ــــــ؟"

میں ہنس پڑا ــــــ

"اعصاب ناکارہ تو نہیں ہوئے' البتہ اعصاب پر بوجھ ضرور پڑا ہے۔ کیونکہ آپ کی باتیں سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ پہلے میں ایک ہی رخ پر سوچتا تھا۔ آپ نے میرے دماغ کی بہت سی کھڑکیاں کھول دی ہیں۔ مجھے تو آپ کا ممنون ہونا چاہیے۔"

"لیجئے بھیا ــــــ اب بولیے۔"

عاطف بھی ہنس پڑا ــــــ

"تو پھر میرے ہی اعصاب ناکارہ ہوتے جا رہے ہیں۔ کم از کم مجھے تو تم نے مخمصے میں ڈال دیا ہے۔"

"آپ جیسے دنیا دار آدمی کو اگر میں مخمصے میں ڈال سکتی ہوں' پھر تو میں سمجھدار لڑکی ہوں ــــــ لیکن سب فضول ہے۔ دنیا داری میں کیا دھرا ہے اور سمجھداری تو سرے سے ہے ہی کچھ نہیں ــــــ بے کار شے!"

"کوئی شے آپ کی نظر میں ایسی بھی ہے' جو بے کار نہ ہو ــــــ؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں کیوں نہیں۔ ٹھنڈا پانی حلق سے اترتا ہے' تو کتنا اچھا لگتا ہے۔ ہوا کا ٹھنڈا جھونکا کتنی راحت بخشتا ہے ---- ویسے یہ سوال آپ نے پہلے بھی پوچھا تھا اور میں نے حسب توفیق جواب دیا تھا۔ آپ بھول کیوں جاتے ہیں۔ اب میں بار بار امتحان دینے سے تو رہی۔"

"امتحان تو ہم دے رہے ہیں۔ آپ تو ممتحن ہیں۔"

"نہیں صاحب ---- مجھے ایسا کوئی شوق نہیں۔"

عاطف نے کہا ----

"ہاں۔ تمہیں تو کوئی شوق نہیں' مگر اب سردی سے کانپ رہی ہو۔ بارش میں پیدل چوکی تک پہنچنا کیا بہت ضروری تھا ----؟"

واقعی اسے سردی لگ رہی تھی۔ گڑھی حبیب اللہ پہنچ کر ہم نے گرم گرم چائے پی۔ تھرماس میں بھی چائے بھرلی ----

دریائے کنہار کا پل عبور کر کے جب ہم بٹراسی کی چڑھائی چڑھنے لگے تو اصل بولی۔

"کل کاغان چلیں گے۔ بالاکوٹ بھی دیکھیں گے اور ہاں دیکھنے والی جگہ تو جھیل سیف الملوک ہے۔"

"بٹراسی کی چڑھائی چڑھ کر میں نے دوبارہ چائے کے لئے پوچھا کیونکہ اوپر ہوا اور زیادہ ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اصل بولی۔

"اب مانسہرہ پہنچ کر چائے پئیں گے۔"

مانسہرہ ہم تقریباً آٹھ بجے پہنچ گئے ---- عاطف اور میں نے سامان اتارا ---- اصل اپنے کمرے میں چلی گئی۔

آج ہماری رفاقت کا چوتھا دن تھا' مگر میں ایسا محسوس کر رہا تھا کہ اٹھائیس برس یونہی بیت گئے۔ اصل زندگی اب شروع ہوئی ہے!

رات کو میں بستر میں لیٹ گیا تو گزشتہ چار دن کی باتیں تصویروں کی طرح میرے تصور میں آتی رہیں۔ میں جوں جوں اس سے متاثر ہوتا جا رہا تھا' توں توں اپنے آپ کو کم محسوس کر رہا تھا ---- پہلے دن جتنا دلیر تھا' دوسرے دن اتنا نہیں تھا۔ تیسرے دن اس سے کم اور چوتھے دن اس سے بھی کم ----!

پہلے دن میرا رویہ یہ تھا کہ اگر وہ عجیب و غریب ہے تو میں عجیب تر ---- لیکن پہلے ہی دن سورج غروب ہونے سے پہلے مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ میں نے تو خواہ مخواہ خود کو انوکھا تصور کر رکھا ہے ---- اصل حقیقت یہ لڑکی ہے۔ یہ عجیب و غریب نہیں ہے۔ غیر معمولی ہے ---- اٹھائیس برس میں میں نے اتنا خوبصورت کردار نہیں دیکھا تھا۔

لیکن خاص بات تو یہ ہے کہ یہ لوگ میرے مستقل ساتھی نہیں ہیں۔ چار دن کی شناسائی ہے۔ نہ جانے کس لمحے یہ لاابالی لڑکی مجھے تنہا چھوڑ کر چلی جائے۔ میں سوچ رہا تھا۔ تب کیا ہو گا؟

یہ چھوٹی سی خوبصورت ناک پھر کہاں نظر آئے گی۔ ایسا منفرد ذہن پھر کہاں پاؤں گا۔ بالکل اچانک اور غیر متوقع چونکا دینے والی باتیں کون سنائے گا ----؟

یہ بات میرے دل میں گھر کر گئی تھی کہ جس رنگ میں بھی ہو' اس لڑکی کی قربت زندگی کی سب سے بڑی عنایت ہے ---- اچھی خوراک' اچھی پوشاک' اچھی رہائش'

جائیداد' روپیہ' شہرت' سب کچھ امل کی قربت کے مقابلے میں ہیچ ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن یہ کہاں تک میرے بس میں ہے کہ اس سے دور نہ رہوں۔

میں حیران تھا کہ چاہنے والوں اور دانش وروں کا جم غفیر اس کے ساتھ کیوں نہیں تھا۔۔۔۔؟

رات کے تقریباً ساڑھے بارہ بجے تھے۔ میں سو گیا تھا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں اٹھا' بتی جلائی۔ دروازہ کھولنے سے پہلے پوچھا۔

"کون صاحب ہیں۔۔۔۔۔؟"

"میں ہوں وسیم صاحب۔" یہ عاطف کی آواز تھی۔۔۔۔۔ جلدی سے بولٹ کھولا۔ عاطف گھبرایا ہوا تھا۔ خانساماں بھی ساتھ تھا۔

"خیریت ہے۔۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"امی کے سینے میں سخت درد ہے۔ میں ڈاکٹر کو لینے جا رہا ہوں۔ آپ تھوڑی دیر امی کے پاس بیٹھیں۔" میں اور کچھ نہ کہہ سکا۔

وہ لوگ موٹر میں بیٹھ کر چلے گئے۔ میں بالکل بوکھلا گیا تھا۔ ایک دو لمحے مبہوت کھڑا رہا۔ پھر گاؤن پہن کر' دھڑکتے دل کے ساتھ امل کے کمرے میں چلا گیا۔

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ سیدھی لیٹی ہوئی تھی اور اس کا سانس رک رک کر آ رہا تھا۔ میں چند لمحے خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ پھر کرسی کھینچ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ نبض دیکھی معمول سے تیز تھی۔ اسے بخار تھا۔

اس کی ننھی سی ناک کے پھول جیسے نازک نازک' نرم نرم نتھنے' تیزی سے اوپر نیچے ہو رہے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں اسے نہایت ہی قریب سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی مڑی ہوئی بند پلکیں' چھوٹی سی ٹھوڑی اور چمکتی ہوئی خوبصورت پیشانی اور وہ سرخ انگور کے دانے کی طرح رس بھرا ہونٹ۔۔۔۔۔!

میں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ اس کا جسم تپ رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اس کی پیشانی دبانے لگا۔ اس عمل سے مجھے روحانی مسرت محسوس ہوئی اور اپنائیت کا شگفتہ

احساس۔

باہر موٹر آ کر رکی۔۔۔۔۔ ڈاکٹر آ گیا تھا۔ ادھیڑ عمر کا یہ ڈاکٹر مانسہرہ کے سول ہسپتال کا انچارج تھا۔۔۔۔۔ امل بے خبر پڑی رہی۔ ڈاکٹر نے نہایت توجہ سے معائنہ کیا۔ انجکشن لگا کر بولا۔ "سردی لگ گئی ہے' لیکن اچھا ہوا کہ آپ نے صبح ہونے سے پہلے مجھے بلا لیا۔ انشاء اللہ تین چار گھنٹوں میں ان کی حالت معمول پر آ جائے گی۔ صبح ایک انجکشن اور لگانا پڑے گا۔"

ڈاکٹر کو چھوڑ کر عاطف واپس آیا تو میرا شکریہ ادا کرنے لگا۔

"بس وسیم صاحب۔ اب آپ آرام کریں۔ بہت بہت شکریہ۔ تکلیف کی معافی چاہتا ہوں۔"

مگر میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں آدھی نیند سو چکا ہوں عاطف صاحب۔ البتہ آپ نہیں سوئے۔ میں یہیں بیٹھوں گا اور صبح تک جاگوں گا۔ آپ آرام کریں۔ میں نے صبح تک یہ کتاب ختم کرنی ہے۔"

میرے مزید اصرار پر عاطف خاموش ہو کر اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک کونے میں اعلیٰ کوالٹی کے چار اٹیچی کیس پڑے ہوئے تھے۔ دونوں بہن بھائیوں کے دن کو پہنے ہوئے کپڑے ایک اسٹینڈ پر بے ترتیبی سے رکھے ہوئے تھے۔۔۔۔۔ دیوار گیر پر دو خوبصورت جھولے اور عاطف کا پستول لٹک رہا تھا۔ اس کے بالکل نیچے فرش پر بہن بھائی کے جوتوں کی لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔

کارنس پر سرخ گلاب کے تازہ پھولوں کا گلدستہ سجا ہوا تھا۔ صوفہ اور کرسیاں وہی تھیں جو میرے کمرے میں بھی لگی ہوئی تھیں۔

یہ سب کمرے ایک جیسے تھے۔۔۔۔۔ البتہ اس کمرے میں بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ شاید یہ ایک بے مثال عورت کے وجود کی حرارت تھی۔

عاطف سو گیا تو میری نظریں بے اختیار امل کے ان کپڑوں کی طرف اٹھیں جو اسٹینڈ پر پڑے تھے۔ ایک نامعلوم خوف اور ڈر کے باوجود میں نے اس کی قمیص اٹھائی۔۔۔۔۔ میرے

رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور میری کیفیت ایسی ہو گئی جیسے انسان زندگی میں پہلی بار اپنے محبوب کو چوری چھپے چھو رہا ہو۔۔۔۔!

اس قمیص میں محبوب کے بوسے کی طرح تسکین تھی اور اس سے وہی حرارت پھوٹ رہی تھی' جو جوان عورت کے وجود کا خاصا ہوتا ہے۔ میں نے دیوانوں کی طرح اس قمیص کو ہونٹوں' پلکوں اور گالوں سے لگایا۔ اس میں ایسی گرمی اور مہک تھی۔۔۔۔ کہ ایک عجیب کیفیت سے میرا جسم کانپنے لگ گیا۔

عین اس لمحے عاطف نے کروٹ بدلی۔ میں نے جھٹ سے قمیص اسٹینڈ پر پھینک دی۔ یہ قطعی غیر شعوری حرکت تھی۔۔۔۔ عاطف سو رہا تھا' مگر مجھے یوں لگا جیسے چور رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا ہو۔

کس قدر متضاد کیفیتوں کی آماجگاہ ہے انسان کا ذہن!

تسکین و تسلی' خوف اور ڈر' لذت اور ندامت' پلک جھپکتے میں زندگی کیا کیا روپ دکھاتی ہے۔۔۔۔!

کافی دیر بعد میری حالت سنبھلی۔۔۔۔ سامنے وہی روشن پیشانی تھی۔ وہی پسندیدہ ناک اور زرد گال اور شانوں پر بکھری ہوئی زلفیں۔۔۔۔

یہ ایک عجیب رات تھی۔

سہاگ رات تو ہر آدمی کی زندگی میں آجاتی ہے' مگر ایسی رات شاید لاکھوں سالوں بعد ہی کسی کے نصیبوں میں آتی ہو گی۔۔۔۔ محبوب پاس ہو' مگر صرف دیکھنے کے لئے' جی بھر کر دیکھو۔ اتنا دیکھو کہ روح میں گھلا دو تاکہ اگر کل وہ چلا جائے تو یہ احساس نہ ہو کہ وہ نہیں ہے کیونکہ وہ روح میں موجود ہے!

واقعی یہ ایسی ہی رات تھی' جو انسان کی فطرت کی تاریخ مرتب کرتی ہے اور اس کی سرشت کی جزئیات کے ایک ایک گوشے کو روشن کرتی ہے۔

میں تو کہہ سکتا ہوں اور بڑے دعوے اور فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ انسانی تاریخ میں ایسی رات صرف مجھے ہی نصیب ہوئی ہے۔

میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس میں کھو گیا تھا۔ اس کا جسم دو کمبلوں میں چھپا ہوا تھا' صرف اس کا چہرہ کھلا تھا۔ وہ معصوم چہرہ جو دیکھنے میں صرف سولہ سترہ سال کا لگتا تھا۔

یہ انوکھی سی تیمارداری تھی۔ چار دن کے ساتھ نے مجھے یہ حق دے دیا تھا کہ رات بھر اس کے پاس بیٹھا رہوں اور جی بھر کر دیکھتا رہوں۔۔۔۔ ان لمحوں میں میرے دل میں کسی قسم کی ترغیب نہیں تھی۔ بس ایک سچی محبت کا پرتو تھا۔

میں گمبھیر تھا اور سرشار تھا اور ایک انجانی سی مدھر ترنگ میں مدہوش تھا۔ یہی وہ رات تھی کہ محبت اور نیکی نے مجھے اپنی پناہ میں لے رکھا تھا۔ میں اپنے دل اور وجود میں ایک نئی قسم کی تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔

میں اب پہلے جیسا خود غرض آدمی نہیں رہا تھا۔

قطرہ' قطرہ' جرعہ جرعہ' لمحہ لمحہ رات بیت رہی تھی۔ ہر قطرے' ہر جرعے اور ہر لمحے کا ذائقہ خوب سے خوب تر تھا۔۔۔۔ ایک پل "دوسرا پل" ہر پل میں ایک نیا احساس۔۔۔۔ اور اس کی نازک پھول کی پنکھڑی جیسے نتھنوں کی ہر حرکت میں ایک مدھر سندیسہ۔۔۔۔

یہ تھی محبت۔۔۔۔!

یہ تھا جیون کا گداز۔۔۔۔!!

اور یوں صبح ہو گئی۔

مگر یہ میری صبح تھی۔۔۔۔ عاطف سو رہا تھا۔ امل بھی سو رہی تھی۔ میں سرشار دل کے ساتھ اٹھا۔۔۔۔ چند لمحے ایک وجدانی کیفیت' ایک خود فراموشانہ محویت اور شیفتگی سے اسے دیکھتا رہا۔۔۔۔ ایک نظر عاطف پر ڈالی۔ پھر دوبارہ نگاہیں اس عدیم المثال لڑکی پر جم گئیں' جو معصوم بچے کی طرح بے خبر سو رہی تھی۔ میں اس پر جھکا اور بڑی عقیدت سے اس کی پیشانی چوم لی۔ اس لمحے کوئی خوف میرے دل میں نہیں تھا اور میں پھول کی طرح ہلکا پھلکا تھا۔

دروازہ کھولا۔ باہر جانے سے پہلے مڑ کر دیکھا اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔

امل کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔۔۔۔!

میں کچھ نہ بولا...... بول ہی نہ سکا۔ وہ برابر تکے جا رہی تھی۔ یہ عجیب سی ٹکٹکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کوئی جذبہ نہیں تھا...... اس کی نظروں میں نہ محبت تھی' نہ نفرت تھی' البتہ ان میں ایک ٹھہراؤ سا تھا...... لیکن اس کے کوئی معنی نہیں تھے۔ بس یہ خلا خلا نظریں تھیں۔

میں بوکھلا سا گیا...... مگر خوف زدہ نہیں تھا۔ کیونکہ میں امثل کے کردار کو سمجھتا تھا۔ اگر وہ میری اس حرکت پر ناراض ہوتی تو بلا تامل اس کا اظہار کر سکتی تھی' مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ میری حرکت اس کے نزدیک پسندیدہ بھی تھی۔

میں زیادہ دیر وہاں نہ ٹھہر سکا اور چپکے سے چلا آیا۔

نہا دھو کر ناشتہ کر رہا تھا کہ عاطف آ گیا۔ میں نے امثل کی طبیعت کا پوچھا' تو وہ بولا۔

"امثی نے ایک عجیب شوشہ چھوڑ دیا ہے۔"

"کیا؟" میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"کہتی ہے میں کراچی جاؤں گی۔ آج ہی واپسی کے لئے کہہ رہی ہے۔"

میرا دل ڈوب سا گیا۔ میں حیرت سے عاطف کو دیکھ رہا تھا۔

"جانا ہی پڑے گا۔" عاطف بے دلی سے بولا...... "وہ اپنی بات منوا کر چھوڑتی ہے۔"

"مگر کاغان...... جھیل سیف الملوک......"

"میں نے بھی کہا تھا۔" عاطف میری بات کاٹ کر بولا...... "مگر وہ کہتی ہے اگلے سال چلے جائیں گے اور اگر بہت شوق ہے تو میں چلا جاؤں۔ وہ کراچی اکیلی چلی جائے گی!"

"مگر میں یہاں اکیلا کیا کروں گا۔ آپ لوگوں کے بغیر یہاں میرا جی کیسے لگے گا؟" یہ میں نے ایسے کہا جیسے مجھ پر بڑا ظلم ہو رہا ہے۔

"مجھے بہت افسوس ہے وسیم صاحب۔ مگر میں کیا کروں۔ میں بہت مجبور ہوں۔ میں امثی کی کوئی بات رد نہیں کر سکتا۔"

بات ختم ہو چکی تھی۔

دوپہر کو وہ لوگ چلے گئے۔ راولپنڈی سے انہوں نے جہاز پر بیٹھنا تھا۔ میرا سارا دن ااک بنگلے میں گزرا۔

ہاں...... تو یوں لوگ ملتے اور بچھڑ جاتے ہیں...... اور باؤلے کتے کی طرح آدمی کو کچھ سجھائی نہیں دیتا۔

رات اور پھر اگلے دن بھی میں بہت پریشان رہا۔ باہر بھی نہ جا سکا۔ ایک تو یوں بچھڑ جانے کا غم اور اس پر یہ پریشانی کہ اس کے جانے کی وجہ کہیں یہ نہ ہو...... کہ میں نے اس کی پیشانی کو چوما تھا۔

کوئی اور وجہ ہو بھی کیا سکتی تھی۔ یوں اچانک فیصلہ اور پھر جاتے وقت اس کے رویے میں کھنچی کھنچی سی اجنبیت...... سب باتیں ایسی تھیں کہ ہر لحہ میری وحشت میں اضافہ ہو رہا تھا۔

میں...... جو عورت کا اچھی طرح سے واقف تھا' جو میرے لئے غیر معمولی اور اہم چیز نہیں تھی' چار دن پہلے ایک ایسی عورت سے ملا جس نے میری سوچ بچار ہی نہیں' میری دنیا ہی بدل ڈالی تھی۔

میں اس قدر جلد اور فوری طور پر زندگی میں کسی سے متاثر نہیں ہوا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ مجھے ان کے جانے کا بے حد صدمہ ہوا تھا اور اب یہ مشکل میرے سامنے تھی کہ آئندہ زندگی کا پروگرام کیا ہو گا؟

امثل جو اثر چھوڑ گئی تھی' وہ ملک اور بیرونِ ملک کی سیاحت سے کیا زائل ہو جائے گا؟

لیکن مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ یہ ایک قسم کی سطحی سی کوشش ضرور ہو گی۔ میں چند دن یا چند مہینے اپنے آپ کو مصروف رکھ سکتا ہوں۔ مگر امثل جو نہ صرف میرے دل میں گھر کر چکی ہے' بلکہ شعور میں بھی اتر چکی ہے' شاید ہی میرے ذہن اور روح سے نکل سکے......!

مگر سوال یہ تھا کہ میں کیونکر اس کا پیچھا کر سکتا ہوں اور کیونکر اسے حاصل کر سکتا

ہوں۔ ایسی خود سر اور خود رائے لڑکی کو اپنے ڈھب پر لانا مذاق نہیں تھا۔۔۔۔ محبت لالچ، دولت، ہر قسم کی ترغیب امل جیسی لڑکی کے لئے بے کار تھی۔

تین دن اور تین راتیں اسی کشمکش میں گزر گئیں۔

آخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ حتی الامکان میں اس بے مثال لڑکی کا پیچھا کروں گا، بری نیت سے نہیں، بس اس کا قرب جس شکل میں بھی ملے، میرے لئے عین سعادت ہے!

چنانچہ اگلے دن سامان باندھا اور شام تک میں لاہور پہنچ گیا۔۔۔۔ شہروں کا خوبصورت شہر لاہور۔ لاکھوں کی آبادی کا شہر مجھے سونا سونا لگا۔ میں ہمیشہ سے لاہور کو کراچی پر ترجیح د رہا تھا۔۔۔۔ مگر آج کراچی میں لاہور سے زیادہ کشش تھی۔ وہاں اس صدی کی ایک چنچل روح رہتی تھی، جس کا درد سمجھنے والا کوئی نہ تھا۔

اگلے دن ہوائی جہاز سے کراچی پہنچ گیا۔ رات کو تقریباً نو بجے ہوٹل سے عاطف کو فون کیا۔ عاطف گھر پر نہیں تھا۔ کوئی ملازم بول رہا تھا۔ امل کا پوچھا تو وہ بولا۔

"ہاں صاحب، وہ تو ہیں، مگر ان سے کون کہے، وہ کسی سے ٹیلی فون پر بات کرنا پسند نہیں کرتیں۔"

میں نے کہا۔۔۔۔

"تم اسے میرا نام بتا دینا۔ میں وسیم بول رہا ہوں۔"

ملازم بولا۔۔۔۔

"جناب۔۔۔۔ میں چھ سال سے ان کا ملازم ہوں۔ میں ان کا مزاج جانتا ہوں۔ نوکری کا معاملہ ہے۔ براہ کرم میرے حال پر رحم کیجئے۔"

میں ہنس پڑا۔۔۔۔

"دیکھو بھائی۔ تمہاری نوکری کا ذمہ ہم لیتے ہیں۔ بس تم اتنا کہہ دو کہ مانسہرہ والے وسیم کا فون ہے۔"

"اچھا صاحب۔۔۔۔!" ملازم نے ٹھنڈی آہ بھری۔۔۔۔ "یہ بھی کر دیکھتے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد امل کی آواز سنائی دی۔۔۔۔

"ارے وسیم صاحب۔۔۔۔ کب آئے؟۔۔۔۔ ہوٹل میں کیوں ٹھہر گئے۔۔۔۔؟ نہیں صاحب نہیں۔۔۔۔ میں موٹر بھیج رہی ہوں۔ فوراً چلے آیئے۔۔۔۔ بھائی جان بھی آنے والے ہیں۔۔۔۔ ہاں ہاں۔۔۔۔ ہاں تو بس آ جایئے۔۔۔۔ سامان بھی ساتھ لے آیئے!"

جو کچھ سنا یقین نہیں آ رہا تھا۔ حیرت اور مسرت کی بے پناہ یلغار نے مجھے جذباتی بنا دیا تھا۔۔۔۔ ایسا لگ رہا تھا، جیسے کسی نے خوشی کے ان گنت جام میری روح میں انڈیل دیئے ہوں۔

یہ خوشی ان تمام خوشیوں سے مختلف تھی، جو زندگی کی اٹھائیس بہاروں میں وقتاً فوقتاً میں نے دیکھی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد ان کی کریم کلر کی مرسڈیز کار مجھے ان کے گھر، ہاؤسنگ سوسائٹی کی طرف لے جا رہی تھی۔

جب کار ایک خوبصورت کوٹھی کے کشادہ اور وسیع لان میں داخل ہوئی تو میرا دل ایک بار پھر زور سے دھڑکا۔ امل رات کے کپڑوں پر چاکلیٹی رنگ کا خوبصورت ریشمی گاؤن پہنے منتظر کھڑی تھی۔۔۔۔ میرے نزدیک یہ ایک عظیم انقلاب تھا۔۔۔۔ کہ امل جیسی بے نیاز لڑکی میزبانی کے فرائض سے بھی عہدہ برآ ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اس طرح کے بناوٹی اور سماجی ربط و ضبط کی وہ سرے سے قائل ہی نہیں تھی۔

میں موٹر سے اترا۔۔۔۔ وہ مسکرائی۔

پورے چھ دن بعد میں نے وہ من موہنی صورت پھر دیکھی۔

وہی شانوں کو چھوتے ہوئے سیاہ بال، وہی بے قرار آنکھیں، وہی ننھی منی ناک اور انگور کے سرخ دانے کی طرح رس بھرا ہونٹ اور اس پر چھوٹی چھوٹی عمودی لکیریں۔۔۔۔!

اس نے اپنا نازک ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ اس میں خلوص اور گرمی تھی۔ میری دل کے گوشے تک اس کی حرارت پہنچی۔

ان کا خوبصورت ڈرائینگ روم دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ انتہائی سادہ مگر انتہائی پُروقار
ایسا سلیقہ کم دیکھنے میں آتا ہے۔۔۔۔۔ ہمارے بیٹھتے ہی کافی آ گئی۔۔۔۔۔ کافی لانے والے
ملازم نے مجھے کنکھیوں سے دیکھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ ٹیلی فون اسی نے سنا تھا۔

کافی بناتے ہوئے امثل بولی۔۔۔۔۔

"بھائی جان سے اکثر باتیں ہوتی رہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم نے آپ کو بہت مس کیا ہے!"

"مگر مجھے تو آنا ہی تھا۔۔۔۔۔!"

امثل قہقہہ لگا کر ہنسی۔ کافی کا پیالہ دیتے ہوئے بولی۔

"ہم سوچتے تھے' یہاں کیوں آ گئے اور اگر آ گئے' تو آپ کو آخر کیوں نہ دیا۔۔۔۔۔؟"

"میں سوچ رہا تھا آپ نے مجھے چھوڑ دیا' مگر میں تو آپ کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" وہ اور زور سے ہنسی۔۔۔۔ "ہم جیسے لوگوں کی کم از کم ایک قدر مشترک ہے کہ باپ دادا کی چھوڑی ہوئی دولت کیسے خرچ کریں؟"

اتنے میں عاطف بھی آ گیا۔ مجھے دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ بے اختیار بغل گیر ہوا اور حیرت سے بولا۔

"کب آئے آپ؟"

"تین چار گھنٹے ہوئے۔"

"بھائی جان۔" امثل بیچ میں بول پڑی۔۔۔۔۔ "یہ تو ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ فون پر معلوم ہوا تو میں نے بلا لیا۔"

"بہت خوب۔" عاطف نے تائید کی۔۔۔۔۔ "بھئی آپ کی کمی ہم لوگوں نے بے حد محسوس کی۔ ہمارا خیال ہے کہ اب تک جتنے لوگ ہمیں ملے ہیں' آپ ان سب سے ۔۔۔ ہیں!"

"شکریہ جناب عاطف' شکریہ۔"

"ہم مذاق نہیں کر رہے۔ امثی کا بھی یہی خیال ہے۔"

"ہاں ہاں۔۔۔۔۔ میں تو ایک دن میں آدمی سے بور ہو جاتی ہوں۔ آپ کے ساتھ چار دن میں بھی بور نہیں ہوئی۔"

"اچھا۔۔۔۔ تو پھر میں خدا کو مانتا ہوں۔۔۔۔۔!"

وہ دونوں ہنس پڑے۔ امثل نے پوچھا۔

"ہمارے آنے کے بعد آپ مانسہرہ میں کتنے دن رہے؟"

"تین دن۔۔۔۔ میرا بھی وہاں دل نہیں لگا۔۔۔۔۔ عجیب بات ہے۔ میں مہینوں اکیلے رہنے کا عادی ہوں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے ساتھیوں سے بچھڑ جانے کا دکھ ہوا۔۔۔۔۔!"

"کوئٹہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" امثل نے پوچھا۔۔۔۔ "کراچی میں ابھی تو کافی دن گرمی رہے گی؟"

"میں کوئٹہ نہیں گیا۔ لیکن مقصد گھومنے پھرنے سے ہے۔ اِدھر نہ سہی اُدھر سہی۔"

"ٹھیک ہے۔ بھائی جان دو چار دنوں میں اپنے کاموں سے فارغ ہو جائیں گے' پھر کوئٹہ ہی کا پروگرام بناتے ہیں۔"

عاطف نے کہا۔۔۔۔۔

"اچھا بھئی۔ یہ پروگرام تو اب بنتے ہی رہیں گے۔ کھانے کا کیا پروگرام ہے۔ مجھے بھوک لگی ہے۔"

"میں تو کھا چکا ہوں۔"

"تو پھر آپ لوگ بیٹھیں۔ میں کھانا کھاتا ہوں۔ اس کے بعد برج وغیرہ کھیلنا ہو تو بیٹھ جائیں گے۔"

عاطف چلا گیا۔ امثل نے پوچھا۔

"کیا کھیلیں گے۔۔۔۔۔؟ کیرم' شطرنج یا برج؟"

میں نے مسکرا کر کہا۔۔۔۔

"کوئی ایسا کھیل کھیلیں' جس میں مجھے ہارنا پڑ جائے۔۔۔۔۔!"

"یہ آدمی بھی عجیب ہے۔" وہ طنزیہ انداز میں مسکرائی۔۔۔۔۔ "ذہین سے ذہین اور

معقول سے معقول آدمی پر بھی جذبات کا دورہ پڑتا ہے تو بالکل احمقوں کی طرح لگتا ہے نہ جانے آدمیوں کو اپنی حماقتوں کا احساس کیوں نہیں ہوتا۔"

"جذباتی سچائیوں کو آپ حماقتیں کہتی ہیں؟"

"کونسی جذباتی سچائیاں۔۔۔۔؟" اس کی متجسس آنکھیں اور زیادہ پھیل گئیں۔۔۔ "اپنے خون کے ابال کو آپ سچائی کہتے ہیں۔ خوبصورت آنکھوں اور خوبصورت جسم کی کشش کو آپ جذباتی سچائی سمجھتے ہیں۔۔۔ نہیں وسیم صاحب نہیں' یہ اپنا ہی روگ ہوتا ہے۔ جب خوبصورت آنکھوں کے سرخ ڈورے اور حسین جسم کا تناسب ختم ہو جاتا ہے' تو جذباتی سچائیاں بھی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی ہیں۔"

"مگر کیوں۔۔۔۔؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ قانون فطرت ہے۔ یہ دنیا اسی طرح نامکمل رہے گی۔"

"اس کا فائدہ۔۔۔۔؟"

"آپ فائدہ ڈھونڈ رہے ہیں' اس کا تو کوئی مقصد ہی نہیں۔ کیڑے مکوڑوں کی طرح لاکھوں انسان' طاعون یا ہیضے کے ایک ہی حملے سے ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ آپ اکیلے ایک دل کی بات کرتے ہیں' لیکن پلک جھپکنے میں لاکھوں دل خاک ہو جاتے ہیں۔ اب اس کا جواز ڈھونڈنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔۔۔ دریاؤں کا پانی کنارے سے اچھل جاتا ہے' تو اس کا کوئی مقصد نہیں ہوتا لیکن سینکڑوں انسانوں اور مویشیوں کو بہا کر لے جاتا ہے اور ساحلوں پر سونا اگلنے والی مٹی پھینک جاتا ہے۔ یوں لوگ اپنے اپنے طور سے مقصد متعین کرتے ہیں۔ صدیوں سے ہم ایسی حماقتوں میں مبتلا ہیں۔"

میں گہری اور عقیدت مند نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس سے متفق نہ ہونے کے باوجود اس کی باتیں مجھے اچھی لگتی تھیں۔۔۔ اتنے میں عاطف بھی آگیا۔

"ہاں بھئی تو پھر کیا سوچا ہے۔ ان ڈور گیم کھیلیں گے' کوئی فلم دیکھیں گے یا باہر گھومنے جائیں گے۔"

"میں تو سونے لگی ہوں۔" امل اٹھ کھڑی ہوئی۔ "البتہ کل کے پروگرام میں پورا

ساتھ دوں گی۔"

وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔۔۔ عاطف نے مجھے سونے کا کمرہ دکھایا۔ اس کے بعد ہم لان چلے گئے۔۔۔ گلشن میں رات گئے تک موٹریں آتی جاتی رہتی ہیں۔ کچھ لوگ موٹروں سے اتر کر ادھر ادھر سیر کرتے ہیں۔ کچھ موٹروں میں بیٹھ کر چائے' ٹھنڈا یا آئس کریم سے دل بہلاتے ہیں۔ کچھ لوگ شراب سے شغل کرتے ہیں۔ جب بور ہو جاتے ہیں تو چلے جاتے ہیں۔ اگر چاندنی راتیں ہوں تو چار آٹھ آنے دے کر آپ دوربین سے دور ستاروں کا مشاہدہ بھی کر سکتے ہیں۔ تیل مالش کے علاوہ آپ یہاں ستار بھی سن سکتے ہیں۔"

ان لوگوں کے لئے یہ جگہ بڑی آئیڈیل ہے' جن کے پاس موٹر ہے۔ روپیہ وافر ہے۔ رات کو دیر تک جاگنے اور صبح کو دیر تک سونے کے عادی ہوں۔

عاطف نے رازداری کے لہجے میں پوچھا۔

"کچھ پئیں گے آپ۔۔۔۔؟"

ظاہر ہے کہ اس نے چائے یا کوکا کولا کے لئے نہیں پوچھا تھا۔ میں نے کہا۔

"ہاں بیئر پی لیں گے۔"

"میں بھی ایک بیئر پی لوں گا' مگر امل سے ذکر نہ کرنا۔"

میں ہنس پڑا۔۔۔

"تو پھر چھوڑیئے۔ نہیں پیتے۔"

"کیوں۔۔۔۔؟" وہ حیرت سے بولا۔۔۔ "آپ کیوں نہیں پئیں گے؟"

"میں نے عہد کیا تھا کہ امل کے سامنے کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ جس طرح کی وہ لڑکی ہے' اس کے ساتھ اسی سطح پر پیش آنا چاہیے۔"

"ہاں۔۔۔۔!" وہ قدرے خفیف ہو کر بولا۔۔۔ "مگر میرا کردار اس طرح کا کبھی نہیں تھا!"

"کردار تو میرا بھی مثالی نہیں ہے' لیکن میں اپنے اندر ایک زبردست تبدیلی محسوس کر

رہا ہوں۔ اثل کی غیر معمولی شخصیت اور ذکاوت نے مجھ پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ میں ذ
میں کسی سے اتنا متاثر نہیں ہوا۔ اس لئے بے حد کوشش کر رہا ہوں کہ خود کو ایسے م
میں ڈھالوں جو کم از کم ایک حد تک منفرد ہو۔"

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے......؟" اس کے لہجے میں یقین نہیں تھا...... "انسان
آپ کو کس طرح بدل سکتا ہے۔ کیا فطرت میں اتنی لچک ہے......؟ کم از کم میں تو
بے بس ہوں...... لنگور کی تیزی اور پھرتی 'گیدڑ' کے حصے میں نہیں آسکتی اور لومڑ
عیاری' بھیڑ کی سادگی میں نہیں بدل سکتی۔ پھر انسانی جبلت کیوں کر بدلی جا
ہے......!"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔" میں نے اس کی تائید کی...... "مگر میں نے تو خود کو
میں ڈال دیا ہے۔ میں ایک تبدیلی محسوس کر رہا ہوں۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ یہ
عارضی نہیں ہوگی۔ کبھی کبھی میرا دل زبردست مسرت سے بھر جاتا ہے اور کبھی میں
اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہوں۔ ایسا بلاوجہ نہیں ہوتا۔ اس کے پیچھے ایک زبرد
تحریک کارفرما ہے۔ ایسی تحریک پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ میں اس تحریک کو ذہنی ا
کہہ سکتا ہوں۔ کچھ بھی کہہ دیں۔ میں ان دنوں ایک سچائی کا پیچھا کر رہا ہوں اور
خوش ہوں!"

"میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ صحیح کہہ رہے ہیں یا غلط......؟ مگر ہاں' آپ کا
صاف ہے۔ آپ واحد شخص ہیں کہ اثل کے ساتھ دو قدم چل سکیں گے۔"

"میں اس اعتماد کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

"شکریہ نہیں' یہ آپ کا احسان ہے۔" عاطف جذبے سے بولا...... "میں اس
بے تابی سے منتظر ہوں جب اثل ایک پُرمسرت زندگی کا آغاز کرے گی۔ سب سے
بات تو یہ ہے کہ وہ جیون کی لگن سے آشنا ہو۔"

"میں بھی یہی آرزو لے کر نکلا ہوں کہ اس نہایت ہی انمول رتن کی حفاظ
جائے...... اس میں فرد اور اجتماع دونوں کی بہتری ہے۔ ہم دونوں یہ کام اپنے

مطلب سے کریں گے۔ یعنی ہمارا فرض ہے کہ اس مطلب کے لئے جئیں۔"

"میرا تو زندگی کا نصب العین ہی یہی ہے۔ اگرچہ میرا کردار مثالی نہیں ہے' لیکن اثل
کے سلسلے میں میں واقعی اصول پسند ہوں۔ آپ کی وجہ سے مجھے اور زیادہ تقویت پہنچے
گی۔"

"میں آپ کے ساتھ ہوں۔" میں نے جوش سے کہا...... "یہ میری خوش قسمتی ہے
کہ آپ نے مجھے پہچان لیا ہے۔"

سحا وہ چونک کر بولا......

"ایک بات یاد رکھئے۔ یہ ذمہ داری بالکل آپ کی اپنی ہوگی کہ آپ کس حد تک اور
کہاں تک' اپنے آپ کو اس کے قریب رکھ سکتے ہیں۔ یہ آپ کی صلاحیتوں اور خلوص پر
مبنی ہوگی۔"

"ہاں ہاں...... یہ خوف تو مجھے ہمیشہ ستاتا رہا ہے...... میں اس کی مزاج دانی کا دعویٰ
نہیں کرتا...... ہاں بین بین چلوں گا۔ مجھے امید ہے کہ ایک دن اسے پالوں گا۔"

عاطف نے پیار سے میرا ہاتھ دبایا۔ تقریباً ڈیڑھ بجے ہم وہاں سے لوٹے۔ صبح ناشتے
سے فارغ ہوئے تو عاطف نے کہا۔

"مجھے تو کچہری میں کام ہے۔ آپ کا کیا پروگرام ہے؟"

میری جگہ اثل نے جواب دیا۔

"آپ کے کام تو کبھی بھی ختم نہ ہوں گے بھائی جان' آدمی خود ختم ہو جاتا ہے' مگر اس
کے کام ختم نہیں ہوتے۔"

"واقعی...... میں آج واقعی فارغ نہیں ہوں۔"

"جب آپ میرے ساتھ کراچی سے باہر ہوتے ہیں' تب آپ کے سارے کام چلتے
ہیں' مگر یہاں پہنچتے ہی دنیا کے سارے بوجھ آپ اپنے سر پر رکھ لیتے ہیں۔ مجھے تو حیرت
ہوتی ہے۔ آپ اتنا بوجھ کیسے اٹھا لیتے ہیں......؟"

عاطف ہنس پڑا......

"آج تو میں معافی چاہتا ہوں وسیم صاحب۔ کل سے برابر آپ کے ساتھ رہوں گا۔"
عاطف چلا گیا تو امل میری طرف متوجہ ہوئی۔

"یہاں کلفٹن ہے' صدر ہے' بندر روڈ ہے' منوڑہ ہے۔ ہاکس بے ہے۔ سوسائٹی ہے۔ انڈسٹریل ایریا ہے۔ آپ کس طرف جانا پسند کریں گے۔۔۔۔؟"

میں کراچی کئی بار آ چکا تھا۔ خوب سیر کر چکا تھا' مگر میں کراچی امل کی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے کہہ دیا۔

"جہاں آپ لے چلیں۔"

"ٹھیک ہے' چلئے۔۔۔۔"

ہم باہر آ گئے۔ آج وہ ہلکے بادامی رنگ کی قمیص اور ٹخنے کی شلوار پہنے ہوئے تھی۔ پاؤں میں سبک سی چپل تھی۔ شلوار قمیص میں وہ زیادہ سمارٹ اور کم عمر نظر آ رہی تھی۔

ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ تو میں نے کہا۔

"آپ کو پہلی بار شلوار قمیص میں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔"

امل مسکرا کر بولی۔

"اس لباس میں میرے عورت پن کی تخصیص ہو جاتی ہے اور میری ذات کا تعین ہو جاتا ہے۔۔۔۔ ٹھیک ہے۔ مجھے عورت ہونے سے کب انکار ہے۔ مگر اصل بات تو یہ ہے کہ ہم سوچتے کس انداز میں ہیں۔ حقیقی آدمی کپڑوں میں نہیں' اپنے من میں چھپا رہتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں نا یہ شاندار بنگلے' ایک سے ایک بڑھ کر کوٹھیاں۔ میں دعوے سے کہتی ہوں ناجائز آمدنی سے بنی ہیں۔۔۔۔ ہل چلا کر کوئی کوٹھی نہیں بنا سکتا۔ سبزی اگا کر بھی کوٹھی نہیں بنائی جا سکتی۔۔۔۔ زندگی کے جائز اور اصل ذرائع تو یہی ہیں نا۔۔۔۔ کہ زمین کھودی جائے اور اس سے پیٹ بھرا جائے اور تن ڈھانپا جائے۔۔۔۔ ملازمت اور تجارت تو مصنوعی اور غیر قدرتی ذرائع ہیں۔۔۔۔ یہ ذرائع رشوت اور سمگلنگ کو جنم دیتے ہیں۔ اس طرح وافر روپیہ آتا ہے اور یوں عالی شان بنگلے تعمیر ہوتے ہیں!"

وہ حسب معمول میری حیرت میں اضافہ کر رہی تھی۔۔۔۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا۔

اس کی ننھی سی ناک کے سائیڈ پوز میں وہی تیکھا پن تھا اور وہ اپنی رو میں بولے جا رہی تھی۔

"پہلے یہ کام بادشاہ کیا کرتے تھے۔ ان کے جرائم کی یادگاریں محلوں' قلعوں اور مقبروں کی شکل میں آج بھی ہماری زمین پر موجود ہیں۔۔۔۔ عوام تو سبزی اور غلہ اگاتے تھے۔ وہ تب بھی جھونپڑوں اور کچے مکانوں میں رہتے تھے۔ موہنجوداڑو اور ٹیکسلا کے کھنڈر اس کے گواہ ہیں۔۔۔۔ اس دور میں بادشاہ نہیں رہے۔ اب حاکم اور کارخانے دار آ گئے ہیں۔ محل کی جگہ بنگلہ بنتا ہے اور اصطبل کی جگہ گیراج۔۔۔۔!"

منگھو پیر روڈ کی طرف جانے والی سڑک پر نالہ آیا' تو امل نے موٹر رکوا لی۔ نالے کے دونوں طرف ہزاروں جھونپڑے ایستادہ تھے۔ جھونپڑوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ باہر سینکڑوں میلے کچیلے بچے مٹی میں کھیل رہے تھے۔ اس نے میری طرف دیکھا۔

"آپ نے سوسائٹی دیکھی۔ اب یہ بھی دیکھئے۔ اس وسیع و عریض رقبے میں جتنی کوٹھیاں ہیں' اس سے بہت محدود رقبے میں اس سے زیادہ جھونپڑیاں ہیں۔ چار کنال کی کوٹھی میں جتنے آدمی بستے ہیں' چار مرلے کے جھونپڑے میں اس سے زیادہ آدمی رہتے ہیں۔۔۔۔ سوچئے۔ اگر زندگی وہ ہے تو شاید کوئی معنی بھی رکھتی ہے' لیکن اگر زندگی یہ ہے' تو اس کے کیا معنی ہیں۔۔۔۔؟ یہ تفریق کیوں۔۔۔۔؟ یہ فاصلے کیسے؟ یہ ننگ دھڑنگ' کالے کلوٹے بچے' بجھے بجھے چہرے' گندے غلیظ کپڑے' آخر کیا مقصد ہے ان کی زندگی کا۔۔۔۔؟ اگر مقصد نہیں ہے' تو ٹھیک ہے' لیکن اگر ہے کوئی مفہوم۔۔۔۔! تو انہیں اٹھا کر سوسائٹی کے بنگلوں میں کیوں نہیں پہنچایا جاتا۔۔۔۔؟ وہ طاقت کہاں جو ان خلیجوں کو پاٹ دے۔۔۔۔؟ جبھی تو کہتی ہوں' مجھے یہ دنیا پسند نہیں۔ لوگ اتنے غریب ہیں۔ اس پر بھی خوش ہیں۔ دیکھئے۔۔۔۔ ہر جھونپڑے سے دھواں نکل رہا ہے!"

میں نے ہولے سے کہا۔۔۔۔

"یہ زندگی کی نشانی ہے۔"

"ہاں ہاں۔۔۔۔ یہ زندگی کی نشانی ہے۔ سانپ کے منہ سے پھنکار نکلتی ہے۔ یہ واقعی

اس کی زندگی کی نشانی ہے ----! آپ روپیہ سیر سپاٹے پر ضائع کر رہے ہیں' یہ بھی زندگی کی نشانی ہے۔ کتا ایک ٹکڑے کے لئے مالک کے پاؤں چاٹتا ہے' یہ زندگی کی نشانی ہے۔ گدھ مردے نوچتا ہے' یہ زندگی کی نشانی ہے ---- جھونپڑوں سے دھواں نکل رہا ہے' یہ واقعی زندگی کی نشانی ہے ----!"

میں اس کا مطلب سمجھ رہا تھا' مگر چھیڑنے کے لئے کہا۔

"سانپ کی پھنکار اس کی فطرت ہے۔ کتے کا مالک کے پاؤں چاٹنا اس کی جبلت ہے۔ گدھ کا مردے نوچنا بھی اس کی فطرت ہے۔ اس لئے یہ سب قابلِ نفریں نہیں ہے۔"

"تو پھر کچھ بھی قابلِ نفریں نہیں ہے۔ جو جیسا ہے ٹھیک ہے۔ غربت سے ہمدردی بے کار ہے اور امارت پر تنقید فضول ----!"

"میرا مطلب یہ نہیں تھا۔"

"آپ کا مطلب یہ تھا کہ آپ جو باپ کا چھوڑا ہوا روپیہ ضائع کر رہے ہیں' یہ عین فطرت ہے۔ ہاں ---- میں اس سے اتفاق کرتی ہوں۔ اس لئے تو کہتی ہوں کہ جب یہ عین فطرت ہے تو مقصد اور مطلب کیوں تلاش کیا جاتا ہے۔ جو جہاں ہے' ٹھیک ہے۔ اصلاح کا خیال بے معنی اور بے ہودہ ہے ---- کیونکہ یہ خیال تو ہماری رگوں ہی میں نہیں ہے!"

میں نے چڑ کر کہا ----

"آپ بار بار میرے روپیہ کا ذکر کرتی ہیں۔ اگر دو چار لاکھ روپوں سے دنیا سدھر سکتی ہے' تو میں آج ہی اس سے دست بردار ہونے کے لئے تیار ہوں۔"

"ہر آدمی آپ ہی کی طرح جواز تلاش کرتا ہے۔ دست بردار کوئی نہیں ہوتا' کیونکہ یہ اَن نیچرل ہے' غیر قدرتی ہے ---- سماجی اور تمدنی سوچ ہمارے دماغ میں تو ہوتی ہے' دل میں نہیں ہوتی!"

اشل کے سامنے عذر اور فرار کا ہر راستہ بند ہو جاتا تھا۔ زندگی کی تلخ باتیں اس کی زبان سے آدرش اور قدر بن کر نکلتی تھیں اور جو اصل آدرش اور قدریں ہوئی تھیں'

ان کا کہیں نام و نشان نہیں ملتا تھا۔

میں اپنی بدنصیبی کو سمجھ رہا تھا' مگر میں اس کا قائل تھا کہ زندگی کی آخری سانس تک ہمت نہیں ہارنا چاہیے ---- کیا پتہ' آخری دم ہی میں جیون کے مفہوم کا راز کھلے ---- جب گیئر لگا کر وہ آگے بڑھی تو میں نے کہا ----

"موٹر تو آپ کے پاس بھی ہے۔ بنگلہ بھی اور بینک بیلنس بھی' آپ نے انسان کے لئے کیا کیا ہے؟"

"میں انسان کے لئے کیا کر سکتی ہوں۔ انسان ایک دوسرے کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم خواہ مخواہ بیچارے انسان پر ذمہ داریاں تھوپ رہے ہیں' وہ اس کا اہل ہی نہیں ہے!"

میں نے معترضانہ لہجے میں کہا ----

"تو پھر آپ سوسائٹی کے بنگلے اور گندے نالے کے جھونپڑے پر تنقید کیوں کرتی ہیں۔ چار کنال اور چار مرلے کے فاصلے پر کیوں کڑھتی ہیں ----؟"

"میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ دنیا آج سے دس ہزار پہلے بھی یہی تھی۔ اب بھی یہی ہے اور ایک لاکھ سال بعد بھی یہی ہوگی ---- انسان نہ کبھی بدلا ہے ---- اور نہ کبھی بدلے گا ----"

"اشل ---- آخر اس کا مطلب کیا ہے؟" میں نے جھنجلا کر کہا ---- "زندگی کو بے مقصد اور انسان کو گھٹیا کر آپ کے ہاتھ کیا آئے گا ----؟"

اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

"آپ کی جھنجلاہٹ کے معنی یہ ہیں کہ میری باتوں میں معنی ہیں۔ اگر آپ کو زندگی سے بہت پیار ہے' تو میرا ساتھ چھوڑ دیجئے۔ میری ہرگز یہ خواہش نہیں ہے کہ آپ کو انسانوں کی بستی سے دور لے جاؤں ----!"

"اشل ----!" میں گمبھیر ہو گیا ---- "مجھے زندگی سے صرف اس لئے پیار ہے کہ اس میں آپ بھی ہیں۔ آپ مجھے انسانوں کی بستی میں رہنے دیں' یا اس سے دور لے

جائیں' مگر اپنے سے الگ نہ کریں۔ میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔ بس اتنی بات یاد رکھیں۔۔۔۔!!"

"دوستی کی حد تک آپ مجھے پسند ہیں۔ میں آپ سے بور بھی نہیں ہوتی۔ آپ ان گنے چنے آدمیوں میں سے ایک ہیں' جن کے ساتھ میں رہ سکتی ہوں' اس لئے جب تک آپ چاہیں یہاں ٹھہر سکتے ہیں۔"

"مسئلہ جب تک کا نہیں ہے انجل۔۔۔۔ جب تک کے معنی تو یہ ہوئے کہ مہینہ' چھ مہینے' سال کے بعد ہم الگ ہو جائیں گے۔ میں تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔۔۔۔"

"سال چھ مہینے رہ کر آپ فیصلہ کر لیں۔ انسانی جبلت کا راز ایک نہ ایک دن آپ پر کھل ہی جائے گا۔ آپ تعلیم یافتہ ہیں۔ ذہین ہیں۔ شکیل ہیں' تجربے اور مشاہدے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ مجھ سے ملنے کے بعد آپ نے ایک تبدیلی محسوس کی ہے۔ اس طرح کی اور بہت سی تبدیلیاں آپ یقیناً محسوس کریں گے' دیکھئے۔ انتظار کیجئے۔۔۔۔ آج کا استقبال کل نہیں ہو گا۔۔۔۔ یہی انسان کا مقدر ہے!"

"میں اس مقدر پر یقین نہیں رکھتا۔۔۔۔ میں اپنا مقدر خود ڈھونڈوں گا۔ میں اس کی تلاش میں نکل آیا ہوں۔ بس یہ تلاش ہی میرا مقدر ہے۔"

"آپ نہیں سمجھیں گے۔ آپ نہیں سمجھیں گے!"

جیسے وہ اپنے آپ سے بولی۔۔۔۔ موٹر اب تنگ سڑک پر جا رہی تھی۔ میں کراچی کے اس حصے میں پہلے نہیں آیا تھا۔۔۔۔ انجل خاموش ہو گئی تھی۔ ایک دو موڑ مڑنے کے بعد اب کھلی شاہراہ آ گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہماری موٹر شیزان کے سامنے رک گئی۔ انجل نے میری طرف دیکھا۔۔۔۔

"آپ کو پیاس لگی ہے۔"

انجل نے مجھ سے پوچھے بغیر کولڈ کافی کا آرڈر دے دیا۔۔۔۔ ڈیڑھ دو گھنٹے ڈرائیونگ کے بعد اس کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار تھے اور وہ خاموش تھی۔ میں نے کہا۔

"آپ تھک گئی ہیں۔"

وہ تساہل پسندانہ انداز میں مسکرائی۔۔۔۔

"ہاں۔۔۔۔ میں ذہنی طور پر تھک گئی ہوں۔۔۔۔ ایک سا دن' ایک سی رات اور ایک سی زندگی۔ میں حیران ہوں کہ اسے کس طرح برداشت کر رہی ہوں!"

"آپ نے یہ جمود خود طاری کر رکھا ہے۔ خود آپ ہی اسے توڑ سکتی ہیں۔ آپ خول سے باہر نکلئے تو۔۔۔۔"

اس نے ہنستے ہوئے کافی کا خالی گلاس ٹیبل پر رکھ دیا۔

"تو گویا آپ کا خیال ہے میں ابھی خول سے باہر نہیں نکلی۔۔۔۔ ہاں' آپ سے محبت کا اقرار کر لوں' تو شاید آپ کو یقین آ جائے کہ میں خول سے باہر آ گئی ہوں' مگر نہیں۔۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں آپ کو دوست ضرور سمجھتی ہوں' مگر آپ سے متاثر نہیں ہوں۔ آپ کی طرح وجیہہ لوگ مجھے اچھے ضرور لگتے ہیں' مگر ان سے مرعوب نہیں ہوتی۔۔۔۔ میں ایسی کھاری جھیل ہوں جس کا ایک قطرہ بھی حلق سے نہیں اتر سکتا!"

میں نے بے حد نرمی مگر احتجاج سے کہا۔

"آپ عورت ہیں انجل۔ عورت بنیادی طور پر سنگدل نہیں ہوتی۔ عورت کے خمیر میں حسد ہوتا ہے' نفرت نہیں ہوتی۔ عورت کی ممتا کی مثال دنیا میں نہ رہے تو روئے زمین سے سچائی مٹ جائے۔ عورت صداقت کا وہ سرچشمہ ہے جو کبھی خشک نہیں ہوتا۔۔۔۔ آپ کہتی ہیں میں ذہنی طور پر تھک گئی ہوں۔

ایک سا دن' ایک سی رات اور ایک سی زندگی نے آپ کو مایوس کر دیا ہے۔۔۔۔ میں کہتا ہوں۔۔۔۔ زندگی کو سکھی بنانا ہی نجات اور عبادت ہے۔ انسان ہنس نہ سکے رو نہ سکے' تو وہ انسان نہیں پتھر ہوتا ہے۔۔۔۔ وہ طہارت' جو انسان کے فطری تقاضوں کو ڈسنے والے' ہرگز انسان کو ابدی مسرت سے ہمکنار نہیں کر سکتی۔ یہ بات ہمارے اختیار میں ہونی چاہیے کہ زندگی کی یکسانیت کو ختم کر دیں!"

انجل حیرت آمیز تبسم کے ساتھ میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"چند روز پہلے آپ عجیب و غریب آدمی تھے۔ لا ابالی اور بے پروا' انسانی رشتوں پر

ہے اور تمام عالم اس کا متلاشی......!

گھر پہنچ کر ہم موٹر سے اترے تو وہ بولی۔

"آپ ڈرائنگ روم میں بیٹھیں۔ میں منہ ہاتھ دھو کر آتی ہوں۔"

وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ میں ڈرائنگ روم کی طرف چلا' تو کل والے نوکر نے سلام کیا۔

میں نے فوراً پوچھا......

"کل ٹیلی فون پر گفتگو تم سے ہوئی تھا......؟"

"جی حضور۔" وہ خوش ہو کر بولا...... "میں ہی تھا۔ میں نے بے بی میں پہلی بار ایسی تبدیلی دیکھی ہے۔"

"کیا وہ تم لوگوں سے سختی کا برتاؤ کرتی ہیں......؟"

"ہرگز نہیں جناب۔" وہ جلدی سے بولا...... "مشکل سے مہینوں میں کوئی بات کرتی ہیں۔ وہ بھی مختصر اور نرم لہجے میں' مگر ان کا رعب گھر میں اتنا ہے کہ ہر آدمی ڈرتا ہے۔ جب وہ گھر میں موجود ہوں' تو چڑیا بھی پر نہیں مارتی۔"

میں نے ہنس کر پوچھا......

"جب ڈانٹتی نہیں' ناراض نہیں ہوتیں' تو پھر تم لوگ ڈرتے کیوں ہو؟"

"یہی تو بات ہے سرکار' عاطف صاحب ڈانٹتے ہیں' ناراض ہوتے ہیں۔ ہم لوگ انہیں چکمہ بھی دے جاتے ہیں مگر بے بی سے کوئی ایسا سلوک نہیں کر سکتا۔ سارے ملازم ان سے دبتے ہیں اور دل سے ان کی عزت بھی کرتے ہیں!"

مجھے عجیب سی خوشی ہوئی...... ایک گمبھیر مسکان میرے لبوں پر پھیل گئی۔ امثل کے خوبصورت ڈرائنگ روم کی بھی ایک خاص شخصیت تھی' جس سے آدمی متاثر ہوتا تھا۔

تھوڑی دیر میں عاطف بھی پہنچ گیا۔ امثل بھی آ گئی...... کھانے کی میز پر امثل نے کہا......

"بھائی جان' اگر آپ کے کام ختم ہو گئے ہیں' تو کل پرسوں کوئٹہ کے لئے ہوائی جہاز

لیکن سیٹیں ریزرو کرا لیں......"

عاطف نے کہا...... "ہاں کرا لوں گا۔"

مجھے عاطف کی ادا بہت پسند آئی۔ کاروباری آدمی ہے۔ پچاس ذمہ داریاں ہیں' مگر بہن کی خوشی کے لئے ہر ایثار پر تیار رہتا ہے۔ بقول امثل...... زندگی بے مقصد سہی۔ مگر لا بے مقصد بھی نہیں ہے......!

تقریباً ڈیڑھ بجے ہمارا جہاز کراچی سے کوئٹہ کے لئے پرواز کر گیا۔ امثل اور میری سیٹیں ساتھ تھیں۔ عاطف ہم سے آگے والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ چوسنے والی گولیوں کے بعد ہوسٹس' انناس کا جوس لائی۔ تو امثل نے اس سے کہا۔

"آپ کی مخلصانہ مسکراہٹ ذاتی ہے یا پی آئی اے کی مرہون منت؟"

"آپ کے لئے ذاتی اور آپ کے ساتھی کے لئے تکلفانہ......!"

امثل اس بات سے بہت محظوظ ہوئی۔

"کرایہ تو اس بیچارے نے بھی مجھ جتنا دیا ہے۔"

"مجبوری ہے۔" وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ "ہنسنا میری ڈیوٹی ہے۔" امثل بہت خوش ہو کر میری طرف دیکھ کر بولی۔

"یہ لڑکیاں بہت تجربہ کار ہو گئی ہیں۔ اب اتنی آسانی سے آپ انہیں ٹھگ نہیں ...ے۔"

میں نے کہا۔

"کون انہیں ٹھگنے جا رہا ہے؟"

"ارے یہ سب......! جتنے مرد ہیں سب یہی کام کرتے ہیں!"

"عاطف بھی......؟"

"ارے سب ---- کوئی ایک تھوڑا ہے ہر مرد ہر جوان عورت کو پسند کرتا ہے' چاہے
کوئی بھی ہو۔ یہ بات آپ لوگوں کے خون میں ہے۔"

میں ہنس پڑا ---- "ہمارے خون کی بات آپ جانتی ہیں؟"

"واہ ...... کیوں نہیں ---- عورت سے زیادہ کون جانے' ہر مرد کی چپکی میں شرار
ہوتی ہے۔"

"شرارت ہوتی ہے یا فطری تقاضے ......؟"

"جس مصنوعی سماج میں آپ رہتے ہیں' وہاں فطری تقاضوں کا کوئی مفہوم نہیں ہو
جب ہم نے رہنے سہنے کے لئے مکان اور جینے کے لئے قاعدے کلیے بنا لئے ہیں' تو ان
پابندی بھی لازمی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے میں فطری تقاضے بھی محدود ہو جاتے ہیں۔"

"محبت کو کون محدود کر سکتا ہے۔ کوئی کسی کے کام آنا چاہے ---- بیمار کی دلجوئی' ز
کی مرہم پٹی' دکھی کے دکھوں میں شرکت' یہ شجر ممنوعہ نہیں ہے اور نہ ان پر پابندی ع
کی جا سکتی ہے اور نہ یہ مفہوم سے خالی باتیں ہیں۔"

"یہ الگ پہلو ہے ---- خدمت کا!" وہ بولی ...... "یہ مہاتمائی سوچ ہے۔ اس
پیغمبرانہ پیغام ہوتا ہے۔ اس میں سچائی بھی ہوتی ہے۔ جیسے ممتا کا جذبہ' رحم کا احساس
ایثار و قربانی کا ولولہ' خدمت میں ایک روحانی مسرت مخفی ہوتی ہے' مگر بہت کم خو
نصیب ایسے ہوتے ہیں جو اس راہ پر چلتے ہیں۔ یہ عقل کی نہیں' جذبے اور عشق کی
ہوتی ہے۔ اس کا تعلق اجتماع سے نہیں فرد سے ہوتا ہے۔"

میں نے خوش ہو کر ......

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تعلق اور بے تعلقی کے درمیان ایک اور راستہ بھی ہے
خدمت گزاری کا ---- یہی زندگی کو پاکیزہ' مقدس اور بامعنی بناتا ہے؟"

وہ تسلی سے بولی ......

"مگر اس کے لئے روحانی یا اجتماعی بنیاد پیدا کرنا مشکل ہوگا۔ چونکہ قدرت کے قا
ناقابل فہم ہیں اور ہماری سمجھ میں نہیں آتے اس لئے ہم خدا کے تصور میں پناہ لیتے ہ

اور اپنے من کو ڈھارس دیتے ہیں۔"

میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"پھر تو خدمت کا مقصد بھی فوت ہو جاتا ہے۔ جس چیز کا انجام ہی نہ ہو۔ وہ رحم ہو'
پیار ہو' یا خدمت ہو ...... بے معنی ہو جاتا ہے؟"

"مگر انسانی ارتقا میں اس کا درجہ ہے۔" وہ اعتماد سے بولی ---- "بالکل ذاتی سہی' مگر
دوسروں کا دکھ درد دور کرنے میں خوشی ہوتی ہے' لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ دکھ آیا کہاں
سے؟ اسے پیدا کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ جو نہیں ہونا چاہیے تھا وہ کیوں ہے؟"

میں نے جھنجلا کر کہا ......

"ہم آخر سوال کیوں کرتے ہیں ---- جس کا جواب ہمارے ادراک سے بعید ہے۔ ہم
کیوں خود کو تشکیک اور تذبذب میں ڈال دیتے ہیں؟ ہم ایسی سیدھی سادی زندگی کیوں
نہیں گزارتے جس میں پیچ و خم نہ ہوں۔ زندگی میں چھوٹی چھوٹی خوشیاں بہت ہوتی ہیں۔
چاہیے کہ ہم ان پر اکتفا کریں۔"

اس نے ہنس کر میری طرف دیکھا ......

"ہاں ...... اس طرح سہولت رہتی ہے۔ انسان طبعی عمر گزار کر مرتا ہے۔ نہ ذہن پر
بوجھ پڑتا ہے' نہ چاند پر پہنچنے کی تڑپ رہتی ہے اور نہ غار میں واپس جانے کی خواہش رہتی
ہے۔ زندگی سہل ہو جاتی ہے!"

میں اس کے طنز کو سمجھ گیا ...... کوئٹہ کے پہاڑوں کی ڈھلانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا
تھا۔ جوں جوں جہاز آگے بڑھ رہا تھا' پہاڑ اونچے اور واضح ہوتے جا رہے تھے۔

چونکہ جہاز پہاڑوں کے اوپر اڑ رہا تھا اس لئے ان کی عظمت کا احساس نہیں ہو رہا
تھا ...... بلند و بالا چوٹیاں ہمارے قدموں کے نیچے تھیں۔

بارش کے پانی اور پگھلتی ہوئی برف نے جو راستے بنائے تھے ان کے پتھر سفید ہو گئے
تھے ---- اوپر سے یہ خشک پتھریلی ندیاں یوں لگتی تھیں۔ جیسے کولتار کی سڑکیں۔

چھوٹی اور تنگ نشیبی وادیوں میں چھوٹے چھوٹے گاؤں اور مٹی کے گھروندے' بالکل

بادل کی طرح لگتے تھے ...... ہولے ہولے جہاز نیچے ہونے لگا۔ پہاڑوں کی بھاری بھر
چٹانیں اور آڑی ترچھی چوٹیاں واضح ہوتی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد ایئر ہوسٹس کی آواز آئی
”خواتین و حضرات! تھوڑی دیر بعد ہم کوئٹہ کے ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں
آپ سے درخواست ہے کہ اپنے حفاظتی بیلٹ باندھ لیں اور سگریٹ بجھا دیں۔ شکریہ۔
یہی اعلان انگریزی زبان میں بھی دہرایا گیا۔ امثل نے حفاظتی بیلٹ باندھا۔ میں
ہنس کر کہا۔

”آپ تو موت سے نہیں ڈرتیں۔ پھر حفاظتی بیلٹ کیوں باندھ لیا؟“

امثل نے برجستہ جواب دیا۔

”میں ڈروں نہ ڈروں‘ آپ تو ڈرتے ہیں نا......؟ میری وجہ سے آپ کو نقصان پہنچ
یہ میں پسند نہیں کرتی......“

”آپ کے ساتھ مرنے پر تو مجھے بھی اعتراض نہیں ہے۔“

”ایسا موقع ایک بار آیا تھا۔ ڈاڈر سینی ٹوریم کے پاس پہاڑ سے دریائے سرن میں
کودنے کی ایک تجویز میں نے پیش کی تھی۔ آپ کو یاد ہوگا۔ آپ ہٹ گئے تھے......؟“

”ہاں مجھے یاد ہے۔“ میں ہنس پڑا...... ”تب میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا‘ مگر ا
کے باوجود میں جینا چاہتا ہوں۔ اس لئے آپ سے استدعا کروں گا کہ مجھے جینے دیجئے۔ و
اگر آپ میرا امتحان لینا چاہیں گی تو یاد رکھیئے‘ میں پیچھے نہیں ہٹوں گا......!“

اس نے شرارت آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ عین اس لمحے ہمارا فوکر جہ
منگلی کے ہوائی اڈے کے ٹریک کو چھو رہا تھا۔ اس کی گول گول حیرت زدہ آنکھوں
گہرائی میں دور...... بہت دور...... کوئی بھولا بھٹکا ستارہ جگمگا رہا تھا...... یا شاید میرا و
تھا۔ مگر کچھ تو تھا جس نے انگور کے سرخ دانے جیسے ہونٹ کے بجائے‘ میرا دھیان اس
آنکھوں کی طرف کر دیا تھا۔

لارڈز ہوٹل میں ہم نے دو کمرے لئے۔ یہاں کچھ یورپین اور امریکی بھی ٹھہر
ہوئے تھے۔ ہوٹل کے لان میں ان کے بچے کھیل رہے تھے۔ عاطف نے ہوٹل کے مینج

سے بات کر کے کل کی سیر کے لئے جیپ کا انتظام کر لیا تھا۔

شام کا کھانا کھا کر باہر لان میں بیٹھ گئے۔ کراچی کا موسم خاصا گرم تھا‘ مگر یہاں نہایت
خوشگوار خنکی تھی۔ طبیعت بے حد ہشاش بشاش تھی۔ میں نے موسم کی تعریف کی تو امثل
بولی۔

”لیکن اس کے باوجود کراچی کی آبادی کئی گنا زیادہ ہے۔ لوگ موسم کے پیچھے نہیں‘
پیسے کے پیچھے بھاگتے ہیں۔“

میں اس وقت بحث کے موڈ میں نہیں تھا اور سوچ رہا تھا کہ بات کا رخ کس طرح
بدلوں کہ اتنے میں بیرے نے اطلاع دی کہ کراچی کی کال ہے۔ عاطف فوراً اٹھا۔ اس نے
کراچی کے لئے دو تین کالیں بک کرا رکھی تھیں۔ امثل ہنس پڑی۔

”بھائی جان کاروبار سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔“

میں نے کہا......

”اگر دنیا کے سارے انسان آپ کے نیچر کے ہوتے‘ تو آج شہروں کے بجائے جنگل
آباد ہوتے۔“

”جنگل تو آج بھی آباد ہیں۔ وہاں آپ سے زیادہ خوش حال مخلوق بستی ہے۔“

میں نے ہنس کر کہا......

”یہ کیسے ثابت ہوگا کہ وہ ہم سے زیادہ خوشحال ہیں......؟“

”یہ ثابت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ پنچھی کی پرواز کے مقابلے میں انسان کے پاس
کیا دھرا ہے۔ کچھار سے باہر آنے والے شیر کی شان کو آپ نے کیا دیکھا ہوگا۔ چوکڑیاں
بھرتے ہوئے ہرنوں کی آزادی کا تصور ہی کتنا دلفریب ہے‘ مگر اصل قصہ تو شعور کا ہے۔
انسان کو غرض نے جکڑ رکھا ہے اور حیوان کو زندہ رہنے کے وجدان کے سوا کچھ ودیعت
نہیں ہوا۔ حیوان کے مسائل‘ انسان کے مسائل کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ بلکہ ایک
طرح سے حیوان کا تو کوئی پرابلم ہی نہیں ہے۔ ماسوائے اس کے...... کہ انسان کے شعور
سے خائف ہے اور جنگل میں پناہ گزیں ہے!“

میں نے پوچھا۔۔۔۔ "آپ کی انتہا درجے کی بالغ نظری' آپ کی بدقسمتی کا باعث تو نہیں ہے؟"

"یہی تو مسئلہ ہے۔" اس نے تائید کی۔۔۔۔ "جوں جوں شعور بڑھ رہا ہے' توں توں فتور بھی بڑھ رہا ہے۔ بے خبر آدمی' باخبر آدمی کے مقابلے میں بہت خوش نصیب ہوتا ہے۔۔۔۔ بالغ نظری ہی سارے فساد کی جڑ اور تنہائی کے احساس کا منبع ہے!"

"مگر مجھے تو ہمیشہ ایسا لگا ہے کہ آپ کی ذہانت' آپ کی فطرت پر غالب نہیں آئی۔ آپ کی راہنمائی ہمیشہ فطرت کرتی ہے۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔۔۔۔

"اگر آپ ایسا محسوس کرتے رہے ہیں' تو یہ بہت اچھی بات ہے۔ انسان کی مصنوعی سچائی سے جانور کی فطری سچائی زیادہ ٹھوس ہوتی ہے۔"

"آپ نے مصنوعی اور حقیقی سچائیوں کا ذکر چھیڑ دیا ہے۔ کیا وفا اور ایثار حقیقی سچائیاں نہیں ہیں؟"

وہ نہایت بے رخی سے بولی۔۔۔۔

"یہ شعوری اختراعیں ہیں۔ عقلی چیزیں ہیں۔ تہذیب و تمدن نے ان کو پیدا کیا ہے۔ نیکی اور ایثار' زندگی کے سنگھار ہیں۔ انسان کے دکھوں کو ختم کرنا بہت بڑی بات ہے۔ یہ سب اچھی باتیں ہیں۔ مگر یہ فطرتاً ہمیں وراثت میں نہیں ملتیں۔ سماج ذہانت کا مرہون منت ہے۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔۔۔۔

"اس کا مطلب تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مرد عورت کی محبت بھی کوئی حقیقت نہیں ہے؟"

وہ بہت نرمی سے بولی۔۔۔۔

("اگر آپ لفظ "محبت" کے آفاقی مفہوم کو کچھ دیر کے لئے ذہن سے دور کر سکیں' تو شاید یہ عقدہ بھی حل ہو جائے۔ انسانی فطرت میں چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش رچی

بسی ہوئی ہے۔ اس خواہش میں درپردہ بوسے کی تحریک کارفرما ہوتی ہے۔ اس تحریک میں جنسی طلب کی تڑپ رواں دواں رہتی ہے۔ اب اس جنسی کشش کو محبت کہہ لیں یا کچھ اور کہہ لیں۔ جنسی تسکین ایک طرح سے محبت کے آفاقی مفہوم سے زیادہ بڑی حقیقت ہے!")

میں اس کے جواب سے بوکھلا گیا۔

"خیر یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ میں محبت کر سکتا ہوں یا نہیں؟"

وہ بغیر کسی تاثر کے بولی۔۔۔۔("ابتدا میں ہر آدمی اس فریب میں مبتلا رہتا ہے کہ مجھ جیسا سچا عشق کسی نے نہ کیا ہوگا' لیکن المیہ یہ ہے کہ زندگی کے ہر موڑ پر بے پناہ خلوص اور فریفتگی کا مظاہرہ نہیں ہوتا' لیکن زندگی میں ایک آدھ بار ہی دیانتدارانہ سپردگی کا موقع ملتا ہے۔ انسان اس موقع کو زندگی کی معراج سمجھتا ہے اور اس کو سچی محبت کہتا ہے اور اسی کے لئے زندگی بھر روتا ہے!")

میں خاموش ہو گیا تھا۔ اس کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ وہ اسی رو میں بولی۔

("انسان جب پہلی بار محبت میں مبتلا ہوتا ہے' تو محبوب کی ایک جھلک کے لئے پہروں کھڑا رہ سکتا ہے۔ پھر اس کے بوسے کی خواہش تڑپاتی ہے جب اسے یہ بھی میسر آ جاتا ہے' تو پھر مہینوں اس پر مدہوشی اور سرشاری کا عالم طاری رہتا ہے۔۔۔۔ پھر دھیرے دھیرے وہ تڑپ' وہ کپکپی' وہ گدگدی' وہ گرمی' وہ تشنگی اور وہ لرزا دینے والی کیفیت اپنی گرفت ڈھیلی کرتی چلی جاتی ہے۔ آخر میں کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔۔۔۔ نہ وہ راحت' نہ وہ لذت اور نہ وہ حرارت۔ ہر چیز ختم ہو جاتی ہے۔ دوسرا بوسہ' پہلے بوسے کی طرح تسکین بخش نہیں ہوتا۔ دوسرے تجربے میں پہلے تجربے کی طرح والہانہ پن نہیں ہوتا۔ ہر دوسرا اور تیسرا لمس' باسی روٹی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔۔۔۔ حسن اس وقت تک انمول ہے' جب تک چھوا نہیں گیا۔ جسم اس وقت تک خوبصورت ہے' جب تک ٹٹولا نہیں گیا۔ راز اس وقت تک راز ہے' جب تک فاش نہیں ہوتا۔۔۔۔ آخر میں آدمی سوچنے لگ جاتا ہے کہ وہ خوشی پارے کی سی تڑپ کیوں کھو بیٹھی ہے؟ یہ تھک کیوں جاتی ہے؟

پھر آدمی نتائج اخذ کرتا ہے کہ زندگی کی آخری خواہش یہی تھی کیا------ ایسی بھیانک انتہا------! منزل پر پہنچ کر منزل کی جستجو------! آخر کیا معنی------؟"

اب یہ بات صاف تھی کہ اس جنس کے کئی مراحل طے کر چکی ہے۔ وہ جگ بیتی نہیں' آپ بیتی کہہ رہی ہے۔ ورنہ اس کا ذہن اس بارے میں اتنا صاف نہ ہوتا' مگر اس کا یہ مطلب کب نکلتا تھا کہ میں بدظن بھی ہو سکتا ہوں اور اس کا خیال چھوڑ دوں گا------ یا دل سے نکال دوں گا------

معاوہ دھیرے سے بولی------ "خوشی کی تلاش بے کار ہے۔ ایک جیسے دن' ایک جیسی راتیں۔ ایک جیسا پیار اور ایک جیسا بوسہ' اتنی طویل زندگی پر ایک بوجھ ہے۔ تمنا بر آنے کے بعد آگے کیا دھرا ہے۔ خوشی کی منزل پر پہنچ کر آگے سفر کا مقصد کیا ہے------؟ اسی لئے میں کہتی ہوں کہ یہ زندگی یونہی نامکمل رہے گی!"

میں نے آسرا لے کر کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ماضی کی سوگواری سے انسان کو اتنی گہری وابستگی نہیں ہونی چاہیے۔ انسان کو پیچھے نہیں آگے دیکھنا چاہیے------ ایک دیا بجھ گیا تو اسے مقدر کیوں سمجھا جائے۔ آگے ہر قدم پر دیا جلایا جا سکتا ہے۔ جب منزل ڈھونڈنے کے اتنے مواقع موجود ہوں' تو کوئی اتنا احمق کیوں بنے کہ کولہو کے بیل کی طرح ساری زندگی بجھے ہوئے دیئے کا طواف کرتا رہے؟"

وہ گمبھیر ہو کر بولی------

"بار بار دیئے جلانے کے کوئی معنی نہیں۔ میں محبت پر بھروسہ نہیں کرتی۔ محبت کے نام پر میں کسی سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتی۔ میں باہمی اعتماد کو محبت سے زیادہ قوی اور قابل احترام سمجھتی ہوں۔"

میں نے کہا------ "آپ اس احترام کو محبت کیوں نہیں کہتیں؟"

وہ ہنس کر بولی------

"اگر آپ اس سے خوش ہوتے ہیں' تو کہنے میں کیا حرج ہے' لیکن محض کہنے سے

میری سوچ تو بدل نہیں جائے گی۔"

"مگر محض حیوانی سطح پر ایک دوسرے کو اپنانا مجھے بہت ناگوار لگتا ہے۔"

"آپ کا یہ ردعمل فطری نہیں محض عقلی اور معاشرتی ہے۔"

میں نے کہا "عقل کے بغیر کوئی سماج نہیں چل سکتا------"

"یہ ٹھیک ہے۔" اس نے تائید کی------ "عقل اگر غرض سے بے نیاز ہے' تو اس کا اقتدار مان لینا چاہیے' مگر المیہ یہ ہے کہ عقلی وقار اور اختیار شخص کے ساتھ رخصت ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دھاندلی شروع ہو جاتی ہے۔ حالانکہ سماج شخصوں سے بنا ہے اور شخص کو بھول کر ہم کسی سماج پر غور نہیں کر سکتے۔ کیونکہ چھوٹے بڑے ہمیشہ رہیں گے۔ جب سے انسان میں خودی کا ارتقاء ہوا' شخصیت نے جنم لیا اور شخصیت نے دنیا کو مسخر کیا------ کبھی اس کے نتائج مثبت نکلے اور کبھی منفی------ عقل اگر زمانہ جاہلیت میں حکومت نہ کر سکی' تو اب کر رہی ہے اور آئندہ بھی ہمیشہ کرتی رہے گی۔ لیکن اصل رونا تو یہ ہے کہ عقل مبہم صورت میں کیوں ہی------ خوبصورتی' ذہانت اور طاقت ہر انسان کے حصے میں برابر کیوں نہ آئی۔ چھوٹے بڑے کا فرق صرف دولت ہی سے تو نہیں ہے------!"

"یہ سب ٹھیک سہی------" میں نے پھر آسرا لے کر کہا------ "مگر انسان جو اشرف المخلوقات ہے' اسے اجتماعی احساس کی امنگ سے بھرپور رہنا چاہیے۔ زندگی خودبخود حسین ہو جائے گی۔"

اس نے پوچھا------ "آپ کا اس میں کتنا حصہ ہے؟"

"کچھ بھی نہیں' مگر اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ میں ہمیشہ تہی دامن رہوں گا۔ میرا ارادہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ میں ایک نہ ایک دن کوئی غیر معمولی کارنامہ سرانجام دوں گا۔"

"ہر آدمی آپ کی طرح نہیں ہو سکتا۔"

"کوئی حرج نہیں۔ ہر آدمی کم یا زیادہ ایک حد تک استطاعت رکھتا ہے۔ وہ اپنی

صلاحیت کے مطابق حصہ دے سکتا ہے۔"

"مثلاً میں...... مجھ جیسے نکمے لوگ زندگی کو کیا دے سکتے ہیں؟"

"آپ کو کون نکما کہے گا۔ آپ پیغمبر نہیں ہیں۔ مگر پیغمبرانہ پختگی رکھتی ہیں۔ افسوس! ہے کہ آپ زندگی سے بیزار ہیں اور پیغام پر یقین نہیں رکھتیں۔ فطرت کی ستم ظریفی کہ آپ کی پختگی ضائع ہو رہی ہے۔"

"نہیں نہیں......!" وہ خاموش ہو گئی اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ میں نے پوچھا......

"نہیں نہیں! اس کا کیا مطلب ہوا......؟"

اس نے گول گول متجسس آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ چند لمحے خاموش رہ پھر بولی......

"کوئی پختگی نہیں۔ سب غلط ہے۔ انسانی فطرت کے اپنے تقاضے ہیں۔ مثلاً ایک خوبصورت پھول آپ دیکھتے ہیں۔ آپ کو اچھا لگتا ہے۔ اس سے زیادہ خوبصورت پھول آپ دیکھتے ہیں۔ وہ بھی آپ کو اچھا لگے گا!"

میں نے تائید کی...... "یہ تو بالکل فطری بات ہے۔"

"ظاہر ہے کہ پسندیدگی کسی مقام پر آ کر رک نہیں جاتی۔"

"رکنی بھی نہیں چاہیے۔"

"تب یہ بھی ہو گا آپ کسی عورت کو پسند کرتے ہیں' لیکن جب اس سے خوبصورت عورت دیکھتے ہیں' تو اسے بھی پسند کریں گے!"

میں ہنس پڑا...... "ہونا تو یہی چاہیے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔ اور جب یہ ٹھیک ہے' تو پھر پختگی کیا' محبت کیا اور پیغام کیسا...... سب ڈھکوسلے ہیں۔ انسان فطرت کے ہاتھوں مجبور ہے۔"

"مگر اصل...... میں ایک بات پوچھتا ہوں۔ محبت کو لافانی جذبہ کیوں کہا گیا۔ ہمارے شاعر اور ادیب نے اسے کیوں سراہا......؟"

"اس لئے کہ ہمارے شاعر اور ادیب کے ذہن میں وہ تاثر ابھی تک موجود ہے جو صدیوں پرانا ادب اس کے لئے چھوڑ گیا ہے۔ محبت کے لئے مر مٹنے کے جذبات اس کے خون میں نہیں ہیں' تو اس کے خیالوں میں ضرور ہیں۔ کیونکہ یہ ان کا وارث ہے۔"

"یعنی آپ کا خیال ہے ہمارا شاعر اور ادیب روایات کا پجاری ہے؟"

وہ جوش سے بولی...... "پجاری کیا وہ روایات سے ڈرتا ہے۔ جو بات اس کے خون میں ہے' اسے کہنے کی ہمت نہیں' مگر جھوٹی شہرت کے لئے ان پامال راہوں پر چلتا ہے' جو اس کے قدم اس کے لئے منتخب کر چکے ہیں۔"

"گویا آپ کی نظر میں وہ تمام ادب بے کار ہے جو عورت کی محبت کے گن گاتا ہے؟"

"ہاں......!" وہ دعوے سے بولی...... "جن لوگوں نے ایسا ادب تخلیق کیا ہے' درحقیقت انہیں عورت نصیب ہی نہیں ہوئی۔"

"یعنی جو کچھ انہوں نے کہا ہے' محض تخیل ہے......؟"

"یقیناً...... میں سمجھتی ہوں' انہیں زندگی میں ایک آدھ جھنگی یا بھدی عورت کے سوا کچھ نہ ملا...... نامرادی نے نڈھال کر دیا' تو من کی تسلی کے لئے ایک ذہنی لیلیٰ کی تخلیق کی اور اس سے آسمانی روایات وابستہ کر دیں۔"

"اس کی وجہ......؟"

"اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا فنکار بھوکا ہے۔ روٹی کا بھی' عورت کا بھی' اسے آدھی روٹی ملتی ہے۔ نہ جی سکتا ہے۔ نہ مر سکتا ہے۔ اسے زندگی میں ایک آدھ عورت نصیب ہوتی ہے۔ اس کی ایک ایک رگ' ایک ایک نس اور ایک ایک روئیں کو ٹٹولتا ہے۔ جب کوئی راز باقی نہیں رہتا' تو تجسس اور راز جوئی کی خواہش بھٹکا کر اسے خیالوں کی وادی میں لے جاتی ہے۔ دراصل اس معاشرے میں تشنگی اور ناآسودگی مقدر ہے...... یہی وجہ ہے کہ ہمارے ادب میں لیلائے خیال کا راج ہے!"

"تو پھر آخر انسان کیا کرے......؟" میں نے جھنجلا کر کہا...... "کہاں جائے' کس سے ٹکر مارے...... کیا کرے؟"

"جو کچھ آپ کر رہے ہیں' جو کچھ میں کر رہی ہوں' آخر کیا کرتے ہیں۔ ہم کر ہی سکتے ہیں۔ بھٹکنا ہمارا مقدر ہے۔ بھٹک رہے ہیں اور بھٹکتے رہیں گے۔"

"مگر امثل ...... میں مقصد چاہتا ہوں مقصد ...... میں بہت بھٹک چکا ہوں ...... میں کہتا ہوں کہ اگر آپ کی بات میری سمجھ میں آ بھی گئی ہو' تو بھی میں مقصد چاہتا ہوں ...... مجھے تلاش سے نہ روکئے۔ میں آپ کے ساتھ کنوئیں میں گرنے کے لئے تیار ہوں۔ کیونکہ آپ کے ساتھ گرنے میں بھی ایک سچائی ہے' لیکن جو ذہانت مجھے کنوئیں میں گرا سکتی ہے' کنوئیں سے نکال بھی سکتی ہے ...... مجھے دھوپ اچھی لگتی ہے۔ مجھے ٹھنڈی اور خوشگوار ہوائیں اچھی لگتی ہیں۔ مجھے پھول اچھے لگتے ہیں اور چاندنی خوبصورت لگتی ہے ...... اور سب سے سوا کہ میں آپ کو جی بھر کر دیکھنا چاہتا ہوں!"

"اچھا ......" وہ چند لمحے غور سے مجھے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے بھائی کی طرف دیکھا۔ جو ٹیلیفون سے فارغ ہو کر اب ہوٹل کے منیجر سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ وہ یہ سب غیر ارادی طور پر کر رہی تھی ......

"اچھا" بھی اس نے تائید کے معنوں میں نہیں کہا تھا۔ بس ایسے ہی غیر شعوری لہجے میں۔

موسم کی خنکی لحہ بہ لحہ بڑھ رہی تھی۔

عاطف نے بیٹھتے ہوئے کہا ...... "لوگ خواہ مخواہ مری کی طرف بھاگتے ہیں۔ یہاں کس قدر سکون ہے۔ کتنی دلفریب خنکی ہے۔"

امثل نے بھائی کی طرف دیکھا ...... "ہر پرندہ اپنی مرضی کا گھونسلہ بناتا ہے۔ بھائی جان اور گھونسلے کے لئے اپنی پسند کا پیڑ انتخاب کرتا ہے۔ دنیا کے ہر شخص کی خواہش دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔"

"لیکن امثی ...... تم نے دیکھا ہو گا۔ ایک نسل کے پرندوں کے آشیانے ایک جیسے ہوتے ہیں۔"

"ہاں ...... اس پوری نسل کا عرفان ایک ہوتا ہے۔ اس لئے وہ انتظار سے بچے رہتے

ہیں' لیکن انسان کی نسل کو یہ عرفان ودیعت نہیں ہوا ...... اولاد' ماں باپ کے نقش قدم پر کبھی نہیں چلتی۔ کیونکہ اسے عرفان کی جگہ عقل ملی ہے ......!"

میں نے پوچھا ...... "آپ کے نزدیک عرفان اچھی چیز ہے یا عقل ......؟"

"عرفان تو وجدانی چیز ہے۔" وہ بولی ...... "الہام کو آپ کم تر کیسے کہہ سکتے ہیں۔ الہام تو خدا کا پیغام ہوتا ہے۔"

"اور عقل ......؟" میں نے پھر سوال کیا ......

"عقل تو طاقت کا نام ہے۔ جس کے پاس جتنی طاقت ہوگی' وہ اتنا طاقتور ہو گا۔ طاقتور ہونا بجائے خود ایک ترغیب ہے کہ طاقت کا استعمال بھی ہو!"

"عرفان بھی تو ایک طاقت ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں ......" وہ بولی ...... "مگر اس کے مزاج میں شر نہیں ہے۔ مثلاً ایک دن کے چوزے کا دانہ چگنے کا عرفان' افزائش نسل کے لئے پرندوں کا باہمی اتصال' لیکن انسان بالکل اسی فطری فعل کو سو لبادوں میں چھپا کر کرتا ہے۔ یہ سب عقل کی کارستانی ہے اور آپ اسے محبت کہتے ہیں!"

میں نے عاطف کی طرف دیکھا۔ وہ محجوب سا ہو رہا تھا' مگر مسکرا رہا تھا ...... ہوٹل کے برآمدے میں لگے ہوئے ایک بڑے بلب پر ہزاروں پروانے نثار ہو رہے تھے ...... مرنا بھی ایک عرفان ہے۔ شاید زندگی کا مقصد ہی مرنا ہے ...... زندگی کی انتہا موت ہے ...... ہاں ...... تو شاید زندگی کا مقصد ہی مرنا ہے' مقصد کے لئے مرنا۔"

مجھے خاموش پا کر عاطف بولا ...... "کافی پینا چاہیے۔ کیا خیال ہے۔ کتنا آئیڈیل موسم ہے۔"

"ہاں منگوا لیجئے بھائی جان۔" امثل نے تائید کی۔

کافی پی کر میں کچھ تازہ دم ہو گیا ...... اب میں پھر سفر کے لئے تیار تھا ...... ہمارے قریب کی ٹیبل پر ایک امریکن فیملی آ کر بیٹھ گئی۔ میاں بیوی اور دو بچے تھے۔ لڑکی کی عمر لگ بھگ سات برس اور لڑکا تین ساڑھے تین برس کا ہو گا۔ میاں بیوی دونوں کے قد

لمبے اور جسم چھریرے تھے۔ مرد نے نیلے رنگ کا پھول دار شوخ بش شرٹ پہنا ہوا تھا۔ عورت ہلکے زرد رنگ کے بلاؤز اور سکرٹ میں ملبوس تھی...... دونوں بچوں نے بھی شوخ رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ انہوں نے کولڈ ڈرنک کا آرڈر دیا...... میں نے آہستہ سے کہا۔

"کتنا مطمئن گھرانہ ہے' کتنا صبر' کتنی شانتی اور سکون ہے ان کے چہروں پر۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" امثل نے بظاہر تائید کی...... "تھکے ہوئے لوگوں کا انداز یہی ہوتا ہے۔ انہیں آرام چاہیے۔ آرام ملنے کے بعد ان کے چہرے ایسے ہی شانت اور مطمئن نظر آتے ہیں!"

"مگر امثل ان بچوں کو دیکھو۔ فرشتوں کی طرح معصوم' حوروں کے تصور کی طرح خوبصورت' سرخ سرخ گال' نیلی نیلی آنکھیں' پھول جیسے ناک' ایسے والدین کو اور کیا چاہیے۔ ایسے پیارے بچوں کی اپنائیت اور قربت میں کوئی احساس نہیں ہوگا!"

امثل نے میری طرف دیکھا...... خالی خالی نگاہوں سے' مگر وہ خاموش ہو گئی۔ کچھ دیر بعد بولی۔

"مجھے نیند آ رہی ہے' میں سونا چاہتی ہوں۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی' عاطف اور میں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا' مگر وہ شب بخیر کہہ کر چلی گئی۔ ہم دونوں بیٹھے رہے۔

"عجیب و غریب ہوتے ہیں اس لڑکی کے فیصلے۔" عاطف دھیرے سے بولا۔

میں نے خوش ہو کر کہا......" وہ کچھ محسوس کر کے گئی ہے۔ جیسے چوٹ کھا بیٹھی ہو۔"

"مگر وہ کسی سے ڈرتی تو ہے نہیں کہ چوٹ کھا کر بھاگ جائے۔ وہ ہر مصیبت کا سامنا کرنے والی لڑکی ہے۔"

"یہ بات نہیں عاطف' بعض دفعہ انسان اپنے آپ سے ڈر جاتا ہے۔ اصل خوف یہی ہوتا ہے۔ اپنے آپ سے انسان کب تک بھاگے گا......!"

عاطف میرا مطلب سمجھ گیا تھا۔ بولا...... "بعض لوگ اذیت پسند ہوتے ہیں۔ انہیں اپنے آپ سے بھاگنے میں لطف آتا ہے۔"

"اپنی اذیت پسندی ہی ان کے کام آئے گی...... کوئی کب تک بھاگے گا۔ بھاگتا رہے۔ ایک دن تھک جائے گا۔ رک جائے گا' وہ لمحہ ضرور آئے گا۔ جب وہ اپنی روح کے دکھ کو پالے گا!"

عاطف کی آنکھیں چمکنے لگیں...... "وسیم صاحب' آپ یہ بات امثل سے ضرور کہیں۔"

"میں امثل کے ساتھ ہوں عاطف' مگر سمجھانے سے آپ امثل کو کوئی بات نہیں سمجھا سکتے۔ وہ مضطرب روح ہے۔ کسی شاعر کی' کسی بڑے مصور کی' جو شعر نہیں کہہ سکتی' جو تصویر نہیں بنا سکتی...... وہ ایک ایسا آتش فشاں پہاڑ ہے' جس میں صدیوں سے لاوا ابل رہا ہو' مگر اگلنے کا راستہ نہ ہو۔ فطرت نے جانے کس مقصد کے لئے اس میں اضطراب بھر دیا ہے؟"

عاطف خوش تھا اور اپنے گال مسل رہا تھا۔

"وہ ابھی سوئے گی نہیں۔ کروٹیں بدلتی رہے گی۔ آج شاید ہی اس کی آنکھ لگ سکے۔"

"نہیں......!" میں نے تردید کی...... "امثل جیسی لڑکی کے لئے ایک جھٹکا کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس کے اعصاب اتنے کمزور نہیں ہیں۔ وہ تائید اور تردید کی اتنی پروا نہیں کرتی' ایک معمولی جذباتی واقعہ اس کی روح میں گھاؤ نہیں لگا سکتا۔"

صبح ناشتے پر اکٹھے ہونے سے پہلے عاطف نے مجھے بتایا...... "رات آپ نے ٹھیک کہا تھا۔ میں سونے کے لئے کمرے میں گیا' تو وہ بے خبر میٹھی نیند سو رہی تھی۔"

"ٹھیک ہے' وہ معمولی لڑکی نہیں ہے' غیر معمولی ہستی ہے۔ اسے ہم اتنی جلدی سے نہیں پکڑ سکتے!"

"ہم اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ ہم اس کا پیچھا کرتے رہیں گے۔ یہ ہمارے لئے مقدر ہو

چکا ہے!"

عاطف متذبذب تھا۔

"مجھے ڈر ہے آپ کہیں مایوس نہ ہو جائیں۔ آپ ہمارا ساتھ چھوڑ نہ دیں۔ میں۔۔۔"

"عاطف۔۔۔!" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔۔۔ "خدا سے لوگ مایوس نہیں ہوتے۔ وہ لوگوں کے کام آئے نہ آئے' لوگ اس کا آسرا نہیں چھوڑتے۔"

"ہاں ہاں۔۔۔" اس نے بے ساختہ سر ہلایا۔۔۔ "خدا سے لوگ مایوس نہیں ہوتے۔ خدا سے لوگ مایوس نہیں ہوتے۔"

عاطف کی آنکھیں یکبارگی چمکنے لگ گئی تھیں۔

میں نے سوچا۔۔۔ امید صرف غریب ہی کا آسرا نہیں ہوتی۔۔۔ یہ امیروں کے سینوں میں بھی ہلچل مچا دیتی ہے۔۔۔

ہم دونوں ڈائننگ ہال میں آ گئے۔ مغلیہ طرز کا یہ ہال بے حد نفیس اور ستھرا تھا۔ ہم بیٹھ گئے' تو ایک چاق و چوبند بیرا مؤدبانہ انداز میں جھکا۔

"سر۔۔۔! آپ کا ناشتہ تیار ہے۔ مس صاحبہ کو اطلاع کر دوں؟"

"ہاں۔" عاطف نے جواب دیا۔۔۔

ایک اور ٹیبل پر ایک اکیلا ہپی کافی پی رہا تھا۔ دو ٹیبل اور بھی مصروف تھے۔ باقی ہال خالی تھا۔۔۔ تھوڑی دیر میں امثل بھی آ گئی۔ آج وہ پھر سرخ قمیص اور سفید پتلون پہنے ہوئے تھی۔ اس کا چہرہ صاف اور شفاف تھا۔ سرخ قمیص میں اس کے چہرے کی ہلکی زردی' تازگی اور شگفتگی میں بدل گئی تھی اور وہ مسرور نظر آ رہی تھی۔۔۔ جب وہ کرسی پر بیٹھی' تو میں نے دیکھا کہ دنیا سے لاپروا اور اپنے آپ سے بے نیاز ہپی نے بھی اس پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔

دراصل امثل کی شخصیت اور بانکپن اس بات کے متقاضی تھے کہ جس کے سینے میں دل ہو وہ اس کا نوٹس لے۔۔۔ میں نے چھیڑنے کی خاطر کہا۔

"دیکھئے امثل' ہپی آپ کو پرشوق نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔"

امثل ہنس پڑی۔۔۔ "میری سرخ قمیص کو دیکھتا ہو گا۔ اسے ضرورت ہو' تو دے سکتی ہوں۔ آپ پوچھ لیجئے اس سے؟"

میں اٹھ کر اس کے پاس چلا گیا۔ اور بڑی نرمی سے کہا۔۔۔ "کیا آپ ہمارے ساتھ ناشتہ کرنا پسند کریں گے۔۔۔؟"

"نو نو۔ تھینکس۔۔۔ البتہ آپ کی کمپنی کر کے مجھے بہت خوشی ہو گی۔"

وہ اٹھ کر ہماری ٹیبل پر آ گیا۔ عاطف اور امثل نے اس سے ہاتھ ملایا۔ اس کی ڈاڑھی اور سر کے بال سرخ تھے۔ اس کے ہاتھ لمبے لمبے تھے۔ اور اس کی بھوری آنکھوں میں ایک عجیب سی متانت اور ٹھہراؤ تھا۔ وہ بہت مدھم لہجے میں بات کرتا تھا۔ امثل نے اس سے کہا۔۔۔ "میں نے ساتھیوں سے کہا کہ اگر ان کو میری سرخ قمیص کی ضرورت ہو' تو میں انہیں دے سکتی ہوں!"

"تھینکس۔ تھینکس۔" وہ بھی ہنس پڑا۔۔۔ "میں آپ کو دیکھ رہا تھا۔ آپ کی لبھا دینے والی شخصیت کو' قمیص کو میں کیا کروں گا۔ میں تو ننگے بدن بھی رہ سکتا ہوں۔"

"میری شخصیت میں کیا دھرا ہے۔ ایک عورت میں رکھا ہی کیا ہے۔۔۔ کتنی دیر آپ میری شخصیت سے مسحور رہ سکتے ہیں۔۔۔؟"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔" اس نے تائید کی "عورت کا طلسم بہت جلد ٹوٹ جاتا ہے۔ جس طرح ایک خوبصورت منظر کو ایک بار دیکھنے کے بعد انسان آگے سفر شروع کر دیتا ہے اور کسی نئے منظر کو دیکھنے کا متمنی ہوتا ہے' اسی طرح عورت کا ساتھ بھی تھوڑی سی مسافت کے بعد ختم ہو جاتا ہے!"

امثل نے فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھا۔

"ہاں۔۔۔ بیٹے۔۔۔ وسیم صاحب۔۔۔ جن لوگوں نے زندگی کو برتا ہے' وہ اس طرح نتائج حاصل کرتے ہیں' اور پھر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ اور زندگی کے میدان میں نکل آتے ہیں۔ یہ انسانوں کی تلاش میں نہیں ہوتے۔ بس خوبصورت مناظر ڈھونڈتے ہیں۔ کھوئے رہتے ہیں' بھٹکتے رہتے ہیں۔۔۔ یہی ہے انسان کی اصلیت۔۔۔!"

"امثل!" میں نے مشفقانہ لہجے میں کہا...... "میں نے سینکڑوں ہزاروں آدمیوں کو دیکھا ہے' جنہوں نے واقعی زندگی کو برتا ہے' لیکن مرنے کو ان کا بھی جی نہیں چاہتا...... اس کا مطلب یہ ہے۔"

"زندگی ضروری ہے......؟"

"مرنے کو تو یہ چپی بھی مرنا نہیں چاہتا' لیکن اس کا مطلب یہ کب نکلتا ہے کہ زندگی ضروری ہے۔ آپ دیکھئے...... آوارہ پھر رہا ہے۔ زندگی کی کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔ کسی آورش اور قدر پر یقین نہیں رکھتا۔ معاشرتی زندگی کے بوجھ سے آزاد گھر گھر پھرتا ہے۔ نہ نیکی کی تمنا رکھتا ہے اور نہ کسی کا حق چھیننے کا روادار ہے۔ آزاد پنچھی کی طرح بے مقصد پھریریاں لے رہا ہے۔ اب اس کے لئے زندگی کیا ضروری ہے......؟ اور موت اس کا کیا بگاڑ سکتی ہے......؟"

چپی تجسس اور سوالیہ نگاہوں سے ہم سب کی طرف باری باری دیکھ رہا تھا۔ میں نے امثل کا زاویہ نگاہ اس پر واضح کیا' تو وہ خوش ہو کر بولا۔

"ہاں مجھے مس سے اتفاق ہے' لیکن تھوڑا سا فرق ہے' ابھی وقت لگے گا۔ کیونکہ میں اپنا پیٹ بھرنے کے لئے عقاب کا سا رویہ اختیار نہیں کر سکتا۔ مجھے قانون کا ڈر ہے۔ قانون کی باز پرس کی وجہ سے میں اپنی فطرت کو کچل رہا ہوں۔ یہ اچھی بات نہیں' لیکن میں مجبور ہوں۔ قانون کو ماننے والے ابھی بہت زیادہ ہیں۔ اس لئے ہم اپنی منشاء کے مطابق زندگی نہیں گزار سکتے!"

میں نے اسے ٹوکا...... "آپ حیوان کی طرح زندگی گزارنے پر کیوں بضد ہیں۔ چیرنے پھاڑنے میں آخر کیا راحت ہے۔ فطرت نے آپ کو احساس اور جذبے کی جو دولت بخشی ہے' آپ اس سے اپنا دامن کیوں خالی کرنا چاہتے ہیں......؟ عقل سلیم کی برتری سے آپ کیوں خائف ہیں......؟ اپنی بہن اور بھائی اور ان کی اولاد سے آپ راہ فرار کیوں اختیار کرتے ہیں......؟ فطرت نے آپ کو محبت کی صلاحیت عطا کی ہے' تو آپ اس صلاحیت سے کام کیوں نہیں لیتے؟ زندگی سے فرار میں اگر کوئی مثبت پہلو نکلتا ہے' تو

مجھے قائل کیجئے؟"

چپی نہایت شگفتہ انداز میں مسکرایا......

"مجھے بھائی اور بہن سے محبت نہیں ہے۔ یہ بات میرے خون ہی میں نہیں ہے۔ آپ اسے مجھ پر زبردستی کیوں تھوپتے ہیں...... رشتے ناتے فضول قسم کی زنجیریں ہیں' جنہیں ہم توڑ چکے ہیں۔ یہ زنجیریں اس وقت تک ہوتی ہیں' جب تک ہم اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہوتے۔ آپ جانوروں کو دیکھتے ہی ہیں۔ جوان ہوتے ہی ماؤں اور باپوں سے الگ ہو جاتے ہیں...... یہ فطرتی جدائی ہے' زندگی سے فرار نہیں ہے!"

یا اللہ!...... میں سٹپٹا گیا...... کیا واقعی یہ انسان بول رہا ہے۔ کیا انسان کی اصلیت سچ مچ یہی ہے......؟

امثل مسکرا رہی تھی اور میری پریشانی سے محظوظ ہو رہی تھی۔ میں نے قدرے جھنجلا کر کہا۔

"آپ میری بے بسی کا مزا لے رہی ہیں۔ آپ کو ایک مدد ساتھی مل گیا ہے۔ آپ بہت خوش ہیں!"

"ہاں میں بہت خوش ہوں......" اس نے نہایت تسلی سے جواب دیا۔

"جب آدمی ہارتا ہے اور لاجواب ہو جاتا ہے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ دوسرا سچ کہتا ہے۔ ہارنے والا اس سے متفق ہو گیا ہے...... آپ نے اپنے آپ کو پہچان لیا ہے۔ اس لئے مجھے خوش ہونا چاہیے۔"

"ہرگز نہیں......!" میں نے تردید کی...... "میں کسی سے متفق نہیں ہوا۔ نہ آپ سے اور نہ آپ کے ساتھی سے' میں آپ کو خوش ضرور دیکھنا چاہتا ہوں' لیکن اگر انسان کی نفی کر کے آپ کو خوشی ملتی ہے' تو مجھے افسوس ہے کہ میں ایسی خوشی آپ کو نہیں دوں گا' آپ اپنے طور سے خوش رہیں۔ میرا اس خوشی سے کوئی تعلق نہیں ہوگا......!"

عاطف نے رحم طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھا' لیکن امثل اسی طرح پرسکون تھی۔

"آپ کے استقلال سے مجھے ہمدردی ہے۔ آدمی کو اسی طرح اٹل رہنا چاہیے۔ کیونکہ دنیا دار لوگ مصنوعی سچائی کے علمبردار ہوتے ہیں...... رہی میری خوشی' میں خوشی اور غم پر اعتقاد ہی نہیں رکھتی۔ خوشی آئے غم آئے۔ میں اسے محسوس ضرور کرتی ہوں' مگر یہ مستقل ساتھی نہیں ہوتے۔ مجھے تو اپنے سانس پر یقین نہیں ہے۔ کیا بھروسہ آئے نہ آئے۔"

عاطف نے گھبرا کر کہا...... "کیا ارادہ ہے۔ جیپ کافی دیر سے آئی کھڑی ہے؟"

"ہاں تو چلئے نا بھائی جان' خود آپ لوگ ہی تو بحث میں الجھ گئے۔"

ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے...... امثل نے پپی سے اجازت لی۔ مجھے اس سے یک گونہ خوشی ہوئی...... آج پھر ہمیں ایک نیا سفر درپیش تھا۔

ہوٹل سے نکلتے ہی چھاؤنی شروع ہو گئی۔ سڑک کے دائیں بائیں فوجی بیرکیں تھیں۔ بائیں ہاتھ کی بیرک کے سامنے فوجی ٹرک اور جیپیں کھڑی تھیں۔ کچھ سپاہی ڈانگریاں پہنے ان کی صفائی میں مصروف تھے۔

کوئٹہ کی صاف ستھری چھاؤنی ہمیں بہت اچھی لگی...... حنالیک اور اڑک کو جانے والی سڑک چھاؤنی کے عین بیچ میں سے گزرتی ہے۔ جیپ میں چلا رہا تھا۔ حسب معمول امثل ہم دونوں کے درمیان بیٹھی تھی۔ کچھ مارکیٹ پہنچ کر میں نے ایک سپاہی سے اڑک جانے والی سڑک کے متعلق پوچھا...... اس نے سارا نقشہ سمجھا دیا۔

اب ہم مطلوبہ سڑک پر آ گئے تھے۔

ہوٹل کے ڈائننگ ہال کی گفتگو پر مجھے کچھ ندامت سی ہو رہی تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میرا رویہ جارحانہ ہو گیا تھا۔ امثل کی مسرت سے میں چڑ گیا تھا اور اس کی خوشی کے

...ں کی نفی کی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میرے رویے میں سرکشی کی جھلک آ گئی تھی۔ ہو سکتا ہے اس کی وجہ وہ پپی ہو' جس کی منطق سے میں پریشان ہو گیا تھا اور جو دیکھتے ہی دیکھتے بساط الٹ رہا تھا۔

کچھ بھی ہو' میں نادم تھا اور اب خاموش تھا۔ عاطف بھی گمبھیر ہو گیا تھا...... ہاں امثل کے متعلق نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کے دل میں کیا تھا۔ اس نے سیاہ عینک لگا رکھی تھی...... اور سامنے دیکھ رہی تھی...... اب ہم چھاؤنی سے نکل رہے تھے۔

سامنے کوئٹہ کے خشک اور بلند پہاڑ نظر آ رہے تھے۔ دور سے ان کا رنگ سرمئی ہو رہا تھا...... جہاں سڑک پہاڑوں میں گم ہو گئی تھی' وہاں آمنے سامنے کے دونوں پہاڑ اس طرح ایک دوسرے کے گلے مل گئے تھے جیسے دو قوی ہیکل بھینسے سر ٹکرا کر لڑ رہے ہوں۔

جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے' توں توں یہ بھینسے پیچھے ہٹتے جا رہے تھے۔ ان کا فاصلہ برابر بڑھ رہا تھا...... جب ہم قریب پہنچے' تو دونوں پہاڑوں کے درمیان ایم کیلی ندی ایسے لگی' جیسے اونٹ کے جبڑوں کے درمیان زبان۔ کچھ اور آگے بڑھے' تو بائیں ہاتھ کی پہاڑی پر موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا۔

"وزٹ حنالیک!"

یہاں سے ایک سڑک سیدھی اڑک کے چشموں کی طرف نکلتی ہے اور دوسری بائیں ہاتھ کو حنالیک کی طرف...... اڑک کی نسبت حنالیک نزدیک تھی۔ اس لئے ہم ادھر مڑ گئے...... اب ہلکی ہلکی چڑھائی شروع ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہم اوپر پہنچ گئے۔

خشک پہاڑوں کے درمیان دو ڈھائی میل کے احاطے میں پھیلی ہوئی حنا کی یہ مصنوعی جھیل واقعی غنیمت تھی۔

کنٹین سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ہم جیپ کھڑی کر کے باہر نکل آئے۔ سرکاری عملے کے سوا اور کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ حنا کی جھیل پر آج سب سے پہلے پہنچنے والے سیاح ہم تھے۔ بائیں ہاتھ اونچا پہاڑ تھا۔ دائیں ہاتھ کو تھوڑی سی اترائی کے بعد جھیل تھی۔

کنٹین اور جھیل کے درمیان کی ڈھلان پر چھوٹے چھوٹے پلاٹ بنے ہوئے تھے' جن میں سبز گھاس لگی ہوئی تھی۔ بچوں کے کھیل کود کے لئے بھی مختلف دلچسپیاں تھیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ مختصر سا پارک تھا۔ جھیل تک اترنے کے لئے خوبصورت روشیں بنی ہوئی تھیں۔ کنارے پر تین چار چھوٹی چھوٹی کشتیاں بھی کھڑی تھیں۔ امثل کشتیاں دیکھ کر بولی------

"لیجئے صاحب' یہاں تو کشتی میں سیر بھی کی جا سکتی ہے۔"

کنٹین کا عملہ دیکھ رہا تھا۔ دو آدمی کشتیوں کی طرف اتر گئے------ یہ ملاح تھے اور اس امید پر نیچے اتر گئے تھے کہ شاید ہم کشتی میں بیٹھ کر جھیل کی سیر کریں۔

اور یہ امر واقعہ ہے کہ خشک پہاڑوں کی اس مصنوعی جھیل میں کشتی میں بیٹھ کر سیر کرنا بہت بڑی عیاشی تھی۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ حنالیک جا کر وہاں کشتی میں بیٹھ کر سیر نہ کرنا جھیل بنانے والوں کے ساتھ بہت بڑی زیادتی تھی۔

چار روپیہ فی گھنٹہ بھی زیادہ نہ تھا۔ ہمیں نیچے اترتا دیکھ کر ملاحوں کی باچھیں کھل گئیں اور وہ جلدی جلدی تکیے ٹھیک کرنے لگے۔ ہم کشتی میں بیٹھ گئے' تو ملاح نے پوچھا۔

"صاحب' ادھر سامنے پہاڑی کی طرف جائیں گے یا جھیل کا پورا چکر لگائیں گے؟"

"پہاڑی کی طرف چلو۔ وہ جھیل کے درمیان جو پہاڑیاں ہیں' وہیں اتریں گے۔ پیدل اوپر جائیں گے' تھوڑی دیر گھومیں گے' پھر واپس آ جائیں گے۔" امثل نے اس سے کہا۔

ملاح نے ناؤ کو دھکیلا------ ناؤ آہستہ آہستہ سینہ آب پر رواں ہو گئی۔ پانی کی تہہ میں سبز کائی نظر آ رہی تھی۔ جس کی وجہ سے پانی کا رنگ بھی سبزی مائل نظر آ رہا تھا۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے' پانی گہرا اور گھمبیر ہوتا جا رہا تھا۔ مصنوعی جھیل اب پراسرار ہوتی جا رہی تھی۔ چاروں طرف سے احاطہ کئے ہوئے پانی کی عظمت اب یکایک محسوس ہونے لگی' لیکن امثل ایک طرف کو جھکی ہوئی ہاتھ سے جھیل کے پانیوں کو چیر رہی تھی اور موتیوں کی طرح کٹتے ہوئے پانی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

ملاح چپو چلا رہا تھا اور امثل کے کھیل سے محظوظ ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہم اٹھ

کی شکل کی گول پہاڑی کے دامن میں پہنچ گئے------ ملاح نے کشتی کنارے لگائی۔ ہم تینوں چھلانگ لگا کر اتر گئے۔ اوپر جانے کے لئے پگڈنڈیاں بنی ہوئی تھیں------

اوپر اچھا خاصا لان بنا ہوا تھا۔ پتھر کی پکی چھتریاں اور ان کے نیچے پتھر ہی کی بنی ہوئی کرسیاں تھیں۔ امثل لپک کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی------

"واہ------ خوب! اتنا ڈھیر سارا پانی' ان پہاڑوں میں سمندر تو آ نہیں سکتا۔ وزات حنالیک' کوئی ایسا برا بھی نہیں ہے۔"

"کیا برا ہے۔" میں نے بظاہر اس کی تائید کی------ "جن لوگوں نے سمندر نہیں دیکھا' دریا نہیں دیکھے' ان کے لئے تو حنالیک سمندر ہی ہے۔"

"ہاں------" وہ ہنس پڑی' "وہ کنوئیں والا مینڈک' بے چارہ اپنے خول میں بند' کنوئیں کی پہنائیوں پر نازاں' دراصل جو اپنے خول سے باہر آ گیا' مر گیا!"

"کیسے مر گیا------؟" عاطف نے چونک کر پوچھا۔

"جیسے ہم------!" امثل نے جواب دیا------ "بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ سرگرداں ہیں۔ مرنا اور کیا ہوتا ہے------ نہ منزل نہ ٹھکانہ' گھوم رہے ہیں۔ خول سے باہر آنے کا نتیجہ ہے یہ!"

"ہم کچھ تلاش کر رہے ہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹی' ہم جستجو میں ہیں۔ ہم پالیں گے ایک دن۔ یہ میرا ایمان ہے۔ ڈھونڈنے والا ضرور پاتا ہے۔"

"ہاں------ آپ پالیں گے عنقا کو۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی------ "ہم عنقا کی تلاش میں ہیں۔ آپ ضرور عنقا کو پالیں گے------!"

اس نے ایک چھوٹا سا پتھر اٹھا کر جھیل میں پھینکا۔ ایک چھوٹا سا بھنور چاروں طرف پھیل گیا۔ اس کی ننھی ننھی لہریں دھیرے دھیرے سینہ آب میں تحلیل ہو گئیں۔

"آپ نے یہ ننھا سا بھنور دیکھا نا وسیم صاحب------ یہ ننھی ننھی لہریں' جو ابھی تھیں ابھی نہیں ہیں۔ آپ ان کی تلاش میں ہیں۔ آپ انہیں ضرور پالیں گے------!"

میں چند لمحے اس کی ننھی سی ناک کو تکتا رہا۔ پھر مسکرا کر بولا۔

"شاید میں ان لہروں کو نہ پا سکوں' مگر ان لہروں کی محرک قوت کی تلاش جاری رکھ سکتا ہوں۔ اس پتھر کو ڈھونڈ سکتا ہوں' جس نے سطح آب کو متزلزل کر دیا تھا اور اس ہاتھ کو بھی' جس نے اس پتھر کو اس کام کے لئے اکسایا تھا...... اور اس خواہش کو بھی' جس نے اس ہاتھ کو متحرک کر دیا تھا......!"

"تخیل پرستی محض تخیل پرستی...... آدمی سے زیادہ دنیا اسی کے سہارے جیتی ہے۔"

"منظر پرستی اور خیال پرستی میں آخر کیا فرق ہوتا ہے امل......؟"

"منظر ایک حقیقت ہوتا ہے۔ خوبصورت منظر سے من میں گدگدی پیدا ہوتی ہے۔"

"خوبصورت خیال سے بھی من میں گدگدی پیدا ہوتی ہے۔"

"ہاں...... لیکن منفی گداز روح کو قوت نہیں بخشتا۔ وقتی تسلی کس کام کی' عارضی شادابی میں نمو نہیں ہوتی۔ پانی کے چند قطروں سے بیج نہیں پھوٹتے۔ خیال محض جاڑے کی چاندنی ہیں!"

اس نے پھر ایک پتھر اٹھا کر پھینکا اور اس کا خوبصورت جسم لچکا گیا۔ میں اس لمحے سوچ رہا تھا' یہ لڑکی نادانستہ روح کے اندر کی سیر کرا دیتی ہے۔ یہ کام انسان خود نہیں کر سکتا۔ اکیلا آدمی اپنی روح میں نہیں اتر سکتا......

تخیل پرستی کی منفی تسکین کے بخیے اس نے دو لفظوں میں ادھیڑ دیئے تھے۔

عاطف کے ہاتھ میں کوئی کتاب تھی۔ مجھے چپ پا کر اس نے کتاب بند کر دی۔ ہماری نظریں ٹکرائیں۔ عاطف کی نگاہوں میں سوال تھا' لیکن میرے چہرے پر شاید بے قراری نہیں تھی۔ اس لئے وہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ پھر بھی جیسے چپ رہنے کی وجہ سمجھنا چاہ رہا ہو...... میں دل میں سوچ رہا تھا......

"عاطف' میں تجھے کیسے سمجھاؤں کہ ہماری نسل زندگی کے اس موڑ پر آ گئی ہے' جس کی آرزو نہ جانے بہترین انسانوں کی کتنی نسلوں نے کی ہوگی...... اب لوگ ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک کر ایک دوسرے کے ذہن کا ایکسرے لے لیتے ہیں۔ پہلے

زمانے میں لوگ عالم پیری میں بالغ نظر ہوتے تھے' اب نوجوانی میں بلوغت سے آگے نکل جاتے ہیں۔ ذہانت نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ خطہ ارض بہت سکڑ گیا ہے...... یہ خطرے کی علامت ہے۔ شاید امل ٹھیک کہتی ہے!"

"آپ خاموش کیوں ہو گئے وسیم صاحب؟" امل نے مڑ کر دیکھا...... "آیئے نا یہاں آیئے...... بھائی جان آپ بھی آیئے۔ یہ پانی کی ہلکی ہلکی لہروں کو دیکھئے۔ کسی دوشیزہ کی نرم نرم' نازک نازک انگلیوں کی طرح کتنا اچھا لگتا ہے۔ ہے نا؟"

"ہاں......" میں نے مسکرا کر کہا...... "کبھی کبھی ہماری سوچیں بڑی بے درد ہو جاتی ہیں۔ ویسے میں ایک عجیب بھاگ دوڑ سی لگی رہتی ہے اور ہمیں خبر بھی نہیں ہوتی کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے' زندگی کے لئے ملا ہے۔"

اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور اچانک ہنس پڑی۔

"ٹھیک ہے۔ یہی تو بات ہے کہ میں آپ کی معیت میں بور نہیں ہوتی۔" یہ ایک ہلکا سا اعتراف تھا' مگر اس میں ذرا بھی سنجیدگی نہیں تھی۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"جو بات میں دل کی گہرائیوں سے کہتا ہوں' وہ بھی آپ کو مذاق لگتی ہے۔ افسوس ہے کہ میں آپ کو سمجھا بھی نہیں سکتا کہ حقیقت کیا ہے۔"

اس نے پتھر اٹھا کر پھینکا......

"دل کی گہرائیاں ہوتیں' تو آپ کے ساتھ ضرور اترتی۔ ہم جہلا ہیں' یہ بڑی ٹھیک جگہ ہے۔ سفر جاری ہے۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

"امل!" میں بظاہر مسکرا رہا تھا۔ مگر میری آواز گمبھیر ہو گئی تھی...... میں سمجھتا ہوں کہ آپ' اپنے سینے میں چھپائے ہوئے جذبات کے موتیوں سے ایک موتی بھی لٹانے کے لئے تیار نہیں!"

اس نے میری طرف دیکھا۔ شاید میرا اندازہ غلط ہو...... لیکن اس کی گول گول آنکھوں میں ایک سوگوار تاثر تھا۔

"میرے سینے میں کچھ نہیں' میرا دامن خالی ہے۔ کسی کے پاس بھی کچھ نہیں ہوتا۔

کوئی بھی کچھ نہیں لٹا سکتا۔ آپ کتابیں نہ پڑھتے' تو بے حد مطمئن آدمی ہوتے۔ ہم ذمہ داریوں کی باتیں کرتے ہیں۔ حالانکہ ہم بالکل ذمہ دار نہیں۔ ہم جذبات کی باتیں کرتے ہیں۔ حالانکہ ہم بالکل درندے ہیں۔ افسوس ہے کہ آپ نے کتابوں سے لفظ چرا لئے ہیں۔ اب ان الفاظ کے مفہوم اور نتائج کے لئے سرگرداں ہیں' مگر نتیجہ کہاں سے ملے گا؟ سرابوں سے کبھی پیاس بجھتی ہے------!؟"

مجھے محسوس ہوا کہ مجھ میں سکت آ رہی ہے------

"چلئے۔ میں الفاظ کا پیچھا چھوڑ دیتا ہوں۔" میں نے اعتماد سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"میں الفاظ کا نہیں آدمی کا پیچھا کرتا ہوں۔ الفاظ نتائج سے عاری ہوتے ہیں' لیکن آدمی اور آدمی کا سامنا بے نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ بلبل کی چہکار کو آپ لفظ نہیں کہیں گی۔ پپیہے کی پی پی کو آپ راگ کہیں گی' روگ نہیں۔ یہ چہکار زندگی ہے' اور یہ راگ زندگی کا راگ ہے------ کیا اس سطح پر آدمی سے آدمی نہیں مل سکتا------؟"

"کیوں نہیں------" اس نے سبک لہجے میں کہا------ "یہ حیوانی سطح ہے۔ افزائش نسل کا ایک بہانہ' اس کے لئے دلائل اور وسائل ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم اصل میں یہی تو ہیں!"

میرے پاؤں تلے سے ایک بار پھر زمین کھسک رہی تھی۔ عاطف نے میری طرف دیکھا اور آنکھیں جھکا لیں۔ میں تو خیر بے بس تھا ہی' مگر اس کی بے بسی بھی قابل رحم تھی------

دراصل ہم دونوں ہی قابل رحم تھے۔

ہم دونوں کی چاہت کے رنگ مختلف تھے' مگر شدت ایک جیسی تھی۔ امثل جیسی زیرک لڑکی سے ہمارے دلوں کی بات مخفی تو نہیں رہ سکتی تھی' لیکن اس کا کردار اتنا عجیب و غریب تھا کہ اظہار تمنا اور خلوص کے کوئی معنی ہی نہیں رہ گئے تھے۔ اسے نہ ان باتوں کی پروا تھی نہ ضرورت اور نہ ہمدردی------ یہی کیا کم تھا کہ وہ ہم دونوں کو

برداشت کرتی تھی اور دل کھول کر رکھ دیتی تھی۔ وہ تو کسی کے ساتھ ایک قدم رکھنے کی روادار نہیں تھی۔

میں سوچتا------ یہی غنیمت ہے کہ میں اس کے ساتھ ہوں۔

ہم کشتی میں واپس آ رہے تھے۔ وہ برابر کشتی کے کنارے سے لگی پانی سے کھیل رہی تھی۔ اسے ذرا بھی خبر نہیں تھی کہ ہم کیا سوچ رہے ہیں اور کس اذیت میں مبتلا ہیں------ اور ہمارے دل کتنے بھاری ہیں۔

کنارے پر اترے تو اوپر ایک کار آ کر رک گئی تھی۔ ہم تینوں ادھر متوجہ ہو گئے۔ ایک عورت دو بچے اور ایک مرد کار سے نکل آئے۔ عاطف چونکا۔

"یہ تو ذکی الدین لگتا ہے۔ سی ایس پی' شاید یہاں بدلی ہو گئی ہو۔"

امثل ہنس پڑی۔

"تب تو آپ کے دوست ہوں گے بھائی جان؟"

"ارے لنگوٹیا۔ ایک ہی کالج میں پڑھتے رہے ہیں۔ مجھ سے ایک سال آگے تھا۔ بڑا گھو------ مگر تھا بہت ذہین۔"

اوپر پہنچے تو دونوں نے ایک دوسرے کو للکارا اور بے ساختہ گلے لگ گئے۔ عاطف نے کہا۔

"یار تم تو کہیں اسسٹنٹ کمشنر تھے' فرنٹیر میں غالباً۔ یہاں کیسے؟"

ذکی الدین مسکرایا۔

"ذرا دھیرے سے یار' ذرا دھیرے سے' سارا ڈسپلن خراب ہو رہا ہے۔ دیکھتے نہیں یہاں کا سارا اسٹاف دم سادھے کھڑا ہے۔ بھئی میں یہاں کا ڈپٹی کمشنر ہوں------!"

"ارے------!" عاطف نے اس کے سینے پر ہلکا سا گھونسا جمایا------ "تم اور ضلع بھر کے ڈپٹی کمشنر؟"

"ہوں یار' سچ کہہ رہا ہوں۔ ذرا تمیز سے بولو' آؤ تمہیں بیوی سے ملاؤں۔"

"مین' یہ میرے کالج کا دوست ہے عاطف۔"

ڈپٹی کمشنر کی بیوی نے عاطف کو سلام کیا...... عاطف ہماری طرف متوجہ ہوا......

"بھئی آؤنا...... دیکھا ہم نے نیچے سے ہی پہچان لیا تھا...... یار ذکی' یہ میری بہن ہے امل اور یہ ہمارے دوست وسیم۔"

میں نے ڈپٹی کمشنر سے ہاتھ ملایا۔ امل نے بھی سلام کیا اور بچوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

عاطف نے کہا...... "یار کمال ہے' ڈپٹی کمشنر تو خیر ہو ہی گئے ہو' لیکن اتنے پیارے پیارے بچوں کے باپ کیسے بن گئے......!"

"شٹ اپ!" ڈپٹی کمشنر ہنسا۔

"دراصل بات یہ ہے۔" عاطف نے کہا...... "سی ایس پی بن جانے کے بعد بیویاں تو اچھی مل ہی جاتی ہیں۔ بچے دونوں بھابی پر گئے ہیں۔"

ہم سب ہنس رہے تھے۔ عاطف کی شوخی ذرا کم ہوئی' تو ڈپٹی کمشنر بولا۔

"بھئی کوئٹہ کب آئے ہو۔ کیسے گھوم رہے ہو؟"

عاطف ہی اس سے مخاطب تھا...... "سیر کر رہے ہیں۔ سیزن منا رہے ہیں۔ باپ دادا کی کمائی پر عیش کر رہے ہیں۔ تمہاری طرح ملازم تھوڑے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔ میں جانتا ہوں۔" ڈپٹی کمشنر زچ ہو کر بولا...... "لیکن خدا کے بندے' ذرا تو سنجیدہ ہو جاؤ۔ یہ تمہاری بہن اور تمہارے دوست کیا کہیں گے کہ کیا واقعی ڈپٹی کمشنر ایسے ہوتے ہیں۔"

ڈپٹی کمشنر کی خوبصورت بیوی پہلی بار کھل کر ہنسی۔ ہلکے پیازی رنگ کی ساڑھی میں ملبوس' یہ خوش پوش اور خوش ادا عورت ہنستے ہوئے بہت اچھی لگی۔

ڈپٹی کمشنر بولا۔

"لو...... اب تو بس کرو۔ میری بیوی بھی مجھ پر ہنسنے لگ گئی ہے۔"

"یار بہت سالوں کے بعد ملے ہو۔ دل چاہتا ہے کہ تم سے کشتی لڑوں یعنی ڈپٹی کمشنر سے' کمال ہے۔ کالج کے زمانے میں ہم لوگ کتنے غیر ذمہ دار ہوتے ہیں۔ کیا کیا حرکتیں

کرتے ہیں اور بعد میں ڈپٹی کمشنر بن جاتے ہیں۔"

امل نے مداخلت کی...... "بھائی جان' ان سے کوئی وقت طے کر لیجئے اور پھر دل کی بھڑاس نکال لیجئے۔ یہ سب کے سامنے آپ واقعی زیادتی کر رہے ہیں۔"

"اچھا یار ٹھیک ہے۔ ہم چلتے ہیں۔ شام کو ڈنر تمہارے ساتھ کریں گے' لارڈز میں۔ موٹر بھیج دینا۔"

"لیکن آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں...... پروگرام تو بتایا نہیں......؟" ڈپٹی کمشنر نے پوچھا۔

"پروگرام نہیں بتا سکتے۔" عاطف نے مسکرا کر ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ "میرے ساتھی بڑے انوکھے لوگ ہیں۔ یہ دوسروں کی نہیں سنتے۔ اپنی سنانے کے عادی ہیں۔ مجھے ان کی مرضی سے چلنا پڑتا ہے۔"

"خیر ٹھیک ہے۔ مگر ڈنر پر ضرور آنا۔"

سب نے ایک دوسرے کو سلام کیا۔ امل نے بچوں کو پیار کیا۔ اور ہم جیپ میں بیٹھ گئے...... کچھ دیر بعد ہم اڑک جانے والی سڑک پر آ گئے' تو میں نے ہنس کر کہا......

"عاطف آپ تو چھپے رستم نکلے۔"

امل بھی ہنسنے لگی...... "میں نے پہلی بار بھائی جان کو اتنی ترنگ میں دیکھا ہے۔ بے چارہ ڈپٹی کمشنر۔"

"دراصل بات یہ ہے۔" عاطف بھی ہنسنے لگا...... "ذکی میرا بہت ہی کلوز فرینڈ تھا۔ ہم نے مل کر بہت وارداتیں کی ہیں۔ یہ جوڑ توڑ کا بہت ماہر تھا۔ لڑنے سے بھی نہیں کتراتا تھا۔ اس کی شرارتیں اور اب ڈپٹی کمشنری' مجھے تو یقین ہی نہیں آتا۔ کتنا سنجیدہ اور بااختیار عہدہ ہے ذکی جیسے کھلنڈرے کے پاس۔"

"کالج میں یہی ہوتا ہے۔ سبھی کھلنڈرے ہوتے ہیں۔ یہی لوگ آگے جا کر قوم کے معمار بن جاتے ہیں۔"

"بھائی جان' اپنے بارے میں تو سوچتے نہیں۔ کتنا بڑا کاروبار سنبھال رکھا ہے۔ کتنی

بڑی جائیداد کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ آپ بھی تو انہیں کے ساتھی تھے اور اب کیا ہے۔ وکیل اور کچہری کا آپ کو تجربہ' بزنس کے اتار چڑھاؤ کا آپ کو شعور' سماجی اور دنیاوی تعلقات پر آپ کی نظر' زندگی کا کونسا شعبہ ہے' جو آپ کی حد نظر سے باہر ہے۔ پھر ایک سرکاری افسر بننا کونسا مسئلہ ہے۔"

"ہاں یہ تو سب ٹھیک ہے۔" عاطف نے تائید کی...... "ممکن ہے بہت ہی اچھا افسر ہو' مگر اسے دیکھ کر مجھے ہنسی آتی ہے۔ ایک دفعہ ہم دونوں نے مل کر ایک لڑکے کو پیٹا تھا۔ بات بہت بڑھ گئی تھی۔ بڑی مشکل سے کالج سے نکلتے نکلتے بچے تھے۔ اب یاد آتا ہے تو عجیب سا لگتا ہے۔"

سامنے سے اونٹوں کی ایک قطار چلی آ رہی تھی۔ ایک ساربان نے اگلے اونٹ کی مہار پکڑ رکھی تھی۔ باقی کے ساربان اونٹوں پر سوار تھے۔ پچھلے تمام اونٹوں کی مہاریں' ہر اگلے اونٹ کی دم سے بندھی ہوئی تھیں۔ ایک چھوٹی سی نکیل کی بدولت یہ دیو قامت جانور نہایت فرمانبرداری سے سڑک کے کنارے قطار میں جا رہے تھے۔ ہماری جیپ پاس سے گزری' مگر اونٹوں نے ذرا بھی نوٹس نہ لیا۔ میں نے امل کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اونٹ اور سارس کو ابھی تک علم نہیں ہوا کہ حضرت سلیمانؑ کی بادشاہت ختم ہو گئی ہے۔ اس لئے یہ دونوں جانور ابھی تک قطار میں چلتے اور اڑتے ہیں!"

امل نے پوچھا...... "اس کا مطلب......؟"

میں نے مسکرا کر کہا...... "یہ ایک روایت ہے۔ مجھے بچپن میں بتایا گیا تھا کہ سلیمان علیہ السلام نے انس' جن' چرند' پرند' درند' ہر جاندار پر حکومت کی ہے۔ روئے زمین کی ہر چیز ان کی تابع تھی اور ان کا اتنا جاہ و دبدبہ تھا کہ دنیا کا ہر جاندار نظم و نسق کا عادی ہو گیا تھا' لیکن جونہی ان کے وصال کی خبر پھیل گئی' ہر جاندار باغی اور منتشر ہو گیا...... صرف اونٹ اور سارس ہی اتنے سادہ دل نکلے کہ ابھی تک پابند کارواں ہیں۔" امل اور عاطف ہنسنے لگے۔

"روایت بری نہیں ہے۔" امل بولی...... "چڑھتے سورج کی پوجا اور پھر اچانک

بغاوت اور انتشار' فطرت انسانی کے عین مطابق ہیں۔ روایت صحیح نہ بھی ہو' تو بھی میں اسے مانتی ہوں۔"

"یہ بھی تو ہے۔" عاطف نے گویا تائید کی...... "کہ دنیا ہمیشہ طاقت کے زیر نگیں رہی۔"

"یہ تو ہر زمانے کا سچ ہے۔ طاقت آج بھی سچائی ہے...... طاقت چاہے رستم کی شکل میں ہو' چاہے ایٹم بم کی صورت میں' طاقت کھلتی بھی ہے۔ مگر میں تو کہوں گی...... یہ سچی سچائی ہے۔ چونکہ لفظ سچائی کا ایک مخصوص مفہوم موجود ہے۔ ورنہ تو میں اسے دھاندلی کہتی!"

اب ہماری جیپ ایسی جگہ پہنچی' جہاں سڑک کے دونوں طرف سیب کے باغات تھے۔ سیب کے درختوں کی شاخیں سڑک کی طرف نکل آئی تھیں اور ان پر سرخ سیب انگور کے گچھوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ باغ دور دور تک پھیلے ہوئے تھے اور سرخ سیبوں سے لدے ہوئے تھے۔ میں نے جیپ روک لی۔ ہم سب نے درخت میں لگا ہوا سیب پہلی بار دیکھا تھا اور بہت اچھا لگ رہا تھا۔ شہر کے رہنے والوں کے لئے یہ واقعی دلفریب نظارہ تھا۔

ہمارے دل مچلنے لگے۔ یہ خواہش کہ خود درخت سے توڑ کر سیب کھائیں اور دیکھیں کہ تازہ تازہ سیب اتار کر کھانے میں کیسا لگتا ہے' مگر دور دور تک کوئی آدمی دکھائی نہ دیا۔ اور بغیر اجازت باغ میں داخل ہونا مناسب نہ تھا۔

ہم دوبارہ جیپ میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ تین چار بچے جن کی عمریں دس گیارہ سال سے زیادہ نہ ہوں گی' مل گئے۔ ہم نے جیپ روک کر مدعا ظاہر کیا تو وہ ہنسنے لگے اور نفی میں سر ہلانے لگے۔

"سیب نہیں ہے۔ سیب نہیں ہے!"

امل نے ہنس کر کہا...... "کیوں نہیں ہے۔ ہمیں تو نظر آ رہا ہے۔ اتنے ڈھیر سارے سیب ہیں۔ ہم اپنے ہاتھوں سے توڑیں گے۔ تم جتنا پیسہ مانگتے ہو لے لو۔"

"نہیں میم صاحب۔ ہم سیب نہیں بیچتا۔" اچانک درختوں کے بیچ میں سے ایک سفید ریش آدمی دکھائی دیا...... "ہم نے باغ بیچ دیا ہے۔ اب یہ سارا پھل ٹھیکیدار کا ہے۔ ہم صرف رکھوالی کرتا ہے۔ ہم پر ایک دانہ بھی حرام ہے۔ ہم کو افسوس ہے۔ ہم آپ کا شوق پورا نہیں کر سکتا۔"

ہم نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

میں نے فخر سے کہا...... "یہ ہوتا ہے انسان......!"

"ہاں یہ ہوتا ہے انسان......" امثل نے جواب دیا..... "لیکن میں یقین سے کہتی ہوں کہ یہ شخص اس علاقے سے کبھی باہر نہیں گیا۔ اس کا تعلق بہت کم انسانوں سے رہا ہوگا۔ اسے زندگی میں اپنے باغ سے فرصت ہی نہ ملی ہوگی۔ اسے انسان کی فطرت سے واسطہ نہ پڑا ہوگا۔ ورنہ یہ اتنا معصوم ہرگز ہرگز نہ ہوتا۔"

میں نے ہنس کر کہا...... "اس کی اپنی بھی تو ایک فطرت ہوگی۔ اگر یہ معصوم رہ سکتا ہے' تو اس کا مطلب ہے' انسانی فطرت میں معصوم رہ سکنے کی گنجائش اور لچک ہے' پھر تو ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔"

"یہاں معصوم لوگ نہیں ہیں۔ اس لئے ہم مایوس ہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ اس دنیا میں بہت معصوم لوگ ہیں۔ اوتار' پیغمبر' اولیا یہ سب لوگ انسان کی بہترین نسلوں کے بہترین نمائندے تھے' مگر بہترین اصولوں کے پرچار کے باوجود دنیا میں امن نہ لا سکے۔ تسلی اور سکون کا دور دورہ نہ لا سکے۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ مخلص نہ تھے۔ یقیناً وہ مخلص تھے' لیکن افسوس ہے کہ بنیادی طور پر انسان کے کردار میں کمزوریاں ہیں۔ نیکی اور محبت سے یہ کمزوریاں وقتی طور پر دب جاتی ہیں' مگر ختم نہیں ہوتیں۔ جن لوگوں کو ان کمزوریوں سے واسطہ نہیں پڑتا' وہ باغ کے رکھوالے کی طرح معصوم رہ جاتے ہیں' اور جو زندگی کے بازار میں نکلتے ہیں' مایوس ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اس بازار میں کھرا سودا نہیں ملتا۔"

میں نے کہا...... "لیکن مایوسی کا مطلب یہ کب نکلتا ہے کہ انسان نیکی کرنے پر اعتقاد

چھوڑ دے...... دنیا میں دو ہی رستے ہیں۔ نیکی کا اور بدی کا۔ یہ تو بہت عجیب ہوگا کہ اگر انسان نیکی کی توفیق نہیں رکھتا' تو بدی کی راہ پر چل پڑے۔ آخر انتخاب تو کرنا پڑے گا...... ایسی بھی کیا مصیبت ہے کہ آدمی جان کر دھوکے کی طرف جائے اور روشنی سے آنکھیں بند کرے؟"

"آپ کونسی روشنی کی بات کر رہے ہیں......؟" امثل سوالیہ لہجے میں بولی۔

مگر ابھی وہ بات پوری نہ کر پائی تھی کہ عاطف درمیان میں بول پڑا......

"سیب تو ملنے سے رہے۔ ہم جیپ میں بیٹھ کر بحث جاری رکھ سکتے ہیں۔ شام تک واپس بھی آنا ہے۔"

ہم اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ امثل حسب معمول ہمارے درمیان تھی۔ سڑک پر ٹریفک زیادہ نہیں تھی۔ یوں بھی سڑک سیدھی ہموار تھی۔ دائیں بائیں خشک پہاڑوں کے سلسلے تھے...... یہ باغ اڑک کی طرف سے آنے والے چشموں کے مرہون منت تھے۔

میں نے چھیڑنے کی خاطر کہا۔ "آپ کس روشنی کی بات کر رہی تھیں......؟"

"میں نہیں آپ کر رہے تھے۔ آپ روشنی سے آنکھیں بند نہ کرنے کی تلقین کر رہے تھے...... میں نے پوچھا تھا۔ آپ کونسی روشنی کی بات کر رہے ہیں......؟ کیسی صبح کے منتظر ہیں......؟ کیونکہ روشنی یہی ہے' جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ اور صبحیں بھی یہی ہیں...... روز ازل سے ایک جیسی صبحیں ہیں اور ایک جیسی روشنی' وہ جو نئی صبح کا انتظار ہے ہمارے ہر شاعر اور ادیب کو' وہ کبھی طلوع نہ ہوگی کیونکہ ہم سے ہزاروں سال پہلے کی ہر نسل نے ہر ایسی صبح کے طلوع کا انتظار کیا ہے اور ہر نسل نے آنے والی نسل کے لئے اس طلوع سحر کا سندیسہ چھوڑا ہے۔ ہم بھی منتظر ہیں' لیکن جب انتظار کی عمر ختم ہونے کو ہوگی' تو ہم بھی پچھلی نسلوں کی طرح آنے والی نسل کے لئے...... یہ پیغام چھوڑ کے کہ یہ سفر جاری رہے۔ ایک نئی صبح طلوع ہونے والی ہے...... لیکن افسوس ہے کہ یہ صبح کبھی طلوع نہیں ہوگی۔ کیونکہ ایسی سحر وجود ہی نہیں رکھتی...... ہمارے سینے خلا ہیں۔ ان میں ایسی کوئی روشنی نہیں ہے......!"

اچانک سامنے سے ایک ویگن آگئی۔ میں نے اس سے بچنے کی کوشش کی۔ جیپ میں اتر گئی۔ اس کش مکش میں امل بے ساختہ میرے کندھے سے آ لگی۔ میں نے جیپ سنبھالا۔

امل قہقہہ لگا کر ہنسی۔

"واہ...... خوب......! زندگی کتنی پیاری چیز ہے۔ وسیم صاحب نے کس تیزی صفائی سے اسٹیرنگ اِدھر اُدھر گھمایا۔"

"اس میں کیا شک ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا...... "مجھے واقعی زندگی سے ا ہوتا جا رہا ہے۔ اور یہ پیار روز بروز شدید تر ہو رہا ہے۔ آپ جس زور سے زندگی کی کرتی ہیں' اس سے دگنی قوت سے میرا زندگی پر اعتماد بڑھتا جا رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" اس نے کھلتے ہوئے کہا...... "چوہا بھی مرنا نہیں چاہتا کیڑے کوڑے بھی زندگی کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ ہر ذی روح کو زندگی سے پ ہے۔ آپ کو بھی ہونا چاہیے۔"

"ہاں کیوں نہیں......" میں نے زور دے کر کہا...... "کیونکہ یہ قانون فطرت ہے فطرت اپنا عمل نہیں روکتی۔ اندھیرا ہو جائے' تو میں سو جاتا ہوں۔ روشنی آئے تو جاگ اٹھتا ہوں۔ پیاس لگے تو پانی پیتا ہوں۔ بھوک لگے تو پیٹ بھرتا ہوں۔ پھول کی خوشبو او رنگ سے محظوظ ہوتا ہوں۔ اپنی صلاحیت کے مطابق ہر حسین چیز سے اپنا حصہ اپنی روح میں انڈیل لیتا ہوں...... میرا زندگی سے پیار قانون قدرت کے عین مطابق ہے۔"

"خوب خوب......!" امل نے بظاہر داد دی "مجھے کیا نقصان ہے' اگر آپ زندگی کو چاہتے ہیں' لیکن ایک دن آئے گا' آپ کو مایوسی ہوگی کیونکہ جو آدمی جتنی زیادہ [illegible] وابستہ کرتا ہے' اتنا ہی زیادہ مایوس بھی ہوتا ہے۔ جو توقع نہیں باندھتا' اسے نقصان بھی کوئی نہیں پہنچا سکتا۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ کا دل ٹوٹے۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ تہی دامن رہ جائیں۔ میں تو یہ کہتی ہوں کہ آپ اٹل ہو جائیں۔ آپ مضبوط بن جائیں۔"

"ہاں...... میں مضبوط ہوں۔ میں اٹل ہوں......" اسٹیرنگ پر میری گرفت مضبوط ہو گئی۔ اور میں جوشیلا ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری آنکھیں چمک رہی ہیں...... امل! میں ان پہاڑوں کی طرح ٹھوس ہوں...... بلکہ میں پہاڑوں سے بھی افضل ہوں۔ کیونکہ میرے اندر روح ہے۔ احساس ہے۔ پہاڑ میری چھاتی پر نہیں چڑھ سکتا' لیکن میں پہاڑ کی چوٹی پر قدم رکھ سکتا ہوں...... کیونکہ میں انسان ہوں۔ انسان ہی اس کائنات کی سب سے ٹھوس حقیقت ہے۔"

امل مسکرا رہی تھی اور دور...... سامنے دیکھ رہی تھی' لیکن اس نے عینک لگا رکھی تھی' اس لئے میں اس کی آنکھوں کی چمک نہیں دیکھ سکا۔ شاید وہاں چمک تھی یا نہیں تھی' لیکن میں خوش تھا۔ میری روح سرشار تھی اور ایک خوشگوار کیفیت نے مجھے اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔

ہم اڑک پہنچ گئے تھے۔

جیپ ایک طرف کھڑی کر کے ہم اتر آئے۔ یہاں سرسبز و شاداب درختوں کی بہتات تھی۔ جگہ جگہ آئینے کی طرح صاف و شفاف پانی بہہ رہا تھا...... یہ چشموں کا پانی تھا۔ ان چشموں کا منبع کچھ اور اوپر پہاڑوں میں تھا۔ وہاں جانے کے لئے پرمٹ کی ضرورت تھی۔

کوئٹہ کے خشک اور سنگلاخ پہاڑوں میں ایسی شادابی غنیمت تھی۔ لوگ یہاں پکنک منانے آیا کرتے تھے۔ دائیں طرف پہاڑ کے دامن میں کچھ گھر آباد تھے۔ ان گھروں کے بچے کھیتوں کی منڈیروں پر کھیل رہے تھے اور عورتیں پانی کے کنارے کپڑے دھو رہی تھیں...... اکا دکا مرغیاں کھیتوں میں ٹھونگیں مار رہی تھیں۔

یہاں مٹی سے لپے ہوئے گھروں کے علاوہ چند دکانیں بھی تھیں۔ ان میں ضرورت کی چیزوں کے ساتھ ساتھ گرم کڑک چائے بھی ملتی تھی۔ ہمارے پاس تھرماس میں چائے موجود تھی' لیکن تجربے کی خاطر ہم وہاں کی کڑک چائے سے بھی محظوظ ہوئے۔ دوپہر کے کھانے کے لئے ایک دکاندار کو تین مرغیاں بھوننے کا آرڈر دیا' تو وہ خوش ہو کر بولا......

"صاحب۔ ہمارے ہاتھ کی مرغی ایک بار کھائے گا' تو زندگی میں دوسری بار اڑک آنے

کا ارمان ضرور کرے گی۔"

عاطف نے ہنس کر کہا۔۔۔۔ "ایک بار دیکھا ہے۔ دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے!"

امل بولی۔۔۔۔ "جب تک ہمارا لنچ تیار ہوگا' ہم ان پہاڑوں پر گھوم کر آ جائیں گے۔"

ہم دونوں نے تائید کی۔۔۔۔ پہاڑ کا راستہ خاصا عمودی تھا۔ بعض پتھر سخت اور نو
تھے اور بعض جگہ چھوٹی چھوٹی باریک کنکریوں کی وجہ سے پھسلن تھی۔۔۔۔ عاطف سب
سے پیچھے تھا۔ امل درمیان میں اور میں آگے۔

ہم نہایت احتیاط سے آہستہ آہستہ چڑھ رہے تھے۔۔۔۔ دونوں بھائی بہن پسینے
شرابور تھے۔۔۔۔ پسینہ مجھے بھی آ رہا تھا' لیکن ان کی حالت مجھ سے غیر تھی۔

تقریباً ڈیڑھ دو فرلانگ ہی گئے ہوں گے کہ امل ایک چٹان پر بیٹھ گئی۔ وہ بری طر
ہانپ رہی تھی۔ پسینے سے تر بر سرخ قمیص اس کے جسم سے چپک گئی تھی۔

کنپٹیوں پر پسینے کے قطرے بہہ رہے تھے اور اس کا رنگ اور زیادہ پیلا پڑ گیا تھا۔۔۔۔
عاطف بھی ایک طرف کھڑا ہانپ رہا تھا۔ خود میری ٹانگیں بھی کانپ رہی تھیں۔۔۔
کچھ دیر دم لینے کے بعد جان میں جان آئی۔ امل اٹھی۔ اس نے دائیں بائیں نظر
دوڑائیں۔ بائیں ہاتھ کا سلسلہ ہائے کوہ نہایت عمودی' بلند اور ناقابل عبور تھا' لیکن پہ
کی جس شاخ پر ہم چڑھ رہے تھے' نسبتاً کم اونچا اور آسان تھا۔

تھوڑی دیر میں ہم اوپر پہنچ گئے۔۔۔۔ ہم تینوں ہانپ رہے تھے۔ کامیابی اور تھکن
ملی جلی کیفیت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔۔۔۔ تاحد نظر خشک اور بے
آب و گیاہ پہاڑوں کے لامتناہی سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔ غالباً انہی سلسلوں میں کہیں
افغانستان اور ایران کی سرحدیں شروع ہوتی تھیں۔

تاریخ کے کسی دور میں یہ ایک ملک ہوا کرتا تھا۔ ایک زبان' ایک کلچر' ایک سا لباس
ایک سا رہن سہن' بلکہ کابل اور تاشقند تک میں اب بھی قہوے کا رواج اور 13 نقشہ ایک
جیسا ہے۔ رباب اور سارندہ اب بھی ان علاقوں کا مشترک اور مرکزی ساز ہے۔

اب یہ سارے علاقے مختلف ممالک کے حصے بن گئے ہیں' لیکن ان علاقوں کے لوک
گیتوں میں اب بھی یک رنگی اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔۔۔۔ تاشقند کی ہواؤں میں جو
نغمے بکھرے ہوئے ہیں' وہ صدیوں سے بلوچوں اور پٹھانوں کے سینوں میں رچے بسے
ہوئے تھے۔ تاریخ اور جغرافیے نے انہیں جسمانی طور پر ایک دوسرے سے الگ کر دیا
ہے' مگر ان کی روحوں کے گداز کو ختم نہیں کر سکے۔

امل ہلکے ہلکے دھند میں لپٹے ہوئے پہاڑوں کے ان عریض و طویل سلسلوں میں کھوئی
ہوئی تھی۔۔۔۔ اس کی سرخ قمیص جگہ جگہ سے اس کے جسم سے چپکی ہوئی تھی۔۔۔۔
عاطف ایک چٹان پر بیٹھ گیا تھا اور غیر ارادی طور پر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔۔۔۔ پسینہ دھیرے دھیرے خشک ہو رہا تھا۔ ٹھنڈے
ٹھنڈے جھونکے من کو سرور اور تقویت پہنچا رہے تھے۔۔۔۔ میں نے مڑ کر نیچے دیکھا۔
اڑک کے قد آور درخت اب چھوٹے چھوٹے پودے نظر آ رہے تھے۔ گھروں میں
عورتیں اور بچے ایسے لگ رہے تھے' جیسے چابی بھرے کھلونے ادھر ادھر حرکت کر رہے
ہوں۔ چائے کی دکانوں اور گھروں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ میں نے امل کو متوجہ کیا۔

"یہ دھواں دیکھیے۔۔۔۔ دھواں زندگی کی علامت ہوتا ہے۔ دور ویرانوں میں' جہاں
انسان کا گزر نہ ہوتا ہو' دھواں دکھائی دے' تو آدمی فوراً یقین کر لیتا ہے کہ انسان کے قدم
وہاں پہنچ گئے ہیں!"

امل مسکرائی۔۔۔۔

"وسیم صاحب۔۔۔۔ دھوئیں سے پہلے بھی انسان موجود تھا۔ تب اسے چقماق سے
آگ جلانے کا سلیقہ نہیں تھا۔ وہ جانوروں کا شکار کرتا تھا اور کچا گوشت کھاتا تھا اور غار میں
سوتا تھا۔ شاید آپ اسے اپنے آباؤ اجداد تسلیم کرنے میں شرم محسوس کرتے ہیں۔"

میں ہنس پڑا۔۔۔۔ "بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔"

"آپ دھوئیں اور انسان کا تعلق پیدا کر رہے تھے۔ اگر یہ تعلق کام و دہن تک محدود
ہے' تو میں بھی اسے مانتی ہوں!"

"کمال ہے یعنی انسان نے جو ترقی کی ہے' آپ کو اس پر اعتراض ہے۔ کچے گوشت پکا کر کھانے لگا تو قابل تضحیک ٹھہرا؟"

"مجھے افسوس ہے کہ فطرت پھر بھی نہ بدل سکی۔ ساری ترقی مصنوعی تھی۔ ہم سب مصنوعی ہیں۔ شعور کے مارے ہوئے۔ شاید آپ کو یاد ہو۔ رامو' لکھنؤ کے قریب' بارہ تیرہ سال کا ایک لڑکا پکڑا گیا تھا جو چوپائے کی طرح ہاتھوں اور پاؤں سے بھاگتا تھا۔ بھیڑیے کی طرح غراتا تھا اور کچا گوشت کھاتا تھا۔ غالباً بچپن میں اسے بھیڑیے اٹھا کر لے گئے تھے۔ وہیں پلا اور بڑھا لیکن جب اسے پکڑ کر ہسپتال میں داخل کیا گیا' ڈاکٹروں کا بورڈ اس پر تجربے کرنے لگا تو ان کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں۔ رامو نے دودھ کی بالٹیاں الٹ دیں۔ ابلے ہوئے گوشت کو منہ نہ لگایا..... آخر غیر فطری زندگی سے تنگ آکر ایک دن چپکے سے مرگیا..... ایک سال کی مسلسل کوششیں رائیگاں گئیں۔ اس لئے کہ اس کی فطرت اپنے اصلی رنگ میں پروان چڑھی تھی' اور اسے ہماری طرح مصنوعی انسان بنانے کے لئے ہزاروں سال درکار تھے۔

"اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے انل کہ چیر پھاڑ کا قانون درست ہے۔ وہ ترقی جو انسان نے کی ہے عبث ہے۔ سب قوانین مہمل ہیں اور سب اصول لغو ہیں......؟"

"آپ قانون بناتے جائیں' اصول گھڑتے جائیں' لیکن انسان کرے گا وہی جو اس کی فطرت میں ہے۔ چیر پھاڑ کا قانون غلط تھا یا صحیح مگر کم از کم فرد تک محدود تھا' لیکن ترقی یافتہ انسان تو اجتماعی انداز میں اس پر عمل کرتا ہے۔ چنگیز اور ہلاکو کو چھوڑیئے وہ ذرا دور کی بات ہے۔ آیئے اس صدی کی بات کریں۔ ہیروشیما' ناگاساکی آپ کے سامنے ہیں۔ کس بے دردی سے انسان کو تہس نہس کر دیا گیا۔ ہنگری' پولینڈ اور چیکوسلواکیہ کا کیا حشر ہوا۔ کانگو اور الجزائر میں کیا کچھ نہ ہوا۔ کئی لاکھ فلسطینیوں کو بے در' بے گھر اور خاک چھاننے پر مجبور کر دیا گیا۔ ویت نام نصف صدی تک خون میں نہاتا رہا۔ پاکستان کے مشرقی ونگ میں کیا ہوا۔ مسلمان نے مسلمان کا خون چاٹا۔ بھائی نے بھائی کی شہ رگ کاٹ دی۔ بیس پچیس لاکھ انسانوں کو تاریخ کا سیاہ باب چاٹ گیا..... کہاں تھے قوانین' کہاں رہے

اصول' اور کہاں گیا وہ ضمیر انسانی' جس کے بلند بانگ دعوے کئے جاتے ہیں..... قوم نے اپنی قوم کو رگیدا' مذہب نے اپنے ہم مذہب کو لتاڑا..... وطن نے اپنے ہی ہم وطن کو خیر باد کہا..... میں کہتی ہوں' ہم حقیقت کو تسلیم کیوں نہیں کر لیتے' ہم مان کیوں نہیں لیتے کہ انسان' انسان کا دوست نہیں ہے اور روئے زمین کا مہذب سے مہذب ترین انسان بھی محض غرض کا بندہ ہے۔"

میں دم بخود کھڑا تھا اور اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا' جو بلند پہاڑ کی ایک سخت اور پتھریلی چٹان پر کھڑی تھی۔ جس کا رنگ زرد تھا اور جس کے ہونٹ سرخ انگور کے دانے کی طرح رسیلے تھے اور جس کی آنکھوں میں بچوں کا سا تجسس اور حیرت تھی' اور جس کا جسم ہلکا پھلکا اور متناسب تھا اور جس کی ننھی سی ناک نگینے کی طرح اس کے چہرے پر جڑی ہوئی تھی۔

عاطف جو اکیلا بیٹھا تھا ہمارے قریب آگیا..... انل اڑک کے ہاتھوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے بولی۔

"یہ دنیا ایسی ہی ہے۔ یہ بھوک اور افلاس اور قحط کو ختم کرنے کے لئے لاکھوں ٹن اناج کی پیش کش کرتی ہے۔ ہزاروں روپے کی امداد دے کر انسان دوستی کی بنیاد فراہم کرتی ہے' لیکن جب پانسہ پلٹتا ہے تو پلک جھپکنے میں انسان دوستی' انسان کشی اور انسان دشمنی میں بدل جاتی ہے۔ آدرش اور اصول ختم ہو جاتے ہیں۔ نیکی اور ہمدردی بے معنی ہو جاتی ہے۔ لاکھوں انسان آرزوؤں اور تمناؤں کے انبار اٹھائے صفحہ ہستی سے مٹ جاتے ہیں' لیکن مہذب انسان کی آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہیں ٹپکتا..... پھر بھی ہم منتظر ہیں اس سحر کے لئے' جو انسان کے سینے سے کبھی طلوع نہیں ہوگی۔"

میں گہری عقیدت اور جذبے سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی سرخ قمیص خشک ہو چکی تھی۔ اس کے پرجوش لہجے میں بلا کی بے ساختگی تھی۔ کسی منجھے ہوئے مقرر کے انداز میں جو نمائشی پن ہوتا ہے' دور دور تک اس کا نام و نشان نہیں تھا' بلکہ یہ برجستگی نہایت ہی فطری تھی' جس میں سچے وجدان کی آمد آمد تھی..... وہ بات کرتی' تو اسے

اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے لفظوں کی خاطر بھٹکنا نہیں پڑتا تھا۔ ہر لفظ موتی کی طرح
سیدھا اس کے دل سے نکلتا تھا اور یقین کی روشنی لئے ہوئے دوسروں کے دل میں اتر
جاتا تھا اور آنکھوں سے تمام حجابات اٹھتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ ایک
ناقابل تشریح سی حقیقت شعلہ بداماں نظر آرہی ہے!

عاطف جو ہماری باتوں کو غور سے سن رہا تھا' بولا۔

"امتل ---- میں ہمیشہ تم سے بحث سے کتراتا ہوں' لیکن آج ایک بات پھر کہنا چاہتا ہوں کہ اگر ہم انسان پر بالکل ہی یقین کرنا چھوڑ دیں' پھر اس کا نتیجہ تو یہ نکلا ہے کہ ہم اپنی ذات اور صلاحیتوں سے قطعی منکر ہو گئے ہیں۔ فکر سے گھبرانا اور اس پر بھروسہ نہ کرنا آخر کیا رنگ لائے گا؟"

"بھائی جان! یہ بات تو میں کئی بار پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ فکر پر یقین رکھنے کا نتیجہ ایٹم اور ہائیڈروجن بم کی شکل میں سامنے آگیا ہے۔ ہم علم اور سائنس کو مسترد نہیں کرتے۔ بھلا ایٹمی دور کی صلاحیتوں سے کون کافر منکر ہے؟"

عاطف اس کے طنز کی پروانہ کرتے ہوئے بولا.....

"امتل..... تمہارا رویہ تشکیک اور لاچاری کے سوا ہمیں کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ انکار ہمیشہ بے نتیجہ ہی رہتا ہے۔ میں کہتا ہوں' تمہاری بات صحیح بھی ہو' تو بھی ہمیں اس سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے..... مکمل انکار کے معنی تو یہ ہیں کہ ہم ایک قدم بھی آگے نہ بڑھائیں..... اگر ہم کوئی عقیدہ نہیں رکھتے' کسی اصول کو خاطر میں نہیں لاتے' تو ہم کیونکر انسان کے دکھ سے باخبر رہ سکتے ہیں اور کس طرح اس کے مستقبل کے لئے سوچ سکتے ہیں اور ہم کیسے فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"بھیا-----!" وہ بے حد تسلی سے بولی..... "آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں' یہ جذب اور وجدان کی باتیں نہیں ہیں۔ تمام شعوری اور فکری باتیں ہیں اور بقول شخصے' فکری کارکردگی انسان کے لئے غیر فطری کارکردگی ہے!"

میں اس کے آخری جملے پر بے اختیارانہ چونکا۔

"فکری کارکردگی' انسان کے لئے غیر فطری کارکردگی ہے!"

مگر عاطف بے حد جوش میں تھا..... "میں پوچھتا ہوں' اگر تم علم حاصل نہ کرتیں' کتابوں سے نہ ملتیں' تو تم کو یہ فکر' یہ شعور کہاں سے ملتا۔ اگر تم غار میں جوان ہوتیں' تو چیخ پکار کے سوا کیا کر سکتی تھیں؟"

"کاش----! میں غار ہی میں پیدا ہوتی اور غار ہی میں پروان چڑھتی۔ فکر نے مجھے جو کردار دیا ہے' بالکل غیر فطری ہے۔ دنیا بھر کی تہذیبوں کا بوجھ میرے کاندھوں پر ہے اور میری روح اس کے بوجھ تلے سسک رہی ہے۔"

میں مسکرا رہا تھا اور عاطف کو دیکھ رہا تھا اور خیال کر رہا تھا کہ اب مزید اپنی ہاری سے کیا نکلا ہے..... مگر وہ لاچار اور بے بس ہو کر امتل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس بے چارگی اور سنجیدگی میں پیار تھا' مگر امتل ہمیشہ کی طرح بے نیاز تھی.....

میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔

کہ ہاں..... یہی ہے وہ لڑکی' جس کی قربت حاصل کرنے کا میں نے عہد کر رکھا ہے.....

میں اس کے ساتھ ہوں.....

اور میرا وہم ابھی سلامت ہے.....!

ڈنر پر ڈپٹی کمشنر ذکی الدین نے ایک عجیب و غریب کردار سے متعارف کرایا..... کہنے لگا۔

"یہ جو بھاری بھرکم شخصیت ہے نا' اس کو ذرا غور سے دیکھیں۔" اس نے انگریزی میں کہا۔ "صرف آپ لوگوں کی خاطر میں نے اسے کھانے پر بلایا ہے۔"

ہم تینوں نے بیک وقت اس کی طرف دیکھا..... کھچڑی ڈاڑھی' سرخ و سفید رنگ' سر پر بھاری بھرکم سیاہ رنگ کی پگڑی' کشادہ پیشانی' بڑی بڑی آنکھیں' ہڈیالہ چہرہ' عمر پچاس سال سے زیادہ نہ ہوگی.....

عاطف نے کہا.....

"کسی قبیلے کا سردار معلوم ہوتا ہے ----؟"

"ہاں ---- کچھ ایسا ہی ہے۔" ڈپٹی کمشنر نے جواب دیا۔ "سرکاری افسروں کے ہم میل ملاپ رکھنا اس کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ نہایت ذوق و شوق سے دعوتوں کا اہتمام کرتا ہے اور تقریباً ہر ہفتہ ڈالی کے طور پر تیتر کے شکار سے نوازتا ہے۔ پاکستان کا نہایت وفادار ہے۔"

ہم انگریزی میں گفتگو کر رہے تھے۔ سردار صاحب انگریزی نہیں جانتے تھے۔

"ہاں ---- تو پھر ہو جائے نا تعارف' تم کیا کہنا چاہتے ہو' اس کے بارے میں۔" عاطف نے پوچھا۔

ڈپٹی کمشنر نے ہنس کر سردار کی طرف دیکھا....

"سردار صاحب' میرے یہ مہمان وہ قصہ سننا چاہتے ہیں۔ وہ پہاڑ پر جھنڈا لگانے کا"

سردار ہنس پڑا ---- اس کی ہنسی میں ہلکی سی خفت تھی....

"ڈپٹی کمشنر صاحب مجھے شرمندہ کرنے پر بہت خوش ہوتے ہیں۔ میں نے زندگی میں ایک حماقت کی ہے۔ میں اسے بار بار دہراتا ہوں' مگر لعنت کا یہ طوق میرے گلے سے نہیں اتر تک۔"

"ارے نہیں سردار صاحب' ہم تو مزہ لیتے ہیں۔" ڈپٹی کمشنر نے کہا.... "بلکہ ہم سے زیادہ مزہ تو آپ خود لیتے ہیں۔ یہ میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے ڈپٹی صاحب۔ آپ کے مہمان میرے مہمان ہیں۔ میں ان کو اپنی بیوقوفی کا قصہ ضرور سناؤں گا۔ تھوڑی دیر ہنس لیں گے۔ خوش ہو جائیں گے۔"

کھانے کے بعد اب قہوے کا دور چل رہا تھا۔ سردار نے مسکراتے ہوئے کہانی شروع کی ----

"دراصل میں بڑا کم بخت آدمی ہوں۔ مجھے نام اور شہرت کی بڑی ہوس ہے۔ مگر ہمیشہ دھوکا کھاتا ہوں ---- ادھر ایک پہاڑ ہے۔ افغانستان اور پاکستان کی سرحد پر' بہت اونچا پہاڑ ہے ---- اس کی چوٹی تک کوئی آدمی نہیں پہنچ سکتا۔ بہت دشوار گزار اور

عمودی پہاڑ ہے۔ پہاڑ کا ادھر کا رخ افغانستان کا' اور ادھر کا رخ پاکستان کا ہے ---- میں نے ڈپٹی صاحب سے کہا کہ میں اس کی چوٹی پر پاکستان کا جھنڈا لہرانا چاہتا ہوں ---- یہ ایک تاریخی واقعہ بن جائے گا... آپ کا بھی نام ہو جائے گا۔ میرا بھی نام ہو جائے گا۔ آپ حکومت سے سفارش کریں گے۔ مجھے سند مل جائے گی ---- ڈپٹی کمشنر صاحب پہلے تو نہیں مانے۔ کہنے لگے' افغانستان ہمارا دوست ملک ہے۔ ہمیں ایسی کوئی بات نہیں کرنا چاہیے کہ افغانستان اعتراض کرے' لیکن میرے زیادہ اصرار کرنے پر انہوں نے حکومت سے اجازت لے لی۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ چلو زندگی میں ایک آرزو تو پوری ہوئی۔ تاریخ میں نام آ جائے گا۔ ہماری اولاد ہمیشہ فخر کرتی رہے گی ---- چنانچہ منظوری کے بعد میں نے دھوم دھام سے تیاری شروع کی۔ پاکستان کا نیا جھنڈا بنوایا اور اپنے علاقے میں خوب ڈھنڈورا پٹوایا۔ راشن پانی کا انتظام کیا۔ میرا خیال تھا کہ تیسرے دن چوٹی پر جھنڈا لہرا دوں گا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ میں چوٹی تک نہیں پہنچ سکوں گا' لیکن میرے ارادے بہت مضبوط تھے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ کارنامہ ضرور سرانجام دوں گا۔"

"تو کیا آپ ناکام ہو گئے ----؟" عاطف نے پوچھا۔

"سنو بھائی سنو ---- ناکام نہیں ہوا۔ سات بکروں کی قربانی دی۔ اور اللہ کا نام لے کر چل پڑا ---- لیکن کیا بتاؤں' تین چار میل چڑھنے کے بعد سارا دم خم نکل گیا۔ میں نے وہیں کیمپ لگایا۔ رات بسر کی۔ صبح تازہ دم ہو کر اٹھا۔ ناشتہ کیا اور خدا کا نام لے کر آگے بڑھا' مگر جوں جوں آگے بڑھتا گیا' توں توں دشواریاں بھی بڑھتی گئیں۔ ایسا لگتا تھا کہ انسان کے پاؤں پہلی بار اس سرزمین پر پڑے ہیں۔ بڑی بڑی دیوہیکل چٹانیں رینگ رینگ کر عبور کرتا۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ ہاتھوں' پیروں اور جسم کے کئی حصوں سے خون بہہ رہا تھا۔ دس گز آگے بڑھتا' تو آدھ گھنٹہ سانس لینے کے لئے رکنا پڑتا ---- جھنڈا میں نے کمر سے باندھ رکھا تھا۔ دل میں عجیب عجیب خیال آتے تھے کہ دنیا کے نامور لوگوں نے کیسے کیسے ستم اٹھائے ہوں گے۔ ان لوگوں پر کیا گزری ہوگی' جو دنیا کی اونچی اونچی چوٹیوں کو سر کرتے رہے۔ ان باتوں کو یاد کر کے مجھے بیک وقت گھبراہٹ اور ڈھارس

ہوتی...... مختصر یہ دوستو! کہ اگلے دن میں منزل مقصود کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ چوٹی اور میرے درمیان صرف پندرہ قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ میں بہت خوش تھا اور ایک چٹان پر بیٹھا دم لے رہا تھا کہ اچانک چونکا...... میرے کانوں میں کسی کے قدموں کی آواز آ رہی تھی...... میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا...... میں نے دیکھا اور حیران رہ گیا...... مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا تھا...... تقریباً ستر سال کی ایک بڑھیا سوکھی لکڑیوں کا گٹھا سر پر اٹھائے جا رہی تھی۔ میں نے اسے آواز دی تو وہ رک گئی...... چند لمحے حیرت سے اسے تکتا رہا۔ یہ جن بھوت نہیں تھی، سچ مچ کی عورت تھی۔ انسان تھی...... میرا حلق بالکل خشک ہو گیا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا...... "تم یہاں کیا لینے آئی ہو......؟" وہ بڑے پیار سے بولی...... "بیٹا! میں تو یہاں روز آتی ہوں، لکڑیاں چننے، نیچے پہاڑ کے دامن میں میرا گھر ہے۔" بس...... اس سے زیادہ میں کچھ نہ سن سکا۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس وقت میری کیا حالت ہو گی؟"

امل بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی......

ہم بھی ہنسنے لگے...... واقعہ بے حد دلچسپ تھا۔ عاطف نے پوچھا۔

"آپ جھنڈا تو لگا آئے ہوں گے؟"

"توبہ کرو بھائی......" سردار بولا...... "زندگی میں اس قدر شرمندہ نہیں ہوا تھا۔ پورا ایک ہفتہ پشیمانی اور ندامت کا بخار چڑھا رہا اور جب ٹھیک ہو گیا، تو ایک ایک لفظ جس طرح آپ کو سنایا، ڈپٹی کمشنر صاحب کو بھی سارا واقعہ سنا دیا...... اب میرے سر سے ناموری کا بھوت اتر چکا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ دنیا میں ہر کام کے لئے الگ الگ آدمی پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے جو جیسا ہے، اس کو اسی حیثیت میں رہنا چاہیے۔"

دیر تک ہم سردار صاحب کی باتوں سے محظوظ ہوتے رہے۔ امل نے ان سے پوچھا۔

"فرض کریں۔ بڑھیا آپ کو نہ ملتی۔ پھر تو آپ جھنڈا لگا کر آتے، سند بھی مل جاتی اور شہرت بھی......؟"

"یہی تو اچھا ہوا...... اللہ نے مجھ پر مہربانی فرمائی۔ قدرت ہمیشہ رہنمائی کرتی ہے اور

غلط بخشی سے بچاتی ہے۔"

"مگر دنیا میں ایسے واقعات بہت ہیں کہ ایک معمولی سے حادثے نے انسانوں کو امیر کبیر بنا دیا۔ اس کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟"

بے چارا سردار کیا کہتا۔ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ امل اور ڈپٹی کمشنر کی بیوی ہنسنے لگ گئیں۔

"میں آپ کی جگہ ہوتی تو جھنڈا ضرور لگا کر آتی۔" امل نے اس سے کہا۔ "اصل بات تو نیت کی ہے۔ وہ یقیناً نیک تھی۔"

"اوہ بی بی! میں کیسے سمجھاؤں۔" سردار کچھ الجھ رہا تھا...... "دراصل میں دھوکہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ حکومت سے بھی اور اپنے آپ سے بھی، میں شہرت اور نام کا بھوکا ضرور تھا، مگر بے ایمان نہیں تھا۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں۔"

ڈپٹی کمشنر صاحب نے اس کی تائید کی۔

"یہ واقعہ ہے۔ سردار صاحب پورے علاقے میں نہایت نفیس اور کھرا آدمی ہے۔ بہت بے ضرر شخص ہے۔ اس کے علاقے کے لوگ بہت خوش ہیں اور دل سے اس کی عزت کرتے ہیں۔ سرداروں اور نوابوں میں ایسے لوگ کم کم ہی ملتے ہیں۔"

سردار صاحب اصرار کر رہے تھے کہ ہم ان کے گاؤں جائیں اور ایک دو راتیں مہمان ٹھہریں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ان کی دعوت قبول کر لی جائے اور اس طرح کے وضع دار لوگوں کے ساتھ دو چار گھڑیاں گزاری جائیں، مگر امل نے معذرت کر دی۔

دراصل وہ مخصوص قسم کی پابندیوں سے اکتا جاتی تھی۔ دوسروں کی مرضی سے ہر کام کرنا اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ اس لئے ہم سردار صاحب کی دعوت سے لطف اندوز نہ ہو سکے۔

صبح ناشتہ کر کے ہم زیارت کے لئے روانہ ہو گئے۔ کوئٹہ سے زیارت، ہندو باغ اور چمن کا فاصلہ تقریباً برابر ہے۔ بیس پچیس میل کے بعد چمن کی سڑک بائیں ہاتھ کو الگ ہو جاتی ہے۔ یہی سڑک قندھار اور کابل سے ملی ہوئی ہے۔ یہ ایک وسیع اور خشک وادی

ہے' جو سینکڑوں میلوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ جہاں کہیں پہاڑ کے دامن میں چشمہ نکل ہے' وہاں لوگ آباد ہو گئے ہیں اور آبادی کے ارد گرد سیبوں کے باغات ہیں۔ اگر بلوچستان میں پانی وافر ہوتا تو یہ علاقہ محض پھلوں کی وجہ سے دنیا کا امیر ترین علاقہ ہوتا۔ سیب' ا سردہ' گرما اور بادام کے لئے یہاں کی آب و ہوا نہایت ہی مناسب اور موزوں ہے۔

بارش اگرچہ کم ہوتی ہے' لیکن بارش اور برف کے پانی کو محفوظ کرنے' اور اس کے صحیح تصرف کے لئے جگہ جگہ کاریزیں بنی ہوئی ہیں۔ کاریزوں کے ذریعے زیر زمین پانی لے جانے کا طریقہ بلوچستان میں نہایت محنت طلب لیکن منظم ہے۔

اس وادی میں ریل کی سیدھی آہنی لائن ایسی لگتی ہے' جیسے ڈرائینگ کی کاپی پر کسی پنسل کی لکیر......

جگہ جگہ خانہ بدوشوں کے اکا دکا اونٹ گردنیں جھکائے چر رہے تھے۔ دور سے ایسے لگتے تھے' جیسے جیومیٹری کے پرکار۔

چالیسویں میل پر ہم نے جیپ روک لی۔ یہاں سیاحوں کی رہنمائی کے لئے ایک بورڈ لگا ہوا تھا۔ ہم تینوں اتر پڑے اور بورڈ پر لکھی ہوئی انگریزی تحریر پڑھی۔

یہاں سے دائیں ہاتھ جانے والی سڑک زیارت' ہرنائی' لورالائی اور ڈیرہ غازی خان جاتی ہے۔ بائیں ہاتھ جانے والی سڑک ہندو باغ اور فورٹ سنڈیمن نکل جاتی ہے۔ فورٹ سنڈیمن ریل بھی جاتی ہے۔

زیارت جانے والی سڑک پہاڑوں کے بیچ سے نکلتی ہے۔ زیارت ضلع سبی کا گرمائی صدر مقام ہے۔ حالانکہ سبی سے زیارت ڈائرکٹ پہنچنے کے لئے کوئی راستہ نہیں ہے۔ کوئٹہ سے ہی زیارت پہنچنا پڑتا ہے۔ زیارت کو اصل شہرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ قائداعظمؒ کو زیارت بہت پسند تھا۔ علالت کے آخری ایام انہوں نے زیارت ہی میں گزارے تھے۔

جب ہم زیارت جانے والی سڑک کی طرف مڑے' تو امل نے کہا۔

"ایک عظیم سیاست دان کو جہاں چین اور سکون ملتا تھا' وہ تو واقعی دیکھنے کے لائق جگہ

ہوگی۔" کچھ دیر کے بعد ہم "کچھ" پہنچ گئے...... یہاں ایک چھوٹا سا ریسٹ ہاؤس تھا اور کھانے پینے کی چند دوکانیں۔ کسی زمانے میں ریلوے اسٹیشن بھی تھا' مگر اب ریل نہیں رہی۔ پھر بھی زیارت آنے جانے والی بسیں یہاں ٹھہرتی ہیں' اور مسافر چائے پیتے ہیں۔ کھانا کھاتے ہیں۔

ہم بھی چائے پینے کے لئے اتر گئے۔ ابھی ہم لکڑی کے بنچوں پر بیٹھنے کے لئے سوچ ہی رہے تھے کہ ایک نوجوان' جس کی عمر انیس برس سے زیادہ نہ ہوگی' آگے بڑھ کر ہم سے مخاطب ہوا۔

"سر......! اگر آپ مناسب سمجھیں' تو یہاں کے بجائے ریسٹ ہاؤس میں تشریف رکھیں۔ چائے وہیں آجائے گی۔"

لڑکے کی پیش کش میں بے حد خلوص' سادگی اور بے غرضی تھی۔ عاطف نے کہا۔

"کوئی حرج نہیں۔ چلے چلتے ہیں۔"

مگر امل نے ٹوکا۔

"کیا صوفے کے بغیر چائے نہیں پی جا سکتی بھائی جان......؟ اور اگر بہت ہی ضروری ہے' تو ریسٹ ہاؤس کے لان میں بیٹھ جایئے۔ آڑو کے پیڑ کے نیچے کتنی خوبصورت چھاؤں ہے۔"

نوجوان نے فوراً تائید کی......

"چلئے' وہیں چلتے ہیں۔ میں کرسیاں بھجواتا ہوں۔"

"نہیں بھئی۔" امل بولی...... "وہیں گھاس پر بیٹھیں گے۔ پندرہ منٹ کی تو ساری بات ہے۔"

نوجوان نے دکاندار کو پشتو میں کچھ ہدایات دیں اور ہم سب آڑو کے پیڑ کے نیچے آکر بیٹھ گئے۔ نوجوان نے اپنا تعارف کرایا......

"میرا نام سہراب خان ہے۔ کوئٹہ گورنمنٹ کالج میں پڑھتا ہوں۔ تین دن کی چھٹی آیا ہوں۔ اس پہاڑی کے پیچھے میرا گھر ہے۔ سیاحوں کی مدد کرنا میری ہابی ہے۔ بعض لوگ

میرے ساتھ میرے گاؤں بھی چلے جاتے ہیں اور ہمارے سیبوں کے باغ سے سیب کھاتے ہیں۔"

اشل نے فوراً میری طرف دیکھا...... میں نے ہنس کر کہا۔

"اپنے ہاتھ سے سیب توڑ کر کھانے کا شوق تو ہمیں بھی ہے۔ اڑک جاتے ہوئے یہ شوق پورا کرنے کی کوشش کی تھی' مگر باغ کے رکھوالے نے کہا کہ وہ باغ بیچ چکا ہے' اس لئے ہم سیب نہیں توڑ سکتے۔"

سہراب خان نے کہا......

"باغ تو ہم نے بھی بیچ دیا ہے' مگر دو چار درخت فروخت نہیں کئے۔ اگر آپ پسند کریں تو شوق پورا کر سکتے ہیں۔"

اشل نے فوراً کہا...... "ہاں' ہم چلیں گے۔ کیوں بھائی جان' کیا حرج ہے؟"

عاطف نے ٹوٹے دل سے کہا...... "ہاں...... کیا حرج ہے!"

چائے پی کر ہم سہراب خان کے ساتھ چلے گئے۔ باغ دور نہیں تھا۔ آدھ گھنٹے میں وہاں پہنچ گئے۔

سہراب خان کے باغ میں چار پانچ سو کے قریب سیب کے مختلف نسل کے درخت تھے۔

اس باغ کا دورہ نہایت ہی فرحت بخش اور معلومات افزا ثابت ہوا۔

سہراب خان نے ایک ایک پیڑ کے پاس جا کر اس کی ہسٹری بیان کی۔

"یہ شین کلو ہے۔ زردی مائل' نہایت خوشبودار' بلوچستان کا سب سے اعلیٰ نسل سیب' کمرے میں ایک سیب پڑا ہو' تو اس کی مہک پورے کمرے میں پھیل جاتی ہے۔ اگر اس کی پیکنگ صحیح ہو اور چوٹ سے بچا رہے' تو سیب کے اگلے موسم تک' یعنی ایک سال بعد بھی تازہ اور مہکتا ہوا ملے گا...... اور یہ تور کلو ہے۔ سرخ سیب۔ شین کلو کی طرح لذیذ اور قیمتی' مگر اس کا نمبر دوسرا ہے...... اور یہ امیری سیب ہے۔ بالکل سرخ' گاہک اس کے رنگ پر مرتا ہے' مگر اس میں مٹھاس نسبتاً کم ہوتی ہے۔ اور یہ مشہدی سیب ہے۔

اس کا رنگ بھی سرخ ہوتا ہے۔ اور یہ قندھاری ہے۔ اس پر چھوٹے چھوٹے گول گول سرخ داغ ہوتے ہیں۔ یہ کشمیری سیب ہے۔ آدھا سرخ اور آدھا سبز اور یہ چکی سیب ہے۔ قدرے چپٹا زردی مائل' اور قدرے ترش اور یہ سمرقندی ہے۔ آدھا سرخ آدھا سبز' اس کا جو حصہ دھوپ کے سامنے ہوتا ہے' سرخ ہو جاتا ہے اور جسے دھوپ نہیں لگتی' سبز رہ جاتا ہے۔"

سیبوں کی اتنی ڈھیر ساری نسلوں اور قسموں کے متعلق سن کر ہمیں بے حد حیرت ہوئی اور خوشی بھی......

ہم لوگ اس بارے میں کتنے بے خبر تھے......

عاطف نے پوچھا......

"آپ کے باغ میں کتنے درخت ہیں اور اس کی کیا قیمت لگی ہے؟"

"ساڑھے چار سو کے لگ بھگ ہیں۔" سہراب نے کہا...... "اور یہ چالیس ہزار میں اس سیزن کے لئے بکا ہے۔"

ہم نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کیونکہ باغ بہت تھوڑے سے رقبے میں لگا تھا۔

سہراب خان نے کہا......

"اگر ایک ہزار درخت ہوں' تو ایسا باغ بڑی آسانی سے ایک لاکھ روپے میں بک جاتا ہے۔"

عاطف بے حد متاثر ہوا......

"ایک لاکھ روپے میں......! کیا ٹھیکیدار اس میں سے کما بھی لیتا ہے؟"

"ٹھیکیدار صرف ایک صورت میں نقصان اٹھاتے ہیں۔ آندھی آ جائے یا ژالہ باری ہو جائے...... آندھی سے پھل گر جاتا ہے۔ ژالہ باری سے کانا ہو جاتا ہے۔ ورنہ عام حالات میں ہزاروں روپے کماتے ہیں۔"

عاطف کے دل میں تھوڑا بہت شک باقی تھا۔

"مگر اتنے محدود رقبے میں اتنا پھل کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ ایک لاکھ تو بہت بڑی رقم ہوتی ہے؟"

سہراب خان نے بتایا-----

"سیب کا ایک درخت دس من سے لے کر بیس من تک پھل دیتا ہے۔ نوجوان درخت دس من تک پھل دیتا ہے اور ہر سال اس میں اضافہ ہوتا ہے۔"

عاطف نے پوچھا----- "نوجوان سے آپ کی کیا مراد ہے-----؟"

"آٹھ سال کا درخت نوجوان ہوتا ہے۔" سہراب خان نے کہا----- "دس سال میں مکمل جوان ہو جاتا ہے۔ سیب کا درخت چھ اور سات سال کے بعد پھل دینے لگتا ہے۔"

امثل ہنس پڑی-----

"کیوں بھائی جان' باغ لگانے کا ارادہ ہے-----؟"

"معلومات حاصل کرنے میں کیا حرج ہے۔ زندگی میں کسی وقت بھی کوئی کام شروع کیا جا سکتا ہے۔ باغبانی' فیکٹری لگانے سے زیادہ خوبصورت کام ہے۔"

"ہاں کیوں نہیں۔" امثل نے ہنستے ہوئے کہا----- "درخت مزدوروں کی طرح ہڑتال بھی نہیں کر سکتے۔"

"یہ تو قدرت کی طرف سے رعایت ہوئی نا ویسے میں سچ کہتا ہوں۔ ایک طرف باغات کی خوشگوار فضا اور مہکتی ہوئی ہوائیں' اور دوسری طرف کارخانوں اور فیکٹریوں کا شور' اور کثیف دھوئیں کی گھٹن' واقعی ہم کتنے بدقسمت ہیں!"

سہراب خان ہمیں شیرین کلو اور نور کلو کے ان درختوں کی طرف لے گیا' جو ٹھیکیدار کی گنتی سے باہر تھے اور جو باغ کے مالک نے گھر والوں اور دوستوں کے لئے وقف کر رکھے تھے----- ہمارے ارمان پورے ہو گئے اور اپنے ہاتھوں سے سیب توڑنے کی حسرتیں نکل گئیں-----

وہاں باغ میں چائے آ گئی اور دیسی گھی کے پراٹھے بھی ہم نے وہاں پورے دو گھنٹے گزارے۔

اس کے بعد سہراب خان سے اجازت لے کر زیارت روانہ ہو گئے۔

راستے میں عاطف نے کہا-----

"یہ سہراب خان بھی خوب نوجوان نکلا۔ آخر کس خوشی میں اس نے یہ سب کچھ کیا-----؟"

میں نے جواب دیا-----

"اوگی کے تھانیدار نے بھی تو آپ کو مرغے کھلائے تھے۔ دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کسی غرض کے بغیر خدمت کر کے خوشی محسوس کرتے ہیں۔ دراصل یہ چھوٹے چھوٹے واقعات ہی زندگی کو روشن بنا دیتے ہیں۔"

"کچھ" سے آگے خشک پہاڑوں کی یہ گھاٹی نہایت ہی کنٹراسٹک اور خوبصورت تھی----- بائیں ہاتھ کے پہاڑ کا دامن سرخ تھا۔ اوپر کا حصہ سخت' پتھریلا اور عمودی تھا۔ جو ایک کٹی پھٹی فصیل کی طرح دور تک چلا گیا تھا۔ بیچ میں سیاہ چٹانوں کے ٹیڑھے ترچھے سلسلے ایسے لگ رہے تھے' جیسے پہاڑ کے زخموں پر کھرنڈ آ گیا ہو۔

اب اکا دکا صنوبر کے پیڑ نظر آنے لگ گئے تھے۔ یہ البیلا درخت نیچے سے گول چوڑا اور پھر بتدریج تنگ ہوتے ہوتے آخر میں بالکل نوکدار ہو جاتا ہے۔ اس کا رنگ سیاہی مائل سبز ہوتا ہے۔

"کان" کے کھلوں سے گزر کر اب ہم "کواس" کے قصبے سے گزر رہے تھے۔ یہاں سڑک پر مزدور کام کر رہے تھے۔ اور ہماری جیپ سیب کے باغوں کے بیچوں بیچ گزر رہی تھی----- مگر سیبوں کو ہاتھ سے توڑنے کی خواہش میں اب شدت نہیں رہی تھی۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ انگور کے گچھوں کی طرح' سیبوں سے لدی ہوئی سرخ سرخ شاخیں اب بھی دیدہ زیب تھیں اور نگاہیں ان پر جم جم جاتی تھیں۔

ایک بات میں نے ہر جگہ دیکھی کہ وہاں کا نفیس سیب' پاکستان کے بڑے بڑے شہروں اور کچھ ملک سے باہر چلا جاتا ہے۔ مقامی لوگوں کے حصے میں تیسرے درجے کا سیب آتا ہے' جو وہاں بہت سستا بکتا ہے۔

"زندرہ" سے آگے صنوبر کے درختوں کی تعداد بڑھنے لگی اور سڑک کے دونوں طرف کے پہاڑوں میں سبزہ دیکھ کر اطمینان ہوتا جا رہا تھا کہ ہم واقعی کسی صحت افزا مقام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

چند میل کے بعد صنوبر کے درختوں کی بہتات جنگل کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھی۔ دائیں بائیں اور سامنے کے پہاڑ گھنے' سیاہ اور سبز نظر آ رہے تھے---- یہاں وادی بے حد دلفریب اور دلکش ہو گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہم زیارت پہنچ گئے-----

وہی ہل اسٹیشن جیسا سماں' کھپریل اور لوہے کی چادروں کی چھتیں۔ پہاڑی پتھر کے بنے ہوئے صاف ستھرے مکان' دکانیں' ہوٹل اور کوٹھیاں' کھلے اور ڈھیلے کپڑوں میں ملبوس پٹھان دکاندار' پتلونوں والے ملکی اور غیر ملکی سیاح' چاروں طرف رونق' چہل پہل اور گہما گہمی تھی---- ہوٹلوں میں ریکارڈنگ ہو رہی تھی اور دکانوں کے ریڈیو میں ریڈیو پاکستان کوئٹہ سے پشتو کے نغمے نشر ہو رہے تھے۔

ہم سامنے کے پہاڑ کی ڈھلان پر واقع ایک ہوٹل کے لان میں چائے کے لئے بیٹھ گئے۔

امتل کے ہونٹ خشک ہو گئے تھے۔ اور ان پر پپڑی سی جم گئی تھی۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری تو میں نے ہنس کر کہا۔

"یہ خشک اور سرد ہواؤں کا اثر ہے۔"

امتل نے کہا---- "چلو کچھ محسوس تو ہوا نا کہ ہم کراچی سے باہر ہیں۔"

"مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ آپ کچھ مظلوم مظلوم سی نظر آ رہی ہیں۔"

امتل مسکرائی-----

"مجھے مجبور اور بے بس دیکھنے کی آپ کو بہت خواہش ہے؟"

"آپ سچ کہتی ہیں----؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"مگر آپ کی یہ خواہش شاید ہی کبھی پوری ہو----؟"

"ہونہ ہو' میں تو اس کے انتظار میں زندگی گنوا دوں گا۔"

عاطف منہ ہاتھ دھونے کے بہانے اٹھ کر چلا گیا---- امتل نے اپنی سیماب وش آنکھوں سے عینک اتار لی۔ ایک دو لمحے غور سے دیکھتی رہی' پھر ہنس پڑی۔

"بھائی جان اٹھ کر چلے گئے۔ مرد کتنے احمق اور خود غرض ہوتے ہیں۔ جو بھائی مجھے دنیا میں سب سے زیادہ جانتا اور سمجھتا ہے' وہ بھی بالکل آپ ہی کی طرح سوچتا ہے۔ آپ لوگوں کے اندازے کتنے غلط ہوتے ہیں-----؟"

"مرد کچھ زیادہ ہی رجعت پسند ہوتے ہیں شاید؟"

"عورتیں بھی آپ ہی کی طرح ہوتی ہیں۔ انسان یا غاصب ہوتا ہے یا رجعت پسند' طاقت ور ہو تو غاصب' کمزور ہو تو رجائی؟"

میں ہنس پڑا------

"بات کہاں سے کہاں نکل گئی-----!"

"خشک ہونٹوں سے خشک منطق تک' آپ لوگ چاہتے بھی تو یہی ہیں۔ ہیر پھیر کر بات ہونٹوں پر ختم کرتے ہیں۔ بے چارے فرائڈ نے تو عمر عزیز اسی جستجو میں گنوا دی!"

"لیکن ایک دنیا اس سے متاثر ہے۔"

"جن لوگوں نے دلیلوں کے زور سے اپنی بات منوائی ہے' ان کی تعداد کم نہیں ہے' لیکن المیہ یہ ہے کہ وہ سب ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں۔ میرے خیال میں حق کا تعین ابھی نہیں ہوا!"

میں نے پوچھا---- "حق کا تعین کبھی ہو گا-----؟"

"آپ جیسے رجعت پرست اس کا انتظار کرتے رہیں گے اور قیامت آ جائے گی' اور سب کچھ ختم ہو جائے گا۔"

میں نے محسوس کیا کہ ہر نئے پڑاؤ پر پہنچ کر یہ لڑکی تازہ دم ہو جاتی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم جاتی ہیں۔ جمی رہیں۔ اس کے ذہن کی تر و تازگی ختم نہیں ہوتی۔

چائے پی کر ہم زیارت کی سیر کے لئے نکل گئے۔ سبی ہاؤس اور کمشنر ہاؤس سے ہوتے

ہوئے ہم بالکل اوپر پہنچ گئے...... یہاں یخ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ صنوبر کے
درخت یہاں زیادہ تنومند ہو گئے تھے۔ کوٹھیوں کے لانوں میں سبزی مائل قرمزی رنگ کی
جو گھاس لگی ہوئی تھی' میں نے ایسی دل کو لبھا دینے والی نرم' کومل اور خوبصورت گھاس
پہلے نہیں دیکھی تھی۔ گیندے کا مبالغے کی حد تک بڑا اور شگفتہ پھول بھی میں نے اس
سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

اوپر سے نیچے کی فضا اور سامنے کے پہاڑوں میں صنوبر کے لامتناہی سلسلے' جادو کی نگر
کی طرح حسین تھے...... اور پھر یہ کہ نہایت ہی پر سکون ماحول تھا۔

قائداعظم جیسے سنجیدہ اور متین شخص نے یہ جگہ یونہی پسند نہیں کی تھی......

محکمہ سیاحت نے سیاحوں کی معلومات کے لئے ایک بورڈ پر لکھا تھا...... "صنوبر کا
جنگل دنیا کا دوسرا بڑا جنگل ہے۔ اس کی حفاظت کرنا آپ کا فرض ہے۔"

یہ پڑھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی اور میں نے سوچا' اس ملک میں کیا نہیں ہے۔ ا
جانے والی سڑک پانی کے تالاب کے پاس آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ دائیں بائیں کے پہاڑ
کے درمیان پگڈنڈی کی شکل میں ایک پکا راستہ آگے کو نکل جاتا ہے۔ پانی والے تالا
کے چوکیدار نے بتایا۔

"یہ راستہ خرواری کو نکل جاتا ہے۔ جہاں ان کا مزار ہے۔"

اسی چوکیدار کی زبانی معلوم ہوا...... کہ زیارت کا اصلی نام کوشکی ہے۔ چ
خرواری بابا کے مزار کو لوگ زیارت کے نام سے موسوم کرتے ہیں' اس لئے آہستہ آ
کوشکی کا نام بھی زیارت پڑ گیا......

یہ پگڈنڈی صنوبر کے درختوں کے بیچوں بیچ دور تک چلی گئی تھی اور بائیں ہاتھ
پہاڑ کے ایک اونچے موڑ پر غائب ہو گئی تھی...... امثل بولی......

"کیا ہم اس موڑ تک نہیں جاسکتے......؟"

"کیوں نہیں جاسکتے۔" ہم دونوں نے تائید کی۔

موڑ تک تقریباً ایک میل کا راستہ ہم نے پیدل طے کیا' لیکن یہ صاف ستھرا راستہ

وں کے اس طرف وہی پہاڑ اور صنوبر کا وہی سیاہ جنگل' تقریباً ستر اسی گز نیچے' دونوں
اڑوں کی تنگ وادی میں ایک کچی سڑک جا رہی تھی۔ یہ بھی خرواری بابا کے مزار کو نکلتی
تھی......

جب ہم زیارت کی طرف واپس آ رہے تھے' تو راستے میں آٹھ دس آدمیوں کی ٹولی
لی' جو بغلوں میں گٹھڑیاں لٹکائے خرواری بابا کی طرف جا رہے تھے۔ یہ سب کے سب
تقریباً جوان تھے' مگر سب کی ڈاڑھیاں بھی تھیں۔

ان کی گھنگھریالی ڈاڑھیاں انتہائی خوبصورت' نہایت اعلیٰ تراش خراش والی اور بے حد
زیب تھیں...... ہم نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

ہمارے ساتھ لڑکی کو دیکھ کر سب کے سب بے حد احترام سے ایک طرف ہٹ کر
کھڑے ہو گئے۔

امثل کی دلچسپی محسوس کر کے میں نے ان سے بات کا آغاز کیا۔

"بھائی صاحب! اگر آپ پسند کریں تو دو چار باتیں ہو جائیں؟"

ان میں سے دو چار شرمائے اور دو چار مسکرائے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھنے
لگے۔

میں نے کہا......

"بات یہ ہے کہ آپ کی ڈاڑھیاں بے حد نفیس اور خوبصورت ہیں۔ ہم اس کی وجہ
جاننا چاہتے ہیں......"

ان میں سے چند آدمی ہنس پڑے۔ انہی میں سے ایک نے بتایا...... "ہمارے سارے
قبیلے میں اسی ڈاڑھی کا رواج ہے۔"

میں نے پوچھا...... "آپ کونسے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں......؟"

اسی آدمی نے جواب دیا...... "ہم مری قبائل سے تعلق رکھتے ہیں۔"

"اچھا اچھا' تو آپ مری ہیں' مگر کیا آپ کی ساری نسل کی ڈاڑھیاں اسی طرح
رہیں......؟"

وہ ہنس پڑا۔۔۔۔۔

"ہاں۔۔۔۔۔ کچھ ایسی ہی ہیں' مگر قدرتی ایسی نہیں ہوتیں۔ ہم انہیں بناتے ہیں۔ محنت کرتے ہیں۔ رات کو انہیں پنسلوں پر لپیٹ کر باندھتے ہیں' اور صبح بڑے اہتمام کھول کر بنواتے ہیں۔ تب یہ ایسی بنتی ہیں!"

ہم نے خوش ہو کر ان کا شکریہ ادا کیا۔۔۔۔۔ جب ان سے رخصت ہوئے' تو وہ م کر ہمیں دیکھتے رہے اور مسکراتے رہے۔ حتیٰ کہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

واپس پانی کے تالاب پر پہنچے تو وہاں ایک یورپین سیاح کھڑا سگریٹ پی رہا تھا اور ہ طرف دیکھ رہا تھا۔۔۔۔۔ عاطف نے اس سے سلام دعا کی۔

ہمارا تعارف کرایا' تو اس نے بھی اپنا تعارف کرایا۔

وہ اسپین کا رہنے والا تھا۔ تقریباً سارا پاکستان گھوم چکا تھا' اور اب ہندوستان جا پروگرام بنا رہا تھا۔ جب عاطف نے اس سے پوچھا۔

"پاکستان آپ کو کیسا لگا۔۔۔۔؟"

تو اس نے نہایت فصیح جواب دیا۔

"یہ ملک نہایت بھرپور ملک ہے' اور صحیح معنوں میں اپنا الگ کلچر رکھتا ہے۔ شہروں چھوڑ دیجئے' جہاں لوگ کوٹ پتلون پہنتے ہیں۔ ہوٹلوں میں کھانا کھاتے ہیں اور کلبوں جاتے ہیں۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ میں جہاں بھی گیا' جس علاقے میں گیا' ایک مخصوص تہوار ایک مخصوص زبان' مخصوص ذائقے اور رہن سہن کے اپنے اپنے طریقے۔۔۔۔۔ نئے آد کے لئے اس میں عجیب دلکشی اور تنوع ہے۔ خصوصاً یورپ کے آدمی کے لئے تو یہا قدم قدم پر تاریخ کا ورق ورق بکھرا ہوا ملتا ہے۔"

"آپ کہاں کہاں گھومے ہیں۔۔۔۔۔؟" عاطف نے پوچھا۔

"موہنجوداڑو' ہڑپہ' ملتان' لاہور' ٹیکسلا' پشاور' مردان' سوات اور خاص کر کاغا ویلی۔۔۔۔۔ کیا بتاؤں۔ پاکستان کا شمال مغربی حصہ دنیا کا حسین ترین ٹکڑا ہے۔"

اصل نے پوچھا۔۔۔۔۔

"آپ نے جھیل سیف الملوک بھی دیکھی۔۔۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔۔۔ دیکھی دیکھی۔۔۔۔۔ مگر میں اپنا ردعمل نہیں بتاؤں گا۔۔۔۔۔ اس جھیل کے بارے میں جو بھی مجھ سے پوچھے گا' میں کہوں گا۔ خود جاؤ' خود جاؤ۔۔۔۔۔ میں اپنے سفر نامے میں بھی ہر جگہ اور ہر مقام کے بارے میں تفصیل سے لکھوں گا' لیکن جھیل سیف الملوک کا ذکر آئے گا' تو کچھ نہیں لکھوں گا۔۔۔۔۔ صرف اتنا لکھوں گا کہ خود جاؤ' خود جاؤ۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ آؤ۔۔۔۔۔ خدا کا تصور کون بیان کر سکتا ہے۔۔۔۔۔!"

اس کا جواب سن کر اصل نے میری طرف دیکھا۔ میں نے سیاح سے پوچھا۔

"آپ کس مقصد کے تحت دنیا کی سیاحت کر رہے ہیں۔۔۔۔۔؟"

"کوئی مقصد نہیں' بالکل کوئی مقصد نہیں۔ میں زندگی کے سارے کام نمٹا چکا ہوں۔ تعلیم مکمل کی' شادی کر والی' بچے پیدا کر لئے۔ دولت بھی جمع کر لی۔ اب باقی کیا رہا زندگی میں' سیاحت کے لئے نکلا ہوں۔ شاید ایک دن اس سے بھی دل بھر جائے۔"

میں نے پوچھا۔۔۔۔۔ "اس کے بعد آپ کیا کریں گے؟"

"شاید خودکشی کر لوں۔۔۔۔۔!"

"خودکشی گناہ ہے۔"

"گناہ زندگی کے لئے بہت ضروری ہے۔ انسان کے جذبات کے سامنے بند نہیں باندھنے چاہئیں۔ اسے آزادانہ عمل کی اجازت دینی چاہیے۔ اچھائی کی طرح برائی بھی زندگی کا لازمی جزو ہے۔ ہمیں بااختیار ہونا چاہیے تاکہ ہم خود نتائج اخذ کر سکیں۔"

"یہ کسی حتمی سوچ رکھنے والے ادیب کی لکھی ہوئی کتاب کی باتیں ہیں۔ ہمیں سماجی فرائض سے پہلو تہی نہیں کرنا چاہیے اور معاشرتی آداب کا احترام کرنا چاہیے۔"

"نہیں نہیں۔۔۔۔۔!" اس نے سختی سے تردید کی۔۔۔۔۔ "معاشرتی آداب اور سماجی فرائض الفاظ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ ہم ان کی خاطر جذبات کا گلا نہیں گھونٹ سکتے' اور نہ ہم جذباتی تجربے بند کر سکتے ہیں۔ آخر ہم قدرتی تقاضوں کا رخ کس طرح موڑ سکتے ہیں۔ آداب زندگی احساسات سے بالا کیسے ہو سکتے ہیں؟"

"میں نے کہیں پڑھا تھا...... ایمرسن نے کہا کہ اگر زندگی کے آداب بے کار ہیں' تو شبنم کے دو قطرے بھی بے کار ہیں' جو مرغزاروں کو حسن اور دلکشی عطا کرتے ہیں۔"

وہ ہنس پڑا.....

"کتاب کے حوالے تو آپ دے رہے ہیں۔ یہ شاعرانہ باتیں ہیں۔ ویسے شعر مجھے بھی اچھے لگتے ہیں' مگر اسے الفاظ تک محدود نہیں رکھنا چاہیے۔ اسے ہر جگہ محسوس کرنا چاہیے...... جیسے ہمارے اردگرد' یہ خوبصورت صنوبر کا جنگل' یہ ٹھنڈی اور خنک ہوائیں' یہ خوبصورت گھاٹیاں' اور یہ آپ کے ساتھ حسین و جمیل لڑکی' کیا ان سب میں شعریت نہیں ہے......؟ کیا یہ چیزیں جذبات سے معمور نہیں ہیں۔ ہم اس حسن کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔ ہم محض آداب کی خاطر ان قدرتی نوازشوں سے محروم کیوں رہیں......؟ اگر یہ گناہ ہے' تو ہم سے یہ گناہ ضرور سرزد ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہ فطری عمل ہے!"

امثل خاموش تھی اور بے نیازی اور سادگی سے ہماری باتیں سن رہی تھی۔ میں نے سیاح سے کہا۔

"آپ کی باتیں ٹوٹے دل کی باتیں ہیں۔ آپ انسانی جذبات کو انسانی فرائض پر ترجیح دے رہے ہیں...... میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ دشمن کا سپاہی آپ کے ملک پر حملہ آور ہوتا ہے' وہ آپ کے گھر میں زبردستی گھس آتا ہے۔ آپ کے گھر میں آپ کی حسین بہن یا آپ کی کنواری بیٹی کو دیکھ کر اس کے جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں۔ وہ زبردستی آپ کی بہن یا بیٹی کی عزت لوٹنا چاہتا ہے...... مجھے بتایئے آپ اس وقت کیا کریں گے......؟ فرض کا دامن پکڑیں گے' بہن یا بیٹی کو بچائیں گے' یا سپاہی کے جذباتی تقاضے اور قدرتی فعل کو جائز سمجھ کر آنکھیں بند کر لیں گے......؟"

انگلش سیاح ایک لمحے کے لئے چکرا گیا...... امثل مسکرائی۔ میں نے بات جاری رکھی۔

"مائی ڈیر فرینڈ......! میں بتاؤں۔ آپ کیا کریں گے۔ آپ اس آزادانہ عمل کو

روکیں گے۔ آپ کی عزت نفس' آپ کی انا' جو انسان ہونے کی حیثیت سے آپ کو ودیعت ہوئی ہے' اس فطری تقاضے کو غیر فطری قرار دے گی' کیونکہ درحقیقت یہ فطری نہیں تھا...... فطری یہ اس وقت تک تھا' جب تک آپ کی ذات کو اس سے فائدہ پہنچ رہا تھا' مگر جب اس سے الٹ ہوا' تو یہ فطری نہ رہا۔ اب فرض مقدم ہو گیا اور آداب زندگی لازمی ہو گئے۔ آپ سپاہی کی دھاندلی کو روکیں گے اور یا اس کے لئے جان دے دیں گے۔"

"ہاں......!" وہ سوچوں کے کنوئیں سے ابھرا۔ "مجھے کچھ کرنا پڑے گا۔ دھاندلی کو روکنا پڑے گا۔ یہ ضروری ہے۔ یہ ضروری ہے...... جس طرح سیلاب آتے ہیں' انسان انہیں روکنے کے لئے بند باندھتا ہے۔ بے شک دشمن کا مقابلہ ضروری ہے!"

سیاح جو تالاب کی دیوار کے سہارے کھڑا تھا' دیوار سے الگ ہو گیا۔ اس نے باری باری ہم تینوں کو دیکھا...... یہ نئی نظر تھی۔ پھر اس نے نیا سگریٹ نکال کر جلایا۔

میں نے اس سے کہا.....

"فطرت نے اگر شیر کو چیرنے پھاڑنے اور غالب آ جانے کی قوت عطا کی ہے' تو ہرن کو چوکسی اور بھاگ نکلنے کی طراری بخشی ہے۔ سانپ کے منہ میں زہر کے پیالے رکھ دیئے ہیں' مگر نیولے جیسے بے ضرر جانور کے ہاتھوں مر جاتا ہے۔ گائے کی سادگی ضرب المثل ہے۔ اس کے تھنوں سے دودھ کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ قدرت نے ہر کمزور چیز کی خود حفاظتی کے اسباب پیدا کر دیئے ہیں۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ دھاندلی کا قانون غلط ہے...... اور انسان کو آزادانہ عمل کی تائید نہیں کرنا چاہیے۔"

انگلش سیاح نے آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"آپ نے مجھ پر جینے کی ذمہ داری ڈال دی ہے۔ کم از کم اب میں اپنی مرضی سے مرنا پسند نہیں کروں گا اور یہ بھی کہ اگر زندگی میں ہر کام میری منشاء کے مطابق نہیں ہوتا' تو کوئی حرج نہیں!"

امثل بے ساختہ ہنس پڑی...... ہم سب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور

ہنس رہی تھی۔ اس نے چینی سیاح کی طرف دیکھا اور پھر ہنستے ہوئے اس سے مخاطب ہوئی۔

"ذات کے کرب سے خوفزدہ ہو کر ذات کی بازیافت کے لئے گھر سے نکلے تھے کہ دھر لئے گئے' لیکن آپ کی بھی کیا خطا' اسیر اجتماع اور اسیر ذات دونوں کو کسی نظریئے پر یقین نہیں رہا۔"

چینی سیاح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسل کو دیکھنے لگ گیا تھا۔ اسل نے اس کی حیرت پر کوئی توجہ نہ دی اور کہنے لگی۔

"ہم نے اس سے پہلے بھی جو نصب العین اور یقین قائم کئے تھے' ان کی بنیاد محض فکری تھی۔ اس لئے بودے نکلے۔ فکر نے ہر صدی میں ترقی کی اور ہر دور نے نئی اساس پیدا کیں۔ اس لئے ہم نتیجے پر کیسے پہنچ سکتے ہیں اور کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ غلطی ہے؟"

میں جان گیا تھا کہ اسل میرے کئے کرائے پر پانی پھیر دے گی۔ کیونکہ چینی سیاح کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا تھا اور وہ مریدوں کی طرح اسل کو دیکھ رہا تھا۔

"آپ ذات کی تلاش میں چین سے نکلے تھے۔" اسل نے مزید کہا۔۔۔۔ "لیکن ہمارے دوست نے دشمن کے سپاہی کا ڈراوا دے کر آپ کو جینے پر آمادہ کر لیا۔ حفاظت خود اختیاری سہی' مگر آپ کو آمادہ پیکار کر دیا اور آپ کو یہ مفہوم دیا کہ آپ دھاندلی کو روک رہے ہیں۔ دراصل یہ انسان سے انسان کی نفرت کی تبلیغ ہے۔"

چینی سیاح نے تازہ سگریٹ پاؤں تلے روند دیا اور ہولے سے بولا۔

"آپ بات جاری رکھیں۔۔۔۔!"

اسل ہنس پڑی۔۔۔۔

"بات یہ ہے میرے دوست۔۔۔۔ کہ یورپ کی میکانکی زندگی' مشرق کی روحانیت سے ہمیشہ مرعوب رہی ہے۔۔۔۔ شہری زندگی کا کرب اور صنعتی دور کی ناآسودگی نے انسان کو مشین کا ایک پرزہ بنا دیا ہے۔ تم مغرب کے لوگ جب اس صورت حال سے گھبراتے ہو' تو مشرق کی طرف دوڑتے ہو۔ یہاں تمہیں اس جوگی کی تلاش ہوتی ہے جو ننگ دھڑنگ

روحانی راہوں کا مقابلہ محض اپنی شکتی سے کرتا ہے۔ دراصل تم اپنی ذات کی تلاش میں ہوتے ہو۔ اس ذات کی تلاش میں' جسے تم غار میں چھوڑ آئے ہو۔۔۔۔!"

"ہاں۔۔۔۔!" سیاح کی آنکھیں یکبارگی چمک اٹھیں۔۔۔۔ "ہاں' شاید میں اسی کی تلاش میں ہوں۔۔۔۔ لیکن' لیکن میں وہاں تک کیسے پہنچوں گا۔۔۔۔؟ میں تنہا ہوں۔ میں اکیلے یہ سفر کیسے طے کروں گا؟ اے معزز خاتون! یہ واپسی کیونکر ممکن ہوگی۔"

اسل نے ایک دو لمحے اسے غور سے دیکھا۔ پھر بولی۔

"انسان جب زمین پر پہنچایا گیا' تو اس کی کوئی قومیت نہیں تھی۔ کوئی مذہب نہیں تھا۔ اسے نسلی اور جغرافیائی مسئلہ بھی درپیش نہیں تھا۔ وہ سیدھا سادا انسان تھا۔ بھائی بہن سے شادی رچاتا تھا۔ کسی اخلاقی اور تمدنی سوچ نے جنم نہیں لیا تھا۔۔۔۔ صدیاں بیت گئیں۔ آہستہ آہستہ خدا کا تصور پیدا ہوا اور الہامی دور آیا۔ اور دنیا مذاہب میں بٹ گئی اور قومیتوں نے جنم لیا۔۔۔۔ جن لوگوں کو قومیت کے نعرے سے فائدہ پہنچ سکتا تھا' وہ اسی پر اڑ گئے۔ مذہب اور قومیت کو زندگی کا مقصد ٹھہرایا' لیکن جن لوگوں کو یہ نعرہ راس نہیں آتا تھا' انہوں نے اس کی سختی سے تردید کی۔۔۔۔ یوں دنیا دو گروہوں میں بٹ گئی۔ ہر گروہ' دوسرے گروہ کو نیچا دکھانے کی تگ و دو میں لگ گیا۔۔۔۔ اس مقابلے کا فائدہ یہ ہوا کہ دنیا مادی ترقی میں بہت آگے نکل گئی' مگر اس کا نقصان یہ ہوا کہ سائنسی ترقی نے انسان کو مشین کا پرزہ بنا دیا۔۔۔۔ چنانچہ اب صورت حال یہ ہے کہ اسے نہ مذہب پر اعتقاد رہا اور نہ بے روح سائنس سے کوئی عقیدت' وہ تنہا ہے۔ آپ کی طرح' میری طرح' میرے ساتھیوں کی طرح' شعور نے اسے غار سے نکالا تھا۔ اب شعور ہی اسے واپس غار کی طرف دھکیل رہا ہے!"

چینی سیاح دم بخود کھڑا تھا۔ وہ بیک وقت حیران بھی تھا۔ رنجیدہ بھی اور خوش بھی' اس کی عقیدت مندانہ نگاہیں اسل پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر وہ آہستہ سے مگر یقین کے ساتھ بولا۔

"میں آج تک جتنے لوگوں سے ملا ہوں' ان سب میں آپ لوگ شاندار ہیں۔ میں نے

جتنی کتابیں پڑھی ہیں' کسی حد تک ان کا مفہوم آج سمجھا ہوں ---- یہ مختصر سی ملا[قات]
مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ یہ صنوبر کا جنگل اور سطح سمندر سے نو ہزار فٹ کی بلندی' اور [یہ]
آن بان کے دو البیلے جوان اور ایک دلکش بے مثل لڑکی۔ میں اپنا سفرنامہ یہیں ختم کر[وں]
گا اور اپنے بچوں کی طرف لوٹ جاؤں گا......!"

عاطف نے کہا......

"کیا آپ نیچے ہوٹل میں ہمارے ساتھ چائے پئیں گے......؟"

"ہاں ہاں...... بہت خوشی سے۔"

جب ہم نیچے پہنچ گئے اور ہوٹل کے لان میں چائے کے ٹیبل کے اردگرد بیٹھ گئے
سیاح نے کہا......

"اب ہم نو ہزار فٹ کی بلندی پر نہیں ہیں۔"

امثل نے برجستہ جواب دیا۔

"لیکن بہرحال آپ بلندی پر ہیں۔ فیکٹریوں کے دھوئیں سے دور اور کارخانوں
چمنیوں سے اونچے......؟"

سیاح ہنس پڑا...... اور بے حد خوش ہوا۔

"اٹیکواکل' اٹیکواکل......! کاش مجھے زندگی میں ایسی کمپنی نصیب ہوئی ہوتی۔
شاید یہ زندگی اتنی دوبھر نہ ہوتی!"

امثل بھی ہنسنے لگی......

"یہ الفاظ کا سکون ہے...... لفاظی سے دھوکہ نہ کھائیے۔ چند دن ہمارے ساتھ رہ[یں]
گے' تو یہ راز بھی آپ پر کھل جائے گا کہ ہمارے دلوں کی طرح ہمارے الفاظ بھی [معنی]
سے خالی ہیں!"

"عمدہ' نہایت عمدہ......!" بیتی سیاح جذبے سے بولا...... "مگر آپ کے الفاظ [ایک]
معصوم بچے کے بوسوں کی طرح تسکین پہنچا رہے ہیں۔ پھر بھی اگر آپ کی رفاقت میں [کسی]
طرح کا خدشہ موجود ہے' تو میں اس ملاقات کو یہیں ختم کر دوں گا' تاکہ ان مختصر

حسین اور قیمتی لمحوں کی یادیں میں اپنے ساتھ لے جا سکوں۔"

چائے آ گئی تھی۔ گرم گرم چائے نے ہمیں بے حد تقویت پہنچائی۔

اگلے دن ہمارا پروگرام چمن جانے کا تھا۔

صبح نو بجے ہم ہوٹل سے نکل گئے۔ آج امثل نے سفید قمیص اور سفید پتلون پہنی
ہوئی تھی۔ شہر سے نکلے تو عاطف نے جھنڈا گاڑنے والے سردار صاحب کا ذکر چھیڑ دیا۔
امثل بے تحاشہ ہنسنے لگی۔

میں نے کہا......

"کتنا عجیب اتفاق ہے۔ جب کامرانی صرف دو قدم رہ گئی تھی' تو کم بخت بڑھیا آفت
ناگہانی کی طرح ٹپک پڑی۔ شاید اسی کو لوگ قسمت کہتے ہیں۔"

لیکن امثل اس بارے میں بالکل سنجیدہ نہیں تھی۔ وہ برابر ہنستی رہی...... راستے میں
شیخ ماندہ' بلیلی' کچلاک اور یارو کے گاؤں آئے۔ سڑک کے دونوں جانب حسب معمول
سیب کے باغات تھے' جن میں سرخ سیب لگے ہوئے تھے۔ دائیں ہاتھ پہاڑوں کا اونچا
سلسلہ چلا گیا تھا۔

کچلاک سے آگے ایک عجیب نظارہ تھا۔ سڑک کے ساتھ ساتھ چھوٹی بڑی' گول مول'
نوکدار پہاڑیوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ ان کا رنگ سیمنٹ کی طرح تھا اور ایسا لگتا تھا
جیسے ابھی ابھی کوئی لپائی کر گیا ہو...... حالانکہ یہ بالکل فطری عمل تھا۔ امثل نے دور تک
پھیلے ہوئے ان ٹیلوں کو دیکھ کر کہا......

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ وسطیٰ کا کوئی لشکر خیمہ زن ہے۔"

عاطف نے برجستہ جواب دیا......

"مگر جیسے سپاہ شکست کھا کر بھاگ گئی ہے۔ افرا تفری میں خیمے گڑے کے گڑے رہ گئے ہیں۔"

"ہاں۔ بالکل یہی نقشہ ہے۔" میں نے تائید کی ---- "قدرت کا یہ کھیل کتنا غیر قدرتی ہے۔ اس میں ذرا بھی انتشار نہیں ہے۔"

"سب مادے کی کارستانی ہے۔" اسلم بولا ---- "جب گیسوں سے مائع اور مائع سے زمین بن رہی تھی' تو اس اندھے عمل نے عجیب و غریب نتائج پیدا کئے۔ جواہرات' کوئلہ' تیل' سونا اور دوسری معدنیات کے علاوہ پتھر کے یہ مجسمے بھی گاڑ دیئے گئے۔"

"اور کسی غیبی ہاتھ نے لپائی کر دی ----" میں نے گویا تائید کی۔

"ہاں ---- یہ عجیب سا لگتا ہے۔" عاطف بولا ---- "میں اس طرح کا منظر پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ زمین کی عمر جانے کتنے کروڑ سال ہو گی۔ غالباً اس لپائی کی عمر بھی اتنے ہی برس ہو گی!"

سڑک تنگ تھی' مگر ٹریفک زیادہ نہیں تھی۔ اکا دکا بسیں چمن اور کوئٹہ کی طرف آ جا رہی تھیں۔ تقریباً بارہ بجے ہم سرانان پہنچ گئے۔ سرانان ایک چھوٹا سا گاؤں تھا' جو سڑک کے دونوں طرف آباد تھا۔ یہاں ایک چھوٹا سا بازار بھی تھا۔ ہم چائے پینے کے لئے رک گئے۔ جونہی ہماری جیپ کھڑی ہو گئی' دس بارہ سال کا ایک پٹھان لڑکا دوڑتا ہوا آیا اور بولا۔

"صاحب' روز کھائیں گے؟"

ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ---- "روز" نیا نام تھا ہمارے لئے۔

"ابھی ہم چائے پئیں گے۔ کہاں ہے دکان تمہاری ----؟" میں نے پوچھا۔

"صاحب ہم چائے نہیں بیچتے۔ ہمارے ہوٹل میں صرف روز پکتا ہے۔ ساتھ والے ہوٹل میں چائے ملے گی۔"

ہم اتر کر چائے کی دکان پر چلے گئے۔ ساتھ والی دکان میں پانچ چھ دنبے لٹک رہے تھے' جن پر چربی چڑھی ہوئی تھی اور ان کا گوشت نہایت اعلیٰ قسم کا لگ رہا تھا ---- لڑکے نے

بھی پھر ترغیب دی ----

"صاحب آپ روز دیکھ لیجئے۔ بہت لذیذ گوشت ہوتا ہے۔ بہت دور دور سے لوگ کھانے کے لئے آتے ہیں۔"

لڑکے کی ترغیب میں بڑی صداقت تھی۔ ہم نے اٹھ کر دیکھا۔ پانچ چھ بڑے بڑے سیخوں میں گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے تھے۔ ہر ٹکڑا پاؤ ڈیڑھ پاؤ سے کم نہ ہو گا۔ ڈھائی روپے فی پلیٹ قیمت بھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔

سوائے نمک کے اس میں کوئی اور مصالحہ نہیں ڈالا گیا تھا۔ دنبے کی اپنی چربی میں پکایا گیا تھا' لیکن بلا مبالغہ' میں بیان نہیں کر سکتا کہ یہ کس قدر لذیذ گوشت تھا۔ یوں کہیے کہ ہم تینوں میں سے کسی نے بھی اتنا لذیذ گوشت قبل ازیں نہیں کھایا تھا۔

اسلم' جس کا کام و دہن سے اتنا گہرا لگاؤ نہیں تھا' وہ بھی "روز" کی تعریف میں پیش پیش تھی۔

بلاشبہ ریزہ ریزہ ہونے والے اس گوشت کا ذائقہ نہایت اعلیٰ اور نفیس ترین تھا۔ سیخوں کے پیچھے مٹی کے تھڑے پر بیٹھا ہوا پٹھان ہمیں کسی دوسری دنیا کا آدمی لگا۔

گوشت کے اس لذیذ ٹکڑے کی وساطت سے بلوچستان کا سارا کلچر ہماری روح میں اتر گیا تھا۔

دوسرے دکاندار نے پوچھے بغیر چائے کے بجائے ہمیں قہوہ بھیج دیا۔ لڑکے نے کہا۔

"روز کھانے کے بعد آپ کو قہوہ ہی پینا چاہیے۔ آپ کا گلا صاف ہو جائے گا اور ہاضمہ بھی جلدی ہو گا۔"

قہوہ پی کر ہم اٹھے۔ اِدھر اُدھر بازار میں گھومے۔ بھاری بھرکم شلواروں' لمبی قمیصوں' بھاری پگڑیوں اور واسکٹوں میں ملبوس پٹھان اب ہمیں اجنبی نہیں لگ رہے تھے۔ روز پکانے اور کھانے والے لوگ بالکل ہمارے اپنے آدمی تھے۔

ان لوگوں نے ہمیں ایک نیا ذائقہ دیا تھا اور اب ہم ان میں مکمل مل گئے تھے۔ ہمیں اس ثقافت پر فخر ہو رہا تھا' کیونکہ یہ ہمارا اپنا ملک تھا۔

جب ہماری جیپ روانہ ہو گئی' تو میں نے جذباتی ہو کر کہا۔

"یہ ہوتا ہے انسان کا انسان سے تعلق۔"

اصل' جو ہمارے درمیان بیٹھی تھی' چونکی۔ مگر میں نے اپنی بات جاری رکھی۔

"مجھے یہ لوگ بہت اچھے لگے۔ کتنا کھرا اور صاف ستھرا سودا بیچتے ہیں۔ جیسے چہروں پر کوئی کھوٹ نہیں' ویسے ان کے دیگچوں میں اصلی اور کھری چیز ملتی ہے۔۔۔ ملاوٹ نہیں' کوئی دھوکہ نہیں' اپنے بھاری بھرکم کپڑوں کی طرح دل بھی بڑا رکھتے

میں نے کنکھیوں سے دیکھا۔ اصل مسکرا رہی تھی اور سامنے دیکھ رہی تھی۔

گاؤں سے نکل آئے تھے۔ دائیں بائیں اور آگے دور تک' سپاٹ اور خشک تھا۔۔۔۔ تاحد نظر سیاہی مائل' تقریباً فٹ ڈیڑھ فٹ کی جھاڑی' زمین کے بھورے اس طرح پھیلی ہوئی تھی' جیسے چہرے پر چیچک کے داغ۔۔۔۔

کہیں کہیں اکا دکا خانہ بدوشوں کے آڑے ترچھے' سیاہ اور بھورے رنگ کے خ آجاتے تھے' جہاں ایک آدھ گدھا اور مجھر چر رہے ہوتے اور مرغیاں دانہ دنکا چگ ہوتیں۔ کتا بھونکتا' چند قدم بس یا جیپ کے ساتھ دوڑتا اور پھر واپس خیمے کی طر جاتا۔

میں نے اصل سے کہا۔۔۔۔

"قدرت نے انسان کی ضرورتوں کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ مرغی کو دیکھئے۔ ا پالتو جانور ہے۔ انڈا اور گوشت مہیا کرتا ہے۔ کتنی سادگی اور سپردگی ہے اس ع رکھوالی کرتا ہے۔ گدھا بار برداری کے کام آتا ہے اور گھوڑا اپنی سرکشی اور طاقت باوجود انسان کے تابع ہے۔ بکری دودھ دیتی ہے اور زمین' اناج۔ سب کچھ انسان ہے۔ انسان کو پیدا کرنا بے مقصد نہیں ہو سکتا۔"

"ہاں۔ میں بھی سوچتی ہوں۔ مادہ اتنی منظم سازش نہیں کر سکتا۔ سانپ' جونکیں' آخر انسان انہیں کیا کرے گا؟"

عجیب جواب تھا۔ نہایت پیچ دار۔۔۔۔

"آپ خاموش ہو گئے۔" اصل نے میری طرف دیکھا۔۔۔۔ "آپ نے ہاتھی کا ذکر کیا۔ یہ بھی پالتو جانور ہے۔ انسان نے اس کی پشت پر ہودج رکھی اور زرہ بکتر پہن کر بیٹھ گیا' اور پھر انسان کو کچلنے کے لئے آگے بڑھا' چنانچہ صفیں الٹتا گیا اور فتح و ولی کے جھنڈے گاڑتا چلا گیا۔ انسان بھاگتا رہا اور تاریخ بنتی چلی گئی۔۔۔۔ یہ جو نے' آڑے ترچھے' سیاہ خیمے میں اکیلا انسان آپ کو نظر آ رہا ہے۔۔۔۔ یہ تاریخ سے ہوا آدمی ہے۔۔۔۔ تاریخ کا ستایا ہوا آدمی' یہ تاریخ سے بھاگ گیا ہے اور انسانوں دور چلا گیا ہے۔ اکیلا' ویرانوں میں' جنگلوں میں' پہاڑوں میں' ہم نے اس کا نام خانہ ل رکھ دیا ہے۔ اگر آپ اسے جاننے کی کوشش کریں' تو یہ وہی سپاہی ہے' جو ہاتھی بھاری بھرکم پاؤں کے نیچے کچلے جانے کے خوف سے بھاگ گیا تھا اور آج تک امن تلاش میں' بن بن' مارا مارا پھر رہا ہے! یہ خانہ بدوش نہیں وسیم صاحب' تاریخ سے ہوا انسان ہے!"

"سوال یہ نہیں ہے کہ ہم اس کے بچھڑنے کا رونا روئیں۔" میں نے اسے جواب ۔۔۔۔ "سوال یہ ہے کہ ہم اسے احساس دلائیں کہ انسان سے بھاگنا ترک کر دے۔ کے دل میں جو خوف بیٹھا ہوا ہے' نکال دے کہ فرار' زندگی کا مفہوم نہیں ہے۔"

"یہی تو ٹیڑھا مسئلہ ہے کہ ہم اسے زندگی کا مفہوم نہیں سمجھا سکتے۔" اصل نے نرمی کہا۔۔۔۔ "خود ہمیں کونسا زندگی کا مقصد معلوم ہے۔ آدھی دنیا مذہب کو مانتی ہے' مگر آدھی دنیا مختلف مذاہب میں بٹ جاتی ہے۔ ہر مذہب زندگی کا مقصد بیان کرتا ہے۔ اس اکیلے انسان کو کونسا مفہوم بتائیں گے اور کیا مقصد بیان کریں گے۔ اجتماع کی خود ہماری سمجھ میں تو آتی نہیں۔ اس اکیلے انسان کو کیسے قائل کریں گے؟"

میں نے ایک دو لمحے کے بعد کہا۔۔۔۔

"ہم اسے یہ تو سمجھا سکتے ہیں کہ آوارہ گردی چھوڑ دے۔ خیمے کی زندگی ترک کر خیمہ اسے آندھی سے نہیں بچا سکتا۔ انسانوں سے دور رہ کر اسے معاشرتی اور تحفظ نہیں مل سکتا۔ وہ بڑی آسانی سے ایک چھوٹا سا گھر بنا سکتا ہے۔ قانون کی پناہ

میں آنے کے بعد اس کا تاریخ سے بچھڑنے کا احساس خودبخود مٹ جائے گا۔"

امل ہنس پڑی۔

"آپ چاہتے ہیں' اڑتے پنچھی کے پر کاٹ دیئے جائیں۔"

"نہیں' میں یہ نہیں چاہتا۔ میں اسے واپس زندگی کی طرف لوٹنے کا خواہش

ہوں۔"

"آپ کی خواہش ہے کہ وہ ایک چھوٹا سا مکان بنالے۔ ایک چھوٹی سی نسل کا

جائے۔ ایک چھوٹے سے علاقے کی روایتوں میں گم ہو جائے۔ ایک مختصر اور مح

زبان کے تعصب کا شکار ہو جائے۔ پہاڑوں' زمینوں اور دریاؤں کو پوجنے لگ ج

علاقائی بتوں کی پرستش شروع کر دے۔ ہاں...... آپ اسے پکا دنیا دار آدمی بنا

ہیں۔ کیونکہ آپ بھی ایسی ہی زندگی پر یقین رکھتے ہیں۔"

"ہاں ہاں...... میں ایسی زندگی پر یقین رکھتا ہوں۔" میں نے چڑ کر کہا "میں

کی قربت سے خائف نہیں ہوں۔ کیونکہ میں انسان ہوں اور میں ستاروں میں گم

سکتا—— میں انسان کے ضمیر پر یقین رکھتا ہوں۔ ہزار خامیوں کے باوجود میں انسا

مایوس نہیں ہوں۔ یہ میرا نقطہ نظر ہے۔ میں اسی نقطہ نظر کے لئے جینا پسند کروں گا

"بصد شوق......!" امل اسی رواداری سے بولی...... "یہ نقطہ نظر نیا نہیں

روز اول سے انسان اسی نقطہ نظر کا آسرا لے کر جی رہا ہے...... بے چارہ کیا

ہمارے جینے کی امنگ انتہائی سطحی ہے۔ کہیں دولت کی فراوانی' کہیں عورت کی آ

گرمی' کہیں ہوس اقتدار کی آرزو اور کہیں نام و نمود کی خواہش' مگر افسوس ہے

کو یہ سب کچھ نہیں ملتا اور وہ زندگی اس کے لئے بتا دیتا ہے۔ اگر یہ سب کچھ مل

اس کی سب خواہشیں پوری ہو جائیں' تو شاید پھر اسے پتہ لگے کہ زندگی کتنی ہے

ہے۔"

"مگر میں کہتا ہوں امل کہ اگر کوئی آدمی اپنی پسند کی عورت کی امنگ کو ز

معراج سمجھتا ہے' تو آپ کیسے فیصلہ دے سکتی ہیں کہ یہ امنگ سطحی ہے۔ ہم ا

حتی کیوں سمجھیں؟ ہم یہ کیوں نہ کہیں کہ یہ ایک مایوس آدمی کی ذہنی اختراع ہے؟"

"ہاں درست ہے——" امل نے تسلی سے کہا—— "واقعی یہ ایک مایوس آدمی کی

ہنی اختراع ہے۔ اختراع نہیں بلکہ تجربہ ہے۔ اختراع میں شک و شبہ کی گنجائش ہو سکتی

ہے۔ مگر تجربے میں قطعی یقین ہوتا ہے۔ میں یقین کی بات کرتی ہوں مگر افسوس ہے۔

نسان کی فطری کمزوری ہے کہ دھوکہ کھاتا رہے۔"

میں نے بات کا رخ موڑتے ہوئے کہا——

"اگر انسان کو نام و نمود کی خواہش ہے' تو اس میں کیا برائی ہے۔ آخر یہ خواہش انسان

کو فطرت نے ودیعت کی ہے۔"

"ہاں...... یہیں آکر بات ختم ہو جاتی ہے کہ فطرت جو چاہتی ہے' کراتی ہے۔ پھر نیکی

ور برائی کا تصور کہاں باقی رہ جاتا ہے اور زندگی کے معنی کیا رہ جاتے ہیں۔ چونکہ چرند'

پرند' درند سب زندہ ہیں' اس لئے ہم بھی زندہ ہیں—— ہاں تو پھر یہی اصول

ٹھہرا......؟"

میں پھر لاجواب ہوتا جا رہا تھا—— اب ہم گلستان کے قصبے کے قریب سے گزر رہے

تھے۔ یہاں سڑک کے دونوں طرف سردے کے باغ تھے۔ ہم نے جیپ روک لی۔ چاروں

طرف زرد سنہری سردے' پتھروں کی طرح کھیت میں بکھرے پڑے تھے...... یہاں ہم نے

دو آنے سیر کے حساب سے سردے خریدے۔

کچھ دیر بعد ہم قلعہ عبداللہ پہنچ گئے—— یہاں سے پہاڑی سلسلے بھی شروع ہو گئے

تھے۔ ایک اونچا پہاڑ ہماری راہ میں حائل تھا۔ اس پہاڑ کے اس طرف چمن کا قصبہ تھا۔

ہماری جیپ اب چڑھائی چڑھ رہی تھی۔ اچانک امل نے شور مچا کر ہمیں متوجہ کیا۔ وہ

ایک پہاڑی سلسلے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

"وہ دیکھئے' وہ پہاڑی—— جیسے جج کے سر پر ٹوپی!"

واقعی یہ عجیب و غریب نظارہ تھا۔ بالکل جج کی سفید گھنگھریالی ٹوپی کی طرح چونے کے

سفید پتھر کی گھنگھریالی جھاڑیں یوں لگ رہی تھیں' جیسے دیو مالائی دور کے پتھر کا کوئی عظیم

جج انصاف کرنے بیٹھا ہو۔

نیچے ریلوے لائن نظر آ رہی تھی اور یہ لائن پہاڑ کے اندر کہیں گم ہو گئی تھی۔ پہاڑ پر کچھ فاصلے سے جگہ جگہ ٹاور بنے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ ٹاور سڑک اور ریلوے لائن کی حفاظت' سرنگ کی نشاندہی اور دفاعی نقطہ نگاہ سے تیار کئے گئے تھے۔

یہ سرنگ تقریباً آٹھ نو میل تک چلی گئی تھی اور پہاڑ کے اس طرف جا نکلتی تھی۔ غالباً یہ پاکستان ریلوے کی سب سے لمبی سرنگ تھی۔۔۔

کچھ دیر بعد ہم اوپر پہنچ گئے۔۔۔۔

یہ جگہ شیلا باغ کہلاتی ہے۔ نام بے حد خوبصورت اور رومانٹک تھا۔ لیکن نام کی مناسبت سے نہ یہاں باغ تھا اور نہ کوئی شیلا! وہی خشک پہاڑ اور سنگلاخ چٹانیں' جو بلوچستان کا مقدر ہیں۔۔۔۔

ہم جیپ سے اتر آئے۔ ہمارے بالکل سامنے ایک پتھر پر سطح سمندر سے یہاں کی بلندی ساڑھے آٹھ ہزار فٹ لکھی ہوئی تھی۔۔۔۔ گویا مری سے یہ جگہ اونچی تھی۔

پہاڑی کے اس طرف تاحد نظر خشک اور چٹیل میدان تھا۔۔۔۔ لیکن ساڑھے آٹھ ہزار فٹ کی بلندی سے یہ خشک اور ویران علاقہ' جادو کی نگری کا پراسرار تاثر دے رہا تھا۔۔۔ سنگلاخ چٹانوں کی طرح اس خشک وادی میں بھی ایک ناقابل بیان عظمت اور متانت تھی۔ بالکل چاند کی ویران سطح کی طرح۔۔۔

پتھریلی میدانی وادی میں ریل کی لائن چمک رہی تھی اور خاکستری رنگ کا تاریخی قصبہ چمن نظر آ رہا تھا' جس کے انگور بہت مشہور ہیں' لیکن دور دور تک کہیں سبزے کا نام نشان نہیں تھا اور چمن کے انگوروں کا بچپن کا تصور زائل ہوتا جا رہا تھا۔۔۔

بعد میں معلوم ہوا کہ چمن میں انگور کابل اور قندھار سے آتا ہے۔ چونکہ چمن پاکستان کا آخری ریلوے اسٹیشن ہے' اس لئے فروٹ کی جتنی بلٹیاں اندرون ملک جاتی ہیں' ان پر چمن لکھا ہوا ہوتا ہے۔ لہٰذا منڈیوں میں یہ فروٹ چمن کے نام سے متعارف ہو' ہے۔۔۔۔

چمن پہنچ کر ہم نے ایک چھوٹی سی دکان میں قہوہ پیا۔۔۔۔ یہ چھوٹے دکاندار قہوے کے اتنے ماہر ہوتے ہیں کہ ہم شہر والے ہزار کوشش کے باوجود اتنا عمدہ اور خوشبودار قہوہ نہیں بنا سکتے۔

امل نے افغانستان اور پاکستان کی سرحد دیکھنے کی خواہش ظاہر کی' تو ہم جیپ میں بیٹھ گئے۔ پاکستان کسٹم چیک پوسٹ پر ہماری جیپ روک لی گئی۔ ہم نے اپنا مدعا ظاہر کیا' تو انسپکٹر نے کہا۔۔۔۔

"یہ سامنے پاکستان کا جھنڈا لہرا رہا ہے اور وہ پرے چوکی دیکھئے۔ وہ افغانستان کی سرحد میں ہے اور اس پر افغان جھنڈا لہرا رہا ہے۔"

امل نے جواب دیا۔

"نہیں صاحب۔ ہمیں تو آگے جانے دیجئے۔ میں وہ بارڈر دیکھنا چاہتی ہوں' وہ لائن' وہ لکیر' جو دو ملکوں کو الگ کرتی ہے' میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ سرحد کے دونوں طرف کی مٹی کا رنگ ایک سا ہے یا جدا جدا۔۔۔۔؟"

انسپکٹر ہنس پڑا۔۔۔۔ اس نے جیپ روک لی اور ہمیں پیدل جانے کی اجازت دے دی۔۔۔۔

پاکستانی چوکی پر' جہاں سبز ہلالی پرچم لہرا رہا تھا' ہمیں پھر روک لیا گیا اور بتایا گیا کہ آگے پاسپورٹ اور ویزے کے بغیر جانے کی اجازت نہیں ہے۔

تارکول کی پکی سڑک دونوں ملکوں کو ملا رہی تھی۔ دونوں چوکیوں کے درمیان لوہے کی موٹی زنجیر نے سڑک کو بلاک کر رکھا تھا۔ زنجیر کے اس طرف پاکستان کا اور اس طرف افغانستان کا سپاہی ٹہل رہا تھا۔ دونوں سپاہیوں کے رنگ' روپ' ناک نقشے میں زیادہ فرق نہیں تھا' البتہ دونوں کی وردیوں میں نمایاں فرق تھا۔ دونوں ملکوں کی بسیں اور ٹرک کھڑے تھے اور ان کی چیکنگ ہو رہی تھی۔

خاصی مصروفیت' چہل پہل اور گہما گہمی تھی۔ یہاں تقریباً ہر قوم اور ہر نسل کا آدمی نظر آ رہا تھا۔

دونوں چوکیوں کے دائیں بائیں گاؤں آباد تھے۔ یہ گاؤں "ویش" کہلاتے ہیں۔ ویش پشتو زبان کا لفظ ہے اور تقسیم کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی دو سرحدوں کی تقسیم۔ اسی رعایت سے آس پاس کے دونوں گاؤں کا نام "ویش" پڑ گیا تھا۔

یہ گاؤں عجیب و غریب گاؤں تھے۔ یہاں کے باشندے ایک' یعنی پٹھان نسل سے تعلق رکھتے تھے' لیکن ان کی شہریت کا اصول انوکھا اور منفرد تھا۔ جن گھروں کے دروازے پاکستان کی طرف کھلتے تھے' وہ پاکستانی شہری تھے اور جن کے دروازے افغانستان کی طرف کھلتے تھے' وہ افغان شہری تھے۔ مثلاً ایک باپ کے دو بیٹوں کے گھروں کے دروازے اگر مختلف سمت میں تھے' تو دونوں بھائی دو مختلف ملکوں کے شہری بن گئے تھے۔

اگر اس گاؤں کا کوئی افغان شہری آپ کا دوست بن جائے' تو بغیر پاسپورٹ اور ویزہ کے آپ کو کابل اور قندھار کی سیر کرا سکتا ہے۔ اسی طرح پاکستانی شہری بغیر کسی تردد کے کسی افغان شہری کو کوئٹہ کی سیر کرا سکتا ہے۔

دوستی کے بغیر بھی یہ کاروبار جاری رہتا ہے۔ قندھار کی سیر کی فیس دس روپے اور کابل کی تیس روپے ہے۔ قندھار چمن سے صرف پچھتر میل ہے۔ البتہ کابل چار سو میل کے لگ بھگ ہے۔ جونہی آپ چمن میں اترتے ہیں' ایجنٹ آپ کے پیچھے لگ جاتے ہیں...... ان پر اعتماد بھی کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان کی روایت ہے کہ حفاظت سے آپ کو پہنچائیں اور واپس لائیں۔ دراصل یہ ان کا کاروبار ہے۔

عجیب و غریب روایات میں اس گاؤں کی...... بین الملکی اخوت و رواداری کی ایک انوکھی مثال......

اس گاؤں کے لوگوں کی زبان' شکل و صورت' تہذیب و تمدن اور روایات ایک جیسی تھیں' لیکن یہ دو ممالک کے باشندے تھے اور بلاشبہ ان کی وفاداریاں اپنے اپنے ملک کے ساتھ تھیں۔

دونوں اطراف کے لوگ اپنے ہی جھنڈے کو سلام کرتے تھے۔

یہ سب باتیں جان کر اصل بولی......

"دنیا کے ساختہ حقائق نے انسان کو کتنا مجبور کر دیا ہے۔"

عاطف بڑی دیر کی خاموشی کے بعد بولا۔

"کیا خیال ہے۔ ذرا چمن کے بازار کی سیر نہ کی جائے؟"

"کیوں نہیں بھائی جان۔" اصل ہنس پڑی...... "شاید شاپنگ کے ارادے ہیں...... ہاں کیوں نہیں۔ یہاں بدیسی مال جو ملتا ہے' اور سنا ہے دام بھی واجبی ہوتے ہیں؟"

"سمگل ہو کر آتا ہے۔" عاطف نے کہا...... "ڈیوٹی نہیں لگتی' اور پھر بدیسی مال منگا ہونے پر بھی چارمنگ ہوتا ہے۔"

میں نے کہا...... "یہ قومی المیہ ہے کہ ہم اپنے مال کو کمتر سمجھتے ہیں۔"

"احساس کمتری ہے۔" اصل بولی...... "آخر ہم دیسی اور بدیسی میں تمیز کیوں کرتے ہیں۔ کپڑے سے انسان کو پہچاننا کتنا مہمل ہے۔ شخصیت دوسری چیز ہوتی ہے۔ انسان شناسی بہت مشکل کام ہے۔ ہم یونہی بھٹکتے رہیں گے!"

جیپ ایک طرف کھڑی کر کے ہم چمن کے بازاروں میں گھومنے لگے۔ دکانوں میں بدیسی کپڑے' ریڈیو' گھڑیاں' بجلی کا سامان' صابن ہر قسم کی چیزوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ یہاں خرید و فروخت پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ دکاندار رسید بھی جاری کرتے تھے۔ چمن پاکستان کا قصبہ تھا' لیکن اندرون ملک ان چیزوں پر پابندی تھی' اور کسٹم والے باز پرس کرتے تھے...... یہ غالباً قبائلی پالیسی تھی۔

بازار میں تربوزوں اور خربوزوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ہر قسم کے اعلیٰ انگور کا نرخ سوا روپیہ سیر تھا۔ ان ڈھیروں کے پاس پٹھان بیٹھے کھا پی رہے تھے۔ نانبائیوں کی دکانوں پر بھی رونق تھی۔ تنوروں سے بڑی بڑی سرخ سرخ روٹیاں نکل رہی تھیں اور تکے کباب تلے جا رہے تھے۔

لمبے لمبے تنومند پٹھان' تیموری چہرے' بابری داڑھیاں اور بڑی بڑی غزنوی آنکھیں' ایسا لگ رہا تھا کہ ہم تاریخ ہند کے اوراق الٹ رہے ہیں اور وہ سارے لوگ زندہ ہو گئے ہیں' جنہیں ہم نے تاریخ کے صفحوں میں دیکھا تھا۔ ہر آنکھ ایک داستان تھی' ہر چہرہ ایک

تاریخ تھا اور ہر شخص ایک شخصیت تھی۔

یہاں کا اپنا اور مکمل کلچر تھا' بلکہ ان معنوں میں یہ منفرد تھا کہ صدیوں کی تاریخ اس کی پشت پر تھی اور یہاں پہنچ کر احساس ہوتا تھا کہ وہ لوگ جو ہندوستان کی اینٹ سے اینٹ بجاتے تھے' مکمل اس لحاظ سے نہیں کہ ان کا کلچر مثالی تھا بلکہ اس لحاظ سے کہ راجوں مہاراجوں کو نیچا دکھانے والے وہ جیالے اسی خطہ زمین سے اٹھتے تھے۔

عاطف دکانوں پر ٹوٹ پڑا تھا۔ ضرورت اور بلا ضرورت مختلف اشیاء خرید رہا تھا۔ میں نے بھی اپنی پسند کی دو چار چیزیں خریدیں' لیکن امل نے کسی چیز میں دلچسپی نہ لی۔ وہ بہاؤ ہم دونوں پر چوٹیں کر رہی تھی۔ ایک دکان پر عاطف نے سوٹ کا کپڑا خریدا۔ مجھے بھی یہ کپڑا پسند تھا۔ امل دھیرے سے انگریزی میں بولی......

"آپ لوگوں نے جو کپڑا خریدا ہے' دکاندار کا کوٹ بھی اسی کپڑے کا ہے۔"

"ہم نے غور سے دیکھا واقعی وہی کپڑا تھا' جسے دکاندار نے خاکی رنگ کی سادہ سی شلوار قمیص پر پہن رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کپڑا نکھرا نکھرا نہ لگا اور اس کی شو بھی نہیں تھی۔

عاطف آہستہ سے بولا...... "ٹھگ لئے گئے۔"

میں نے دکاندار سے پوچھا......

"یہ آپ کا کوٹ بھی تو اسی کپڑے کا ہے نا......؟"

"ہاں......" دکاندار نے تائید کی...... "کابل سے جتنا کپڑا لایا تھا' سب میں یہی مجھے پسند تھا۔ اس لئے میں نے بھی اس کا کوٹ بنوایا۔"

امل نے ہنستے ہوئے انگریزی میں کہا۔

"پٹھان کے سادہ کپڑوں پر پہننے کی وجہ سے اس کا معیار گر نہیں گیا۔ سوٹ بن جائے گا' تو اس کی شو بھی نکل آئے گی' مگر واو دیجئے پٹھان کے ظرف کو' اپنی دکان کی سب سے اعلیٰ کوالٹی پہن رکھی ہے۔ بالکل سیدھے سادے کپڑوں پر' کلچر پر بھی حرف نہیں آیا۔ عالی ظرفی بھی قائم ہے۔ اسے احساس ہے کہ اس کے جسم پر کیا ہے۔"

عاطف کو قدرے اطمینان ہوا...... اس نے احترام سے دکاندار کی طرف دیکھا' جس کے سر پر قیمتی مشہدی لنگی بندھی ہوئی تھی اور اس کا چہرہ سرخ تھا...... اور اس کا قد چھ فٹ سے بھی قدرے زیادہ تھا۔

بازار میں گھومتے ہوئے ہم نے دو چار آدمی ایسے بھی دیکھے' جن کے رنگ روپ میں پٹھانوں والی بات نہیں تھی۔ ان کے لہجے میں بھی سختی کے بجائے نرمی تھی اور ان کے چہروں پر ملاحت کے ساتھ ساتھ تابعدارانہ انداز اور تاثر تھا۔ ان کا رویہ پٹھان دکانداروں کے مقابلہ میں بالکل مختلف تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی انکشاف ہو گیا کہ اس طرح کے تمام دکاندار ہندو ہیں' جو قیام پاکستان کے بعد بھی بھارت منتقل نہیں ہوئے......

میں نے امل سے کہا......

"دو نسلوں کے رنگ روپ اور نفسیات میں کتنا تضاد ہے۔ آب و ہوا بھی اس پر اثر انداز نہیں ہو سکی......!"

امل نے جواب دیا......

"فطرت کی طرح نسل بھی اپنی مخصوص خوبیاں اور برائیاں اپنے ہمرکاب رکھتی ہے۔ جرمنی کو دیکھئے۔ ان کی جفاکشی اور ذہانت ضرب المثل ہے۔ جاپانی نسل بھی ایک خاص روایت رکھتی ہے۔ چینی اور ہندو دنیا کے جس حصے میں بھی ہو گا' اپنے کلچر کی برابر نمائندگی کرے گا۔ یہ دونوں نسلیں دنیا کی کسی تہذیب میں گڈمڈ نہیں ہوتیں۔ روسی طویل سکیموں کے لئے شہرت رکھتے ہیں۔ انگریز کڑے ڈسپلن کی وجہ سے مشہور ہیں...... اسی طرح ہر نسل کچھ مخصوص روایات کی حامل ہوتی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں' کتوں کی تازی نسل جس طرح شکار پر لپکتی اور جھپٹتی ہے' کسی اور نسل میں اتنی چستی اور تیزی نہیں ہوتی۔ لیکن تازی کتے سے گھر کی رکھوالی کا کام نہیں لیا جا سکتا۔ اسی طرح بلیئر نسل کو لے لیجئے۔ تازی کتے کی طرح تیز نہیں دوڑ سکتا۔ لیکن شیر' چیتے' ریچھ کسی کے مقابلے میں لے آیئے۔ پیچھے نہیں ہٹے گا۔ یہ نسل صرف مرنا اور مارنا جانتی ہے...... اصیل مرغ کو دیکھ لیجئے۔ ہر نسل کے مرغ سے زیادہ جی دار ہوتا ہے۔ لہولہان ہو جاتا ہے' مگر میدان

نہیں چھوڑتا...... ہاں تو یہ ہوتی ہے نسل......"

میں مسلسل امل کی طرف دیکھے جا رہا تھا' جس کی گول گول آنکھوں میں بلا کا تجسس اور جس کا نچلا ہونٹ انگور کے سرخ دانے کی طرح رسیلا تھا اور جس پر چھوٹی چھوٹی عمودی لائنیں تھیں۔ اس کی چھوٹی سی ناک' نگینے کی طرح اس کے چہرے پر جڑی ہوئی تھی۔

کتنی بے مثال لڑکی تھی یہ...... آپ بھی

کونسا موضوع تھا جو اس کی دست برد سے بچا ہوا تھا۔ کونسا ٹاپک تھا جس پر وہ رائے نہ رکھتی تھی...... زندگی کا کونسا پہلو تھا' جس میں وہ دوسرے کو لاجواب کرنے کی صلاحیت کا اظہار نہ کرتی' اور جو کچھ کرتی عمداً نہ کرتی۔ کیوں کہ اس میں ذرا بھی دکھاوا نہ ہوتا اور نہ کسی قسم کے تفاخر کا احساس ہوتا۔ وہ جو کچھ کہتی روا روی میں کہتی۔ تمام سادگی سے' معصومیت سے' کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کی زبان سے کوئی غیبی طاقت بول رہی ہے۔

وہ فرار کا نادانستہ پرچار کرتی۔ زندگی کی نفی کرتی' لیکن اتنی شدت اور عقیدت سے کہ ہزار اختلاف کے باوجود' اس کی طلسمی شخصیت کے حلقہ اثر سے نکلنا تقریباً ناممکن ہو جاتا۔

وہ ایسی روح تھی' ایسی بے چین آتما کہ پلک جھپکتے میں انسان کی نس نس میں' ہڈیوں کے گودے میں گھوم پھر کر واپس آپ کے سامنے کھڑی ہو جاتی تھی۔ آپ کو پتہ بھی نہ ہوتا تھا اور وہ آپ کی روح سے ہم کلام ہو کر واپس آ جاتی تھی۔

اور تب...... آپ کو اپنی بے بسی کا اس وقت پتہ چلتا' جب آپ سب کچھ گنوا چکے ہوتے۔

واپسی کے لئے جیپ میں بیٹھ گئے' تو امل بولی۔

"بھئی سراناں میں "روش" ضرور کھائیں گے۔"

میں نے اور عاطف نے پرزور تائید کی...... تقریباً چھ بجے شام ہم سراناں پہنچ گئے۔

لیکن جس دکان پر "روش" کے بڑے بڑے دیگچے رکھے تھے' اور سالم دنبے لٹک رہے تھے' وہاں بقول شخصے الو بول رہے تھے۔

ہم نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ "روش" ختم ہو چکا ہے۔ سب دیگچے صاف ہو چکے ہیں اور جو سالم دنبے لٹک رہے تھے' وہ اگلے دن کے لئے چولہوں پر چڑھ چکے ہیں اور رات بھر دھیمی دھیمی آنچ پر پکتے رہیں گے۔

ہمیں شدید مایوسی ہوئی' لیکن ایک بات سمجھ میں آ گئی کہ جہاں کے لوگ کوئی خاص چیز پکانا جانتے ہیں' اسے کھانا بھی جانتے ہیں۔

راستے میں عاطف نے اس پٹھان دکاندار کا ذکر پھر چھیڑ دیا' جس نے سادہ کپڑوں پر نہایت قیمتی انگلش کپڑے کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ اسے حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ اتنا قیمتی اور عمدہ کپڑا' گویا اس قدر بے رحمی سے ضائع کیا گیا تھا۔

امل نے اس سے کہا......

"بھائی جان! آپ کپڑا دوسروں کو دکھانے کے لئے خریدتے اور پہنتے ہیں۔ آپ کی تربیت یہی ہے اور آپ کی تسلی بھی اسی طرح ہوتی ہے' لیکن وہ آپ سے زیادہ ٹھوس آدمی ہے۔ اس نے اپنی ذات کی تسکین کے لئے وہ کپڑا زیب تن کیا ہے۔ اس کا ذہن آپ سے زیادہ صاف ہے اور اس کی انا آپ سے زیادہ مضبوط ہے!"

"ہاں......" عاطف نے تائید کی...... "میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔ واقعی مجھے اس آدمی کے کردار پر رشک آ رہا ہے۔ اس نے اچھائی کو اس لئے اپنایا ہے کہ وہ اچھائی ہے۔ برعکس اس کے کہ میں نے اچھائی کو اس لئے اپنایا ہے کہ اس میں ایک وقار' افتخار ہے۔"

میں نے عاطف سے مذاقاً کہا......

"آپ نے بہت زیادہ شاپنگ کر لی ہے۔ کوئٹہ سے ذرا ادھر کسٹم کی چیک پوسٹ بھی ہے!"

عاطف ہنس پڑا۔

"ذکی الدین کس مرض کی دوا ہے۔ بڑا ڈپٹی کمشنر بنا پھرتا ہے۔"

امل بھی ہنس پڑی-----

"بھائی جان رسک لینے والوں میں سے نہیں ہیں۔ انہوں نے سوچ سمجھ کر شاپنگ کی ہے۔"

امل بہت موڈ میں تھی۔

ہنستے کھیلتے ہم تقریباً ساڑھے سات بجے کوئٹہ پہنچ گئے۔

رات کو ڈنر پر ذکی الدین کا فون آگیا۔ ہماری خیر خیریت پوچھ رہا تھا۔ عاطف نے ا... بلالیا۔ ڈنر سے فارغ ہوئے تو وہ میاں بیوی بھی پہنچ گئے۔ ذکی الدین تھا تو سی ایس پی ا... لیکن ایک دو ملاقاتوں ہی میں معلوم ہوگیا کہ وہ اچھا خاصا لٹریری آدمی ہے۔ افسرانہ ٹھ... باٹ کی بجائے اس میں دوسروں کے ساتھ مکمل گھل مل جانے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ شکل و صورت سے بھی ذہین آدمی لگتا تھا۔

اس کی بیوی کے انداز میں ایک تساہل پسندانہ متانت تھی۔ وہ جب مسکراتی تھی تو لگتا تھا کہ اس کے ہونٹوں کو واپس اپنی جگہ پر آنے کے لئے خاصا وقت لگے گا۔

وہ چھریرے بدن کی دلکش عورت تھی۔

لیکن امل تو امل تھی۔ دلکشی کا لفظ اس کی شخصیت کا احاطہ نہیں کر سکتا تھا۔ غیر... ڈپٹی کمشنر صاحب سے پوچھا۔

"آپ کا یہاں کے لوگوں کے بارے میں کیا خیال ہے۔ یہاں کی زبان، کلچر اور یہاں... روایات آپ کو کیسی لگیں؟"

ڈپٹی کمشنر صاحب نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر فوراً جواب دیا-----

"وسیم صاحب، یہاں کے لوگ نہایت کھرے ہیں۔ ان کی تاریخ کی طرح ان...

...شمنی کرداروں میں بھی کوئی پیچ و خم نہیں ہے۔ یہ دشمن کو کبھی دوست نہیں سمجھتے اور دوست سے کبھی دشمنی نہیں کرتے۔ قبائلی رسم و رواج کی بہت سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ سنگلاخ چٹانوں کی طرح ان کے مزاج میں بھی ایک مناسب سختی ہے۔ زبان اور لہجے میں بھی اس سختی کا عنصر موجود ہے لیکن بحیثیت مجموعی صاف ستھری نسل ہے اور اس کے من میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔"

میں نے امل کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔

کافی آگئی۔ امل نے نہایت سلیقے سے کافی بنا کر سب کو پیش کی۔ اس کے اس رویے سے مجھے بے حد مسرت ہوئی۔

کافی پیتے ہوئے اچانک امل ہنس پڑی----- اور ذکی الدین سے مخاطب ہوئی۔

"ڈپٹی کمشنر صاحب۔ پرسوں جس سردار سے آپ نے ملایا تھا، آج آپ ویسا تحفہ ساتھ نہ لائے۔ کیا بلوچستان کا دامن اتنا محدود ہے؟"

"ہرگز نہیں۔" ذکی الدین نے جواب دیا----- "یہاں اگر کوئلہ اور گیس اور مرمر ہے، تو یہ نہ سمجھئے کہ روح کا سامان موجود نہیں ہے۔ یہاں کے لوک گیت ایک ممتاز اور منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں کی کلاسیکل کہانیاں، اپنے ماحول، مزاج اور فکر کے لحاظ سے امتیازی شان کی حامل ہیں۔ ان خشک پہاڑوں میں زندگی کے ایسے ایسے افسانے بکھرے ہوئے ہیں، کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔"

"کوئی ایسا واقعہ ہے جسے سن کر آپ بے ساختہ پھڑک اٹھے ہوں-----؟"

امل نے پوچھا۔

"ہاں، بہت-----!" ذکی الدین نہایت اطمینان سے بولا----- "لیکن کہنا پڑتا ہے کہ پسند اپنی اپنی، ذوق اپنا اپنا۔ میں نے یہاں کے ایک واقعے سے بہت اثر لیا ہے۔ آپ کے پاس وقت ہو، تو سنا دوں-----؟"

"ہاں ہاں، سنیں گے۔" امل نے دلچسپی لی۔ "واقعہ دلچسپ ہوگا تو ہم رات بھر سنیں

گے۔"

زندگی اور زندگی کے واقعات سے امل کی یہ غیر متوقع دلچسپی دیکھ کر مجھے یک خوشی ہوئی۔ عین اس لمحے عاطف بھی مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی جگنو رہے تھے۔

ڈپٹی کمشنر نے کچھ یوں بات کا آغاز کیا۔

"یہ ایک شاعر کی کہانی ہے۔ اس کا نام توکلی تھا۔ بعد میں یہ توکلی مست کے نام مشہور ہوا...... گئے زمانے کی بات ہے۔ دو قبیلوں کی آپس میں ان بن تھی...... جھگڑے، قتل مقاتلے، انتقام، نفرت، صدیوں سے یہ آگ جل رہی تھی...... دستور مطابق ایک اجتماع میں قبیلے کے سات نوجوان چنے گئے، جن کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ مخالف قبیلے کے سات منتخب آدمیوں کے سر قلم کر دیں۔ اور جب تک اس کام کو تکمیل تک نہیں پہنچاتے، واپس اپنے قبیلے میں نہیں آ سکتے اور اگر کوئی نوجوان کام کئے بغیر واپس قبیلے میں آ گیا تو خود اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ ان سات نوجوانوں توکلی بھی تھا...... اس وقت اس کی عمر سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ نہیں تھی...... گو وقت توکلی کوئی خاص بڑا شاعر نہ تھا، لیکن جو دل اس کے سینے میں دھڑک رہا تھا، وہ حساس شاعر کا دل تھا، جسے حالات کی ستم ظریفی نے قتل کا فرض سونپ دیا تھا...... دستور نہایت اٹل اور سخت تھا۔ توکلی کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ جانا پڑا، لیکن قدرت شاید توکلی سے دوسرا کام لینا مقصود تھا...... راستے میں شدید طوفان باد و باراں نے گھیر لیا...... توکلی ساتھیوں سے بچھڑ گیا۔ گرتے اٹھتے بچتے بچاتے، وہ آگے رہا...... ویرانوں میں سر چھپانے کا کوئی آسرا نہیں تھا مگر توکلی نے ہمت نہ ہاری۔ نو لڑکا تھا۔ سینے سے پار ہوتی ہوئی تیز اور یخ بستہ ہواؤں کو چیرتا ہوا وہ خانہ بدوشوں کے خیمے تک پہنچ گیا لیکن پہنچتے ہی بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ خیمے کے اندر ایک نوجوان خوبصورت لڑکی کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا!"

"واہ......!" امل نے بے ساختہ داد دی۔ "حسن اتفاق شاید اسی کو کہتے ہیں!؟"

"ہاں بالکل۔" ڈپٹی کمشنر نے تائید کی...... "لڑکی نے فوراً دودھ گرم کیا۔ اور قطرہ قطرہ بے ہوش توکلی کے حلق سے اتارا...... گرم گرم دودھ جسم میں پہنچا، تو توکلی آہستہ آہستہ ہوش میں آنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں...... اس کے سامنے بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی ایک نوجوان خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی۔ اسے ایسا لگا، جیسے بے حد حسین خواب دیکھ رہا ہو...... لڑکی نے چاندی کے بنے ہوئے نئے زیور پہن رکھے تھے اور نئے سرخ جوڑے میں ملبوس تھی۔ ناک میں چار گل تھا اور تازہ تازہ باریک مینڈھیاں گندھی ہوئی تھیں۔ ہاتھوں میں چاندی کے کڑے اور گلے میں چاندی کی دمکتی ہوئی ہنسلی تھی۔ اس کی مانگ میں سندور بھرا ہوا تھا۔ ہاتھوں اور پاؤں میں مہندی رچی ہوئی تھی اور اس کے جسم سے نئی نویلی دلہن کی خوشبو اٹھ رہی تھی...... توکلی شاید خواب ہی سمجھتا کہ لڑکی نے اس کا طلسم توڑ دیا...... اس نے لپک کر دودھ کا کٹورا آگے کیا اور ہولے سے بولی...... "دودھ پی لیجیے......!" توکلی کو احساس ہوا کہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور دنیا و مافیہا سے بے خبر اس کی آنکھوں میں ڈوب گیا...... اس نے کوئی بات نہ کی۔ کوئی سوال نہیں کیا۔ بس مسلسل تکے جا رہا تھا...... یہی اس کا مکالمہ تھا...... لڑکی ان متوحش اور بے تاب اور مضطرب آنکھوں کی مسلسل ٹکٹکی سے گھبرا گئی۔ وہ صاف جان گئی تھی کہ ان نگاہوں میں کیا معنی پوشیدہ ہیں اور مسافر کی روح میں کیا تلاطم برپا ہے...... وہ آہستہ سے بولی...... "میری شادی کو صرف دو دن ہوئے ہیں۔ میرا خاوند تھوڑی دیر میں آنے والا ہے۔ کیونکہ طوفان تھم چکا ہے اور تم شاید نہیں جانتے کہ مجھے اپنے خاوند سے بے پناہ پیار ہے!؟"

توکلی نے شاعرانہ تسلی سے اس کے مکالمے کا جواب شعر میں دیا......

سیاہ آنکھوں والی، بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں والی حور،
یہ زمین اس لئے رہنے کے قابل جگہ ہے،
کہ اسے تمہاری خوبصورت آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔
تمہاری آنکھوں میں ہیرے جیسی چمک ہے،

اور تمہارا حسن لافانی۔

اس خطہ ارضی پر رہنے والوں کے ساتھ انتہائی ظلم ہوگا'
اگر یہ ملکوتی حسن' محض ایک آدمی تک محدود ہو جائے'
ہوا کے بغیر کوئی نہیں جی سکتا'
پانی کے بغیر بھی کوئی نہیں جی سکتا
تمہاری آنکھوں میں جو افسوں ہے' پانی اور ہوا کی طرح' وہ بھی جیون کے لئے لابدی ہے'

وہ جو کہتے ہیں کہ زندگی چار عناصر سے ترتیب ہے۔
غلط کہتے ہیں......!
زندگی کے عناصر پانچ ہیں'
پانچواں عنصر تمہاری آنکھوں کا افسوں ہے!

لڑکی حیرت و استعجاب' پسندیدگی اور ناپسندیدگی' الجھن اور کشمکش کے ملے جلے جذبات سے اس نوجوان لڑکے کو دیکھ رہی تھی' جو فرشتوں کی زبان میں اس سے ہمکلام تھا۔ اتو سے قبل' اتنی ذومعنی اور خوبصورت انداز میں اس نے اپنے حسن کی تعریف نہیں سنی تھی...... اس طرح کا والہانہ پن تو اس کے شوہر کے لہجے میں بھی نہیں تھا...... اس کی روح مچل رہی تھی کہ نوجوان شاعر اپنا کلام جاری رکھے' لیکن اس کا فرض آڑے آ رہا تھا کہ اجنبی چلا جائے' کیونکہ اس کے شوہر کے آنے کا وقت ہو چلا تھا۔

"تو کیا شاعر چلا گیا......؟" امثل نے بے تابی سے پوچھا۔

"ہاں...... شاعر چلا گیا...... ہمیشہ کے لئے چلا گیا......!" ڈپٹی کمشنر تاسف اور جذبے سے بولا...... "لیکن شاعر نے اپنے شعروں سے پورے ملک میں آگ لگا دی۔ وہ تو کلی سے توکلی مست بن گیا...... بستی بستی' نگر نگر' اس کا پیغام پھیل گیا۔ ہر زبان پر اس کا شعر تھا۔ ہر گلی اور ہر کوچے میں محبت کے نغمے گونج رہے تھے...... محبت نے اسے گھر اور قبیلے کی قید سے آزاد کر دیا تھا۔ اب وہ دستور اور روایت کے لئے زندہ نہیں تھا۔ اب

اس کی زندگی محبت کے لئے وقف ہو گئی تھی...... اب اس کے گلے میں منکوں کی مالا تھی اور زبان پر موتیوں کی طرح پروئے ہوئے شعر...... سارا دیس اس کی کہانی جانتا تھا۔ مگر اس کے درد کا درماں کسی کے پاس نہیں تھا۔ توکلی مست نگر نگر گھومتا رہا...... آخر ایک نواب کو اس کا خیال آیا۔ اس نے توکلی کو بلایا۔ بہت عزت و تکریم سے مہمان بنایا۔ اور ایک رات نہایت خوبصورت عورت کو توکلی کے ساتھ کمرے میں بند کر دیا۔ عورت نے ساری رات اس کوشش میں صرف کر دی کہ اپنی ناز و ادا سے توکلی کو اپنی طرف مائل کر لے اور اس کی آن توڑ دے لیکن ایسا نہ ہوا...... توکلی اس کے جال میں نہ پھنسا۔ وہ رات بھر اپنی محبوبہ کی محبت کے گن گاتا رہا اور صبح سویرے وہاں سے بھاگ گیا......!"

"بدبخت......!" امثل بے ساختہ بولی۔

"لیکن ہوا کیا......؟" میں نے فوراً پوچھا...... "شاعر کا انجام کیا ہوا......؟"

ڈپٹی کمشنر توکلی کے کردار سے متاثر تھا۔ اس کا انداز بیان ہی اس بات کا شاہد تھا۔ اس نے بے حد جذبے سے کہا......

"توکلی کی آوارگی کو چالیس سال گزر گئے۔ بڑھاپا آ گیا' مگر اس کی محبت کو ضعف نہ آیا۔ وہ برابر شعر کہتا رہا اور اپنی محبوبہ کی یادوں میں ڈوبا رہا...... اس عرصے میں اس کی محبوبہ کئی بچوں کی ماں بن چکی تھی' بلکہ اس کی اولاد جوان ہو گئی تھی۔ اسے توکلی مست کی غیر فانی محبت کا علم تھا۔ دل ہی دل میں وہ اس پر فخر بھی کرتی تھی اور توکلی مست سے ملنے کی دبی دبی آرزو بھی رکھتی تھی' مگر اولاد اور رسم و رواج نے اسے جکڑ رکھا تھا اور پھر توکلی کا کوئی ٹھکانہ بھی تو نہیں تھا...... چالیس سال کے بعد جب قضائے الٰہی سے اس کے خاوند کا انتقال ہو گیا' تو لوگوں نے کہہ کہلوا کر آمادہ کر لیا کہ وہ توکلی کو اپنی جھلک دکھائے۔ چالیس برس کی ریاضت کچھ کم نہیں تھی۔ توکلی نے بھی یہ خبر نہایت صبر اور سکون سے سنی...... چالیس برس میں سہاگ کا جوڑا تو سلامت نہ رہا تھا' لیکن وہ سارا زیور اس کے پاس محفوظ تھا' جو توکلی سے پہلی ملاقات کے وقت زیب تن تھا۔ اس نے پورا پورا اہتمام

کیا۔۔۔۔ آنکھوں میں کاجل لگایا۔ نئی مینڈھیاں گوندھیں۔ ہاتھوں اور پیروں میں مہ
رچائی۔ ناک میں چار گل پہنا اور چاندی کے سارے زیور سجائے۔ اسے قطعی احس
نہیں تھا کہ دونوں کی پہلی اور آخری ملاقات میں چالیس برس کا فاصلہ ہے اور اس و
اس کی عمر چون پچپن برس کے لگ بھگ ہے۔۔۔۔ اپنے خیالوں کے مطابق وہ چودہ پ
برس کی وہی الہڑ دلہن تھی، جس کے خیمے میں توکل طوفان باد و باراں سے بچتا بچاتا آگی
اور بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔۔۔۔ اور انسانی جذبے سے مجبور ہو کر اس نے اس
سالہ نوجوان کو گرم گرم دودھ پلایا تھا۔ اور جب اسے ہوش آیا تھا، تو وہ دیوانوں کی ط
ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھتا رہا تھا، اور وہ اس کی نظروں کی تاب نہ لا کر گھبرا گئی تھی۔
سب باتیں بجلی کے کوندوں کی طرح اس کے انگ انگ کو بیدار کر گئی تھیں۔۔۔۔ اور ا
وہ سوچ رہی تھی کہ واقعی وہ کسی نہ کسی رنگ میں توکل سے محبت کرتی رہی تھی۔ آخ
گھڑی آن پہنچی، جس کی آرزو میں شاعر نے زندگی کے چالیس خوبصورت سالوں کی ا
ایک گھڑی گزاری تھی۔ مرور زمانہ اور چالیس برس کی طویل مدت دونوں، اس لڑکی
خدوخال کو توکل کے ذہن سے مٹا نہ سکے تھے۔ بلکہ چالیس برسوں کی مسلسل ریاضت
یہ خدوخال اس کی روح میں اور زیادہ گہرے ثبت کر دیئے تھے۔ بالکل اسی طرح،
چٹان پر کندہ کی ہوئی تحریر۔۔۔۔! توکل مست نے غور سے اس عورت کو دیکھا، جو زیور
لدی پھندی اس کے سامنے کھڑی تھی۔۔۔۔ جس کے ناک میں چار گل تھا اور کانوں
ماتھے پر چاندی کے زیور، جس کے ہاتھ سرخ تھے اور جس کے گلے میں چاندی کی ہنسلی
جس کی مینڈھیاں تازہ گندھی ہوئی تھیں۔ اور جو فخر و غرور اور محبت کے یقین سے ا
تک رہی تھی۔۔۔۔

"نہیں نہیں۔۔۔۔!" توکل چیخا۔۔۔۔ "یہ نہیں ہے۔ یہ نہیں ہے وہ!"

عورت کی مسکان غائب ہو گئی۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ وہ خاموش کھڑی رہی۔۔۔۔ تو
آگے بڑھ گیا۔۔۔۔ "نہیں نہیں۔۔۔۔ یہ وہ نہیں ہے۔ مجھے کوئی دھوکہ نہیں دے سکا
میں اسے پہچانتا ہوں۔ جانتا ہوں۔ چالیس برسوں سے اسے جانتا ہوں۔ چالیس برسوں۔

اس کے ساتھ رہا ہوں۔۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔۔ توکل اتنی آسانی سے بیوقوف بننے والا
نہیں۔۔۔۔!!!"

ڈپٹی کمشنر نے ٹھنڈی آہ بھری۔۔۔۔

"توکل چلا گیا۔۔۔۔ اور اس کے بعد توکل کو کسی نے نہ دیکھا۔۔۔۔!"

"شاعر بے چارہ۔۔۔۔!" امل دھیرے سے بولی۔۔۔۔ "اس کی خداداد ذہانت ایک
عورت کے تصور میں ڈوب کر رہ گئی۔ اگر میں ہوتی اور اس سماج کا اختیار میرے ہاتھ میں
ہوتا، تو میں وہ عورت اس کے حوالے کر دیتی۔ چھ سات برس بعد، جب وہ تین چار بچوں
کا باپ اور ایک لڑھکتے ہوئے سینے والی عورت کا شوہر ہوتا تو میں اس سے پوچھتی کہ محبت
کے معنی کیا ہیں۔۔۔۔؟"

ڈپٹی کمشنر نے حیرت سے پوچھا۔۔۔۔

"آپ اس کی لافانی محبت کی داد نہیں دیتیں؟"

"لافانی کے کیا معنی ہیں؟ اور محبت کے کیا معنی ہیں۔۔۔۔؟" امل نے اسے جواب
دیا۔۔۔۔ "کیا آپ ایسی افلاطونی محبت کے قائل ہیں، جو سب کچھ تج دے اور ویرانوں
میں نکل جائے۔۔۔۔ نہیں ہرگز نہیں۔۔۔۔ آپ نے ایسی محبت صرف کتابوں میں پڑھی
ہے اور اسے کلاسیکل کا درجہ دے دیا ہے اور اس کا نام لافانی اور جانے کیا کیا رکھ چھوڑا
ہے۔۔۔۔ ڈپٹی کمشنر صاحب، یہ جو آپ کی بیوی ہے نا۔۔۔۔ آپ سے کئی گنا خوبصورت
ہے۔ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ اسے آپ نے محبت کے زور سے نہیں جیتا۔
چونکہ آپ سی ایس پی ہیں، لہٰذا آپ کے سماجی رتبے نے آپ کو اتنی حسین عورت بخشی
ہے۔ یہ افلاطونی نظام کا عطیہ نہیں ہے۔ آپ کا معاشرتی حق ہے۔"

ذکی الدین حیرت سے امل کو دیکھ رہا تھا۔ البتہ اس کی بیوی کے لبوں پر عمیق اور
پراسرار مسکان تھی۔ آج نادانستہ اس عورت کو اپنی فتح مندی کا احساس ہوا تھا۔ میں اور
ناظف بظاہر خاموش تھے، لیکن دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے کہ آج ایک سی ایس پی
کی باری آ گئی تھی۔۔۔۔

ذکی الدین نے آہستہ سے کہا......

"آپ کے خیالات سن کر مجھے تعجب ہو رہا ہے!"

"اس لئے کہ میرے خیالات کتابی نہیں ہیں۔ مجھے آپ کی مسلمہ قدروں سے بھی کچھ زیادہ انس نہیں ہے۔ میں فانی اور لافانی کی قائل نہیں ہوں۔ موٹر کے انجن کو تیار کرنے کا ایک فارمولا ہوتا ہے۔ آپ لوگوں نے کتابیں لکھ لکھ کر اور اصول گھڑ گھڑ کر زندگی کو بھی ایک فارمولا بنا دیا ہے۔ میں انسانی روح کو فارمولوں کے حوالے نہیں کر سکتی!"

"آپ کیا چاہتی ہیں آخر......؟" ذکی الدین ایک طرح سے ہارتے ہوئے بولا۔

"مجھے ابھی اس کا عرفان نہیں ہوا' لیکن جو کچھ آپ لوگ چاہتے ہیں' میں وہ نہیں چاہتی۔ آپ کا سارا ڈسپلن مصنوعی ہے۔ آپ کے اتحاد اور آپ کی یگانگت میں سچائی نہیں ہے' بلکہ سرے سے آپ کے سینے میں ہی سچائی نہیں ہے۔"

ذکی الدین کو ذرا بھی طیش نہ آیا۔

"خاتون محترم' میں ابھی قائل نہیں ہوا......؟"

"مسئلہ قائل ہونے کا نہیں ہے۔ انسان قائل ہو سکتا' تو دنیا میں اتنے فرقے نہ ہوتے...... جنگ وجدل نہ ہوتی۔ فساد نہ ہوتے۔ میں کہتی ہوں' انسان خدا کا آخری تجربہ ہے۔ وہ اس تجربے کے بعد کوئی دوسرا تجربہ نہیں کرے گا......بس اپنے فرشتوں پر اکتفا کرے گا!"

ذکی الدین بے طرح چونک اٹھا تھا...... اس نے پہلے عاطف کی طرف' پھر بیوی کی طرف دیکھا...... آدمی ذہین تھا۔ امثل کی دو باتوں سے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے بحث میں الجھنا چاہیے یا نہیں......؟

ذکی الدین کی بیوی صورت حال کو سمجھ گئی تھی۔ غالباً اس لیے اس نے شوہر کی مدد ضروری سمجھی۔

"مس امثل' آپ کس طرح کہہ سکتی ہیں کہ ذکی نے مجھے محض عہدے کے زور سے جیتا ہے۔ کیا یہ آپ کی زیادتی نہیں ہے کہ آپ ہماری باہمی عقیدت اور محبت پر شک

کریں؟"

"خدا کرے' آپ محبت کر سکیں۔" امثل تسلی سے بولی...... "کم از کم آپ کی عقیدت پر تو میں شک نہیں کرتی۔ کیونکہ یہ آپ کا اقتصادی مسئلہ ہے۔ ہمارے دور کی عورت کا خواب سی ایس پی پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ آپ کو اپنے حسن اور تعلیم کا پورا پورا صلہ مل چکا ہے اور جناب ذکی الدین تو خیر ابھی پہلی منزل میں ہیں۔ ابھی یہ اور کئی تجربے کریں گے۔ کندن بننے کے لئے ابھی کئی مرحلے باقی ہیں۔ ان کا سفر آپ سے زیادہ لمبا ہے اور پڑاؤ بھی بہت ہیں۔ ایک تو ڈپٹی کمشنر ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ مرد ہیں۔ مرد اس سوسائٹی میں زیادہ بااختیار ہوتا ہے۔ آپ کا حسن دو چار سال میں ماند پڑ جائے گا' مگر ڈپٹی کمشنر صاحب کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اس لئے ان کا سفر جاری رہے گا۔"

ذکی الدین کی بیگم کی خوبصورت مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی اور وہ ٹکر ٹکر امثل کو دیکھ رہی تھی۔

عاطف نے اسے ٹوکا......

"امثی...... تم ہر آدمی پر شک کرتی ہو۔ ہر آدمی کے سینے میں شبہات کے بیج بو دیتی ہو۔ لوگوں کی پرسکون زندگیوں میں ہلچل کیوں برپا کر دیتی ہو......؟"

"بھائی جان' سکون باتوں سے غارت نہیں ہوتا۔ یوں کہیے کہ وہ ہماری فطرت ہی میں نہیں ہے۔ ہم صرف غارت گری کے بہانے ڈھونڈتے ہیں...... اور پھر ڈپٹی کمشنر صاحب بالغ نظر آدمی ہیں۔ میں انہیں کیا ترغیب دے سکتی ہوں۔ البتہ وہ وہیں جائیں گے جہاں انہوں نے جانا ہے...... اس میں خود ان کا قصور بھی کیا ہے!"

"اگر اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے اور میں وہی کرنے پر مجبور ہوں جو میرے لئے مقدر ہو چکا ہے' تو پھر سزا و جزا کے تصور کے کیا معنی......؟ پھر ڈر اور خوف کس بات کا؟"

"ذکی الدین صاحب۔" امثل نے اسے جواب دیا...... "ڈر اور خوف سب عارضی ہیں...... ہمارے آباؤ اجداد سے ہمیں ورثے میں ملے ہیں۔ ایک مدت تک ہم اس کی

گرفت میں رہتے ہیں' لیکن جب آزاد ہوتے ہیں' تو ہمیں اس کا علم ہی نہیں ہوتا۔ ہم بے خبری میں ساری دیواریں ڈھا چکے ہوتے ہیں' مگر غلط فہمی پھر بھی قائم رہتی ہے۔ ہم اس فریب میں رہتے ہیں کہ ہم صحیح لوگ ہیں!"

ڈپٹی کمشنر نے اچانک میری طرف دیکھا' اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک تھی۔ جیسے اس کے سینے کے کسی گوشے میں کوئی جگنو دمکا ہو......

"ہاں......!" وہ بے اختیار بولا...... "مس امثل' مجھے افسوس ہے کہ میرے دوست کی بہن ہونے کے باوجود میں آپ سے بہت دیر کے بعد ملا ہوں۔"

"یہ دو دن کی ملاقات ہی غنیمت ہے۔ لوگ مجھ سے بہت جلد بور ہو جاتے ہیں۔ مجھ میں اہلیت ہی نہیں ہے کہ کسی کے ساتھ دو قدم چل سکوں...... میں آپ کی بیگم کی طرح ساری زندگی کی وفاداری کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی تھی...... ساری زندگی تو دور کی بات ہے' میں تو دو دن بھی مخلص نہیں رہ سکتی!"

"آپ اپنے بھائی کے ساتھ تو مخلص ہوں گی؟"

"بھائی میرے ساتھ مخلص ہیں۔ یہ ہمیشہ میری خاطر قربانیاں دیتے آئے ہیں۔ میں نے ان کے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔ میں آئندہ بھی ان کے لئے کچھ نہ کر سکوں گی۔ کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ انسان' انسان کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں' رواداری میں کرتے ہیں۔"

"لیکن دنیا میں ایسے بہت سے واقعات موجود ہیں' جن سے حق داری اور عالی ظرفی کی تصدیق ہو جاتی ہے۔"

"نہیں ذکی الدین صاحب' نہیں۔! جس شخص کے پاس دس کروڑ روپیہ ہے' وہ اگر دس لاکھ خیراتی کام میں دے دیتا ہے تو یہ کوئی عالی ظرفی نہیں ہے' بلکہ ایک حد تک کم ظرفی ہے۔ انسان دس کروڑ کا کیا بنا لے گا...... سونا' چاندی یا نوٹ چبانے والی چیز تو ہے نہیں کہ انسان اس سے ہر لمحہ لذت اٹھاتا رہے اور ان کے ختم ہو جانے کا احتمال ہو اور اس کی جگالی بند ہو جانے کا اندیشہ ہو...... جو لوگ نہایت بخل سے پیسہ اکٹھا کرتے ہیں'

کی اولاد اسی بے دردی سے ضائع کر دیتی ہے...... دنیا کی ریت ہے۔ ایک نسل محل کھڑے کرتی ہے' دوسری نسل بیچ دیتی ہے۔ باپ جمع کرتا ہے' اولاد لٹا دیتی ہے۔ روز اول سے یہی کچھ ہوتا آیا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا' مگر انسان کولہو کے بیل کی طرح جتا رہے گا اور اسے اپنے سفر اور منزل کا نشان نہیں ملے گا!"

"یعنی پھر تو سب بے کار ہے۔" ڈپٹی کمشنر بولا...... "انسان جو تگ و دو کرتا ہے' بے معنی ہے۔ بیس بائیس برس تعلیم میں ضائع کرتا ہے۔ ان سب باتوں کا کوئی فائدہ نہ ہوا "؟

"فائدہ......؟ کیوں نہیں!" امثل بولی...... "ہم پچھلی نسلوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تیز اور ذہین نسل کو جنم دے رہے ہیں جو خلاؤں کا سینہ چیر کر چاند پر پہنچ چکی ہے اور جانے کہاں کہاں پہنچے گی۔ پہلے فساد صرف زمین پر ہوتا تھا' اب پوری کائنات لپیٹ میں آ رہی ہے۔ یہ ہے ہماری تگ و دو کا نتیجہ......!"

"یعنی انسان کی ترقی پر آپ کو اعتراض ہے......؟" ذکی الدین بولا۔

"بالکل نہیں...... یعنی آپ قیامت پر یقین رکھتے ہیں اور اس کا طویل انتظار گوارا نہیں کرتے' تو یہ ترقی بہت جلد آپ کو قیامت سے ہم کنار کر دے گی۔ میرا مطلب ہے کہ قیامت کا خوف انسان پر ہمیشہ سے مسلط رہا ہے' وہ اس خوف کے فاصلے اور مدت کو کم کر رہی ہے۔ کیا یہ احسان نہیں ہے؟"

"یہ عجیب احسان ہے۔" ڈپٹی کمشنر متذبذب لہجے میں بولا۔

امثل ہنس پڑی......

"آپ کا رویہ بھی عجیب ہے۔ کبھی میرے ساتھ چل پڑتے ہیں۔ کبھی رک جاتے ہیں اور پھر سوچتے ہیں' آگے جاؤں نہ جاؤں...... مخصوص عقیدے کے لوگ ایک مقام پر آ کر رک جاتے ہیں۔ آپ کی تکلیف کو میں سمجھ رہی ہوں۔ فکر اور عقیدہ ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔"

ذکی الدین بے چین سا ہو گیا......

"نہیں مس امثل نہیں' اپنے تمام عقیدوں کے باوجود مجھ میں اتنی لچک ہے کہ فکر کی نئی روشنیوں سے آنکھیں چار کر سکوں۔ چونکہ آپ کی شخصیت بالکل اچانک غیر متوقع سامنے آئی ہے' اس لئے میری جھنجلاہٹ قدرتی ہے۔ زندگی کے متعلق ہمارے نقطہ ہائے نگاہ الگ الگ ہو سکتے ہیں' لیکن افہام و تفہیم کے راستے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں!"

"مسئلے ہمیشہ ذہین آدمیوں کے لئے ہوتے ہیں اور ہمیشہ حل طلب ہی رہتے ہیں۔ سیدھا سادہ آدمی ہمیشہ طبعی موت مرتا ہے' اس لئے ہلکان نہیں ہوتا۔ ذہین آدمی قسم قسم کی موت مرتا ہے۔ اس لئے بہت اذیت اٹھا کر مرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک دن آپ کو احساس ہو جائے گا کہ یہ دولت اور حاکمانہ تمکنت سب بیکار محض ہیں۔"

ذکی الدین نے چند لمحے سوچنے کے بعد پوچھا

"آپ اس قدر مایوس کیوں ہیں------؟"

"اگر میں آپ سے پوچھوں کہ آپ اس قدر پر امید کیوں ہیں تو؟"

"تو میں کہوں گا کہ میں نے محنت کی ہے اور اس کا صلہ پایا ہے۔"

"کیا صلہ پایا ہے؟"

"باوقار عہدہ' با عزت زندگی' خوبصورت بیوی' اور کیا چاہیے انسان کو اس دنیا میں۔؟"

"میں پوچھوں گی کہ جب آپ کو سب کچھ مل گیا ہے' آپ کی ہر خواہش پوری ہو گئی ہے' تو آپ کے پاس جینے کے لئے باقی کیا رہ گیا ہے۔ تکمیل تو موت ہے۔"

"مس------! میرے پیارے پیارے بچے ہیں۔ میں ان سے والہانہ پیار کرتا ہوں۔ انہیں دیکھ کر میرے دل کو سکون اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچتی ہے۔ ان کی معصوم ضدیں' ان کی توتلی توتلی باتیں ایسی لگتی ہیں' جیسے ساز بج رہا ہو۔ جیسے فرشتوں سے ہم کلام رہتا ہوں۔ ان کے کنول کی طرح چھوٹے چھوٹے خوبصورت پاؤں' ان کے نازک نازک ہاتھ' جب میں انہیں چھوتا ہوں' تو میرے من میں گدگدی ہوتی ہے اور میری آتما عجیب کیفیت سے سرشار ہوتی ہے جسے میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا------ میں ا

ں ان بچوں کے لئے جینا چاہتا ہوں------!"

"ہاں------ آپ ان کے لئے چند سال جی سکتے ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ چڑیا اور چڑا بھی بال و پر اگنے تک اپنے بچوں کو غذا مہیا کرتے ہیں۔ آپ بھی یہ کام کر سکتے ہیں۔ لیکن ڈپٹی کمشنر صاحب' جب تک آپ ان کے کفیل ہیں' ان کو آپ سے اور آپ کو ان سے والہانہ پیار ہو گا' مگر وہ وقت ضرور آئے گا' وہ لمحہ' وہ گھڑی' وہ ساعت' جب وہ آپ سے یا آپ ان سے اقتصادی بنیاد پر الگ ہوں گے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے شکایتیں پیدا ہوں گی۔ دیکھتے ہی دیکھتے جذباتی رشتے ختم ہو جائیں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے آپ اپنے ماں باپ کو اکیلا چھوڑ کر نیا گھر بسا چکے ہیں۔ آپ کے بچے آپ کو داغ مفارقت دے کر الگ ہو جائیں گے------ یہ ہے آپ کا مقدر' یہی ہے انسان کی تقدیر اور اسی پیار کے بل بوتے پر ہم زندہ ہیں!"

ڈپٹی کمشنر خاموش ہو گیا تھا...... ہم سب خاموش تھے۔ یہ واقعہ تھا کہ شادی کے بعد ذکی الدین نے والدین کو چھوڑ دیا تھا۔ طاطلب نے بعد میں اس کی تصدیق کی تھی...... بیوی اس سے اور وہ بیوی سے آنکھ نہیں ملا رہا تھا۔

میں نے سوچا ذکی الدین کاری وار کھا چکا ہے اور شاید بحث کو مزید آگے نہ بڑھائے۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ امثل کا رویہ انتقامی نہیں ہوتا اور نہ کسی کو زچ کرنے پر خوش ہوتی ہے۔ وہ جو کچھ کہتی ہے' دل آزاری کے لئے نہیں بلکہ اس پر یقین رکھتی ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے بھی نہیں تھی' جو فیشن کے طور پر ہر بات کی تردید اور انکار محض کرتے ہیں اور لوگوں سے توقع رکھتے ہیں کہ ان کی ذات کو بالاتر سمجھیں۔

میں امثل کی بے داغ روح کو بھی سمجھتا تھا۔ نہ تو جدت پسند اور مختلف بننے کی خواہش رکھتی تھی اور نہ وہ انانیت اور خود پسندی کا شکار تھی۔

البتہ ایک سرگرم سعی و جستجو کا اظہار اس کی بے چین آنکھوں سے اکثر ہوتا تھا' لیکن یہ معلوم کرنا بہت مشکل تھا کہ یہ سعی اور جستجو کس چیز کی ہے؟

"امثل------ آپ کی سب باتیں دل کو لگتی ہیں۔ بفرض محال ہم آپ سے اتفاق بھی کر

لیں' لیکن پھر بھی آپ کے پاس اس بات کا کیا جواب ہے کہ اگر پیار اور سچائی نہ بھی زندہ رہنے کا کوئی مقصد نہیں ہے' تو پھر آخر زندہ کس طرح رہا جائے------؟"

امل نے جواب دیا-----

"انسان نے آج تک جتنے نظریے اور جتنے اصول بنائے ہیں' سب مستقبل کی' رواں دواں ہیں۔ انسان کی یہ کوشش بری نہیں ہے۔ پرچار کی حد تک ان خیالوں تندی' تیزی' صحت اور نمو بھی ہے' لیکن میں یہ بات کئی بار کہہ چکی ہوں کہ انسان ہی رہتا ہے' جیسا فطرت نے اسے بنایا ہے۔ آپ سچ کی خاطر جئیں یا پیار کی خاطر آپ فطرت کے ایک کھلونے ہیں۔ یوں جینے کے لئے بے شمار حیلے ہیں۔ میں خود آپ کی طرح زندہ ہوں!"

"اگر ایسا ہی ہے اور ہم نے زندہ رہنا ہی ہے' تو پھر کڑھنے کا کیا فائدہ' بقول آپ جھوٹی ہی سہی' کوئی آس' کسی امید کا سہارا لے کر کیوں نہ جیا جائے؟"

امل ہنس پڑی-----

"یہ تو آپ کر ہی رہے ہیں۔"

"میں آپ کی بات کر رہا ہوں۔"

"میرا جینا کیا جینا ہے۔ میں تو بالکل بے مقصد جی رہی ہوں۔ آپ کے پاس تو آس' کوئی آرزو ہے بھی' میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ دو بار خودکشی کی کوشش ناکام رہی۔ پھر سوچا مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ جب من نے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا سوچا----- چلنے دو۔ نہ موت کا انتظار کرو اور نہ موت کے پیچھے بھاگو۔ اور نہ موت سے خوف کھاؤ----- آ گئی----- تو گلے لگا لو۔ نہ آئی تو پروا نہ کرو۔ انسان سے نفرت نہیں کرتی' لیکن جینے میں والہانہ محبت بھی نہیں پاتی۔ کسی پر ظلم ہوتا ہے' تو دل تڑپ اٹھتا ہے۔ ایسے لمحوں میں مجھے اپنی نیک فطرت پر یقین آ جاتا ہے' لیکن جلد ایسی باتوں کو بھول بھی جاتی ہوں۔ میں انسان سے مایوس ہوں اور خود کو ہمیشہ تنہا پاتی ہوں۔ بلکہ ہر انسان تنہا پاتی ہوں-----!"

"اگر آپ برا نہ مانیں' میں آپ کو ایک مشورہ دیتی ہوں۔" بیگم ذکی الدین نے کہا۔

"آپ شادی کر لیں-----"

امل ہنس پڑی------

"شادی----- عورت کی پہلی اور آخری آرزو' یہ سطحی سوچ ہے۔ ایک طرح کا اقتصادی مسئلہ' لیکن مجھے ایسا کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہے اور شاید جنسی احتیاج کا پہلو بھی ہو' مگر یہ تو ایک دلدل ہے اور میں اس دلدل سے نکل آئی ہوں۔ میں کہنا چاہتی ہوں کہ جہاں فطری ضرورتوں کو پابند سلاسل کر دینا مستحسن نہیں ہے' وہاں محض جنس کے لئے زندگی کو وقف کر دینا لغو لذت پسندی ہے۔"

بیگم ذکی الدین نے فوراً جواب دیا-----

"مجھے افسوس ہے کہ یہ بحث بہت نازک ہے اور مجھ میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ اسے آگے بڑھاؤں' لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ آپ نے ممتا کا روپ نہیں دیکھا' اس لئے آپ کو زندگی کی سچائیوں پر یقین نہیں ہے۔"

"اس کا جواب تو میں دے چکی ہوں۔ میں ممتا کی سچائی سے انکار نہیں کرتی۔ یہ گدھے اور بھینس جیسے بے حس جانور میں بھی ہوتی ہے' لیکن یہ محدود سچائی ہے۔ اس سچائی کی خاص عمر متعین ہوتی ہے۔ جس طرح ڈپٹی کمشنر صاحب نے اپنے ماں باپ کو چھوڑا ہے' اسی طرح ایک دن آپ کے بچے آپ لوگوں کو چھوڑ جائیں گے۔ یہی ہوتا آیا ہے۔ یہی ہوتا رہے گا۔"

بیگم نے خاوند کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گئی۔

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ ذکی الدین نے گھڑی دیکھی اور جانے کی اجازت چاہی----- ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ذکی الدین نے سب سے ہاتھ ملایا اور امل سے کہا------

"میں دنیا دار آدمی ہوں۔ سماج کی ساری ذمہ داریوں کے ساتھ زندگی گزاروں گا' لیکن آپ کی باتیں یاد رکھوں گا۔ میں آپ سے اختلاف نہیں کرتا' مگر زندگی نے مجھ پر جو

عنایتیں کی ہیں' میں انہیں نظرانداز نہیں کر سکتا۔"

"بے شک----- آپ اسے نظرانداز نہیں کر سکتے-----" امثل نے نہایت ہلکے پھلکے موڈ میں جواب دیا----- "ساری دنیا میری طرح سوچنے لگ جائے' تو شاید یہ نظام ہی نہ چل سکے۔ یہ دنیا آپ جیسے دنیاداروں سے عبارت ہے۔ بلکہ یہ زمین آپ کے لئے اور آپ زمین کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔"

ذکی الدین نے عاطف کی طرف دیکھا-----

"ابھی تو آپ یہیں ہیں نا۔ ملاقات ہوتی رہے گی۔"

"مجھے تو کل جانا ہے۔" عاطف نے کہا----- "مقدمے کی ضروری تاریخ ہے۔ امثل شاید یہیں رہے۔ میں دو دن تک آ جاؤں گا۔"

ذکی الدین نے امثل کی طرف دیکھا۔ امثل فوراً بولی-----

"میں کل کے پروگرام کا بوجھ لے کر نہیں سوتی۔ ایک کام میرے بس میں ہے۔ جو جی میں آئے کرتی ہوں۔ شاید اسی لئے زندہ بھی ہوں۔"

اس لمحے میں نے دیکھا کہ ذکی الدین کا رنگ کچھ پیلا پڑ گیا۔ اس کی آنکھوں کے دیئے بجھ سے گئے۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم بھی اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ بستر پر لیٹ کر میں سوچنے لگا----- آج کی گفتگو سے نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ امثل نے جینے کی ہاں بھر لی ہے۔ گو میں سمجھتا تھا کہ اس کا رویہ اب بھی انتہا پسندانہ ہے' مگر ایک بات صاف تھی کہ اس کی پر پیچ شخصیت اب واضح ہوتی جا رہی تھی----- اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اس میں گھناؤنا پن نہیں تھا-----

جنسی اختلاط کے تجربے اور ان کے اعتراف میں اتنی سادگی تھی کہ غصے کی بجائے پیار آتا تھا۔ انگشت نمائی اس کے نزدیک گویا کوئی چیز ہی نہیں تھی----- اس کی بے داغ آتما پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔

وہ نہ بھلائی سے خائف تھی' نہ مجھ سے اور نہ کسی اور سے' صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی

کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتی۔ اگر اسے میرا خیال ہوتا' تو ایک حد تک کم از کم جھجک ضرور ہوتی۔

میرے لئے اس طرح کی ساری باتیں تکلیف دہ تھیں' مگر میں کیا کر سکتا تھا----- میں صرف ایک بات جانتا تھا کہ اس کی قربت میں رہنا ہے۔

ہر روز اور ہر لمحہ اس کی شخصیت نمایاں اور قد آور ہوتی جا رہی تھی----- اور مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچے جا رہی تھی۔

یہی کیا کم غنیمت ہے کہ میں اس کے لئے گوارا ہوں اور وہ مجھے برداشت کرتی ہے' بلکہ اگر ایک فیصد' خود کو دھوکے میں رکھوں کہ وہ مجھے پسند بھی کرتی ہے' تو بھی کوئی مضائقہ نہیں-----

ذکی الدین کے متعلق بھی سوچ رہا تھا کہ میرے مقابلے میں وہ بہت کم وقت میں امثل سے مرعوب ہو گیا تھا۔ دراصل ذہین لوگ اسے بہت جلد پہچان جاتے ہیں۔ دونوں میاں بیوی دل میں ایک طرح سے خائف ہوں گے اور سوچ رہے ہوں گے کہ اس کا ذکر چھیڑیں یا نہیں-----؟ اور اگر چھیڑیں' تو کس رنگ میں' کس انداز میں' عزت کے ساتھ یا طنزیہ روپ میں-----؟ لیکن مجھے یقین ہے کہ دونوں میاں بیوی نے امثل کا ذکر جان بوجھ کر نظرانداز کیا ہو گا----- کیونکہ یہی ایک طریقہ اپنے آپ سے بچنے کا تھا-----؟

صبح میری آنکھ بہت سویرے کھل گئی۔ میں باہر نکل گیا----- بہت خوشگوار موسم تھا۔ چڑیاں درختوں پر پھدک رہی تھیں اور چہچہا رہی تھیں۔ لان میں پھول کھلے ہوئے تھے۔ ہوا میں پھولوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ سڑک پر ملٹری کی دودھ کی گاڑی جا رہی تھی۔

یہ نہایت پیاری اور موہنی صبح تھی-----

میں نے زرد گلاب کے چند پھول توڑے جن کی سبز ٹہنیوں پر نرم نرم کانٹوں کی ہلکی سی پھوار تھی جو چبھنے کا احساس دیتی تھی' مگر چبھتی نہ تھی۔

زرد گلاب کی پنکھڑیوں میں بلا کی تازگی اور رس تھا اور اس میں سے امثل کے وجود کی سی مہک اٹھ رہی تھی۔ میں صبح کی خوشگوار ہوا میں ایک عجیب سے نشے کی کیفیت

محسوس کر رہا تھا۔

میں نے ہولے سے انجل کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا..... جواب نہ پا کر دھیرے سے دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا..... عاطف باتھ روم میں تھا..... انجل سلیپنگ سوٹ میں مزے سے سو رہی تھی۔ اس نے کمر تک چادر لے رکھی تھی اور بائیں کروٹ لیٹی ہوئی تھی..... اس کا خوبصورت دہانہ اور اس کی مضطرب آنکھیں بند تھیں اور اس کی خوبصورت گردن' سیاہ بالوں میں چاندی کی طرح چمک رہی تھی اور اس کا وہ نیچے کا رس ہونٹ' جس میں آدھے جہان کا فساد پنہاں تھا..... اوپر کے ہونٹ سے ہم آغوش تھا۔

اس کی کمر نیچے کو دبی ہوئی تھی اور کولہا اوپر کو ابھرا ہوا تھا اور سانسوں کے زیرو بم سے اس کا خوبصورت جسم کسی ان دیکھے ساز کی طرح مترنم تھا۔

اس لمحے مجھے بالکل خیال نہ آیا کہ میں کوئی اخلاقی جرم کر رہا ہوں' بلکہ نہایت عقیدت اور وجد سے اس فتنہ خوابیدہ کو دیکھ رہا تھا.....

سوتے میں وہ بالکل مختلف لڑکی نظر آ رہی تھی.....

میں نے پھولوں کا گلدستہ اس کی ننھی سی ناک کے قریب براق چادر پر رکھ دیا اور دھیرے سے دروازہ بند کر کے باہر چلا آیا۔

اس مختصر کارگزاری پر میرا دل سرشار ہو گیا اور میں ایک انجانی خوشی اور سرور کی کیفیت میں ڈوب گیا۔

ناشتے پر اس نے عاطف کے سامنے بغیر جھجک کے پوچھا

"صبح پھولوں کا گلدستہ غالباً آپ چھوڑ گئے تھے؟"

میں نے کسی حد تک جھجکتے ہوئے اقرار کیا' تو وہ بولی.....

"زرد گلاب مجھے بہت پسند ہے' مگر افسوس ہے' میں گلاب کے پھول سے الرجک ہوں۔ اس کی خوشبو سے مجھے زکام ہو جاتا ہے۔ میں اسے آنکھوں سے دیکھ کر محسوس کرتی ہوں' لیکن ہاتھ میں لے کر سونگھ نہیں سکتی.....!"

اس جواب نے مجھے الجھن میں ڈال دیا.....

ناشتے پر یہ فیصلہ بھی ہو گیا کہ ہم تینوں واپس کراچی جا رہے ہیں..... عاطف نے تو رات ہی اپنا فیصلہ سنا دیا تھا' لیکن انجل کی واپسی میں ایک احساس پایا جاتا تھا کہ وہ میرے وجود کو تسلیم کرتی ہے اور اکیلی میرے ساتھ رہنے میں اسے جھجک ہے۔

مجھے وہ رات یاد آ گئی جب مانسہرہ کے ڈاک بنگلے میں وہ بیمار ہوئی تھی اور صبح میں نے اس کی پیشانی کا بوسہ لیا تھا۔ اس دن وہ اچانک کراچی چلی گئی تھی۔ آج میں نے سوتے میں اس کا بوسہ نہیں لیا تھا صرف چند پھول نچھاور کئے تھے اور اس نے واپسی کا فیصلہ کر لیا تھا۔

شاید میں یہ سمجھنے میں حق بجانب تھا..... کہ فرار کے کچھ نہ کچھ معنی ضرور ہیں! لیکن معاً پھر ایک اور خیال آیا..... کہ..... کاش وہ مجھے ساتھ لے جانے کو نہ کہتی..... وہ بھائی کے ساتھ جاتی اور میں اپنے طور سے ایک دو دن کے بعد ان کا پیچھا کرتا.....

اور اس کا ردعمل دیکھتا.....

جہاز میں' میں نے اس سے کہا۔

"ہم اپنا سفر ہمیشہ ادھورا چھوڑ دیتے ہیں۔ مانسہرہ میں ہمارا پروگرام کاغان جانے کا تھا' لیکن اچانک آپ کراچی پہنچ گئیں۔ اب یہاں اور کئی جگہیں دیکھنے کے لائق تھیں' مگر ہم پھر کراچی جا رہے ہیں؟"

اس نے شرارت سے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

"یہ سب آپ کا قصور ہے..... یاد ہے' جب میں مانسہرہ میں اچانک بیمار ہو گئی تھی' تو آپ نے مجھے سوتا سمجھ کر میری پیشانی کا بوسہ لیا تھا؟"

"ہاں یاد ہے۔" میں مسکرایا۔

"آج صبح آپ نے میرے منہ کے قریب پھول رکھ دیئے تھے......؟"

"ہاں رکھے تھے۔"

"خیر یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ اپنے پیار اور پسند کے اظہار سے کون کسی کو روک سکتا ہے...... بلکہ اصل بات یہ ہے کہ میں آپ کو ایک دوست کی حیثیت سے دیکھنا چاہتی تھی۔ چونکہ آپ نے اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار کر دیا تھا' کوئی اور ہوتا' تو میں پروا نہ کرتی' لیکن آپ کی میں پروا کرتی ہوں...... ہاں مجھے کہہ دینا چاہیے کہ طویل عرصے کے بعد مجھے ایک ایسا آدمی ملا تھا جس کی عالی ظرفی کی وجہ سے میں اس کے ساتھ دو چار قدم چل سکتی تھی' لیکن جب آپ نے میری پیشانی کا بوسہ لیا' تو میں ایک لمحے کے لئے خائف ہو گئی تھی کہ کہیں ردعمل پیدا نہ ہو جائے اور مجھے ایک بار پھر مایوسی کے تجربے سے دوچار ہونا پڑے اور اس طرح آپ کی دوستی بھی کھو دوں......! وسیم صاحب' زندگی میں دو چار آدمی جو مجھے اچھے لگے ہیں' ان میں سے ایک آپ بھی ہیں۔ لیکن میں آپ پر تجربہ نہیں کرنا چاہتی۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ میرے دل میں آپ کے لئے جگہ ہے...... یہ دوستی اور رفاقت کی جگہ ہے۔ آپ مجھے محبوبہ سمجھ کر میرے لئے پھول نہ چنا کریں۔ کیونکہ میں اس قابل نہیں ہوں۔ بفرض محال مجھ میں ردعمل پیدا ہو بھی جائے' تو یہ بالکل عارضی ہوگا۔ میرے خیال میں آپ یہ پسند نہیں کریں گے کہ ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں......"

میں نے ڈوبتے لہجے میں جواب دیا۔

"میں آپ کی خالی خولی دوستی پر اکتفا کر سکتا ہوں۔ میں نے اکثر اپنے دل میں یہی سوچا ہے کہ اور کچھ نہ ہو' آپ کی رفاقت بھی میرے لئے انمول ہے' لیکن کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ شاید یہ کافی نہیں ہے۔ میں ہزار کوشش کروں اور آپ کا ہم خیال بنا رہوں اور اپنی فطرت پر جبر کرتا رہوں' لیکن میں کس طرح خود کو یقین دلا سکتا ہوں کہ یہ خوبصورت بدن ایک لڑکی کا بدن نہیں ہے۔ یہ خوبصورت ہونٹ صرف دیکھنے کے لئے نہیں بنے اور اس خوبصورت گردن کو چومنے کے لئے میں کس کس طرح بے قرار ہو جاتا ہوں——

امل' آپ کی قربت کی خاطر میں اپنی روح کو ہر اذیت میں مبتلا رکھنے کا عہد کرتا ہوں۔ اگرچہ یہ محض جذباتی فیصلہ ہے' لیکن میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ اسے محبت کہہ لیں' دوستی کہہ لیں۔ میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا...... خوش قسمتی سے آپ ایک ایسے بھائی کی بہن ہیں جو میری موجودگی پر اعتراض نہیں کرتا—— میں مایوس نہیں ہوں۔ میں تنا سمجھ نہیں ہوں کہ آپ کی رفاقت میں تنہائی کا احساس کیونکر پیدا ہو سکتا ہے' بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ میری زندگی زیادہ بامقصد ہو گئی ہے۔ کیونکہ آپ نے کم از کم میری دوستی کا دم تو بھر لیا ہے۔ کل میں آپ کے لئے کچھ بھی نہیں تھا' آج دوست ہوں۔ آنے والے کل سے میں توقع کیوں نہ رکھوں—— میں آپ کے ساتھ ہوں امل' قدم قدم آپ کے ساتھ——!"

امل خاموش تھی اور سامنے دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ گمبھیر ہو گئی تھی اور خلاف معمول اس کی بے قرار آنکھوں میں ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ میں نے اس کی اس کیفیت کو محسوس کیا اور ہولے سے کہا۔

"امل——!"

اس نے میری طرف دیکھا—— بے حد نرم نرم نگاہوں سے' وہ دھیرے سے مسکرائی—— یہ مسکان اس کی آنکھوں میں بھی تھی۔ کچھ ایسا لگتا تھا کہ یہ مسکان کہیں بہت دور سے آئی تھی—— تھکی تھکی سی' مضمحل سی...... اس کے سینے کی اتھاہ گہرائیوں سے سفر کر کے آئی تھی شاید——! شاید عادتاً——!!

وہ نہایت متین لہجے میں بولی——

"آپ بہت جذباتی ہیں۔ بس مجھے اس بات سے ڈر لگتا ہے۔ جذباتی لوگ برے نہیں ہوتے' لیکن احمق ضرور ہوتے ہیں' مگر کمال یہ ہے کہ آپ احمق بھی نہیں ہیں۔"

میں نے ہنس کر کہا——

"احمق ہوتا تو شاید اچھا ہی ہوتا۔"

"ہاں صاحب' اچھا ہی ہوتا۔ نہ غم جاناں نہ غم دوراں۔ شدت احساس ہی تو مار ڈالتا

ہے۔"

"امل...... ہم کراچی میں کیا کریں گے......؟" میں نے ایک دم بات کا رخ بدل دیا۔

"ایک دو دن گھومیں گے' بھائی جان اپنے کام سمیٹ لیں گے' پھر نکل پڑیں گے۔ جہاں سینگ سمائے' چلے جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے جہاں ہم نے سفر چھوڑا تھا' وہیں سے شروع کریں۔ سب سے پہلے کاغان جائیں۔"

"کاغان......!" وہ آہستہ سے بولی...... "اس نام سے جانے مجھے کیوں انس ہے۔ بچپن سے یہ نام میرے ذہن میں رچا بسا ہے...... ہاں...... کاغان ہی جائیں گے۔ جھیل سیف الملوک دیکھیں گے۔"

کراچی پہنچ کر انہوں نے مجھے ہوٹل نہیں جانے دیا۔ عاطف نے دوسرے دن مجھ سے کہا۔

"امتی جانے کے لئے ضد کر رہی ہے اور میرا دو تین دن مزید ٹھہرنا بے حد ضروری ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ دونوں چلے جائیں۔ ایبٹ آباد یا مانسہرہ میں میرا انتظار کریں؟"

"نہیں عاطف نہیں۔ یہ نہ کریں۔ امل کو یہ احساس نہ دلائیں کہ وہ آپ کی دنیا داری میں مخل ہوتی ہے۔ مجھ سے پہلے بھی تو آپ اس کی ہر جائز و ناجائز خواہش کو پورا کرتے رہے ہیں۔ اب اسے یہ خیال ہرگز نہیں آنا چاہیے کہ آپ اس سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ آپ اس سے سچی محبت کرتے ہیں اور اس کی خاطر کسی بات سے دریغ نہیں کرتے' لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا کہ آپ مجھ پر کلی بھروسہ کریں اور خود بہن کے دل میں یہ احساس پیدا کریں کہ آپ نے اسے ایک اجنبی کے اعتماد پر چھوڑ دیا ہے!"

عاطف نے چند لمحوں کے لئے میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں۔ پھر بڑے جذبے

سے گلے لگایا...... شاید وہ مجھے پہچان گیا تھا......!

تیسرے روز ہم صبح کی پرواز سے لاہور اور لاہور سے اسلام آباد کے ہوائی اڈے پر اتر گئے...... شام تک ہم ایبٹ آباد پہنچ گئے۔

ایبٹ آباد میں ٹورسٹ بیورو سے کاغان' ناران اور جھیل سیف الملوک تک پہنچنے کی ساری تفصیلات حاصل کیں...... ایبٹ آباد سے مانسہرہ اور مانسہرہ سے بالاکوٹ تک پکی سڑک ہے۔ جیپ' موٹر' ویگن' بس ہر چیز آسانی سے مل جاتی ہے' لیکن بالاکوٹ سے آگے صرف جیپ سے سفر کیا جا سکتا ہے۔

اگلے دن صبح تقریباً دس بجے ہم بالاکوٹ پہنچ گئے۔ بالاکوٹ' دریائے کنہار کے آرپار مشہور تاریخی قصبہ ہے جہاں سید احمد شہید بریلوی کا مزار ہے...... سید صاحب نے سکھوں کے خلاف آخری جنگ بالاکوٹ کے مضافات میں لڑی تھی اور یہیں شہید ہوئے تھے۔ سید احمد شہید کا مزار گڑھی حبیب اللہ میں بھی ہے اور ایک مزار ٹنڈ کے قصبے میں بھی۔

اس بارے میں مختلف کہانیاں مشہور ہیں۔ کوئی کہتا ہے' گڑھی حبیب اللہ میں ان کا سر دفن ہے اور بالاکوٹ میں دھڑ' میں نے اس سلسلے میں جتنے آدمیوں سے پوچھا' ہر ایک نے مختلف کہانی سنائی......

لیکن بالاکوٹ کے ریسٹ ہاؤس میں جو پتھر پڑا ہے' اس کی کہانی نہ صرف دلچسپ ہے' بلکہ وہاں کے لوگوں کو اس پر قطعی یقین اور اتفاق بھی ہے۔

اس پتھر کا نام مریم ستون ہے۔ مریم ایک گوجر لڑکی تھی' جو اپنے گاؤں سے اپنی سہیلیوں کے ساتھ دریائے کنہار سے پانی بھرنے آتی تھی...... مریم جو نہ صرف خوبصورت تھی بلکہ بلا کی طاقت ور بھی تھی...... دریا کے کنارے چار پانچ من کے اس گول پتھر کو اس طرح اچھالتی اور کھیلتی تھی...... جیسے ہوا سے بھرا ہوا گیند ہو! لوگ اس کی قوت پر حیران تھے۔ کیونکہ طاقت ور سے طاقت ور نوجوان بھی اس پتھر کو گھٹنوں سے اوپر اٹھانے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔

مریم نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ اس شخص سے شادی کرے گی' جو اس پتھر کو سر اوپر اٹھا کر دونوں ہاتھوں پر کھڑا کر دے۔ ان گنت نوجوانوں نے مریم کو حاصل کرنے لئے پتھر اٹھانے کی کوشش کی' لیکن وادی کاغان میں کوئی جوانمرد ایسا پیدا نہ ہوا جو پوری کر کے مریم کو جیت لیتا۔

جوانی گزر گئی۔ مریم کی کنپٹی کے بال سفید ہو گئے' لیکن کوئی مرد میدان سامنے نہ مریم بوڑھی ہو گئی مگر۔۔۔۔۔۔

اس نے اپنی شرط میں رعایت نہ برتی۔

ہزار حسرتوں کو سینے سے لگائے مریم اس دنیا سے رخصت ہو گئی' لیکن مریم ستون بھی بالاکوٹ کے ریسٹ ہاؤس میں پڑا ہے اور ہر آنے جانے والے سیاح کو متوجہ ہے۔ کنواری لڑکیاں لڑکے آتے ہیں' اس تاریخی پتھر کو ہلا جلا کر دیکھتے ہیں اور حیران ہیں کہ وہ عورت کیسی ہو گی جو گیند کی طرح اس پتھر کو اچھالتی اور کھیلتی تھی۔

ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار بڑے فخر سے یہ کہانی ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کو سناتا ہے۔ بالاکوٹ سے کاغان اور ناران کے لئے گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کے علاوہ پرائیویٹ سروس کی جیپیں بھی جاتی ہیں۔ ہم نے پچاس روپے روز کے حساب سے ایک کرائے پر لے لی۔ ہمیں ٹورسٹ بیورو والوں نے تاکید کی تھی کہ اس راستے ڈرائیونگ کا شوق ہرگز پورا نہ کریں۔

چنانچہ ہم نے جیپ کے ساتھ ڈرائیور بھی لے لیا تھا۔

تقریباً بارہ بجے ہم بالاکوٹ سے روانہ ہو گئے۔ دریا کنہار کا پل عبور کرتے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ بالاکوٹ سے ناران کا سفر اکیاون میل ہے۔ یہ سفر جیپ پانچ گھنٹے میں طے کرتی ہے۔ گویا دس میل فی گھنٹہ۔۔۔۔۔۔

کیونکہ تنگ مسلسل چڑھائی ہے۔ چھوٹے چھوٹے اور تنگ موڑوں والی یہ سڑک ہے۔۔۔۔۔۔ البتہ ٹکڑوں ٹکڑوں میں تارکول بچھا دی گئی ہے۔۔۔۔۔۔ عاطف پیچھے اور میں فرنٹ سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ آگے بیٹھ گئے تھے۔ آٹھ دس میل مسلسل اوپر جانے

عاطف نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دراصل وہ حد سے زیادہ خوف زدہ ہو گیا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔

حقیقت یہ ہے کہ خود میرا بھی برا حال تھا۔ گو کہ میں امثل کی وجہ سے بظاہر مسکرا رہا تھا۔

ہم اتنی بلندی پر پہنچ گئے تھے کہ جب نیچے دریائے کنہار کی طرف نگاہ جاتی تو عجیب دہشت ہوتی تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا جیسے دل سینے سے نکل کر حلق میں آ گیا ہے۔۔۔۔۔۔ دریائے کنہار سفید اژدہے کی طرح منہ کھولے ہمارے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔۔۔۔۔۔ یہ اژدہا کبھی نظروں سے اوجھل ہو جاتا اور کبھی اس کی دم اور کبھی اس کا پھن نظر آ جاتا۔۔۔۔۔۔

خوف زدہ ہونے کی نفسیاتی وجہ یہ بھی تھی کہ دریائے کنہار ہم سے ڈیڑھ دو میل نیچے بہہ رہا تھا۔۔۔۔۔۔ سڑک اور دریا کا زاویہ تقریباً عمودی تھا اور ڈرائیور کی ذرا سی بھول چوک گویا ہمیں جیپ سمیت سیدھی دریا میں پہنچا دیتی۔۔۔۔۔۔

عاطف کا سرخ رنگ بالکل پیلا پڑ گیا تھا۔ آنکھوں میں وحشت اور خوف کی پرچھائیاں صاف نظر آ رہی تھیں اور اس سے بات نہیں ہو رہی تھی۔ یقیناً مجھ پر بھی یہی گزر رہی تھی' لیکن میں حیران تھا کہ امثل کے چہرے پر اس صبر آزما سفر کا کوئی تاثر نہیں تھا۔۔۔۔۔۔ ہاں البتہ وہ خوش تھی۔ نہایت مسرور' ہر موڑ پر ایک نیا منظر' نئے نئے "انکشافات" نے اسے ہشاش بشاش بنا رکھا تھا۔

ہر فرلانگ' دو فرلانگ پر ہمیں گوجروں کے مختصر مختصر قافلے ملتے رہے۔ ان کا رخ اوپر کاغان اور ناران کی طرف تھا۔ ان کے ساتھ بھیڑ بکریاں' ٹٹو' بھینس' بیل' گائے' مرغیاں' بستر' کھانے پینے اور پکانے کے برتن اور کتے تک ہوتے تھے۔

عورتوں نے سرخ اور سیاہ رنگ کے بھاری بھرکم کپڑے پہنے ہوتے۔ بغل میں بچے' سر پر گٹھڑیاں' ہاتھ میں چھڑیاں' مردوں کے ساتھ برابر مویشی ہانکنے میں پیش پیش ہوتیں۔۔۔۔۔۔ تنگ سڑک پر جب جیپ ان کے قریب سے گزرتی تو مرد' عورتوں اور بچوں

اور مال مویشی میں افراتفری مچ جاتی۔ ان میں سے ہر آدمی جان کی پرواہ نہ کرتا۔۔۔۔۔ مگر مال مویشی بچانے میں پیش پیش ہوتا۔

اشل نے پوچھا۔۔۔۔۔

"یہ کون لوگ ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔۔۔۔۔؟"

ڈرائیور نے بتایا۔۔۔۔۔

"یہ گوجر قوم کے لوگ ہیں۔ گرمیوں میں مال مویشی کے ساتھ اوپر چراگاہوں میں چلے جاتے ہیں اور ستمبر اکتوبر تک وہاں رہتے ہیں۔ جب برفباری کا آغاز ہوتا ہے' تو یہ لوگ نیچے اتر آتے ہیں۔"

اشل نے دوسرا سوال کیا۔۔۔۔۔

"ان لوگوں نے کتوں کے کان کیوں کاٹ رکھے ہیں؟"

"یہ بڑی پرانی روایت ہے۔ ابھی یہ پلے ہی ہوتے ہیں کہ ان کے کان کاٹ دیئے جاتے ہیں اور پھر کٹے ہوئے کانوں کو بھون کر ان پلوں کو کھلا دیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں اس طرح کتے کی درندگی عود کر آتی ہے اور وہ زیادہ زہری اور خونخوار ہو جاتا ہے اور مویشیوں کے نزدیک کسی کو پھٹکنے نہیں دیتا!"

اشل نے اس انکشاف پر میری طرف مسکرا کر دیکھا۔

اب ہم خاصے نیچے آ گئے تھے۔ پارس کے چھوٹے سے گاؤں میں پہنچ کر ڈرائیور نے جیپ روک لی اور چائے کا آرڈر دیا۔ دریائے کنہار اب ہم سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔

عاطف نے جیپ سے اتر کر پوچھا۔۔۔۔۔

"یہ دریائے کنہار کہاں تک ہمارے ساتھ ساتھ چلے گا؟"

ڈرائیور نے کہا۔۔۔۔۔

"جناب تو یہ ناران تک آپ کے پہلو بہ پہلو چلے گا"

"اوہ خدایا۔۔۔۔۔" عاطف پریشان ہو کر بولا۔۔۔۔۔ "میرا تو آدھا خون اس دریا نے خشک کر دیا ہے۔"

ڈرائیور ہنس پڑا۔۔۔۔۔

"جناب یہ بڑا سرکش دریا ہے۔ جو ایک بار اس میں چلا گیا' واپس نہیں آیا۔ اس کا پانی اتنا ٹھنڈا ہے کہ پانچ منٹ کے اندر دوران خون رک جاتا ہے اور سارا خون جسم میں جم جاتا ہے۔"

عاطف نے بوکھلا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ حالانکہ اس وقت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اشل بے ساختہ ہنس پڑی۔

"بھائی جان' آپ اتنا کیوں ڈرتے ہیں۔ ان ڈرائیوروں نے ساری زندگی اسی سڑک پر گزار دی ہے۔ یہ دن میں چار بار اس پر گزرتے ہیں۔ آپ تو صرف پہلی بار گزر رہے ہیں۔ آخر کراچی کی ٹریفک اس سے کم خطرناک تو نہیں ہے۔"

"نہیں اشل نہیں' یہ بات نہیں۔۔۔۔۔ میل ڈیڑھ میل کی بلندی سے تو ویسے ہی انسان کا سر چکرا جاتا ہے اور پھر یہ احساس کہ نیچے ایک برفانی دریا بہہ رہا ہے۔ اور کم بختوں نے سڑک ایسی بنائی ہے کہ دریا والی سائیڈ پر' ڈیڑھ دو فٹ کی حفاظتی دیوار بنانے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔۔۔۔۔!"

"ہم دونوں کا ردعمل ایک جیسا ہے۔ یہاں پہلی بار آنے والا شخص راستے میں کئی بار سوچتا ہے کہ میری حماقت مجھے کہاں لے جا رہی ہے۔ یقین جانیئے میں نے کئی بار خدا کو یاد کیا ہے اور بنک میں رکھے ہوئے روپے کا مصرف سوچا ہے۔ مجھے پہلی بار شدید احساس ہوا ہے کہ زندگی کتنی قیمتی ہے!"

اشل ہنس رہی تھی۔ وہ بہت ہلکے پھلکے موڈ میں تھی۔ اتنے میں ڈرائیور چائے لے آیا۔ ساتھ ہی دیسی مرغی کے ابلے ہوئے دو دو انڈے' ڈرائیور بہت خوش باش آدمی تھا۔ اس نے ہماری خاطر تواضع میں کوئی کمی روا نہ رکھی۔

تھوڑی دیر بعد ہم روانہ ہو گئے۔۔۔۔۔ اب پھر چڑھائی شروع ہو گئی تھی۔ دریائے کنہار دو سربفلک پہاڑوں کے درمیان ہمارے مخالف سمت بہہ رہا تھا۔۔۔۔۔ یوں کہیے کہ ہم آسمان سے باتیں کرتی ہوئی دو دیواروں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ کبھی ان

دیواروں کا فاصلہ سمٹ کر آدھ فرلانگ رہ جاتا اور کبھی فرلانگ' دو فرلانگ' تین فرلانگ پھیل جاتا۔

دائیں ہاتھ کی دیوار کے پہلو میں جیپیں اس طرح دوڑتی نظر آتیں' جیسے سڑک نہیں ہوا میں معلق ہوں اور کسی مقناطیسی عمل سے بھاگی جا رہی ہوں۔ دائیں بائیں پہاڑوں کے دونوں اطراف' آدھے آدھے میل کی بلندی سے خوبصورت جھرنے گر رہے تھے۔ یہ بالکل پگھلی ہوئی چاندی کی طرح سماں باندھتے تھے۔

گوجروں کے قافلے حسب معمول ملتے رہے۔ امثل نے اچانک میری طرف دیکھا۔

"آپ نے ان لوگوں کو غور سے دیکھا ہے وسیم صاحب؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔

"ہاں----- میں بہت دیر سے ان کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ جوان' ادھیڑ' بوڑھے ہر عمر کے مرد نے ڈاڑھی رکھ چھوڑی ہے۔ سب کی ناکیں اندر اور ٹھوڑی باہر کو نکلی ہوئی ہے۔ سب کے چہرے افلاس زدہ ہیں اور کسی کے چہرے پر تازگی اور شگفتگی نہیں ہے------ ہر عورت' سب کی آنکھیں بھوری اور نیلگوں ہیں اور ان میں بلا کی چمک ہے۔"

امثل نے کہا-----

"کتنے قافلے دیکھے' لیکن کسی کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں دیکھی۔"

یہ بات قطعی صحیح تھی۔ عورتیں بے حد شرمیلی اور حیادار تھیں۔ اگر کہیں اتفاق سے ان کی نظریں جیپ والوں پر پڑ جاتیں اور جیپ والے انہیں دیکھ رہے ہوتے' تو ان کی آنکھوں اور چہروں پر حیا کی ایسی لہر دوڑتی کہ بس لطف آ جاتا۔ شرم و حیا کی ایک جھلک میں بھی عجب گیان ہوتا ہے-----!

امثل نے ایک بات اور کہی-----

"آپ عورتوں اور لڑکیوں کے چہروں کو غور سے دیکھیں۔ جیسے ان کے رخساروں پر خون جم گیا ہو۔ نیل پڑ گئے ہوں۔ شاید موسم اور آب و ہوا کا اثر ہو؟"

عاطف نے حسب معمول جیپ کے ڈنڈوں کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور اس کی

آنکھیں بند تھیں----- عاطف شاید اتنا نہ گھبراتا' لیکن وہاں کے جیپ والے' سیاحوں کی خاطر ترپال اتار دیتے ہیں تاکہ دائیں بائیں کے مناظر اچھی طرح دیکھ سکیں۔

اب ہم مہانڈری کے گاؤں سے آگے نکل چکے تھے اور ناران کے پہاڑوں کی برفانی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ ڈرائیور نے کہا۔

"اب اگلا گاؤں کاغان ہے۔ کاغان سے ناران کا فاصلہ تیرہ میل ہے' لیکن کاغان سے ناران تک سڑک بہت تنگ اور خراب ہے!"

بدقسمتی سے عاطف نے بھی یہ بات سن لی۔ اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

"آپ دونوں کی بہت مہربانی ہوگی---- اگر مجھے ناران ساتھ نہ لے جائیں۔ میں کاغان میں آپ کا انتظار کروں گا!"

امثل کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ڈرائیور نے اس کی ڈھارس بندھائی۔

"بابو صاحب' خدا پر بھروسہ رکھو۔ انیس برس سے اس روڈ پر جیپ چلا رہا ہوں۔ گور کی رات گھر پر نہیں آتی۔ یہاں تک آ گئے ہو' جھیل سیف الملوک دیکھے بغیر واپس چلے جاؤ گے تو زندگی بھر پچھتاؤ گے۔"

عاطف نے نہایت بے بسی سے ڈرائیور کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گیا۔

"بھائی جان!" امثل نے ہنستے ہوئے کہا----- "آپ خیریت سے ناران پہنچ جائیں گے۔ اس کا مجھے یقین ہے۔ خوف کو جتنا گلے لگاؤ اور زیادہ بڑھتا ہے۔ خوف زدہ وسیم صاحب بھی ہیں' مگر ہمت نہیں ہارے۔ بدری جمالہ شہزادی جس جھیل میں نہانے آتی تھی' آخر اس کی بھی کوئی حیثیت ہوگی۔ فطرت کے اس شاہکار کو دیکھے بغیر واپس ہونا' بقول آپ لوگوں کے' زندگی سے فرار کے مترادف ہوگا۔"

میں نے مسکرا کر عاطف کی طرف دیکھا۔ وہ بے چین تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے پھر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

تھوڑی دیر میں ہم کاغان پہنچ گئے----- کاغان مختصر سا گاؤں تھا۔ کاغان کے متعلق اتنا سنا اور پڑھا تھا کہ اس کا اختصار اچھا نہ لگا۔

یہاں دریا کے کنارے چند یورپین سیاح مچھلی پکڑ رہے تھے۔ کاغان کے ٹھنڈے پانی
ٹراؤٹ مچھلی دنیا بھر میں شہرت رکھتی ہے۔ کہتے ہیں کہ دنیا کی لذیذ ترین مچھلی ہے۔

ڈرائیور نے بتایا......

"یہاں ایک عجیب و غریب گھاس ہوتی ہے۔ اسے ہاتھوں پر ملو تو نہایت نفیس خوش
نکلتی ہے۔"

کاغان سے نکلتے ہی ہمیں دنیا کی عجیب و غریب سڑک سے واسطہ پڑ گیا تھا۔ یہ سڑک
پانچ چھ فٹ سے زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ بعض جگہ تو اس کی چوڑائی بہت کم رہ جاتی تھی
ڈرائیور کو انچوں کے حساب سے ماپ تول کر جانا پڑتا تھا...... ذرا سی لاپروائی اور بے
احتیاطی کے معنی موت تھے۔

یہاں دونوں پہاڑوں کا دامن اور تنگ ہو گیا تھا...... سڑک نہ صرف پیچیدہ تھی، پ
پہاڑی جھرنوں کی وجہ سے اس پر جگہ جگہ پانی بہہ رہا تھا...... اور جیپ کے سلپ ہونے
اندیشہ سر پر سوار تھا اور نیچے دریائے کنہار کی چٹانوں سے ٹکراتی اچھلتی سرکش لہریں
خوف میں مزید اضافہ کر رہی تھیں۔

تیرہ میل کا یہ سفر پل صراط عبور کرنے کے مترادف تھا۔

گوجروں کے قافلے ہمیں مسلسل ملتے رہے۔ ایک جگہ ڈرائیور نے جیپ روک لی
پانی گرم ہو گیا تھا۔ وہ پانی بدلنے لگا۔ ہم سستانے کے لئے اتر گئے۔ نیچے ایک قافلہ کھ
کھانے میں مصروف تھا۔ آگ جل رہی تھی۔ ایک عورت توے پر روٹی ڈال رہی
تھی...... ایک اور عورت، بچوں اور شوہر کو ہانڈی میں سے سالن ڈال کر دے رہی
تھی۔ اٹل اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ عورت کے رویے اور انداز میں عجیب حاکمانہ شان
تھی...... وہ اس چھوٹی موٹی سلطنت کی ملکہ تھی......

اٹل نے میری طرف دیکھا......

"کیا تمکنت ہے اس عورت میں، کس دعوے اور شان سے تقسیم میں مصروف ہے۔"
میں نے موقع غنیمت جان کر کہا......

"یہ اصل مشرقی عورت ہے اور یہ اصلی مشرقی کنبہ ہے۔"

"ہاں......!" اٹل نے تائید کی...... "یہ اصل لوگ ہیں۔ نیچر کے اور زندگی کے
بہت قریب، بھیڑ بکریاں پالتے ہیں۔ دودھ مکھن کھاتے ہیں۔ کھلی فضاؤں میں رہتے ہیں۔
شہر کے ہنگاموں سے دور، حرص و ہوس سے آزاد، شعور کی گرفت سے ناآشنا، سیدھے
سادے لوگ، نہ مشینوں کی آواز سے پریشان اور نہ توپوں کی گھن گرج سے خوف زدہ، نہ
اعصاب پر دباؤ اور نہ ذہن پر بوجھ، میرا خیال ہے، یہاں جرم برائے نام ہو گا......"

"مگر یہ آسودہ حال نہیں ہیں اور نہ ہی محفوظ ہیں۔"

"آپ کے ٹریڈ یونین کا منظم مزدور کہاں آسودہ حال ہے۔ احساس عدم تحفظ نے اس
کا خون خشک کر رکھا ہے...... شیر اپنے کچھار سے نکلتا ہے، تو اسے تحفظ کے کسی قانون کی
ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اکیلا جنگل میں دندناتا ہے...... احساس عدم تحفظ بھیڑیوں کو ہوتا
ہے۔ ہرنوں کو ہوتا ہے اور کمزور انسانوں کو ہوتا ہے۔ جو ہمیشہ خوف زدہ ہو کر اکٹھے ہو
جاتے ہیں...... ان لوگوں کو، ان آزاد پنچھیوں کو نہ حفاظت کی ضرورت ہے اور نہ
آسودگی کے احساس کی، یہ بہت سکھی لوگ ہیں۔ بہت سکھی......!"

جیپ پر بیٹھ کر میں نے کہا......

"آپ نے کہا تھا اٹل۔ کتنے قافلے گزر گئے، مگر ہم نے کسی مرد عورت اور بچے کے
چہرے پر مسکراہٹ نہیں دیکھی۔ پھر یہ سکھی کیسے ہیں......؟"

جیپ بہت تنگ اور عمودی چڑھائی چڑھ رہی تھی۔ مگر اٹل کو اس کا ذرا بھی احساس
نہیں تھا۔ بولی۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہنسی اور مسکراہٹ نہایت سطحی ردعمل ہیں۔ انسان
حقیقت میں بہت ہی کم ہنستا ہے۔ ہم ہمیشہ بہت معمولی باتوں پر ہنستے ہیں مثلاً بھائی جان ڈر
رہے ہیں اور ہم ہنس رہے ہیں۔ کیلے کے چھلکے سے آدمی پھسل کر گرتا ہے اور لوگ ہنستے
ہیں...... بھلا یہ بھی کوئی ہنسنا ہے، وسیم صاحب، ہم صرف منہ سے ہنستے ہیں۔ ہمارے
اعصاب ہمیشہ جکڑے رہتے ہیں۔ ہماری فطرت بہت کم ہنستی ہے۔ ہم ہمیشہ جھوٹی ہنسی ہنستے

ہیں......!"

ڈرائیور ہماری باتیں بہت غور سے سن رہا تھا۔ وہ کچھ چونک سا گیا تھا' مگر اس تنگ سڑک کو بے حد ماہرانہ انداز میں عبور کر رہا تھا......

میں نے پوچھا......

"آپ کی باتیں سن کر مجھے ایسا لگتا ہے کہ انسان ایک فیصد بھی با اختیار نہیں ہے امارت اور دولت کے باوجود ہم بے بس ہیں......؟"

"یہ تو بہت سیدھی سی بات ہے۔" امثل نے جواب دیا...... "دولت سے آپ نیند کہ خرید سکتے ہیں۔ دولت سے آپ خوبصورت بچے کیسے حاصل کر سکتے ہیں۔ دولت سے آپ کسی حسین عورت کی محبت کیسے حاصل کر سکتے ہیں۔ دولت سے آپ اس کا جسم خرید سکتے ہیں' اس کی روح میں نہیں اتر سکتے۔ ہم تینوں کے پاس کیا دولت نہیں ہے' مگر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ آخر کس چیز کی تلاش میں ہیں۔ قالین' ایئر کنڈیشنڈ کرے' موٹریں' نوکر چاکر' کیا کچھ ہمیں میسر نہیں ہے' لیکن خوبصورت کپڑے اور کام و دہن کے مزے ہماری روح میں گداز پیدا نہیں کر سکتے۔ بھائی جان کے اپنے پرابلم ہیں اور آپ کے اپنے' اور میرا جس کا بظاہر کوئی پرابلم نہیں ہے...... گیان ہی نہیں رکھتی...... کہ میں چاہتی کیا ہوں......!"

اچانک ایک گلیشیئر سامنے آ گیا۔ ہم نے اس سے پہلے کبھی گلیشیئر نہیں دیکھا تھا۔ ڈرائیور نے بتایا۔

"جب برف جم جاتی ہے' تو ڈھلانوں پر بڑے بڑے تودے یک جان ہو کر نیچے کو کھسکنے لگ جاتے ہیں اور انچوں کے حساب سے غیر محسوس انداز میں آہستہ آہستہ نیچے پہنچ کر رک جاتے ہیں۔ بعض اوقات ان کی رفتار فی انچ' سال ہوتی ہے......؟"

اس گلیشیئر کو کاٹ کر جیپ کے لئے راستہ بنایا گیا تھا...... جیپ کے پہیے برف پر سلپ ہو رہے تھے' لیکن ان گنت پہیوں نے برف پر آدھ آدھ فٹ گہری نالیاں بنائی تھیں اور ان نالیوں پر سے جیپیں تھوڑی سی کشمکش اور اچھل کود کے بعد گزر جاتی تھیں۔

ناران پہنچنے سے پہلے اس طرح کے چار گلیشیئر عبور کرنا پڑے۔ آخری گلیشیئر پر جو سب سے زیادہ لمبا اور چوڑا تھا' گوجروں کا ایک اور قافلہ ملا۔ راستہ بے حد تنگ تھا۔ بھیڑ بکریاں اور دوسرا مال مویشی بہت زیادہ۔ گوجر مرد عورتیں برابر راستہ صاف کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ جیپ آہستہ آہستہ جا رہی تھی۔ غالباً یہ پچاسواں میل تھا۔ ناران ابھی ایک میل اور آگے تھا۔

ایک گوجر لڑکی جس کی ہماری طرف پشت تھی' سرخ کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ اس کے سر پر گٹھڑی تھی۔ بائیں ہاتھ سے گٹھڑی تھام رکھی تھی اور دائیں ہاتھ سے ایک مچلتا ہوا کتا قابو کئے ہوئے تھی۔ ہماری جیپ اس کے قریب سے گزری' تو ہم نے ایک خوبصورت منظر دیکھا۔

یہ لڑکی بے ساختہ ہنس رہی تھی اور ہم لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ امثل بھی اسے دیکھ کر ہنس پڑی۔

"دیکھئے وسیم صاحب' آپ کو ہنسی کی تلاش تھی۔ یہ ہے اصل ہنسی! یہ جو میل میل اوپر سے پہاڑی جھرنے گرتے ہیں' سب سے حسین جھرنا ہے! یہ دیکھئے' کیا کہہ رہی ہے یہ ہنسی......؟"

کتا بلبلاتا رہا' اچھلتا رہا' مچلتا رہا' مگر لڑکی کا ہاتھ اس کی گردن سے نہ ہٹا۔ اسے اپنی دلفریب ہنسی کی طرف متوجہ ہونے والوں پر کتے کا بھونکنا پسند نہیں تھا۔

اکیاون میل کے سفر میں جو کوفت ہوئی تھی' فطرت نے پلک جھپکنے میں اسے ایک انجانی راحت میں بدل دیا تھا۔

واقعی یہ خوبصورت ہنسی اس پل صراط پر سے گزرنے کا انعام تھا......!

منزل آ گئی تھی...... یہ ناران تھا۔ چھوٹا سا صاف ستھرا قصبہ' یہاں وادی میل ڈیڑھ میل تک پھیل گئی تھی اور دریائے کنہار بائیں ہاتھ کے پہاڑ کی طرف سرک گیا تھا اور اس کا شور خاصہ کم ہو گیا تھا۔

ہماری جیپ پہاڑی پتھر کی بنی ہوئی سرکاری ڈسپنسری کے سامنے رک گئی۔ دائیں ہاتھ

فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر پارک ہوٹل تھا اور آدھا میل آگے سرکاری ڈاک بنگلہ۔۔۔۔۔ ہوٹل اور بنگلے کے ڈبل بیڈ کا کرایہ چالیس روپیہ یومیہ تھا۔۔۔۔ گو وہاں بجلی نہیں تھی، مگر ہر کمرے میں مٹی کے تیل کا لیمپ مہیا کیا جاتا تھا اور بھی چھوٹے چھوٹے ہوٹل تھے، جن میں چارپائی بستر مل جاتا تھا اور ان کی قیمتیں بھی بہت واجبی تھیں۔ بکرے کا گوشت شہروں کی نسبت بہت سستا تھا۔

پارک ہوٹل میں آٹھ کمرے تھے۔ ہمیں بمشکل ایک کمرہ مل سکا۔ وہ بھی ایک فرانسیسی جوڑے نے چھ بجے شام خالی کیا۔ یہ لوگ ڈاک بنگلے منتقل ہو گئے تھے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ میں، عاطف اور اسمٰی کے ساتھ ایک کمرے میں سو رہا تھا۔ زائد بستر کے دس روپے الگ ادا کئے۔

ڈاک بنگلہ اور ہوٹل غیر ملکی سیاحوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ان میں یورپ کے مختلف ممالک کے لوگ تھے۔ ان سب کو جھیل سیف الملوک کی شہرت کھینچ لائی تھی۔

ہمیں یہ دیکھ کر انتہائی حیرت ہوئی کہ ان سب لوگوں کے پاس وادی کاغان کے نقشے تھے اور وہ اس علاقے کے متعلق معلومات رکھتے تھے، جب کہ ہمارے پاس کوئی نقشہ نہیں تھا!

اٹلی کے ایک سیاح نے بتایا۔

"میں بہت پہلے آ گیا ہوں، کیونکہ ناران سے گلگت جانے والی سڑک ابھی برف سے ڈھکی ہوئی ہے۔ اب مجھے یہاں ایک مہینہ سڑک صاف ہونے تک رکنا پڑے گا۔"

عاطف نے اس سے کہا۔۔۔۔

"آپ واپس اسلام آباد چلے جائیں۔ وہاں سے ہوائی جہاز کے ذریعے گلگت جا سکتے ہیں۔"

"نہیں نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔۔۔۔۔ "مجھے کوئی جلدی نہیں ہے اور نہ صرف گلگت جانا ہی مقصود نہیں ہے۔ میں سڑک سے جانا چاہتا ہوں۔ ایک مشاہدہ اور تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔"

عاطف نے خطرے کا اظہار کیا۔۔۔۔۔

"سنا ہے بہت خطرناک راستہ ہے۔"

"ہاں۔۔۔۔۔ اسی لئے تو ادھر جانا چاہتا ہوں۔ انسان نے آخر ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی بھی سر کی ہے۔ ہم تو پھر جیپ میں جائیں گے۔ جن لوگوں نے یہ سڑک بنائی ہے وہ آخر انسان سے توقع رکھتے ہیں کہ اس پر سفر کریں۔ ہم ان لوگوں کو مایوس نہیں کر سکتے!"

عاطف نے جھینپتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ اسمٰی ہنس پڑی۔ میں نے اٹالین سیاح سے پوچھا۔

"مگر ایک ماہ اکیلے آپ کیسے گزاریں گے۔ کیا آپ بور نہیں ہوں گے؟"

"دو چار دن تو احساس رہا، لیکن اب میں نے ٹراؤٹ مچھلی پکڑنے کا اجازت نامہ حاصل کر لیا ہے۔ دن بڑے مزے سے گزر جاتا ہے۔ کبھی کبھار ایک آدھ مچھلی بھی ہاتھ آ جاتی ہے اور میں اٹلی خط لکھ دیتا ہوں کہ آج میں نے ٹراؤٹ مچھلی کھائی ہے اور پھر ایک بات بتاؤں، جب آپ کو یہ احساس ہو کہ آپ کے سر کے عین سات میل اوپر جھیل سیف الملوک ہے، تو انتہائی بدقسمتی ہو گی کہ انسان بور ہونے کا خیال بھی دل میں لائے!"

اسمٰی پہلی بار اس سے مخاطب ہوئی۔۔۔۔۔

"یعنی آپ کا خیال ہے کہ وہ لافانی منظر ہے؟"

"سویٹ لیڈی۔۔۔۔۔!" اٹالین سیاح نے اسے جواب دیا۔۔۔۔۔ "میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ اس مقدس منظر کا نقشہ کھینچ سکوں۔ میں انسان ہوں، لیکن جب میں اس روح پرور منظر کو دیکھنے کے لئے اوپر پہنچ گیا، تو ایسا لگا کہ میں مافوق الفطرت ہستی ہوں، اور کسی دوسری دنیا میں آ گیا ہوں اور اگر میں سچ مچ انسان ہوں تو پھر یہ منظر حقیقت نہیں ایک خواب ہے۔۔۔۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ میں انسان نکلا کیونکہ میں اپنے آپ کو محسوس کر رہا تھا اور وہ حقیقت میں ایک جھیل تھی جسے میں دیکھ رہا تھا اور جس کے پانیوں میں میں نے ہاتھ دھوئے!"

ہم تینوں محو حیرت اس سیاح کی باتیں سن رہے تھے کہ اس نے ایک اور بات کہہ

دی۔

"ہاں' افسوس! کہ میں انسان نکلا اور جس طرح انسانوں کو نظرانداز کرنا میری فطرت تھی' میں نے اس جھیل کو بھی اکیلا چھوڑ دیا اور اب...... میں مچھلیاں پکڑ رہا ہوں!؟"

میں دیکھ رہا تھا' امثل کی حیرت زدہ آنکھیں سیاح پر جم گئی تھیں' لیکن اس کی بے تاثر آنکھوں میں بے حد کومل تھی۔ یہ کوملتا میں نے اس کی آنکھوں میں پہلی بار پائی تھی۔

جھیل سیف الملوک سے ایک غیر ملکی سیاح کی اس طرح والہانہ وابستگی اور شیفتگی نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ اس کی باتیں اور خود وہ مجھے پیارا لگا۔

صبح ہم ناشتے سے فارغ ہوئے تو بیرے نے اطلاع دی۔

"گھوڑوں والے آ گئے ہیں۔"

دراصل ہم نے گزشتہ شام ہی جھیل سیف الملوک جانے کے لئے تین گھوڑوں کا انتظام کر لیا تھا۔ جھیل تک کچی سڑک بھی جاتی ہے اور سیزن میں سیاحوں کے لئے جیپ سروس جاری رہتی ہے' لیکن ابھی سڑک صاف نہیں ہو سکی تھی۔ ایک بہت بڑے گلیشیئر نے راستہ روک رکھا تھا اور فی الحال لوگ پیدل یا گھوڑوں پر اوپر جاتے تھے۔ گھوڑا آنے جانے کا کرایہ بارہ روپے تھے۔

امثل نے سفید قمیص اور سفید پتلون پہن رکھی تھی۔ میں نے ایک گھوڑے والے سے کہا۔

"سب سے شریف گھوڑے پر خاتون بیٹھیں گی۔"

گھوڑے والے نے ایک سفید گھوڑے کی طرف اشارہ کیا......

"صاحب...... یہ سب سے اصیل گھوڑا ہے۔"

میں نے امثل کو اس گھوڑے پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ میں اور عاطف دو دوسرے گھوڑوں پر بیٹھ گئے۔ گھوڑے پر بیٹھنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا اور غالباً عاطف اور امثل بھی پہلی بار گھوڑے کی لگامیں تھام رہے تھے۔ کیونکہ میری طرح ان کے انداز میں بھی اناڑی پن تھا۔ بچپن میں سنا تھا کہ گھوڑے پر بیٹھ کر انسان میں غرور اور تمکنت آ جاتی ہے۔

یہ بات ایک حد تک صحیح نکلی۔ گھوڑے کی رکابوں میں پاؤں ڈال کر باگیں ہاتھ میں لے کر اور زین پر بیٹھنے کے بعد ایک انوکھی سی' انجانی سی خود اعتمادی کا احساس ہونے لگتا ہے۔

مجھے بیرے اور گھوڑے والے کچھ مختصر مختصر سے لوگ لگے......!

ہوٹل سے آدھ میل کے فاصلے پر ہم دائیں کو مڑ گئے۔ یہی وہ راستہ تھا جو جھیل سیف الملوک کو جاتا تھا۔

ہمارے بائیں ہاتھ ایک منہ زور تیز رفتار اور شفاف پانی کی ندی چٹانوں سے سر پٹختی ہوئی دریائے کنہار کی طرف بڑھ رہی تھی۔ گھوڑے والے نے بتایا۔

"یہ جھیل سیف الملوک کا پانی ہے۔ جو آبشار کی شکل میں جھیل سے گرتا ہے۔"

ہم نے نہایت احترام سے اس پر شور ندی کی طرف دیکھا۔

ہم ایک تنگ وادی میں جا رہے تھے' جس کے دائیں بائیں سربفلک شاداب پہاڑ تھے اور ان کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ایک میل کے بعد ایک کچے پل کی وساطت سے اس ندی کو پار کیا۔ اب ندی ہمارے دائیں ہاتھ بہہ رہی تھی۔ ہمیں جلد احساس ہو گیا کہ جن گھوڑوں پر ہم بیٹھے ہیں' محض پہاڑی ٹٹو نہیں' بلکہ ہم سے زیادہ شاید ان کو احساس تھا کہ ان پر سواری کرنے والے محض اناڑی ہیں...... اس لئے وہ بہت پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔

دو اڑھائی میل کے بعد گلیشیئر آ گیا جس کی بڑی دھوم تھی اور جس نے جیپ سروس روک رکھی تھی۔ یہ گلیشیئر تقریباً دو میل لمبا تھا اور چوڑائی تین فرلانگ سے کسی صورت کم نہیں تھی۔

گھوڑے والے رک گئے......

"صاحب! یہاں سے پیدل جانا پڑے گا۔"

ہم بھی گھوڑوں کی پیٹھ پر تھک گئے تھے اور برف پر چلنے کا شوق الگ۔ لہٰذا گھوڑوں سے اتر آئے...... میں مری کی کچی برفوں پر چہلیں کرتا رہا تھا' لیکن یہ پکی اور جمی ہوئی برف تھی...... عاطف اور امثل پہلی بار برف پر قدم رکھ رہے تھے۔ آٹھ دس قدم چلا۔

دو تین بار گرا۔ یہی حال عاطف اور امثل کا تھا۔ ان کے پاؤں کانپ رہے تھے۔ بظاہر ہنس رہے تھے مگر اندر سے خوفزدہ تھے۔

گھوڑے والے نے تجویز پیش کی------

"صاحب------ آپ تینوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیں۔"

ہم نے یہ بھی کر کے دیکھ لیا۔ دو چار قدم آگے بڑھے' لیکن جب عاطف اچانک لڑھک کر بے ساختہ گر پڑا' تو ہم دونوں بھی اس کے ساتھ لڑھک گئے اور چار پانچ گز لڑھکنے کے بعد ایک دوسرے پر ڈھیر ہو گئے------

گھوڑوں والے لپک کر آئے۔ ہمیں سہارا دے کر اٹھایا اور ہمارے کپڑوں سے برف جھاڑی۔

امثل ہنس پڑی------ "بھئی میں تو برف پر نہیں چل سکتی------"

"ہم کونسے تیس مار خاں ہیں۔" عاطف نے جل کر کہا------ "ہم کہاں چل سکے ہیں۔"

میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔

"بھئی برف میں وہ لوگ چلتے ہیں' جن کے بڑے بڑے' موٹے موٹے بوٹوں کے نیچے لکڑی کے پھٹے لگے ہوتے ہیں اور ان پھٹوں میں ڈیڑھ ڈیڑھ انچ کی میخیں باہر کو نکلی ہوتی ہیں۔"

"صاحب------ آپ گھوڑوں پر بیٹھ جائیں۔ آپ یہ گلیشیئر گھوڑوں پر بیٹھ کر عبور کریں۔"

میری جان میں جان آئی لیکن عاطف نے فوراً سوال کیا------

"اگر گھوڑا بدک گیا تو------؟"

"نہیں صاحب۔" گھوڑے والے نے تسلی دی------ "یہ اصیل گھوڑے ہیں۔ ہم ان کی لگامیں پکڑیں گے۔ آپ ڈریں نہیں یہ ہمارا روز کا دھندا ہے۔"

امثل ہنس پڑی۔

"بھئی گھوڑے والے' میں جھیل سیف الملوک دیکھنے سے پہلے مرنا نہیں چاہتی۔ پانچ جمل کی بات ہے۔ ذرا خیال رکھنا۔"

گھوڑے والا ہنس پڑا------ اس نے سہارا دے کر امثل کو گھوڑے پر بٹھا دیا۔ میں اور عاطف بھی بیٹھ گئے۔ گھوڑے نے قدم اٹھایا تو عاطف نے کہا۔

"وہ جو انتیس ہزار فٹ کی بلندی پر جا پہنچے تھے اور ماؤنٹ ایورسٹ سر کر لیا تھا' یقین نہیں آتا کہ انسان تھے------؟"

ایک لحاظ سے عاطف کی بات بالکل صحیح تھی۔ میدانی علاقوں کے لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑوں کی برف پوش ڈھلانوں' عمودی چڑھائیوں اور یخ بستہ ہواؤں میں انسان ہزاروں فٹ کی بلندیوں پر جا پہنچے------ جمی ہوئی برف پر دس قدم چل کر ہمیں شدید احساس ہو گیا تھا کہ دنیا کے وہ عظیم دیوانے' جن کے ہم تن سنگھ اور ہلیری تھے' کس جگر اور کلیجے کے آدمی ہوں گے۔

امثل کا گھوڑا سب سے آگے تھا۔ اب ہم گلیشیئر کے عین درمیان میں آ گئے تھے۔ امثل نے اچانک ہمیں ایک برق رفتار ندی کی طرف متوجہ کیا------ یہ ندی عین ہمارے پیروں کے نیچے سے گزر رہی تھی اور ہم سے صرف دس بارہ قدم نیچے گلیشیئر میں شگاف کر کے زخمی اژدہے کی طرح بل کھاتی تڑپتی' گلیشیئر کے اگلے تودے میں گم ہو گئی تھی۔

ہمارے گھوڑوں کے سم برف میں دو دو انچ کھب رہے تھے۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ یہ تصور کتنا روح فرسا تھا کہ اگر ہمارے پاؤں کے نیچے کی برف ٹوٹ گئی' تو ہم گھوڑوں سمیت کہاں پہنچیں گے------!

لیکن دو فٹ بعد ہم خطرے کی لائن سے پار ہو گئے------ میں نے دیکھا' عاطف ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا تھا۔

گلیشیئر عبور کر کے گھوڑے والے نے پھر ایک تجویز پیش کی۔

"صاحب اگر آپ یہاں سے سیدھے اوپر کو پیدل چلیں' تو میل ڈیڑھ میل کا فاصلہ کم ہو جائے گا۔"

ہم نے گھوڑے والے کی تجویز کو خلوص پر مبنی جانا اور اس کی چالاکی کو نہ سمجھ سکے
ہم نے پیدل چڑھنے کی ہامی بھرلی اور گھوڑوں سے اتر گئے۔

مگر بہت جلد ہمیں اپنی حماقت کا احساس ہو گیا۔ یہ چڑھائی دیوار پر چڑھنے کے مترادف تھی۔ آدھ فرلانگ چڑھ کر ہمارے سانس پھول گئے اور ٹانگیں لرزنے لگیں۔ ایک دوسرے کی طرف آنکھ اٹھانے کی ہمت نہ رہی تھی۔ گھوڑے اور گھوڑوں والے تقریباً فرلانگ اوپر چلے گئے تھے۔

عاطف بالکل رہ گیا...... اور وہیں لیٹ گیا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا...... میں اور امل بھی اس کے پاس بیٹھ گئے مگر ہم میں ہمت نہیں تھی کہ اس سے بات کریں یا اس کی مدد کریں۔ گھوڑوں والے بھی اوپر رک گئے۔ غالباً انہیں احساس ہو گیا تھا کہ بابو لوگ ہمت ہار بیٹھے ہیں۔

تھوڑی دیر میں ایک گھوڑے والا ہرن کی طرح چھلانگیں مارتا ہوا ہمارے پاس پہنچ گیا۔ ہم حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ کس طرح اس عمودی ڈھلان پر وہ بے خطر نیچے چلا آیا۔ امل نے اس کی طرف دیکھا۔

"تم گھوڑوں والے اس طرح اجنبیوں کو دق کرتے ہو......؟"

گھوڑے والے نے خفیف ہو کر دانت نکالے۔ امل نے کہا۔

"تم سے کہا نہیں تھا کہ میں جھیل سیف الملوک دیکھنے سے پہلے مرنا نہیں چاہتی۔"

گھوڑے والے کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا...... تھوڑی دیر میں وہ گھوڑوں سمیت اتر آئے۔ ہماری کم ہمتی کی وجہ سے ان کی چالاکی دھری کی دھری رہ گئی تھی...... اب گھوڑوں نے سواروں سمیت دوبارہ چڑھنا تھا......

گھوڑوں کی زینیں پیچھے کو سرک آئی تھیں۔ ستر اسی ڈگری کی چڑھائی چڑھتے ہوئے کبھی کبھی گھوڑے بالکل الف ہو جاتے اور ایسا محسوس ہوتا کہ ہم گھوڑوں سمیت پشت کی طرف لڑھک جائیں گے۔

ان عجیب و غریب مرحلوں کو طے کرتے ہوئے عاطف بے چارہ ایک بار پھر گڑگڑایا...... "دونوں کی بڑی مہربانی ہو گی اگر آپ مجھے یہیں چھوڑ دیں!"

مگر میں نے اسے ڈھارس دلائی۔ ہمت بندھائی...... اگرچہ خود مجھے اپنے اعصابی کھچاؤ کا اچھی طرح علم تھا۔

گھوڑوں کو بے طرح پسینہ آیا تھا' لیکن ان پہاڑی ٹٹوؤں کا استقلال اور ہمت قابل دید تھی۔

امل نے اپنے گھوڑے کو تھپتھپایا......

"غالباً کسی ایسے لمبے ہی پسینے سے شرابور گھوڑے کو دیکھ کر کپل وستو کے راجکمار نے دنیا کو تیاگ دینے کا فیصلہ کیا ہو گا؟"

میں نے عقیدت سے اس کی طرف دیکھا...... عاطف خوفزدہ تھا اور دائیں ہاتھ کی بے پناہ گہرائیوں کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

اب ہم خاصے اوپر آ گئے تھے۔ امل چھلانگ لگا کر گھوڑے سے اتر گئی اور دونوں ہاتھوں میں برف اٹھا کر گولے بنانے لگ گئی...... یہاں دیودار کے اونچے اونچے درخت تھے اور برف میں بھیگی ہوئی ان کی خوشبو...... جھیل ابھی پون میل اور اوپر تھی۔ ہم نے پیچھے اس وادی کی طرف دیکھا' جس پر ابھی ابھی ہم اپنے قدموں کے نشان چھوڑ آئے تھے۔

یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم اتنی بلندی پر پہنچ گئے ہیں اور یہ وادی...... یہ چاندی کی وادی' اس قدر سحر طراز اور خوبصورت ہو گی...... دونوں پہاڑوں کے دامن میں بڑے بڑے گلیشیر اور اس میں چاندی کی طرح مچلتا ہوا اور آنکھ مچولی کھیلتا ہوا آب رواں......!

اور میں سوچ رہا تھا یہ میرا ملک ہے' یہ میرا وطن ہے' یہ میرا دیس ہے اور میں کتنا بدنصیب ہوں کہ اٹھائیس برس کی عمر میں یہ بے مثال حسن پہلی بار دیکھ رہا ہوں......

اور ابھی میں نے وہ منظر نہیں دیکھا...... جسے اطالین سیاح دوسری دنیا کا منظر بتا تھا۔

اب ہم اس موڑ پر آگئے تھے کہ ناران کا قصبہ اور وادی ہماری نظروں سے اوجھل رہے تھے' لیکن اس کے عوض جھیل سیف الملوک کی برفانی ہواؤں نے' استقبالیہ انداز میں ہماری روحوں سے سرگوشیاں شروع کر دی تھیں۔

یہ عجیب و غریب تعارف تھا۔

نور میں ڈھلے ہوئے یخ جھونکے گیان دھیان کے سندیسے دے رہے تھے۔ وہ بس سے آگے تھی' لیکن خاموش تھی' جیسے کچھ جذب کر رہی ہو......

عاطف کے چہرے پر بشاشت لوٹ آئی تھی اور اس کی نیلی آنکھوں کی چمک بھی عود آئی تھی......

آخر وہ موڑ آگیا...... وہ لمحہ آگیا...... جس کے انتظار میں برس اور سال اور دن گن گن کر گزارے تھے اور جس کی خاطر جانے کتنے پل صراط عبور کئے تھے۔ محسوس ہونے والی یخ' تیز اور خوشگوار ہواؤں نے میرے جسم میں دوڑنے والے لہو کے ایک ایک ذرے کو بیدار کر دیا تھا اور میرے جسم کے ہر مسام کو آنکھ بنا دیا تھا۔

اور میں ان گنت آنکھوں سے یہ نورانی منظر دیکھ رہا تھا......!

چاروں طرف دودھ کی طرح سفید برف میں لپٹے ہوئے سربفلک پہاڑ' اور ان کے درمیان ڈیڑھ میل سبز و شفاف پانی کی جھیل' یوں لگ رہی تھی' جیسے سفید سونے کی انگوٹھی میں سیال زمرد کا نگینہ......!

فطرت کا یہ شاہکار سطح سمندر سے تقریباً چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر تھا۔

جھیل میں سفید اور سبز برف کے بڑے بڑے تودے تیر رہے تھے۔ سفید تودے پکی برف کے تھے جن میں پانی جذب نہیں ہو سکتا تھا اور سبز تودے کچی برف کے تھے جن میں جھیل کا سبز پانی جذب ہو جاتا تھا اور ان تودوں کا رنگ دور سے سبز نظر آتا تھا۔

جس سمت ہم کھڑے تھے' وہاں ایک کٹاؤ سے جھیل کا پانی آبشار کی شکل میں گر رہا

تھا۔ یہ منظر بھی دیدنی تھا......

اسی کے خوبصورت سیاہ بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ اس نے کالی عینک اتار لی تھی اور وہ نیم مدہوشی کی کیفیت میں' نیم وا آنکھوں سے جھیل اور جھیل سے آگے دودھیا پہاڑوں کو دیکھ رہی تھی۔

عاطف نے ہولے سے کہا......

"تو یہ جھیل سیف الملوک ہے!"

"ہاں...... یہیں بدری جمالہ پری نہانے آیا کرتی تھی اور شہزادہ سیف الملوک کے عشق میں گرفتار ہو گئی تھی۔"

عاطف نے جذبے سے کہا......

"جو لوگ ہماری طرح پریوں کے وجود پر یقین نہ رکھتے ہوں' یہاں آ کر ایک بار تو ڈگمگا جائیں گے اور دل میں سوچیں گے کہ واقعی یہ پریوں کے نہانے کی جگہ ہے!"

اسی نے ہماری باتوں میں حصہ نہ لیا۔ وہ چپکے سے کھسک کر نیچے جھیل کی طرف چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد عاطف بھی چلا گیا...... میں وہیں چٹان سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

مجھے وہ ہٹ بری طرح کھل رہا تھا جو جھیل کے مغربی جانب اکیلا ایستادہ تھا۔ انسانی ہاتھوں کی بنی ہوئی یہ مصنوعی چیز فطرت کے اس حسین منظر کا جزو بنتا مجھے گوارا نہیں تھی۔

میں نیچے جھیل کی طرف بھی اس لئے نہ گیا کہ جھیل کے پانی کو چھونا نہیں چاہتا تھا...... سوچ رہا تھا کہ اگر میں نے اس پانی کو چھو لیا' تو میرا خواب بکھر جائے گا اور یہ منظر حقیقت میں بدل جائے گا اور اس مقدس پانی کی تقدیس ختم ہو جائے گی۔

گو یہ جذباتی رویہ تھا......

لیکن میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ ایسا شفاف نیلا آسمان میں نے پہلی بار دیکھا تھا اور روح کو تجسیمی دینے والا منظر اور آتما کو شانت کر دینے والی ہوائیں میں نے پہلی بار محسوس کی تھیں......

میں نے ڈاور کے پہاڑ پر بھی باد شمال کے نشیلے جام پئے تھے۔ میں نے اوگی کے زین

جیسے ہوائی درے میں بھی ٹھنڈی ہواؤں کا مزہ چکھا تھا' لیکن جھیل سیف الملوک کے پانیوں کو چھو کر آنے والی ہوائیں روح کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر چکی تھیں۔

ایک پری کے وجود کے تصور کی خوشبو اور اس کے شہپروں کی پھڑپھڑاہٹ کے کو سنگیت اور اس کا انسان جیسے جذبوں سے بھرپور اور سرشار دل اور محبت کی تب و تاب سے بے قرار روشن آنکھیں......

میں بدری جمالہ کو کہیں اپنے آس پاس محسوس کر رہا تھا.....!

میں چٹان سے ٹیک لگائے نیم دراز اس فردوسی منظر کا ایک ایک لمحہ اپنے وجود میں جذب کر رہا تھا۔

اب کچھ یورپین جوڑے بھی اوپر آ گئے تھے۔ میرے قریب سے گزرتے' ایک اچٹتی نگاہ ڈالتے اور آگے چل دیتے......

کچھ دیر بعد سکاؤٹوں کا ایک دستہ اوپر آ گیا۔ ان پاکستانی بچوں کو یہاں دیکھ کر مجھے مسرت ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ بچے چاروں طرف پھیل گئے۔ جھیل کے مغربی اور شمالی کناروں پر اب ہلچل کا سماں بندھ گیا تھا۔

دو بجے تک وہاں اور بھی بہت سے لوگ آ گئے۔ ان میں ملکی اور غیر ملکی ہر طرح کے لوگ تھے۔

ہوا میں خنکی کی شدت بتدریج بڑھ رہی تھی۔ مجھے کھدر کے کرتے اور پاجامے میں سردی محسوس ہونے لگی...... مجھے امل کا بھی خیال آ رہا تھا۔ وہ سفید ریشمی قمیص اور پتلون پہنے ہوئے تھی۔

میں نے گھوڑے والے سے سردی کی شکایت کی' تو اس نے جھٹ تھے کھول کر کے نیچے سے خاکی کاٹنی کمبل نکال کر مجھے پکڑا دیا۔ کمبل اوڑھ کر مجھے اطمینان سا محسوس ہوا۔

عاطف نے اوپر آ کر کھانے کے لئے پوچھا..... میں نے نفی میں سر ہلایا' تو وہ پڑا۔

"عجیب دیوانوں سے واسطہ پڑا ہے۔ امی بھی مدہوش ہے اور خاموش ایک پتھر پر بیٹھی سوچوں میں ڈوبی ہوئی ہے.....!"

اور پھر گھوڑے والے سے تھرماس لے کر اس نے کافی کا ایک کپ مجھے پکڑا دیا۔ میں نے تشکر آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا..... یخ بستہ ہواؤں میں کافی کے ایک کپ نے وسکی کی پوری بوتل کا کام کیا......

گھوڑے والے سے کہہ کر ایک کمبل میں نے امل کو بھی بھجوایا...... عاطف پھر غائب ہو گیا۔ میں اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا بلکہ وہیں لیٹ گیا......

اب تقریباً پانچ بج رہے تھے۔ امل آہستہ آہستہ اوپر آ رہی تھی۔ میں نے دیکھا' اس کی پتلون کے پائنچے گیلے تھے۔ وہ کمبل اوڑھے ہوئے تھی۔ اس کے زرد گال ہلکے ہلکے گلابی ہو رہے تھے اور اس کے ہونٹوں کا رنگ گہرا ہو گیا تھا۔ اس کے خوبصورت سیاہ بالوں کی لٹیں اس کے رخساروں سے کھیل رہی تھیں اور اس کی آنکھوں کی وحشت میں قدرے کمی آ گئی تھی۔ وہ خاموشی سے میرے قریب بیٹھ گئی۔ چند لمحے بعد بولی۔

"میرا دل چاہتا ہے' رات یہیں گزاری جائے۔ میں چاندنی رات میں اس جھیل کو دیکھنا چاہتی ہوں۔"

میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا.....

"سیف الملوک کی روح اب یہاں نہیں آتی..... آپ دیکھتی ہیں یہاں ہٹ بن گئے ہیں۔ جھیل کے کناروں پر ہزاروں قدموں کے نشان ملتے ہیں۔ رات کو ہٹ کے چوکیدار کے خراٹوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس اودھم میں یہاں کون آتا ہے!"

امل ہنس پڑی۔

"واہ.....! آپ نے تو پوری طرح محسوس کیا ہے۔ جبھی آپ نیچے نہیں آئے۔ ٹھیک ہے۔ کبھی کبھی جذباتی ہو جانے میں کوئی حرج نہیں!!"

عین اس وقت گھوڑے والے نے ٹانگ اڑائی۔

"صاحب' واپسی کا وقت ہو گیا ہے۔ تھوڑی دیر میں بہت سردی ہو جائے گی۔ اندھیرا

ہونے سے پہلے پہلے ہوٹل پہنچ جانا چاہیے۔"

امثل نے اس کی طرف دیکھا۔

"بھئی گھوڑے والے' ہم روز روز یہاں نہیں آئیں گے۔ جھیل سیف الملوک رات نہیں گزار سکتے' لیکن سورج غروب ہونے کا نظارہ تو کر سکتے ہیں۔"

گھوڑے والا ایک دم نرم پڑ گیا۔

"بی بی جی' ہمیں آپ کی تکلیف کا خیال ہے' ورنہ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ سورج تھوڑی دیر میں غروب ہو جائے گا۔ یہ پہاڑی سورج ہے۔ بہت جلد آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔"

گھوڑے والے کا خیال ٹھیک تھا۔ بہت سے لوگ واپس جا چکے تھے اور باقی جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اگر ہمارے پاس بستر ہوتے تو بست میں رات بھی گزاری جا سکتی تھی۔ عاطف آ گیا...... تو ہم اس پہاڑی پر آ گئے' جہاں سے ناران کی وادی اس طرح نظر آ رہی تھی' جیسے چاندی کے سفید پیالے میں سبز رنگ کے نقش و نگار بنائے گئے ہوں۔

سورج کا سرخ تھال' برف کی دودھیا چوٹیوں میں غروب ہونے والا تھا۔ جس پہاڑ کی چوٹی پر ہم کھڑے تھے' وہاں سے سامنے پہاڑ کا نظری فاصلہ بہت کم تھا۔ یوں لگ رہا تھا' اگر ہم تھوڑی سی کوشش کریں تو غروب ہوتے ہوئے سورج کے سرخ تھال کو چھو لیں گے...... ہم میدانوں کے رہنے والے دور افق میں غروب ہونے والے سورج کے عادی تھے۔ بھلا ہم نے ایسا دلفریب نظارہ کاہے کو دیکھا ہو گا...... یہی نہیں بلکہ عین اس وقت جب آفتاب غروب ہو رہا تھا' دودھیا چوٹیوں میں سے ماہتاب طلوع ہو رہا تھا...... حسین اتفاق شاید ہمارے لئے مقدر ہو چکا تھا......

شام کے ان سرمئی لمحوں میں آفتاب و ماہتاب کی آنکھ مچولی پر سیف الملوک اور بدری جمالہ کے اختلاط کا گماں ہو رہا تھا......!

یہ وہ لمحے تھے کہ فطرت نے اپنی نوازشیں ہم پر نچھاور کر دی تھیں اور ہمارے دل مسرت و تشکر کے جذبات سے معمور تھے۔

عاطف تعریف کرنے لگا' تو امثل نے اسے ٹوکا۔

"بھائی جان تعریف نہ کریں۔ تعریف جیسا بے بس لفظ ان لمحوں کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ آگے دیکھو یا پیچھے بس دیکھتے رہو۔ یہ محسوسات کی دنیا ہے۔ لفظوں کی زمین نہیں۔ اناڑین سیاح ہو یا کوئی دوسرا' کوئی یہ قدرت نہیں رکھتا کہ فطرت کی ان بوقلمونیوں کو آپ کی روح تک پہنچا سکے۔ ہماری صلاحیت صرف یہ ہے کہ یہاں تک پہنچ گئے۔ اب آگے اپنی آتما کی اہلیت ہے کہ اسے کہاں تک جذب کرتی ہے!"

امثل نے نہایت خوبصورت اور معقول بات کہی تھی...... یہاں آکر ہر آدمی اپنے ظرف کے مطابق متاثر ہوتا تھا۔ مجھے یقین ہے ہم تینوں کا تاثر بھی مختلف ہو گا۔

سورج ڈوب گیا تھا۔ ہم گھوڑوں پر بیٹھ گئے تھے۔ ہم نے آخری بار جھیل سیف الملوک کی طرف دیکھا۔ شام کے سرمئی اندھیروں میں اس کے پانیوں کا رنگ کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔ اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے برف پوش پہاڑ کچھ اور پراسرار ہو گئے تھے۔ آبشار اسی بے کلی اور بے قراری سے نیچے گر رہی تھی...... میں سوچ رہا تھا۔ فطرت کا یہ بے مثل شاہکار' کتنے لاکھوں سالوں سے' کتنے کروڑوں سالوں سے زمین کے سینے پر ثبت ہے' مگر اس کے رنگ پھیکے نہیں پڑے۔

آبشار سے گرتے ہوئے پانیوں کا عمل صدیوں سے جاری و ساری ہے۔ یہ خوبصورت' بے پناہ نقش کیسے تخلیق ہوا تھا اور کیونکر اس کا نام جھیل سیف الملوک پڑا تھا' کوئی نہیں جانتا...... لیکن ایک بات عیاں ہے کہ اس کے مضطربانہ رویے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کا پانی رواں دواں ہے۔ انسان کی طرح مضطرب اور بے چین ہے۔ انسان کی طرح منزل کے لئے سرگرداں ہے۔ صدیاں گزر گئیں' اس کے سوتے خشک نہیں ہوئے۔

اب جدائی کی گھڑی آ گئی تھی۔ آج کے دن کے ہم آخری مسافر تھے' جو جھیل سیف الملوک کو الوداع کہہ رہے تھے۔ میں نے امثل کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بیک وقت سرشاری' ربودگی اور شکستگی تھی۔

یہ عجیب کیفیت تھی۔ ہم ایک ایسے دوست سے الگ ہو رہے تھے' جس کی جدائی کا

گہرا غم بھی تھا اور اس کی شخصیت کی سرخوشی بھی ہمارے سینوں میں محفوظ تھی۔

غم اور خوشی کے اس امتزاج میں ایک عجب طرح کا کیف اور انوکھی قسم کی بے چینی تھی۔ ٹوٹتے ہوئے دلوں کے ساتھ ہم نے نگاہیں موڑ لیں۔ گھوڑوں نے سنبھل کے اترنا شروع کیا۔

جب ہم نیچے گلیشیئر کے پاس پہنچے تو دائیں ہاتھ کے پہاڑ کی چوٹی تک پھیلی ہوئی برف پر دو آدمی ایک عمودی چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ ہمیں حیرت ہوئی۔ دور سے دونوں آدمی بالکل معلق دکھائی دے رہے تھے اور ابھی انہوں نے دو میل مزید چڑھائی چڑھنا تھی۔

ہمارے استفسار پر گھوڑے والے نے بتایا۔

"یہ کوہستانی لوگ ہیں۔ پہاڑ کے اس طرف ان کے گھر ہیں۔ یہاں سے چڑھنا اترنا ان کا روز کا معمول ہے......"

ہم نے دل ہی دل میں اس انوکھی مخلوق کو داد دی۔

چاند اب خاصا اوپر آ گیا تھا۔ پوری وادی منور ہو چکی تھی۔ یہ عجیب سماں تھا۔ اوپر روشن چاند اور نیچے شفاف برف سے پھوٹتی ہوئی کرنیں۔

یہ وادی طلسمات تھی...... اگرچہ یہاں کوئی سامری نہیں تھا۔

بائیں ہاتھ پر دو چٹانوں کے بیچ میں ایک مختصر سا جھونپڑا تھا۔ وہاں دیا جل رہا تھا...... مٹی کا یہ دیا انسان کی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔

عاطف تمسخرانہ لہجے میں بولا......

"شاید اس جھونپڑے میں بدری جمال اور سیف الملوک اپنے بچوں کے ساتھ رہ رہے ہیں!"

امل ہنس پڑی...... "ٹھیک کہتے ہیں بھائی جان...... انسان خوابوں کو زندگی سے الگ نہیں کر سکتا۔"

تقریباً آٹھ بجے ہم ہوٹل پہنچ گئے۔ کمرہ گرم تھا۔ انگیٹھی میں آگ جل رہی تھی۔ ہم کرسیاں کھینچ کر آگ کے قریب بیٹھ گئے۔ مجھے اطالین سیاح یاد آ گیا...... جو ایک ماہ اس

انتظار میں گزارے گا کہ گلگت جانے والی سڑک صاف ہو جائے اور وہ سفر شروع کر سکے۔

صبح آنکھ کھلی۔ انگڑائی لے کر اِدھر اُدھر دیکھا...... عاطف سو رہا تھا' لیکن امل کا پلنگ خالی تھا۔ کمبل اس طرح پڑے تھے' جیسے ابھی ابھی بستر سے اٹھی ہو۔

باتھ روم کا دروازہ بھی بند نہیں تھا۔ البتہ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ سوچا شاید لان میں ٹہل رہی ہو۔

میں رات کے کپڑوں میں ہی باہر نکل آیا لیکن امل نہیں تھی۔ ہوٹل کی پچھلی طرف گیا۔ چاروں طرف اچھی طرح جائزہ لیا' مگر امل نہ ملی...... باورچی خانے کی طرف دوڑا' خانساماں سے پوچھا' بیروں سے دریافت کیا' مگر سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

واپس کمرے میں آیا۔ عاطف کو اٹھایا۔ ساری صورت حال جان کر عاطف بالکل بوکھلا گیا۔ دریائے کنہار کی مچلتی لہروں کا شور' صبح کے سکوت میں برابر کمرے تک پہنچ رہا تھا۔ ہوٹل کے سارے ملازم ہمارے کمرے کے باہر جمع ہو گئے۔ سب سرگوشیاں کر رہے تھے اور مختلف چہ میگوئیاں' ایک گھنٹے سے تو یہ سب لوگ جاگ رہے تھے۔ اس عرصے میں وہ باہر نہیں نکلی۔ اس کا مطلب ہے وہ رات کو یا صبح تڑکے' جب سب لوگ سو رہے تھے' باہر گئی ہوگی۔ یہ سوال بڑا ٹیڑھا تھا......

میں اور عاطف بوکھلائے ہوئے رات کے کپڑوں میں ایک بیرے کو ساتھ لے کر بازار کی طرف دوڑے۔ ایک ہوٹل میں چند آدمی بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ بیرے سے امل کے متعلق پوچھا تو لاعلمی کا اظہار کیا۔ ہم آگے بڑھے۔ دس قدم گئے تھے کہ ہوٹل والے نے آواز دی۔ معلوم ہوا کہ جو لڑکا تڑکے آگ جلانے اٹھا تھا...... اس نے اس لڑکی کو اوپر کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

لڑکے کے ہاتھ میں دھلی ہوئی پیالیاں تھیں۔ ہم نے امل کا حلیہ بیان کیا تو اس نے تائید کی۔ پانچ منٹ میں ہم اس پل پر پہنچ گئے جہاں سے جھیل سیف الملوک کی طرف کچی سڑک مڑتی ہے۔ یہاں ہمیں امل کے پاؤں کے نشان مل گئے۔ وہ رات کے سلیپر پہنے ہوئے تھی۔

یہ نقش پا جھیل سیف الملوک کی طرف جا رہے تھے...... ہماری جان میں جان آگئی۔ ہیرے کو واپس کیا اور ہلکی ہلکی دوڑ شروع کر دی۔ ہمارا خیال تھا کہ راستے میں جا لیں گے فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ کے بعد پاؤں کے نشان دیکھ لیتے اور ہماری ڈھارس بندھ جاتی عاطف کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا اور اس کا سانس پھول گیا تھا' مگر وہ ہمت نہیں ہارا تھا۔ جب وہ دور رہ جاتا تو میں اس کے لئے رک جاتا۔ میرے پاس پہنچ کر وہ چھوٹی چھوٹی سانسیں لیتا اور رحم طلب نگاہوں سے دیکھتا...... دم لے کر وہ پھر دوڑ پڑتا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ ہمیں کہتی' تو کیا ہم اسے دوبارہ وہاں نہ لے جاتے......؟

یقیناً ہم اس کی مرضی کے تابع تھے۔ پھر اسے یوں تنہا' ڈرامائی انداز میں جانے کی کیا ضرورت تھی......؟

دوسرے میل پر ہم اچانک رک گئے...... ایک کالا کتا بھونکتا ہوا ہماری طرف لپکا۔ دو عورتیں جھونپڑے کے نزدیک زمین پر بیٹھی ہنس رہی تھیں۔ ان میں سے ایک امثل تھی...... جو ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں بلا رہی تھی۔

عاطف اور میں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا...... یہ وہی جھونپڑا تھا جس میں گزشتہ شام دیا جل رہا تھا۔ اور بقول عاطف...... اس جھونپڑے میں سیف الملوک اور بدری جمالہ رہتے ہوں گے......

بدری جمالہ کے چمکارنے پر کتا دم ہلاتا ہوا واپس چلا گیا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ امثل بچوں کی طرح خوش تھی اور ہنس رہی تھی۔ مکئی کی روٹی اس کے سامنے رکھی ہوئی تھی...... روٹی پر مکھن کا پیڑا جما ہوا تھا اور وہ مزے سے کھا رہی تھی۔

توا گرم تھا۔ اس کے نیچے دیودار کے ٹکڑے جل رہے تھے اور اس سے بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ بدری جمالہ نے مکئی کی ایک موٹی روٹی توے پر ڈال دی۔

بدری جمالہ مسکرا رہی تھی۔ اس کی عمر تیس بتیس کے لگ بھگ ہو گی۔ ایک بچہ اس کی گود میں تھا اور چار پانچ سال کے دو بچے اس کے قریب بیٹھے ہوئے ہمیں کنکھیوں سے دیکھ رہے تھے۔

امثل بولی......

"بھئی بیٹھو نا۔ یہ روٹیاں آپ کے لئے پک رہی ہیں۔"

ہم دونوں چپ چاپ بیٹھ گئے۔ ہم حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ امثل کا رویہ ایسا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ہمیں خاموش دیکھ کر ہنس پڑی۔

"بھائی جان' صبح سویرے آنکھ کھلی تو یہ جھونپڑا یاد آ گیا...... بس میرا دل مچل گیا اور اس عورت سے ملنے کے لئے بے قرار ہو گئی۔ یہ بدری جمالہ نہیں بھائی جان' مائی حوا ہے۔ مائی حوا اسی طرح جنگلوں میں آدمؑ سے ملی ہو گی...... میں اپنی ماں سے ملنے آئی تھی......!"

Love it.

میں نے ہنس کر پوچھا۔

"تمہارے ابا کہاں چلے گئے......؟"

"ابا جی عجب نکلے۔" امثل نے جواب دیا...... "مجھے دیکھ کر شرما گئے۔ مائی حوا سے دوباتیں کیں اور چلے گئے۔ اب شام سے پہلے نہیں آئیں گے۔ جب دیا جلے گا تب آئیں گے۔"

اتنی دیر میں مائی حوا نے مکئی کی دو روٹیاں اور ان پر مکھن کے پیڑے رکھ کر ہمارے سامنے رکھ دیئے...... مجھے وہ گوجر عورت یاد آ گئی جو کسی پچھلے پڑاؤ پر اپنے خاوند اور بچوں میں کھانا تقسیم کر رہی تھی۔

مائی حوا کی آنکھیں نیلگوں تھیں۔ اس کا رنگ حوادث زمانہ کے ہاتھوں سنولا گیا تھا...... وہ بھاری بھرکم کپڑوں میں ملبوس تھی اور اپنی عمر سے زیادہ ڈھل گئی تھی لیکن گود میں سوئے ہوئے بچے کی حفاظت اس طرح کر رہی تھی' جیسے اس کی آغوش میں کوئی پیغمبر پروان چڑھ رہا ہو۔

امثل بولی......

"میں نے اس سے بڑی دلچسپ باتیں کی ہیں۔ اس نے پہلا بچہ خاوند کی مدد سے جنا تھا' لیکن باقی تین بچے جنتے وقت اس کے پاس کوئی نہیں تھا۔ اس کا ایک بچہ اور بھی ہے'

وہ باپ کے ساتھ چلا گیا ہے۔ ہسپتال' نرس' دائی اس کے لئے حرف غلط کی حیثیت رکھتے ہیں۔۔۔۔ ایک بچہ جھونپڑے میں' ایک بھیڑیں چراتے ہوئے اور ایک ندی کے کنارے کپڑے دھوتے ہوئے پیدا ہوا تھا۔۔۔۔ تھوڑی سی تکلیف کے بعد بالکل قدرتی انداز سے یہ سب کچھ ہوا تھا۔ اور جب شام کو دیا جلے اس کا شوہر واپس آتا تھا' تو پہلے اسے دودھ پلاتی تھی۔ اس کے بعد ایک نئی جان کے جنم کی خوشخبری سناتی تھی۔ تب شوہر اسے گلے لگاتا تھا اور پھر بچے کے کان میں اذان دیتا تھا۔ کیوں ہے نا یہ عورت ملکی حوا۔۔۔۔!"

امل نے جو کچھ کہا۔۔۔۔ واقعی حیران کن تھا۔ ہم بے حد عقیدت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ امل نے مزید کہا۔

"یہ عورت بالا کوٹ سے آگے نہیں گئی۔ وادی کاغان سے سو ڈیڑھ سو میل کے علاقے میں اس نے زندگی گزاری ہے۔ ماں باپ مر چکے ہیں۔ ایک بہن ہے۔ اس کی بھی شادی ہو چکی ہے۔ تین بچے اس کے بھی ہیں۔۔۔۔ شوہر اور بچوں اور مال مویشی کے علاوہ اس کی زندگی میں اور کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بلکہ وہ سرے سے جانتی نہیں کہ ان کے بغیر بھی زندگی میں کچھ ہوتا ہے۔۔۔۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ شوہر سے محبت کرتی ہے' تو شرما گئی۔ پھر کہنے لگی ہم ایک دوسرے کے سچے ہمدرد ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے بچھڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہمارے بچوں کو ہم دونوں کی ضرورت ہے۔۔۔۔ خاوند کا رشتہ ایسا ہوتا ہے' جس میں بھائی اور باپ کا روپ بھی ہوتا ہے!"

"آپ نے اس سے یہ بھی پوچھا کہ اس نے کسی سے محبت بھی کی ہے یا نہیں؟"

میں نے امل سے کہا۔۔۔۔

"میں نے اس سے پوچھا ہے۔" امل بولی۔۔۔۔ "یہ کہتی ہے کہ بچپن میں ایک لڑکے سے میری منگنی ہو گئی تھی۔ اس کے تصور میں ہمیشہ کھوئی رہتی تھی اور جیتے جیتے خواب دیکھا کرتی تھی۔ پھر اچانک وہ لڑکا ایک حادثے میں مر گیا اور میرا دل ٹوٹ گیا' لیکن جب میری شادی اس آدمی سے ہو گئی تو میرے گھاؤ بھر گئے اور مجھے پتہ لگا کہ دنیا میں پیار بھرے دلوں کی کمی نہیں ہوتی۔ اس آدمی نے مجھے کبھی پھول سے بھی نہیں مارا اور نہ

نے کبھی اس کی آنکھوں میں نفرت دیکھی ہے۔۔۔۔ یہ دنیا تو بہت بڑی ہو گی لیکن اس علاقے میں مجھ جیسی سکھی عورت دوسری نہیں ہو گی!"

میں نے ہنس کر کہا۔

"آپ اسے کہتیں' آپ کے لئے بھی دعا کرتی۔"

"ہاں ہاں۔۔۔۔ اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میری شادی ہوئی ہے یا نہیں؟ جب میں نے کہا شادی میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے" تو مجھے بہت دیر تک سمجھاتی رہی کہ شادی کے بغیر عورت مکمل نہیں ہوتی۔ مرد کے بغیر جیون سکھ نہیں ملتا۔ سولہ برس کی عمر میں میری شادی ہو گئی تھی اس لئے مجھے زیادہ عرصہ کنواری رہنے کا تجربہ نہیں ہے۔ لیکن شادی کا تجربہ کر کے میں سمجھتی ہوں کہ اس کے بعد کسی تجربے کی ضرورت نہیں رہتی۔۔۔۔ کنواری رہنا تو ایک عذاب ہے' بلکہ شاید گناہ بھی ہے" اس لئے بی بی شادی کر لو۔ بہت سکھ پاؤ گی۔"

عاطف نے کہا۔ "ہمارا کہنا تو مانتی نہیں ہو۔ ملکی حوا کی بات مان لو۔"

میں نے تائید کی۔۔۔۔

"واقعی اس عورت کی آنکھوں میں جو چین اور سکون ہے" شاید ہی کبھی دیکھنا نصیب ہوا ہو۔"

امل تردیدی لہجے میں بولی۔۔۔۔

"اس سیدھی سادی عورت نے اپنے شوہر کے سوا دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے۔۔۔۔ اس نے شہروں کا دل ہلا دینے والا ٹریفک نہیں دیکھا۔۔۔۔ اس نے دن رات چنگھاڑتی ہوئی مشینوں اور کارخانوں کا شور نہیں سنا۔ اس نے ٹیکسیوں کے تیز رفتار میٹر نہیں دیکھے۔ اس نے آقا اور غلام کی تاریخ نہیں پڑھی۔ اس نے مالک اور مزدور کا فاصلہ نہیں دیکھا۔ اس نے دوستوں اور بھائیوں کے سلوک نہیں دیکھے۔ اس نے وکیلوں کی دھاندلیاں اور کچہریوں کی بے نیازیاں نہیں دیکھیں' اس نے اہلکاروں کی طمع بھری آنکھیں اور افسر شاہی کی رعونت نہیں دیکھی' اس نے مشینی دور کا لالچی مسیحا نہیں دیکھا' اس نے بلکتے ہوئے

بھوکے بچے نہیں دیکھے۔ اس نے بازار کی عورت نہیں دیکھی۔ اس نے اجلے کپڑوں
اندر سیاہ دل نہیں دیکھے۔ اس نے انسان کے ہاتھوں انسان کا کٹنا نہیں دیکھا۔ اس
مسلمان کو مسلمان کا خون پیتے نہیں دیکھا...... اس بیچاری نے اپنے شوہر کے سوا
ہی کیا ہے...... نہ ایٹم اور ہائیڈروجن بم کی دہشت' نہ میراج اور فینٹم کی دل ہلا دے
والی گڑگڑاہٹ' نہ سائرن نہ جنگ...... اس نے کاغان کی سرسبز و شاداب وادی دیکھ
ہے۔ جھرنوں سے رم جھم کرتا ہوا ٹھنڈا پانی پیا ہے۔ معصوم بھیڑوں کی قربت دیکھی۔
اور ایک سادہ دل شوہر کی محبت' لائی حوا بے چاری کیا جانے کہ میں کس دور کی بیٹی ہوں
میں نے کونسی صدی میں جنم لیا ہے اور میرے سینے میں کتنے خوف چھپے ہوئے ہیں؟؟؟"

وہ عورت بڑی سادگی سے امثل کی باتیں سن رہی تھی' جو اس کی سمجھ سے بالا
تھیں۔

چھوٹا بچہ جاگ اٹھا تھا اور ماں کی گود میں لیٹے لیٹے حیرت سے اجنبیوں کو دیکھ رہا تھا
ایسا لگتا تھا کہ وہ ابھی اٹھ کر کہے گا۔

"آدم بو' آدم بو......!"

لیکن اگلے لمحے ماں نے اسے بھاری بھر کم قمیص کے نیچے چھپا دیا اور پستان اس کے
منہ میں ڈال دیا...... بچہ چپڑ چپڑ دودھ پینے لگا۔ امثل بولی۔

"میں اس کی خوشی کے اسباب جانتی ہوں' لیکن یہ میرے دکھوں کو سمجھنے کی صلاحیت
نہیں رکھتی...... یہ بے چاری کیا جانے گی۔ میں تو خود اپنے آپ کو نہیں پہچانتی۔ میں
اس لئے یہاں آگئی تھی کہ غار کے زمانے کے چند صدیوں بعد کے انسان کو دیکھنا چاہتی
تھی اور موجودہ مہذب انسان سے اس کا موازنہ کرنا چاہتی تھی...... ایک کے مسائل
کتنے کم ہیں اور دوسرے کے مسائل کتنے زیادہ...... یہ میاں بیوی سماج کے دباؤ اور خود
ساختہ آدرشوں کے بوجھ سے آزاد ہیں۔ نہ ان کی سائیکل کا پہیہ پنکچر ہوتا ہے اور نہ ان کی
موٹر کا شیشہ ٹوٹتا ہے۔ نہ ہمسائے کے گھر کی چوری کی خبر سنتے ہیں اور نہ کسی معصوم لڑکی
کی عصمت لٹنے کی خبر پڑھتے ہیں۔ نہ ٹیلیفون سے بھاؤ گرنے کی خبر سنتے ہیں اور نہ منڈی

کی اونچ نیچ سے متاثر ہوتے ہیں۔ نہ سیلابوں اور طوفانوں سے ہزاروں آدمیوں کی ہلاکت
کی خبریں سنتے ہیں اور نہ جنگ کی فتنہ سامانیوں سے واقف ہوتے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں
کوئی الجھن' کوئی کشمکش' کوئی جھنجھلاہٹ نہیں ہوتی۔ ان کے اعصاب پر کوئی دباؤ نہیں
ہوتا۔ ان کے سینوں میں کوئی لاوا نہیں ابلتا...... یہ سیدھے سچے لوگ ہیں۔ انہوں نے
انسان سے انسان کی نفرت نہیں دیکھی۔ یہ بھیڑوں اور گائیوں کا دودھ پیتے ہیں اور اپنے
بھولے بھالے مویشیوں کا سا رویہ رکھتے ہیں...... افسوس...... کہ ہم ان سے بہت دور
نکل گئے ہیں......!"

میں نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا......

"آپ افسوس نہ کریں۔ کسی دن یہ بھی ہمارے پیچھے پہنچ جائیں گے۔"

"وسیم صاحب......!" امثل سنجیدگی سے بولی...... "وہ دن ان کی بدقسمتی کا دن ہوگا
جب اقوام متحدہ کا ٹکٹ ان کے ہاتھ میں ہوگا اور امن کی فاختہ لے کر ساری دنیا گھوم
آئیں گے' لیکن ان کی آس پوری نہیں ہوگی۔ ٹوٹے ہوئے دلوں کا یہ آخری سفر ہوگا!"

"امثل...... جو کچھ آپ کہتی ہیں' شاید سچ ہی ہو' لیکن میں اس حقیقت کو کیسے نظر
انداز کروں...... یہ جو سچائی سامنے بیٹھی ہے' یہ عورت۔ میں اسے عورت نہیں ماں
کہوں گا' جس نے اپنا پستان ہم سب کے سامنے بچے کے منہ میں دے دیا ہے۔ کتنی گہری
ریاضت میں مصروف ہے۔ یہ سچائی کا کتنا عظیم اظہار ہے...... ماں! وہ عظیم ہستی' جو
انسانیت کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ لاکھ ہائیڈروجن بم پھٹیں۔ یہ دنیا رہے نہ رہے۔
ماں اپنے پستان بچے کے منہ سے الگ نہیں کر سکتی۔ ہر چیز فنا ہو جائے گی' ممتا باقی رہے
گی۔"

امثل نے کوئی جواب نہ دیا۔ بچہ دودھ پی کر ہنس رہا تھا اور امثل کی طرف ہمک رہا تھا۔
امثل نے ہاتھ آگے کئے تو وہ گیلے آٹے کی طرح اس کے ہاتھوں میں ڈھیر ہو گیا۔ امثل نے
اسے سینے سے لگا لیا اور اس کے نرم نرم شگفتہ گالوں کو چوما۔ بچہ اپنے نرم نرم' نازک
نازک ہاتھوں کے تیز ناخنوں سے امثل کے رخسار اور ہونٹ نوچنے لگا۔

دوسرے دونوں بچے شرما شرما کر ہنس رہے تھے۔ بچے کی ماں فخر و غرور اور ایک ہ
بے نیازی سے محظوظ ہو رہی تھی۔ اس کی تمکنت دیدنی تھی۔

اس عورت کو اپنی محدود دنیا کی ساری مسرتیں اور محبتیں حاصل تھیں۔

عاطف کو بھی یہ بہت اچھا لگ رہا تھا اور وہ خوش تھا۔۔۔۔۔ امثل بچے کو دونوں ہا
میں اچھالنے لگی۔ وہ کھٹ کھٹ ہنسنے لگا۔۔۔۔ اس کی یہ بے ساختہ اور معصومانہ غوغ
کسی اور ہی دنیا کی سرگم تھی۔

کافی دیر تک بچہ اور امثل کھیلتے رہے۔ کان کٹا کتا سامنے کی دونوں ٹانگیں آگے
طرف لمبی کر کے چوکس بیٹھا تھا اور دوستانہ انداز میں دم ہلا رہا تھا۔

جھونپڑے سے دس قدم پر وہ ندی انتہائی برق رفتاری سے بہہ رہی تھی، جو جھیل
سیف الملوک کے پانیوں سے عبارت تھی۔۔۔۔ بچے کی نظر ماں پر پڑی، تو وہ ماں کی طرف
لپکنے لگا۔

ماں نے ہنس کر اسے اٹھالیا۔

امثل ہماری طرف متوجہ ہوئی۔

"آپ نے یہ جھونپڑا اندر سے نہیں دیکھا۔ آیئے دیکھئے۔"

ہم نے باری باری جھک کر اندر جھانکا۔۔۔۔ بہت مختصر سامان تھا۔

موٹے اونی دھاگے کے بنے ہوئے چند کانائی کمبل ایک دوسرے پر تہہ کر کے ر
ہوئے تھے۔ ایک طرف گھی کا کنستر لٹک رہا تھا۔ جس میں بھیڑ بکریوں سے حاصل کیا
خالص گھی تھا۔ ایک رسی پر اس چھوٹے سے کنبے کے کپڑے لٹک رہے تھے۔

مٹی کے برتن، آٹے کی تھیلی اور فرش پر گھاس کی تہہ بچھی ہوئی تھی۔۔۔۔۔

امثل نے کہا۔۔۔۔

"بابا آدم اور مائی حوا جب زمین پر اترے ہوں گے، تو روزگار زندگی کا بالکل یہی اہ
ہو گا۔"

میں نے کہا۔۔۔۔

"گندم خوری کا احساس جرم بھی ان کے ساتھ زمین پر اترا ہو گا۔۔۔۔ لیکن اس جوڑے کو ایسا کوئی غم نہیں ہے اور میرا خیال ہے، ان کو عذاب قبر اور خوف دوزخ کی بھی فکر نہیں ہو گی۔۔۔۔ کیونکہ ان کو تو گناہ کے مواقع ہی میسر نہیں ہیں۔ شفاف پانی اور خالص دودھ پیتے ہیں۔۔۔۔ ملاوٹ کی اشیاء نہ ان کے ہاتھ لگی ہیں اور نہ ان کے خون تک پہنچی ہیں۔ اس لئے ظاہر کی طرح ان کا باطن بھی صاف ہے۔"

"وہ جو جنت ہے، شاید انہی لوگوں کے لئے ہو گی!" امثل نے کہا۔

مگر عاطف نے اتفاق نہ کیا۔ کہنے لگا۔

"ان کا رویہ زندگی کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ بن باس سے انسانی روح کا روگ تو دور نہ ہو گا؟"

امثل ہنس کر بولی۔

"رام چندر جی نے سیتا گنوا دی تھی، مگر سدھارتھ، نروان پا کر مہاتما بن گیا تھا۔ اس لئے آپ فیصلہ تو نہیں دے سکتے بھائی جان!؟"

"میں فیصلہ نہیں دے رہا، لیکن مہاتما نے جس شانتی کا پرچار کیا تھا، آدھی دنیا کے متاثر ہونے کے باوجود، وہ شانتی انسان کو نہ مل سکی۔۔۔۔ تین چوتھائی زندگی گیان دھیان اور تپسیا کی نذر کر کے، آدمی کو آدمی کے گلے لگانے کا کام ادھورا رہا۔"

عاطف کا یہ نیا رویہ دیکھ کر میں نے کہا۔

"انسان کی ازلی بدبختی کا الزام آپ بدھ کو کیوں دیتے ہیں؟"

"نہیں یہ الزام نہیں۔" عاطف نے تردید کی۔۔۔۔ "میں بدھ کی عظمت سے انکار نہیں کرتا۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب امن اور شانتی کی گنجائش ہی نہیں تھی تو یہ مہاتما، اوتار اور پیغمبر کیوں آگ میں جلتے رہے۔ کیوں بن بن پھرتے رہے۔۔۔۔؟"

امثل ایک چٹان پر بیٹھ گئی تھی اور مسکرا مسکرا کر عاطف کو دیکھ رہی تھی۔۔۔۔ آج اس کا کام بھائی انجام دے رہا تھا۔

میں نے اس کے موڈ کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا۔۔۔۔

"جس نے دنیا بنائی ہے' وہ ابھی مایوس نہیں ہوا۔"

امل ہنس پڑی۔۔۔۔۔۔

"جس نے دنیا بنائی ہے' وہ دانہ گندم کی سزا' ابد تک اولاد آدم کو دیتا رہے گا۔ اس نے صبر اور ترغیب کے جذبے ایک ساتھ ودیعت کئے تھے۔ انسان امتحان میں ناکام رہا' سزا بھی بھگتے!"

"قیامت آ جائے تو اچھی ہے۔" عاطف ہار کر بولا۔۔۔۔۔ "یہ روز روز کا عذاب تو ہو جائے گا۔"

"اس کی فکر تم آپ نہ کریں۔" امل بولی۔ "قیامت آئی کہ آئی' ایک دن آئے گا دنیا بڑی طاقتیں اس نتیجے پر پہنچ جائیں گی کہ ایشیا میں دو چار ہائیڈروجن بم گرانے ضرور ہیں۔ چالیس پچاس کروڑ آدمی مریں گے' تو سو سال تک جنگ کا خطرہ ٹل جائے گا اور آ کا اندیشہ بھی کم ہو جائے گا۔۔۔۔ کم از کم ہم لوگوں کو قیامت کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔۔۔۔ ایشیا اس بارے میں بہت خوش قسمت ثابت ہوگا۔"

امل کی یہ پیش گوئی الہام کی طرح میری روح میں اتر گئی اور میرا رواں رواں لر اٹھا۔ امل نے بات جاری رکھی۔

"یہ سب کچھ روپے کے لئے ہو رہا ہے نا۔۔۔۔۔ طاقت ور لوگ دنیا کو لوٹ لینا چاہتے ہیں۔ انہیں کون سمجھائے کہ انسان کی ضرورتیں بہت کم ہیں۔ ہمیں محض دولت کی خاطر زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ ان لوگوں کو دیکھو۔ یہ میاں بیوی اور چار بچے روپے کے ب زندہ ہیں' دودھ' دہی' گھی ان کی ہر چیز خالص ہے۔ کتنی کم ضرورتیں ہیں ان کی' لیکن کس قدر سکھی ہیں۔"

"ہاں۔۔۔۔۔ ہم بھی خوش رہ سکتے ہیں۔" میں نے اس کی تائید کی۔۔۔۔۔ "دولت کی ہوس ختم کر دیں' برتری اور ناموری کا خیال ترک کر دیں۔"

"ہاں ہاں۔۔۔۔۔" وہ بولی۔۔۔۔۔ "دولت کی خواہش شعوری ہے۔ ذہانت روپے کی خواہش کرتی ہے۔ کند ذہن آدمی روپیہ پیدا نہیں کر سکتا' لیکن وہ زندگی گزار سکتا ہے

جس طرح اس جھونپڑے کے لوگ!"

"گویا کند ذہن ہونا عین سعادت ہوئی نا۔۔۔۔۔؟" عاطف بولا۔

امل نہ جانے کس سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ اس نے عاطف کو کوئی جواب نہ دیا۔ میں اس لمحے سوچ رہا تھا۔۔۔۔۔ کاش مجھے روپیہ نہ ملتا' مگر امل مل جاتی۔ میں دنیا کے کسی غیر آباد علاقے میں جا کر آباد ہو جاتا۔۔۔۔۔ اور کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس دنیا میں صرف ہم دو ہی ہوتے اور کوئی انسان نہ ہوتا۔ نہ بڑھاپا ہوتا اور نہ بیماری ہوتی اور نہ افزائش نسل کا معاملہ آگے بڑھتا۔

امل اچانک چونکی۔ اس نے مضطرب نگاہوں سے باری باری ہم سب کی طرف دیکھا۔ وہ ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ پھر اس نے دھیرے دھیرے برفانی چوٹیوں کی طرف نگاہیں پھیر لیں۔

"بے چارا انسان۔۔۔۔۔!" وہ جیسے اپنے آپ سے بولی۔۔۔۔۔ "انسان تاریخ کا خام مال ہے۔۔۔۔۔ جس طرح انجن کو ایندھن کی ضرورت ہوتی ہے' فیکٹریوں اور کارخانوں کو خام مال کی' تب پروڈکشن ہوتی ہے اور مال تیار ہو کر نکلتا ہے' اسی طرح انسان بھی کاروبار حیات کے لئے خام مال کا کام دیتا ہے۔ کبھی تخت شاہی کے لئے اس کے کشتوں کے پشتے لگ جاتے ہیں۔ کبھی جمہوریت کی خاطر لاکھوں کی تعداد میں کٹ مرتا ہے اور کبھی بالشویزم کے لئے مرتا اور زندہ درگور ہو جاتا ہے۔ جرازم ایک فیکٹری ہے' جس کے لئے انسانی خون درکار ہوتا ہے۔ انسان تاریخ کے ہر دور میں خام مال کی طرح استعمال ہوا ہے!!"

عاطف چپ چاپ بمن کی طرف دیکھ رہا تھا اور میں پہلی بار تاریخ کے عفریت سے شدید طور پر خائف ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ ہم لوگ اپنی تمام تر ذہانت اور فراست کے باوجود زندگی کو سمجھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔ یہ بھید انوکھے ہوتے ہیں!

تھوڑی دیر ہم سب خاموش رہے۔ پھر عاطف بولا۔

"ہم تینوں رات کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ کیا خیال ہے ہوٹل واپس جانا ہے یا کچھ اور ارادے ہیں؟"

میں نے لقمہ دیا۔

"ہوٹل جا کر کپڑے بدلتے ہیں۔ آج پھر سیف الملوک چلیں۔۔۔۔۔"

"نہیں۔۔۔۔۔!" امثل نے تجویز رد کر دی۔۔۔۔۔ "ارادہ کر کے لطف حاصل کرنا قدرتی نہیں ہوتا۔ برف سے خون نہیں نچوڑا جا سکتا۔ مناظر لیموں نہیں ہوتے کہ انسان ان کا رس نچوڑ نچوڑ کر لطف اندوز ہوتا رہے۔ جس طرح دوسرے بوسے میں پہلے بوسے کی طرح گرمی نہیں ہوتی' اسی طرح کوئی منظر ایک بار دیکھنے کے بعد دوسری بار دیکھنے سے تجسس سے خالی ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے' جہاں آپ ہیں اور جو لمحہ آپ کے ساتھ ہے بس وہی آپ کا ہے۔"

میں ہنس پڑا۔۔۔۔۔

"آپ ہمیشہ اپنی مرضی ٹھونستی ہیں۔"

"ہرگز نہیں۔۔۔۔۔ آپ جانا چاہیں' تو میں کیوں روکوں گی۔ آپ بے شک چلے جائیں۔ میں تو آج اٹالین سیاح کے ساتھ ٹراؤٹ مچھلی پکڑوں گی!"

عاطف نے جھٹ میری طرف دیکھا۔ میں نے ہنس کر کہا۔

"یہ جو لمحہ ہے جس کا آپ ذکر کر رہی ہیں' ہم کیسے دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہمارا ہے؟"

"میں تو دعویٰ کر سکتی ہوں۔ دیکھئے۔ آج صبح مجھے اس جھونپڑے کا خیال آیا اور میں چلی آئی۔"

میں نے ہلکے پھلکے لہجے میں پوچھا۔

"فرض کیجئے' یہ غیر سماجی فعل ہوتا' تو بھی آپ یہی کرتیں؟"

"کمال ہے۔۔۔۔۔!" وہ حیرت سے بولی۔۔۔۔۔ "یعنی آپ مجھے اس قدر مجبور سمجھتے ہیں۔ اتنے دن ساتھ رہ کر بھی آپ نے صرف یہی پایا ہے!!"

"نہیں!" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں نے آپ کو کبھی مجبور نہیں پایا لیکن شاید میرے تحت الشعور میں یہ بات موجود ہے۔ پتہ نہیں میں کیوں چاہتا ہوں کہ آپ کو کم نہ کسی لمحے مجبور پاؤں۔"

"ارے بھئی چلو۔" عاطف گھبرا گیا۔۔۔۔۔ "میرے سامنے یہ الٹی سیدھی مت ہانکا کرو۔ خواہ مخواہ الجھن ہوتی ہے۔"

امثل ہنستے ہنستے کھڑی ہو گئی۔۔۔۔۔ مائی حوا اور اس کے بچے بھی کھڑے ہو گئے۔ کتا دم ہلا رہا تھا۔ امثل نے چھوٹے بچے کے گال پر چٹکی بھری' تو وہ بے ساختہ ہنسنے لگا۔ امثل نے اسے چوما۔ مائی حوا کا شکریہ ادا کیا اور جب رخصتی کے لئے ہاتھ بڑھایا' تو مائی حوا بے طرح شرمائی اور پھر بے ساختہ ہنس پڑی۔ اس نے امثل سے ہاتھ تو ملا لیا' لیکن اس طرح جیسے کسی اجنبی مرد سے ہاتھ ملا رہی ہو!

اس کی یہ ادا ہمیں بہت پیاری لگی۔

گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی یہ ملاقات تاریخ کا ایک باب تھا۔۔۔۔۔ راستے میں دیسی اور بدیسی لوگ پیدل اور گھوڑوں پر ملتے رہے۔ جھیل سیف الملوک کی طرف جانے والی یہ مخلوق ہمیں رات کے کپڑوں میں دیکھ کر ہنستی اور مسکراتی رہی۔

جب ہم ہوٹل پہنچے تو بیرے خانسامے اور دوسرے لوگ ہمیں حیرت اور خوشی سے دیکھ رہے تھے۔ اٹالین سیاح برآمدے میں کھڑا تھا۔ ٹراؤٹ مچھلی کے شکار کا سامان اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ہلکے سے تمسخرانہ تبسم کے ساتھ ہمیں دیکھ رہا تھا۔

امثل نے اس سے کہا۔

"اگر آپ تھوڑی دیر انتظار کر سکتے ہیں' تو ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں؟"

"مجھے نہایت خوشی ہوگی۔" سیاح نے جواب دیا۔

کپڑے بدلنے میں دس پندرہ منٹ لگے۔ امثل نے ہمیں بھی شکار کے پروگرام میں شامل کر لیا تھا۔

دریائے کنہار کی چیخ و پکار کسی فیکٹری کے شور و ہنگامے سے کم نہ تھی۔ اس کی سراسیمگی اور اضطراب میں' انسانی روح کی بے چینی اور تڑپ تھی۔ اس کی بے پناہ مچلتی ہوئی لہروں کو دیکھ کر امثل بولی۔

"اس دریا کے بہاؤ میں تلوار کی دھار کی سی تیزی اور کاٹ ہے۔"

اطالین سیاح نے جو ایک چٹان پر بیٹھا تھا اور کانٹے اور ڈوریاں ٹھیک کر رہا تھا' اجل کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں قدرے پھیل گئی تھیں۔ اس نے پوچھا۔۔۔۔۔

"آپ کو جھیل سیف الملوک کیسی لگی؟"

اجل ایک دو لمحے خاموش رہی پھر بولی۔

"میرے منہ میں جو زبان ہے' اس میں اتنی قدرت اور صلاحیت نہیں ہے کہ میری آنکھوں نے جو دیکھا ہے اور میرے دل نے جو محسوس کیا ہے' اسے بیان کر سکے۔۔۔۔۔ ہاں میری آتما کو زبان مل جائے' تو شاید جھیل سیف الملوک کی سچائی بیان کر سکے۔"

"ہاں ہاں۔" اطالین سیاح کی باچھیں کھل گئیں۔۔۔۔۔ "میں سمجھتا ہوں۔ اس منظر کو سینے کے کسی گوشے میں چھپا کر رکھ لیا جائے اور ضرورت کے وقت گریبان چاک کر کے دیکھ لیا جائے۔ بس یہی انسان کی ذمہ داری ہے۔"

میں نے کہا۔۔۔۔۔

"ایک چینی سیاح نے بھی جھیل سیف الملوک دیکھی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ خدا کا تصور کون بیان کر سکتا ہے۔"

"ہاں۔۔۔۔۔ یہ سب سے شاندار تعریف ہے۔" اطالین سیاح بولا اور اس نے کانٹے دریا میں ڈال دیئے۔ ہم سب کی توجہ ادھر ہو گئی۔ عاطف نے کہا۔

"اس قدر تیز پانی میں کوئی مچھلی کس طرح سنبھل سکتی ہے اور کیونکر کانٹے میں پھنسے ہوئے کیڑے کی طرف متوجہ ہو سکتی ہے؟"

سیاح نے اس کی طرف دیکھا۔

"جس پانی میں آپ محض پانچ منٹ تک ہاتھ نہیں ڈبو سکتے' اس پانی میں ٹراؤٹ مچھلی زندہ رہتی ہے۔ ظاہر ہے آپ اس کی قوت مدافعت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔"

"ہاں۔۔۔۔۔ بات تو ٹھیک ہے۔۔۔۔۔" عاطف نے اعتراف کیا اور ایک چٹان کے کنارے جمع شدہ جھاگ کے قریب بیٹھ گیا۔۔۔۔۔ اس نے پانی میں ہاتھ ڈالا اور جھاگ کو ہتھیلی میں اٹھا کر غور سے دیکھنے لگا۔ جھاگ کے بلبلوں میں سورج کی شعاعیں قوس قزح

کے رنگ بن کر جھلمل جھلمل کر رہی تھیں' جیسے حباب سانس لے رہے ہوں۔

یہ رنگین سانس اسے بہت اچھے لگے' لیکن دیکھتے دیکھتے حباب ٹوٹنے لگے اور تھوڑی دیر بعد اس کی ہتھیلی میں کچھ بھی باقی نہ رہا۔۔۔۔۔ وہ جو ایک سبک سا جگمگاتا سا سفید پھول' چند لمحے پہلے اس کی ہتھیلی پر' اس کی نظروں کے سامنے تھا' ختم ہو چکا تھا۔

"یہ تھی نیچر۔۔۔۔۔ جو بناتی ہے۔ بگاڑتی ہے۔۔۔۔۔ پھر بناتی ہے۔ پھر بگاڑتی ہے۔ سنگدل نیچر اور بے دل نیچر۔۔۔۔۔! ہم اس سے کوئی توقع نہیں رکھ سکتے!"

اطالین سیاح خاموش تھا۔ اس کی نظریں رواں دواں پانیوں پر تھیں۔ جہاں اس نے ٹراؤٹ مچھلی کے لئے کانٹے پھیلا دیئے تھے۔ عاطف پھر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"میرا خیال ہے کہ اس طرح کے پانی میں جال زیادہ مفید ہو سکتا ہے؟"

سیاح نے ہمدردانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔

"یہ بہت قیمتی نسل کی مچھلی ہے۔ ہم اسے ایکسپورٹ نہیں کر سکتے اور نہ تجارتی بنیادوں پر اس کے شکار کی اجازت ہے۔ آپ منہ کا ذائقہ بدل سکتے ہیں' مگر اس کی نسل ختم کرنے کے منصوبے پر عمل نہیں کر سکتے۔ آپ تو خیر سے پاکستانی ہیں۔ مجھے تو اٹلی میں ان پابندیوں کا علم تھا۔"

عاطف نے خفیف سا ہو کر میری طرف دیکھا۔ میں نے ہنس کر کہا۔

"آپ درحقیقت سیاح ہیں۔ ہم تو دوسرے قسم کے لوگ ہیں۔ پہلی بار گھر سے نکلے ہیں۔ سیاحت کے تجربے کلیے سے نابلد ہیں۔"

سیاح نے ہنس کر کہا۔

"سیاح تو میں بھی نہیں ہوں۔ نہ کتاب لکھنے کا ارادہ ہے اور نہ اخباروں کے لئے مضامین' بس زندگی کی یکسانیت سے اکتا کر بھاگ نکلا ہوں۔"

اجل معاً اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"آپ زندگی سے کیا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔؟"

"ٹراؤٹ مچھلی پکڑ رہا ہوں' مگر یہ تو شاید مقصد نہیں ہو سکتا۔" اس نے مسکراتے

ہوئے جواب دیا...... "اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ میں کیا چاہتا ہوں...... یا زندگی کچھ دے سکتی ہے' پھر تو شاید مشکل آسان ہو جائے اور میں اسے پا بھی لوں...... کیو اس سے پیشتر میں جو کچھ چاہتا رہا ہوں' اسے پاتا بھی رہا ہوں' لیکن اب صورت تو ہے۔ خواہشات جب تک پوری نہیں ہوتیں' انسان ان کے لئے تڑپتا ہے' برسرپیکار ہے۔ آمادہ جنگ رہتا ہے۔ انہیں حاصل کرنے کے لئے جان لڑا دیتا ہے' لیکن: خواہشیں تکمیل ہوتی ہیں' پوری ہو جاتی ہیں' تو بہت جلد محسوس ہونے لگتا ہے کہ جو مانگا تھا' یہ تو نہ تھا' جو کچھ چاہا تھا ہرگز یہ نہ تھا......؟"

"آپ نے کیا چاہا تھا......؟ کیا پایا ہے......؟ اور کیا کھویا ہے......؟"

میں نے پوچھا۔

"اچھا...... تو آپ پوچھ کر ہی رہیں گے۔" اس نے پاؤں پھیلا کر آگے کر دیئے چٹان پر آرام سے بیٹھ گیا۔ چند لمحے خاموشی سے کچھ سوچتا رہا جیسے ماضی کی طرف جھانک رہا ہو۔ پھر اس نے اپنی کہانی شروع کی...... "میں ایک ادنیٰ کارکن تھا۔ بے حد مشکل سے پیٹ بھرنے کا آسرا ہوتا تھا۔ میں نے اخبار بیچے' مشینیں صاف کیں' ملو؛ دواؤں کا ایجنٹ رہا۔ اس کے علاوہ بھی جو کام ملا بے دریغ کیا' لیکن مختلف پیشوں نے بے حد چلتا کار بنا دیا۔ رنگ رنگ کا آدمی دیکھا۔ طرح طرح کے گر سیکھے اور پیسہ کرنے کے ہزاروں ڈھنگ اپنائے۔ میرا مطمح نظر یہ تھا کہ دنیا میں سب سے اہم ہے' سب سے ضروری روپیہ۔ روپیہ ہو تو دنیا کی ہر چیز خریدی جا سکتی ہے۔ آ آسائش' عزت' صحت' عورت' شہرت' لذت' ہر چیز روپے کی رہین منت ہے۔ رو ہو تو آدمی کوڑی کا نہیں رہتا...... میں نے سویرے سے کام شروع کیا۔ لوگوں کے میں جا کر پرانا مال خریدتا۔ کوٹ' سوئٹر' پرانا فرنیچر' جوتے' کتابیں' رسائل' تقریباً ہر جو گھروں میں ہوتی ہے...... یہ چیزیں مجھے سستے داموں مل جاتی تھیں...... میں نے ہے' پرانی چیزوں سے انسان کا رویہ ایسا ہوتا ہے' جیسے لوگ قرض خواہ سے نظریں نکل جاتے ہیں۔ قیمتی چیز ایک دن کے جیب خرچ کے عوض آسانی سے مل جاتی

بعض دفعہ تو ایسا لگتا تھا جیسے لوٹا ہوا مال ٹھکانے لگایا جا رہا ہو۔ مثلاً میں نے ایک فانوس دس لیرے میں خریدا تھا اور اسے تین سو لیرے میں بیچ دیا تھا۔ دو سال یہ کام کیا اور ہزاروں روپے کمائے۔ پھر میں نے اس کام کو مزید پھیلایا۔ دفتر کھول لیا۔ نوکر رکھ لئے اور ساری دنیا میں پرانا مال ایکسپورٹ کرنے لگا۔ نام ہوا' شہرت ملی۔ ہالی وڈ اور دنیا کی دوسری فلم کمپنیوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ لاکھوں روپے کے آرڈر ملتے' اور دنوں اور ہفتوں میں مطلوبہ سامان مہیا کر دیتا...... میں دنیا کے گوشے گوشے سے تاریخی اور تہذیبی نوادرات جمع کرتا۔ ان کی فہرستیں مرتب کرتا اور ان کی کاپیاں دنیا کے بڑے بڑے عجائب گھروں اور فلم کمپنیوں کو بھیج دیتا' اور پھر ان چیزوں کے منہ مانگے دام وصول کرتا۔ چند سالوں میں لکھ پتی ہو گیا' لیکن دولت کمانے کی ہوس بڑھتی ہی چلی گئی۔ چنانچہ میں نے کئی کارخانوں کے شیئرز خریدے۔ متعدد بینکوں کا ڈائریکٹر بن گیا۔ ریس کے لئے دنیا کے بہترین نسل کے گھوڑے خریدے۔ ریس کے ماہرین کو گرانقدر مشاہروں پر ملازم رکھا اور یوں چاروں طرف سے روپے کی بارش ہونے لگی...... اور میں کروڑ پتی بن گیا!"

"نہایت عمدہ" میں نے اسے داد دی۔

عاطف بے حد توجہ اور شوق سے اس کی باتیں سننے میں محو تھا۔ امل خاموش بیٹھی تھی۔ اطالین سیاح نے بات جاری رکھی۔

"نوجوان دوستو۔" اس نے ڈوری کو تھوڑا سا لپیٹ لیا...... "میں نے جب پہلی بار کار خریدی تھی' تو خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس کے بعد دوسری اور تیسری' پھر ہر سال نئے ماڈل کی بہترین کار خریدتا تھا۔ فیکٹری سے نکلنے والی پہلی دو چار موٹروں میں سے ایک موٹر میرے پاس آتی تھی۔ اس امتیاز کے ساتھ کہ نئے سال کی نئی ماڈل سب سے پہلے فلاں شخص کے پاس آئی ہے' لیکن سچ جانئے کہ سب سے پہلے سیکنڈ ہینڈ کار کی خرید پر جو خوشی نصیب ہوئی تھی' وہ ان بہترین کاروں کے نئے ماڈلوں میں نہیں تھی۔ یوں سمجھئے کہ یہ کاریں ہر سال اس طرح آتی تھیں' جیسے دوپہر کو ہر روز لنچ آتا تھا۔ اس میں کسی قسم کی ندرت نہ ہوتی۔ نہ کسی طرح کا جذباتی ہیجان' جیسے روز کے ملنے سے انسان ہاتھ ملاتا ہے۔

علاوہ یا روایتاً کسی جذبے کے بغیر------ دوستو' نزاوٹ مچھلی بہت مشکل سے قابو میں آتی ہے۔ لیکن ہم بھی ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں۔ بیٹھے رہو اور کہانی سنو------ ہاں تو مجھ اکیلے کے پاس اتنی بڑی کوٹھی تھی' کہ اس میں دس خاندان آسانی سے رہ سکتے تھے۔ بائیس کمروں میں سے صرف دو کمرے زیر استعمال رہتے اور سچ پوچھئے تو صرف ایک ہی کمرہ جس میں میں سوتا تھا' ورنہ ڈرائنگ روم کا استعمال تو بس برائے نام تھا' کیونکہ میں سارا کاروبار دفتر میں کرتا تھا اور گھر پر شاذ و نادر ہی کسی سے ملتا تھا' لیکن جہاں تک نیند کا سوال ہے' میرے خوبصورت بیڈ روم اور نفیس ترین بستر میں وہ خواب خرگوش کے مزے کہاں' جب میں ناؤ کھیتا تھا اور سارا سارا دن سیاحوں کو سیر کراتا تھا اور رات کو کشتی میں کمبل لپیٹ کر دنیا و مافیہا سے بے خبر سو جاتا تھا۔ دوستو------ دنیا کی کوئی طاقت مجھے وہ نیندیں لوٹا کر نہیں دے سکتی۔ نہ روپیہ' نہ شہرت نہ عزت اور نہ میری جاہ و حشمت' نیند روپے سے نہیں آتی' سکھ خریدے------ نہیں ملتا------ ہاں' تو پھر میں نے شادی کر لی------ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ میری بیوی اٹلی کی دس خوبصورت ترین عورتوں میں سے ایک تھی۔ وہ میری دولت پر مرمٹی تھی اور میں سمجھتا رہا کہ میری شخصیت پر مرمٹی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میری شخصیت میں قطعی کوئی جاذبیت نہیں ہے' لیکن افسوس ہے کہ اس کا احساس مجھے بہت بعد میں ہوا۔ اس زمانے میں مجھے یہ مغالطہ تھا کہ میں تشخص رکھنے والا جاذب نظر آدمی ہوں اور صنف مخالف کی محبت کے لئے نہایت موزوں' اور یہ کہ میں نے بیوی کو دولت سے نہیں' بلکہ اپنے بانکپن سے متاثر کیا ہے۔ سال چھ مہینے سرشاری میں گزرے اور یہی بہترین زمانہ تھا------ میں اپنی حسین بیوی کی محبت میں مست تھا اور سمجھتا تھا کہ میری بیوی کی بھی یہی کیفیت ہے اور جب میں ایک بچے کا باپ بن گیا تو میری مسرتوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ کیونکہ اب میں ایک باپ تھا اور صحیح معنوں میں ذمہ دار آدمی۔ وقت گزرتا رہا۔ کاروبار بڑھتا رہا------ لیکن کچھ عرصہ بعد ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں اپنی پرائیویٹ سیکرٹری سے محبت کرنے لگا ہوں۔ یہ لڑکی میری بیوی کی طرح حسین نہیں تھی' لیکن اس کی شخصیت میں ایک عجیب و غریب قسم کی طرحداری

اور پراسرار قسم کا بانکپن تھا جسے انسان الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ مگر دل ہی دل میں اسیر ہو جاتا ہے۔ بس ایسا ہی ہوا میرے ساتھ بھی------ مجھے اس کا شدید احساس تھا کہ میں اپنے بچے کی ماں سے بے وفائی کر رہا ہوں' لیکن یہ احساس میری نئی محبت کے سامنے ہمیشہ بے بس و مجبور رہا------ بہت جلد مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میری بیوی کا دل بھی مجھ سے بھر گیا ہے اور وہ ایک بنک کے منیجر سے محبت کا دم بھرتی ہے' جس کا میں ڈائریکٹر بھی ہوں------ اس اطلاع سے جہاں اپنی بے وفائی کے جرم کا احساس جاتا رہا' وہاں بیوی کی بے وفائی پر صدمہ بھی ہوا------ اور جب میں نے اس سے علیحدگی کی بات کی' تو وہ خوشی سے تیار ہو گئی' جو غالباً میرے پاس نہیں تھی۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ اس کے تمام تر حسن کے باوجود' اس کے بوسے میں وہ تازگی' وہ کیفیت باقی نہ رہی تھی جو میری سیکرٹری کے بوسے میں تھی' مگر افسوس ہے کہ بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ مجھے بہت بری لت پڑ چکی تھی۔ اور میں ہر سال ایک نئی محبت میں گرفتار ہو جاتا تھا۔ ہر بار' اس یقین کے ساتھ کہ یہ آخری ہے۔ کیونکہ آغاز میں میں ہر ایک کے ساتھ واقعی مخلص ہوتا تھا اور یقین کر لیتا تھا کہ ہاں' یہ حتمی ہے------ لیکن خدا جانے یہ سچائی میری مٹھی سے کس طرح سرک جاتی تھی۔ مجھے علم ہی نہ ہوتا اور نیا سفر شروع ہو جاتا------ کبھی کبھی میں سوچتا کہ سمجھدار سے سمجھدار آدمی کی زندگی میں بھی ایک وقت ایسا آتا ہے' جب دل میں جذبات کا طوفان اٹھتا ہے اور چھوٹے موٹے بندھن' جو ادنیٰ اور معمولی ہونے کے باوجود دل سے زیادہ قریب ہوتے ہیں' بے حد اہمیت اختیار کر جاتے ہیں اور انسان سماجی اور اخلاقی مقاصد سے ہٹ جاتا ہے۔ اور پھر میں حیران ہوتا کہ انسان کھلونا کیوں ہے اور وہ ثابت قدم کیوں نہیں رہ سکتا۔ لہو کے رشتے' اگر ہیں' تو یہ بندھن ٹوٹ کیوں جاتے ہیں------؟ ادراک اور خود آگہی کے باوجود' ایسی بے بسی کہ ہر نئی امنگ' دوسری امنگوں پر غالب آ جاتی ہے۔ سوجھ بوجھ اور احساس کی تمام طاقتوں کو زیر کر لیتی ہے اور آدمی سوچنے لگ جاتا ہے کہ راستی کو کس طرح پکڑا جائے اور جھوٹ کو کس طرح الگ کیا جائے؟ چنانچہ دوستو------ ایک وقت آیا کہ واقعی میں سوچنے بیٹھ گیا کہ کیا انسان کو' انسان سے دور

رکھنے کا فرض سونپا گیا ہے؟ کتے گدھے اور دوسرے بہت سے جانور' جنسیت میں اولیت حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے لڑتے ہیں------ انسان کی بے اعتکادی اور عدم اعتدالی کا مہذبانہ جنسی رویہ' کہیں اس زمرے میں تو نہیں آتا------؟ ہاں شاید! کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہم نے اپنے سینوں میں بہت سے بھیڑیئے پال رکھے ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً باہر نکلتے رہتے ہیں اور چیرنا پھاڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر ہمارے اندر کتے ہوتے تو غنیمت ہوتے۔ کیونکہ کتا بھوکا ہونے کے باوجود اپنے مالک کو نہیں کاٹتا' لیکن بھیڑیا بھوک میں سب کچھ کر گزرتا ہے۔ دراصل ہم جنسی بھیڑیئے ہیں------! آپ سوچتے ہوں گے کہ میں کیسی باتیں کرتا ہوں------ تم تینوں نوجوان ہو' نوجوانوں کو میری باتیں عجیب لگ سکتی ہیں۔ کیونکہ ان میں جذبہ ہوتا ہے' جوش ہوتا ہے اور وہ امنگوں سے بھرپور ہوتے ہیں' لیکن تجربوں سے خالی ہوتے ہیں------ وہ میری طرح پاگل نہیں ہوتے۔ میری طرح بننے کے لئے انہیں طویل وقت درکار ہوتا ہے۔ ایک دور ہوتا ہے جب انسان نیک دل' نیک سیرت' عالی ظرف اور پاکیزہ ہوتا ہے۔ میں اس دور سے گزرا ہوں------ جب نیکی کرنے میں لطف آتا تھا اور آدمی دوسروں کی بھلائی کے لئے سوچتا تھا------ پھر ایک دور آتا ہے' جب ہم میدان عمل میں نکلتے ہیں۔ زمانے کو پرکھتے ہیں اور صرف دھوکہ دھوکہ پاتے ہیں اور نامحسوس انداز میں خود بھی اس دھوکے میں ضم ہو جاتے ہیں۔ احساس جرم کے بغیر زندگی کا مقصد متعین کر لیتے ہیں اور اپنی کامیابیوں اور کامرانیوں کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں------ اور جب ہم انتہا درجے کی پختگی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ تو ایک دم اچانک ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہماری خوش خوراکی نے ہمارے پیٹ میں کیڑے پیدا کر دیئے ہیں' اور یہ کہ کام و دہن کی لذت بے معنی چیز ہے اور سونے چاندی کے برتنوں کی نمائش خام ذہنی ہے اور نہایت قیمتی لباس محض احساس کمتری کا اظہار ہے۔ تو کیا ہے------ آدمی امیر رہے یا غریب' کیا فرق پڑتا ہے۔ دوستو' میری بات شاید بہت طویل ہو گئی ہے۔ نزاکت کچھ گرفت میں نہیں آتی۔ اس لئے طول دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیوں کیا خیال ہے سویٹ لیڈی؟"

"میں آپ کی باتیں توجہ سے سن رہی ہوں۔" امل نے جواب دیا۔

میں نے ہنس کر کہا------

"آپ ان باتوں کی تائید کر رہے ہیں' جو ہم سویٹ لیڈی کی زبان سے سن چکے ہیں۔"

"کیا واقعی------؟" وہ حیرت سے بولا------ "اس کا مطلب ہے میں اشلکچوئل کی ٹولی میں پھنس گیا ہوں!"

"آپ بات جاری رکھیں۔" امل بولی------ "آپ کا تجربہ مجھ سے زیادہ وسیع اور ٹھوس ہے۔ میں آپ کی باتیں غور سے سن رہی ہوں اور یہ میرے دل میں کھب رہی ہیں۔"

"تب میری خوش قسمتی ہے۔ بے حد!" سیاح بولا------ "آپ لوگ میرے مطلب کے آدمی ہیں۔ ہم جیسے لوگوں کی تعداد اب خاصی بڑھ رہی ہے۔ ایک دور تھا امیر غریبوں پر حکومت کرتے تھے اور ان کا استحصال کرتے تھے۔ غریب ان سے نفرت کرتے تھے اور انتقام کے لئے وقت کا انتظار کرتے تھے۔ یہی دو طبقے تھے جو ہمیشہ دست و گریباں رہتے تھے اور ایک دوسرے پر الزام تراشی کرتے تھے------ یہ طبقاتی جنگ' کسی حد تک اب بھی جاری ہے' لیکن اب آپ جیسے' مجھ جیسے لوگوں کا ایک اور طبقہ پیدا ہو رہا ہے' جو انسانی فطرت کی کج روی سے نہ صرف شاکی ہے' بلکہ اسے ناقابل اصلاح بھی سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ کسی سے کوئی توقع نہیں رکھتا۔ ہمارے طبقے نے اپنے اغراض و مقاصد نہ صرف محدود کر دیئے ہیں۔ بلکہ ایک حد تک ان سے دست بردار ہو گیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا بوجھ قدرے کم ہو گیا ہے۔"

امل مطمئن بیٹھی تھی۔ لیکن عاطف متذبذب تھا۔

"آپ تو کروڑ پتی آدمی ہیں۔ آپ اپنے مفاد سے کیونکر دست بردار ہوئے ہیں؟"

"میں نے اپنی کہانی ختم نہیں کی۔ شاید اس لئے آپ کو یہ سوال کرنا پڑا------ نوجوان دوست------ میں اب کروڑ پتی نہیں رہا------! میں نے تمام جائیداد اور نقد روپیہ رفاہی کاموں میں لگا دیا ہے۔ میں نے صرف اتنا روپیہ اپنے لئے رکھ چھوڑا ہے کہ اس سے میرا

اکلوتا بیٹا تعلیم مکمل کر سکے اور میں اپنی بقایا زندگی کسی کا محتاج نہ رہوں۔۔۔۔۔ اس بارے میں ایک دلچسپ واقعہ سن لیجئے۔ میرا بیٹا اس وقت آٹھ سال کا ہے' تب وہ پانچ سال کا تھا۔۔۔۔ وہ بہت ذہین بچہ ہے اور دنیا میں مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔ اس نے دولت کی ریل پیل میں آنکھ کھولی۔ اس لئے وہ نہیں جانتا تھا کہ غربت کیا چیز ہے۔ ایک بار اس نے ایک غریب آدمی کو دیکھا' جو ایک مشکل اور سخت کام میں جتا ہوا تھا۔ میرے بیٹے نے اسے ان اذیت ناک لمحوں میں دیکھا۔ تو کہنے لگا۔۔۔۔ ابا' یہ شخص سخت تکلیف میں ہے۔ اسے یہ کام نہیں کرنا چاہیے۔۔۔۔ میں نے اسے سمجھایا کہ یہ غریب آدمی ہے' اسے اپنا پیٹ بھرنے کے لئے کوئی نہ کوئی کام کرنا ہی پڑے گا۔ میرے بیٹے نے حیرت سے پوچھا کہ ابا غریب کیا ہوتا ہے۔۔۔۔؟ اور کیوں ہوتا ہے۔۔۔۔؟ میں دیر تک اسے سمجھاتا رہا مگر اس کے پلے کچھ نہ پڑا۔ الٹا پوچھنے لگا۔۔۔۔ کہ ہم غریب کیوں نہیں ہیں۔۔۔۔؟ میں نے اسے کہا کہ ایک زمانے میں میں بھی بہت غریب تھا۔ اور غریبوں جیسے سخت کام کیا کرتا تھا۔۔۔۔ بات آئی گئی ہو گئی۔۔۔۔ لیکن کچھ عرصہ بعد لڑکے نے پھر مجھ سے کہا۔۔۔۔ آپ پھر کب غریب ہوں گے؟ میں نے پوچھا۔۔۔۔ کیوں بیٹا! آپ مجھے غریب کیوں بنانا چاہتے ہیں۔۔۔۔؟ تو وہ بولا۔۔۔۔ تاکہ ہم کام کریں۔ میں بھی آپ کے ساتھ کام کروں گا بہت مزہ آئے گا۔ پھر لوگ ہمیں بھی غریب کہیں گے نا۔۔۔۔؟ میں نے اثبات میں سر ہلایا لیکن دل پر ایک گہری چوٹ کھا چکا تھا۔ میں نے سوچا انسان اپنے خون میں سے خواہشات کا جزو الگ نہیں کر سکتا۔۔۔۔ یہ معصوم بچہ بھی ایک خواہش رکھتا ہے۔ یہ ایک کروڑپتی باپ کا بیٹا ہے۔ اس کی تقریباً ہر خواہش پوری ہوتی رہی ہے' لیکن ایک خواہش اس کے دل میں بھی ہے' غربت کی۔۔۔۔! کیونکہ وہ غریب نہیں ہے اور وہ غریب ہونا چاہتا ہے۔۔۔۔ یہ وہی بات ہوئی نا' جیسے بعض بادشاہوں کے متعلق مشہور ہے کہ انہیں بھیک مانگنے کی عادت تھی۔ بعض شہزادیاں بھی یہ کام کرتی رہی ہیں۔۔۔۔ تو یہ سب کیا ہوا۔۔۔؟ یہی نا۔۔۔۔ کہ انسان اپنی جبلت کے سامنے بے بس ہے۔"

میں اس کی باتیں بہت غور سے سن رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"آپ کی سب باتیں درست' لیکن آپ نے جو ساری جائیداد اور روپیہ رفاہی اداروں کو دے دیا' یا رفاہی کاموں میں لگا دیا' تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ نیکی پر ایمان رکھتے ہیں اور انسان کی بھلائی میں یقین رکھتے ہیں؟"

"انسان کی بھلائی پر یقین نہ رکھنا انتہائی شقی القلبی ہے' لیکن فرض کیجئے' میں اس سلسلے میں کوئی نقطہ نظر نہ رکھتا' تو بھی میں کیا کرتا۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "میں یہ روپیہ سمندر میں پھینکنے کا قائل نہیں تھا کہ اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ روپیہ مچھلیوں کے کام نہیں آ سکتا تھا۔ حکومت کے حوالے کرنا بھی پسند نہ کیا کہ اس سے بارود یا ٹینک خریدے جاتے۔۔۔۔ ریس اور جوئے کے کلب بنانے سے بھی دل بھر گیا تھا۔ چنانچہ یہ بہترین مصرف تھا کہ رفاہی کاموں میں لگا دیتا۔۔۔۔ میں اسے کارنامہ نہیں سمجھتا۔ یہ بالکل سیدھا سادہ عمل تھا۔ روپیہ مقصد نہیں ہونا چاہیے۔ بس یہ بات میری روح لے پائی تھی۔"

"یہ تو پیغمبرانہ عمل تھا۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔۔۔۔

"نہیں' میں ایسا نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ میری روح اتنی پاکیزہ نہیں۔ ترغیب اور تبلیغ کی مجھ میں ذرہ بھر اہلیت نہیں' اور نہ میں بردبار اور متین آدمی ہوں' اور نہ مجھ میں کشادہ دلی' گمبھیرتا اور عالی ظرفی ہے۔ جو اعلیٰ درجے کے انسانوں کے خمیر میں ہوتی ہے۔ میں تو معاف نہ کرنے والا' کینہ پرور' اور انتقام لینے والا آدمی رہا ہوں۔ اس لئے مجھے اپنے قد و قامت کا علم ہے۔۔۔۔ جناب میں بہت مختصر آدمی ہوں!"

امثل خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے رویے سے پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا کوئی اظہار نہیں ہو رہا تھا' لیکن اتنی دیر شانت اور خاموش بیٹھنے کا مطلب یہ تھا کہ اسے سیاح کی باتوں سے اختلاف نہیں تھا۔۔۔۔ ہاں عاطف کچھ متذبذب کیفیت میں بیٹھا تھا۔

میرے ذہن میں بھی طرح طرح کے سوالات اٹھ رہے تھے۔ اس لئے پوچھا۔

"دولت جمع کرنے کی ہوس سے آپ نے چھٹکارا حاصل کر لیا اور جو کچھ آپ کے پاس تھا' انسان کی بہبود کے لئے وقف کر دیا۔ کیا یہ اچھائی کی تلقین یا اچھائی کی راہ پر چلنے کے

مترادف نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہے۔۔۔۔۔ اس کا مطلب ہے پھر تو انسان کی فطرت میں لچک ہے۔ یعنی اچھی بات قبولنے کی گنجائش' پھر ہم کوشش جاری کیوں نہ رکھیں۔۔۔۔۔؟"

"کس کے لئے۔۔۔۔۔؟" امثل نے تمسخرانہ لہجے میں پوچھا۔ "انسان کی بہتری اور بہبو کے لئے۔۔۔۔۔" وہ اسی موڈ میں بولی۔۔۔۔۔ "ہاں انسان روئے زمین کی سب سے عظیم مخلوق جو ٹھہری۔ دنیا کی ہر نعمت اور کائنات کا سارا نظام انسان کے لئے تخلیق ہوا ہے اس لئے اول اور آخر انسان کی بہبود ہی شرط ہونا چاہیے!"

"میرے خیال میں یہ ایسی کوئی بری خواہش بھی نہیں ہے۔۔۔۔۔؟" میں نے اس انداز سے سیاح کی طرف دیکھا' گویا اس کی تائید مقصود ہو۔

سیاح نے قدرے تامل سے کہا۔۔۔۔۔

"میرا خیال ہے کہ مس اس کا بہتر جواب دے سکتی ہیں۔"

"میرے جواب سے ان کی دل شکنی ہوتی ہے' کیونکہ میں ان کی رجعت پسندی کا ساتھ نہیں دیتی۔ یہ خلانوردی اور مہ نوردی کو ترقی سمجھتے ہیں اور میں اسے رد کرتی ہوں۔ میں کہتی ہوں کہ اگر انسان ایٹم کی طاقت کا مالک بنا ہے' تو اسے خلا میں کیوں ضائع کرتا ہے۔ وہ صحرائے اعظم کو سرسبز کیوں نہیں بناتا۔ وہ افریقہ کی دلدل خشک کیوں نہیں کرتا۔ وہ ایشیا کی پسماندگی کو ختم کیوں نہیں کرتا۔ اور وہ دنیا بھر کے مچھر ضائع کیوں نہیں کرتا۔۔۔۔۔ وہ اسے انسان پر استعمال کرتا ہے۔ مچھر اور مکھیاں نظر انداز کر دیتا ہے۔۔۔۔۔ ترقی یافتہ انسان چاند اور زہرہ کا دور دراز کا سفر کرنا پسند کرتا ہے' مگر اپنے سینے میں؟ پسند نہیں کرتا۔ وہ اربوں اور کھربوں روپیہ جھنڈا گاڑنے پر خرچ کر سکتا ہے' مگر اپنے ذہن سے شر نکالنے کے لئے ایک پائی صرف نہیں کر سکتا۔ یہ جو آپ لوگ باتیں کرتے ہیں' انسانی فطرت کی اور اس کی لچک کی' بھلائی اور نیکی کی تو میں انفرادی مثالوں سے مطمئن نہیں ہوتی۔ ایک آدھ کارنامہ محض مثال بن سکتا ہے' لیکن انسان کے مستقبل کا بنیادی مسئلہ حل نہیں کرتا۔ نیکی کا اجتماعی عمل انسان کی قسمت ہی میں نہیں ہے۔ صد

ولی' پیغمبر' اوتار' پیار اور سواگت کی تلقین کر کے تھک گئے' لیکن روئے زمین سے نفرت ختم نہ ہوئی۔ یہ سب مخلص لوگ تھے' لیکن انسان کی فطرت اور اس کی بیمار روح کا روگ دور نہ کر سکے۔۔۔۔۔ آپ' آپ مسٹر انتونی' وسیم صاحب کو کوئی ایسا جواب دیجئے' جس میں زندگی سے بے پناہ پیار کا جواز موجود ہو۔۔۔۔۔!"

سیاح نے نئی نظروں سے امثل کی طرف دیکھا' لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات کرے' عاطف بول پڑا۔

"میں نہیں سمجھ سکتا کہ زندگی سے بیزاری کا بھی کوئی مقصد ہو سکتا ہے۔ انسان خوشی اور مسرت سے اس زمین پر رہے' یہ سب سے سیدھا راستہ ہے اور بہترین عقیدہ۔۔۔۔۔ آپ لوگوں کی باتیں' آپ کی ہیبت ناک اور وحشت ناک مایوسی۔۔۔۔۔ آپ کے نزدیک مایوسیت اعلیٰ ترین چیز ہے۔ آپ چیزوں کو عملی روپ میں نہیں دیکھتے بلکہ خیالی آدرشوں کی تکمیل کے لئے کڑھتے رہتے ہیں۔۔۔۔۔ اگر میں آپ سے اتفاق بھی کروں کہ انسانی سرشت میں انتہائی شدید قسم کی خود غرضی بھری پڑی ہے' تو اس فہرست میں آپ لوگوں کا نام بھی آتا ہے۔ جب آپ خود کو اس فہرست سے خارج نہیں کر سکتے' تو آپ پر لازم آتا ہے کہ بالکل سیدھے سادے طریقے سے اپنی تمام تر خامیوں اور خود غرضیوں کے ساتھ زندگی کو آگے بڑھائیں۔ اپنے آپ سے محبت کریں۔ پھر دیکھیں' زندگی کتنی آسان اور سہل ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔ بھاگنے کے بجائے لوگوں سے ملیں۔ وکیل' وزیر' افسر' ماتحت اور عوام سے تعلقات بڑھائیں۔ دوست بنائیں' راستے نکالیں۔ جہاں راستہ نہ ملے' روپیہ خرچ کریں۔ کڑھنے میں آخر کیا رکھا ہے۔ خوش و خرم زندگی گزارنے کے بہت وسیلے اور طریقے ہیں۔۔۔۔۔ پہاڑوں پر آکر آپ خود غرضی کے اس بھیڑیئے کا گلا نہیں گھونٹ سکتے۔ جو فطرت نے آپ کے خون میں بسایا ہے؟"

ڈاکٹر سیاح حیرت اور وحشت سے عاطف کو دیکھ رہا تھا' مگر امثل مسکرا رہی تھی۔۔۔۔۔ اس نے سیاح کی طرف دیکھا۔

"یہ تو آپ جانتے ہیں' عاطف میرے بھائی ہیں۔ بھائی بھی ایسے' گویا بے پناہ پیار

کرنے والے' دنیاوی دھندوں میں بے حد باخبر آدمی' یہ اکثر میرے ساتھ ساتھ چلتے ہیں لیکن کبھی کبھی بدک کر اپنی مرضی بھی کرتے ہیں۔ میں نہ ان کی مرضی کو رد کرتی ہوں اور نہ انہیں اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کرتی ہوں------ ان کا المیہ یہ ہے' جب دیکھتے ہیں کہ بمن آورش داورش کے ہوائی قلعوں میں بند ہوئی جا رہی ہے' تو جدائی کی وحشت ان کے لئے گوناگوں مسائل کھڑے کر دیتی ہے۔ یہ نہیں چاہتے کہ انسان اپنی فطرت کو زیر کر دے اور سرشت میں یا گھٹی میں آئی ہوئی خود غرضیوں کو جھاڑ دے------ اور زہر ہلاہل پینے کی ہامی بھر لے------ میرا بھائی کھرا آدمی ہے۔ مجھے زندہ دیکھنا چاہتا ہے اور خوش و خرم بھی' لیکن اپنے انداز میں' اپنی سوچ کے مطابق۔ غلط اور صحیح کا فیصلہ تو بعد میں ہو گا لیکن اپنے تئیں سچ کا جو معیار ان کے ذہن میں موجود ہے' اس کسوٹی پر وہ مجھے دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کے خلوص پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔"

اٹالین سیاح اصل کی بات سمجھ گیا تھا۔

"میں ایسے لوگوں کو پسند کرتا ہوں۔ جو غلط باتوں پر خلوص سے یقین رکھتے ہیں!"

"غلط کیسی------؟" عالطف نے اسے ٹوکا۔

"آپ کے نزدیک غلط نہ سہی۔" سیاح بولا------ "دو آدمیوں کا متفق ہونا بہت مشکل کام ہے۔ ممکن ہے' جو میں کہتا ہوں' وہ بھی غلط ہو------ حتمی بات کون کہہ سکتا ہے اور کون اٹل دعوے کر سکتا ہے۔ بلند بانگ دعووں کی بلند بانگ تردید بھی ہوتی ہے' لیکن میں اس حد تک تو آپ سے متفق ہوں کہ ہم مہذب جنگل کے انسان ہیں۔ یہاں لاکھوں کروڑوں درندے بستے ہیں۔ آپ کو ان کے ساتھ رہنا ہو گا' ورنہ سوکھی لکڑی کی طرح جل جائیں گے یا ٹوٹ جائیں گے!"

اٹالین سیاح لمحہ بہ لمحہ مجھے اچھا لگتا جا رہا تھا۔ اس کی باتوں میں بلا کا تجربہ اور مشاہدہ تھا۔ اس نے جس طرح دولت سمیٹی تھی اور پھر اسے بے مقصد جان کر قناعت کر لی تھی------ میرے نزدیک یہ معمولی کردار نہیں تھا۔ بلکہ غیر معمولی تھا۔

اب لنچ کا وقت ہو گیا تھا' لیکن ہم لنچ ساتھ نہیں لائے تھے۔ اس لئے واپس ہو لئے

چلے گئے۔ آج بدقسمتی سے کوئی مچھلی پھنس نہ سکی تھی۔

اٹالین سیاح نے لنچ ہمارے ساتھ کیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"آپ نے اپنے لڑکے کے لئے کچھ نہیں چھوڑا۔ آپ کو اپنے لڑکے سے پیار بھی بہت ہے۔ کیا آپ کی ذمہ داری صرف یہی ہے کہ اس کی تعلیم مکمل کرلیں؟"

"میرا خیال ہے کہ ہر باپ کی ذمہ داری صرف یہی ہونا چاہیے۔ اولاد کے لئے دولت چھوڑ کر اسے بے دست و پا نہیں بنانا چاہیے۔ زندگی کے بازار میں اسے اپنے ہاتھوں سے خود سودا خریدنا چاہیے۔ مجھے واقعی اپنے بیٹے سے پیار ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جب اسے ہوش آئے' تو اس کے چاروں طرف تمناؤں اور خواہشوں کے ہجوم ہوں۔ ہر خواہش اسے تڑپائے اور ہر خواہش کو پورا کرنے کے لئے وہ سر دھڑ کی بازی لگائے------ اس طرح وہ مصروف رہ سکتا ہے اور خوش بھی' اسے زندگی کی تلخیوں پر سوچنے کا موقع ہی کب ملے گا۔ میں اس کے لئے دولت چھوڑ کر اس کے ساتھ دشمنی نہیں کر سکتا کہ اس کی ہر خواہش پوری ہو جائے۔ ہر حسرت نکل جائے اور ایک دن سوچنے لگ جائے کہ اب آگے کیا کرنا ہے؟ اچھے دوستو------! میں نہیں چاہتا کہ میرا بچہ اس سوچنے والے دن کا سامنا کرے اور آگے بڑھنے کا راستہ رک جائے اور پھر میری طرح روح کی تلاش میں مارا مارا پھرے!!"

عالطف کو شاید ان سے اتفاق نہیں تھا۔

"لیکن صاحب' روپے کی اہمیت کو کسی دور اور کسی معاشرے میں بھی رد نہیں کیا گیا۔ جب تک زندگی ہے' روپے کی ضرورت ہمیشہ رہے گی۔ آخری سانس تک روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوا' دعا' بلکہ کفن دفن تک روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"بھائی جان' روپے سے آپ کیا خرید سکتے ہیں------؟ کسی اہل دل کا دل خرید سکیں گے آپ------؟ اس سیاح کی کہانی بھی آپ کو متاثر نہ کر سکی۔ میری فطرت کو روپے کے زور سے بدل نہ سکے آپ' پھر آپ روپے کے زور سے کیا خرید سکتے ہیں------ ہاں' آپ روپے کے زور سے تہذیب خرید سکتے ہیں۔ دراصل روپیہ اس تہذیب کے ایک اصول کا

نام ہے' جس میں آپ کی ساری تہذیب جکڑی ہوئی ہے!"

"ہاں امثل! اگر روپیہ اصول ہے' تو میں اس اصول کی پابندی پر خوش ہوں اور اگر روپیہ خواہش ہے تو میں اس خواہش کو زندہ رکھنا چاہتا ہوں۔ اگر لوگ دنیا اور زندگی سے بیزاری کی خواہش کر سکتے ہیں تو زندگی سے پیار کی خواہش پر پابندی کیوں لگائی ہے......؟"

سیاح ہنس پڑا......

"آپ لوگ الجھتے کیوں ہیں۔ ہر آدمی اپنے طور پر سچا ہوتا ہے...... دانش ور اپنی جگہ سچ کہتا ہے...... مبتدی اپنی جگہ سچ کہتا ہے...... ایک مقام پر پہنچ کر دانش ور کی دانش جواب دے جاتی ہے' لیکن مبتدی اپنی جگہ اٹل ہوتا ہے۔ کیونکہ یہاں نہ آگے بڑھنے کی چٹک ہوتی ہے اور نہ شکست کا ادراک......!"

عاطف نے اسے تیز نظروں سے دیکھا' لیکن سیاح نے اس کا نوٹس ہی نہ لیا۔ وہ کمرے میں ٹہلتے ہوئے اسی موڈ میں بولا۔

"دنیا کے جس حصے میں جاؤ' لوگ دیوانوں کی طرح روپے کے پیچھے بھاگ رہے ہیں میں سمجھتا ہوں' یہ دیوانگی ٹھیک ہے کہ کم از کم مصروفیت اور لگن تو ہے اس میں۔ مکار موٹر اور بنک بیلنس کے شوق میں بے ایمانی کرتے ہیں' دغا دیتے ہیں۔ جیب کاٹتے ہیں لیکن سوچ کے ان اذیت ناک لمحوں سے بچے رہتے ہیں' جن سے ہم تم دوچار ہوتے ہیں...... میرے خیال میں زندگی کی بے مقصدیت اور امنگوں کی بے ثباتی کا احساس ہونے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ آدمی کام کرے اور خود کو مصروف رکھے اور شدت احساس کے ان کربناک لمحوں کے عذاب سے بچا رہے!"

عاطف خاموش ہو گیا تھا۔ شاید بات اس کی فکر سے آگے نکل گئی تھی۔ مجھے موضوع ہمیشہ سے پسند تھا۔ میں اسے مزید آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ اس لئے پوچھا۔

"آپ کا مطلب ہے' حاصل کر لینا اپنے آپ کو عذاب میں مبتلا کرنے کے مترادف ہے۔ البتہ حاصل کرنے کی کوشش اور جستجو میں کوئی عیب نہیں ہے؟"

"میرا تجربہ یہی ہے۔ جستجو کی گرم جوشی میں بلا کی ترنگ ہوتی ہے' لیکن پا لینے کے بعد روح خالی ہو جاتی ہے اور انسانی ڈھانچہ محض جینے کا بہانہ تلاش کرتا ہے۔"

میں نے مسکرا کر کہا......

"جیسے آپ جی رہے ہیں۔ جیسے امثل جی رہی ہیں!؟"

امثل نے فوراً جواب دیا۔

"اور اس کے بعد آپ کو بھی جینا ہوگا۔"

"ہاں...... میں جیوں گا...... میں جینا چاہتا ہوں......" میں نے ایک حد تک مصنوعی جوش سے کہا۔

"میں تمام امنگوں اور آرزوؤں کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ مسٹر انتونی کا بھی یہی خیال ہے کہ آدمی مصروف رہے اور پھر میری زندگی ایسی بے مقصد بھی نہیں ہے۔ میں ہرگز مایوس نہیں ہوں۔ میں جستجو جاری رکھوں گا!"

"ہاں......" امثل ہنس پڑی...... "یہی ہوگا۔ یہی ہوگا' لیکن آپ عام آدمی نہیں ہیں کہ جستجو کا سلسلہ جاری رکھ سکیں۔ آپ ذہین آدمی ہیں۔ وہ دن بے تابی سے آپ کا منتظر ہے' جب جستجو دم توڑ چکی ہوگی اور آپ دوراہے پر کھڑے ہوں گے اور منزل کا تعین نہ کر سکیں گے اور آپ غور کریں گے کہ زندگی کیا چیز ہے......!؟"

اس لمحے بیرا اندر آ گیا اور مجھ سے کہنے لگا۔

"سر...... خانزادہ تاج اکبر خان صاحب نے آپ کو سلام بھیجا ہے۔"

"خان زادہ تاج اکبر خاں!" میں حیرت اور خوشی سے تقریباً اچھل پڑا......

"کہاں ہے بھئی۔ کب آیا ہے......؟"

"سر آج ہی آئے ہیں۔ وہ جب بھی آتے ہیں' ہمارے ہوٹل ہی میں ٹھہرتے ہیں۔ آپ کا معلوم ہوا تو فوراً سلام کہلوایا۔ نمبر دو میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"اچھا اچھا' میرا سلام کہہ دو' بس میں آ رہا ہوں۔"

بیرا چلا گیا' تو میں نے امثل اور عاطف کو بیک وقت مخاطب کیا۔

"واہ خوب! خان زادہ عجیب و غریب کردار ہے۔ آپ اسے مل کر چونکیں گے میرے ساتھ پڑھتا رہا ہے۔ کالج کے زمانے میں محمد شاہ رنگیلا کے نام سے مشہور تھا......"

تھوڑی ہی دیر میں دو نمبر پہنچا' تو تاج نے حسب عادت باہیں کھول دیں اور زور سے گلے لگایا۔ وہ اسی طرح تر و تازہ اور کھلنڈرا تھا اور قہقہے لگا رہا تھا۔ ایک نہایت ہی تندرست اور خوبصورت لڑکی صوفے پر بیٹھی تھی اور مسکرا کر ہم دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ تاج نے تعارف کرایا۔

"یہ میری دوست کشور ہے...... اور یہ میرا دوست وسیم ہے۔"

کشور نے ہنس کر سلام کیا۔ وہ خاصی قبول صورت لڑکی تھی۔ اس کی صحت قابل رشک تھی۔

خان زادہ نے کشور کی موجودگی کی پروا نہ کرتے ہوئے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔

"سنا ہے یار' بڑے مزے میں ہو۔ یہ لڑکی کون ہے' جس کے ساتھ بیزن منا رہے ہو......؟"

خان زادے سے ملاقات کی سطح اب تک یہی رہی تھی' لیکن اس کے ساتھ چند دن رہ کر اب میں خود کو زہر ہلاہل کا پیالہ پینے والوں کی فہرست میں شامل کر رہا تھا اور شاید وقت آنے پر ثابت قدم بھی رہ جاتا۔ اس لئے اس سے کہا "تاج پیارے' میں نے نیا جنم لیا ہے۔ میری عمر پندرہ بیس دن سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ جو اٹھائیس انتیس سال گزر گئے ہیں' بالکل بے معنی' بے مصرف اور ضائع ہوئے ہیں۔ یہ لڑکی' جس کا ذکر تم نے اپنے انداز میں کیا' اس سلوک کی مستحق نہیں ہے۔ مجھے جانتے ہو نا؟ میں ہر غیرو سے دارفتہ نعرے لگاتا تھا' ڈینگیں مارتا تھا' بلند آہنگ دعوے کرتا تھا' اس لڑکی سے پہلی ملاقات ہی میں جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا...... جو بھی اس سے ملتا ہے' چوکڑی بھول جاتا ہے۔ تاج! وہ لڑکی نہیں' ایسا پیغام ہے' جسے نیکی اور بدی کے فرشتوں نے ایک ساتھ زمین پر پہنچایا تھا...... ایسی صدا...... کہ جو سنے' اسی سمت بھاگے۔ وہ مثبت اور منفی کا منبع ہے۔ سرخ

اور سبز روشنی کا مینارہ...... لیکن جس طرح خوبصورت منظر کو اپنے وجود کا احساس نہیں ہوتا' اسی طرح وہ بھی نہیں جانتی کہ وہ کیا ہے۔ تاج! تم اس کا ذکر عزت سے کرو۔ کیونکہ تم میری دوستی کا حق اسی طرح ادا کر سکتے ہو!"

کشور اور تاج دونوں میرے رویے' لہجے اور انداز سے بوکھلا گئے تھے۔ ابھی انہوں نے اسی کو دیکھا نہیں تھا' مگر وہ اس کی شخصیت سے مرعوب ہو چکے تھے۔

تاج ڈوبتے لہجے میں بولا۔

"یار...... کوئی آدمی دوسرے آدمی سے اس قدر متاثر ہو سکتا ہے؟"

"ہاں...... کیونکہ میں نے جو کچھ کہا ہے' اس میں سے ایک لفظ بھی واپس لینے کے لئے تیار نہیں' میں انسانوں میں درجہ بندی کا قائل ہوں۔ کیونکہ یہ قانون قدرت کے عین مطابق ہے اور جو لوگ مساوات کا ڈھونگ رچاتے ہیں' وہاں بھی درجہ بندی مکمل رعونت کے ساتھ موجود ہے۔ اس لئے میں اس کا قائل ہوں۔ اسے مانتا ہوں اور اس کی بڑائی تسلیم کرتا ہوں اور اپنی بات کو دہراتا ہوں کہ میری عمر پندرہ بیس دن سے زیادہ نہیں۔ کیونکہ میں اتنے ہی دنوں سے اس کے ساتھ ہوں!"

"یار' میں اس لڑکی سے ملنا چاہتا ہوں۔ بشرطیکہ یہ کام تمہارے بس میں ہو؟"

"ہاں...... تم اس سے مل سکتے ہو' لیکن اپنی جاگیر اور خانزادے پن کے زعم میں نہ رہنا۔ چاندی اور سونا اس کے لئے پرکاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتے۔ وہ انتہائی سیر چشم لڑکی ہے اور دنیا کی کسی حیثیت سے بھی مرعوب نہیں ہے...... تم عادی ہو کہ لڑکیاں تمہارے ناز اٹھاتی ہیں اور تمہارے پیر دباتی ہیں۔ تمہارے ناخنوں کی تعریف کرتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں' بعد میں تم اپنی محرومی اور بے بسی کا ذمہ دار مجھے ٹھہراؤ گے!"

"یار کمال ہے......!" خان زادہ حیرت سے بولا...... "تم ہر لحظہ اس کی شخصیت کا بوجھ میرے کندھوں پر بڑھاتے جا رہے ہو۔ تمہارے پاس الفاظ ہی ختم نہیں ہوتے کہ اس کی تعریف کو محدود کر سکو۔ لوگ تو پیغمبروں کو ماننے میں آدھی چوتھائی صدی گزار دیتے ہیں اور تم بیس دن میں سب کچھ ہار بیٹھے ہو؟"

"تم نہیں سمجھو گے تاج' تم نہیں سمجھو گے۔ میری مانو تو اس سے ملنے کا خیال ترک کردو۔ نہیں تو سادھو بن جاؤ گے۔ دنیا تیاگ دو گے۔ کہیں کے نہ رہو گے۔"

خان زادہ ہنس پڑا۔

"یار وسیم' میں تمہاری طرح کچا نہیں ہوں۔ جب تک باپ دادا کی جائیداد کی آخری اینٹ بھی نیلام نہ کر لوں گا' گیروے کپڑے نہیں پہنوں گا۔ میں زندگی اور دولت کا مصرف جانتا ہوں۔ تمہاری طرح جذباتی بیوقوف نہیں ہوں۔ چار دن کی زندگی ہے۔ اگر قدرت نے منہ میں سونے کا چمچ دے کر مجھے پیدا کیا ہے' تو میں اسے پھینکنے کی حماقت کیوں کروں گا۔ کیونکہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں کہ میری پیدائش ایک جاگیردار کے گھر ہوئی ہے۔"

"اچھا' کشور کا کیا کرو گے' اکیلے ملو گے یا یہ بھی ساتھ جائیں گی......؟ اور اگر جائیں گی' تو ان کا تعارف کس حیثیت میں ہو گا؟"

"وسیم' تم ایسی باتیں کر رہے ہو' جیسے انٹرویو دینے جانا ہو اور تصدیق شدہ کیرکٹر سرٹیفکیٹ دکھانا لازمی ہو۔ بھئی میں کسی سے ڈرنے والا تو ہوں نہیں۔ کشور میری دوست ہے۔ جہاں جاتا ہوں' میرے ساتھ ہوتی ہے۔ اس کی موجودگی میرے لئے باعث ندامت نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ بھئی ٹھیک ہے۔ میں تمہارے کردار سے واقف ہوں اور مجھے کوئی اعتراض بھی نہیں' مگر ساری دنیا مجھ جیسی نہیں ہے۔ بعض لوگ وضع داری اور رکھ رکھاؤ کے قائل ہوتے ہیں۔"

تاج سے پہلے کشور بول اٹھی۔

"وسیم صاحب' اگر میری وجہ سے آپ کی پوزیشن پر حرف آتا ہے' تو میں نہیں جاؤں گی۔ ایک لڑکی کے ایک لڑکی سے ملنے میں آخر جارحانہ بھی کیا ہے۔ اور پھر سماجی حیثیت بھی قابل رشک نہیں ہے۔ خان زادہ صاحب مجھے دو ہزار روپے ماہوار دیتے ہیں اور اس سے میرا سارا کنبہ پلتا ہے۔ خدا بہت بے نیاز ہے۔ وہ بطلوں کے ساتھ بروں کو بھی رزق پہنچاتا

ہے۔ بھلا ہو خان زادہ صاحب کی بیگم کا...... نیک عورت ہیں۔ سود کا روپیہ گھر نہیں آنے دیتیں۔ تاج صاحب کا کچھ روپیہ بینک میں فکسڈ ڈیپازٹ ہے' جس کا سود دو ہزار روپے ماہوار بنتا ہے۔ تاج صاحب سود کا یہ سارا روپیہ مجھ پر خرچ کرتے ہیں۔ پانچ سو روپیہ میری کوٹھی کا کرایہ دیتے ہیں اور پندرہ سو روپیہ نقد میرے اخراجات کے لئے دیتے ہیں۔"

"واہ...... سود کے روپے کا کتنا خوبصورت مصرف ہے!"

میں نے بظاہر داد دی' لیکن کشور کی باتیں سن کر میرا کلیجہ کانپ گیا...... یہ عورت جو خان زادے کی داشتہ تھی' کتنی تلخ حقیقت اگل رہی تھی۔ اس کی باتوں میں احسان مندی کا کتنا زہر بھرا ہوا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ مسکرا رہی تھی۔ نہ جانے کتنے عرصے سے یہ تاجرانہ مسکان اس نے ہونٹوں پر سجا رکھی تھی۔ میری باتوں سے اس کی انا کو ٹھیس پہنچی...... تو وہ زخمی ناگن کی طرح تڑپ اٹھی تھی۔

اس کی مجروح خودی دیکھنے کے لائق تھی۔

تاج نے اس کا یہ انداز دیکھا' تو اس نے ملامت آمیز نگاہوں سے مجھے گھورا۔

"یار جانے دو' ہمیں کسی سے نہیں ملنا۔"

مجھے اب افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے امثل سے ملنے کی ایسی کڑی شرائط کیوں رکھیں۔ امثل تو ایسی لڑکی نہیں تھی کہ وہ کشور کے تعارف سے بھڑک اٹھتی...... دراصل یہ میری اپنی خودنمائی کا احساس تھا۔ میں خواہ مخواہ' بلاوجہ اپنی اہمیت جتا رہا تھا۔

امثل ٹھیک کہتی ہے...... کہ انسان بنیادی طور پر خودغرض ہے اور حیوان کی طرح ایک ہی ڈگر پر چلتا ہے...... اتنے دن امثل کے ساتھ رہنے کے باوجود لاشعوری طور پر میری جبلت کام کر رہی تھی اور میں وہی کمینہ آدمی تھا' جس کا ذکر امثل صبح و شام کرتی ہے...... اور پھر بھی مجھے غلط فہمی تھی کہ میں صحیح آدمی ہوں اور میں نے اپنی فطرت پر قابو پا لیا ہے اور میں اپنی روح کے دکھ کو پانے میں زود یا بدیر کامیاب ہو جاؤں گا...... لیکن یہ سب میرا وہم تھا' کیونکہ میں ناوانستہ امثل کی قربت پر اترا رہا تھا۔

اور یہ سب کچھ بے حد سطحی تھا۔

تاج شاید میرے رد عمل کو سمجھ گیا تھا۔ اس لئے وہ بے دلی سے ہنس پڑا۔

"یار وسیم' کوئی بات نہیں۔ پھر کبھی سہی...... کشور نے جھیل سیف الملوک نہیں دیکھی تھی' اس لئے چلے آئے۔ میرے لئے پنڈی' لاہور' کراچی اور جھیل سیف الملوک سب ایک جیسے مقام ہیں۔ تم تو جانتے ہو کہ میں پہاڑوں پر خوار ہونے کی بجائے دوستوں کی محفلیں زیادہ پسند کرتا ہوں۔ یہاں پر ہر آدمی کو موسم کے مزے میسر ہیں۔ شہر میں صرف ہمیں یہ سب کچھ میسر ہے۔ ہر آدمی ہماری زندگی پر رشک کرتا ہے۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ پہاڑوں پر مارے مارے پھریں اور روپیہ پانی کی طرح بہائیں۔"

خان زادہ کی باتیں اکثر ایسی ہی ہوا کرتی تھیں' لیکن تب اور اب میں بڑا فرق تھا۔ اب مجھے کوئی چیز اور کوئی بات انوکھی نہیں لگتی تھی اور نہ احساس برتری کا گھمنڈ رہا تھا۔ بلکہ اب تو میں اپنی ذات پر تنقید کر سکتا تھا۔ اسل کی قربت میں کم از کم یہ بات تو پلے پڑ گئی تھی کہ میں کوئی اعلیٰ ترین ہستی نہیں ہوں۔ اس لئے خان زادہ کی باتیں بالکل عام لگیں۔ جنہیں سن کر نہ مجھے غصہ آیا اور نہ پہلے کی طرح روایتاً داد دینے کو جی چاہا۔

بس میں چپ چاپ اس کی شکل دیکھتا رہا' جس پر موسم اور عمر نے ابھی تک کوئی اثر نہیں ڈالا تھا اور جو باپ دادا کی چھوڑی ہوئی دولت کے باعث اپنی انا اور تمکنت کا اظہار کر رہا تھا اور ایک ضرورت مند لڑکی بہن بھائیوں اور ماں باپ کو چھوڑ کر اس کے ساتھ ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی اور اپنی زخمی خودی کے ساتھ خان زادے کی دلجوئی کر رہی تھی۔

آزردہ اور دل برداشتہ' میں نے خان زادے سے اجازت چاہی۔ اس نے بھی ٹوٹے ہوئے دل سے الوداع کہی۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ہم دل ہی دل میں ایک دوسرے پر تنقید کر رہے تھے اور اجنبیت محسوس کر رہے تھے۔

کمرے میں پہنچا۔ اناطین سیاح ابھی تک بیٹھا ہوا تھا اور بحث جاری تھی۔ سیاح کہہ رہا تھا۔

"عجیب ہے انسان' ساری منطق' تمام جذبے' سارے احساسات' مکمل شعور اور صدیوں کی تہذیب کے باوجود ابھی تک اس میں حیوانیت کا عنصر سب سے زیادہ نمایاں ہے!"

اسل نے اس کی تائید کی۔

"آپ نے غور کیا ہے۔ بڑی بڑی پارٹیوں اور دعوتوں میں لوگ کھانے پر کس طرح پل پڑتے ہیں۔ ایسی چھینا جھپٹی کا مظاہرہ ہوتا ہے' جیسے یہ لوگ نصف صدی سے بھوکے ہوں۔ چہروں پر تناؤ۔ آنکھوں میں درندگی...... گدھ جس طرح متعفن لاشوں کو نوچتے ہیں' وہی وحشت مہذب انسان کے چہرے پر ہوتی ہے...... یہ سب عجیب لگتا ہے۔ نفرت انگیز' پندرہ منٹ بعد جب ان کے پیٹ بھر جاتے ہیں' تو پھر ان کی طمانیت دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ کوئی منہ کھولے دانتوں سے گوشت کے ریزے نکال رہا ہے اور کوئی سینے پر ہاتھ رکھ کر ڈکاریں لے رہا ہوتا ہے۔ کوئی بھی یہ نہیں سوچتا کہ اس کی بغل میں جو آدمی بیٹھا ہے' وہ اس کی حرکتوں سے کس قدر مجبور اور بیزار ہے کہ اس کی بے اعتنائی کی شکایت بھی نہیں کر سکتا...... تو یہ ہے جناب ہمارا مہذب انسان اور ہماری مادی ترقی کی انتہا۔ ایک وقت کی روٹی میں اس کی فطرت ننگی ہو جاتی ہے اور سارا ملمع اتر جاتا ہے!"

اناطین سیاح تائیدی انداز میں مسکرا رہا تھا۔

عاطف نے میری طرف دیکھا۔

"جناب وسیم صاحب' آپ کی غیر موجودگی میں طے پایا ہے کہ کل سوات کی تیاری کی جائے۔"

"شاید اناطین سیاح بھی ہمارے ساتھ جا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ وہ گلگت کی سڑک کھلنے تک یہیں رہیں گے۔ البتہ سوات جانے کی ترغیب انہوں نے دی ہے۔ یہ وہاں سے ہو کر آئے تھے۔ بہت تعریف کرتے ہیں۔"

میں نے ہنس کر کہا......

"یہ لوگ ہمارے ملک کے بارے میں ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔"

اسل بولی۔

"یہ آدمی مجھے بہت اچھا لگا ہے۔ پیغمبری کا دعویٰ نہیں کرتا۔ پھر بھی بہترین آدمی ہے۔ دنیا میں کتنے لوگ ہوں گے' جو اس طرح کے تجربوں سے دوچار ہوں گے' اور پھر اس طرح کے نتائج اخذ کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ اگر دنیا میں ایسے آدمیوں کی تعداد ایک ہزار بھی ہو جائے تو یہ دنیا رہنے کے قابل جگہ بن سکتی ہے!"

"چلو یہاں تک تو آئے۔ یہاں تک تو پہنچے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

ہم اردو میں باتیں کر رہے تھے۔ اٹالین سیاح ہمارے چہروں کو دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اجازت چاہی اور چلا گیا۔

میں نے اسل کی طرف دیکھا......

"اگر سوات جانے کا پروگرام ہے' تو ہم رات یہاں کیوں ٹھہریں۔ میرے خیال میں یہاں کا کام ختم ہو چکا ہے۔ ابھی کافی وقت ہے۔ ہم رات نو دس بجے تک ایبٹ آباد پہنچ سکتے ہیں۔"

"وقت کی پابندی کی زنجیروں سے نہ جانے آپ کب آزاد ہوں گے۔"

اسل نے ہنس کر جواب دیا...... "وہی فوجیوں کی طرح کل کے مارچ پاسٹ کا بگل کی آواز پر اٹھنا' اور مقررہ وقت پر بیرک کو چھوڑ دینا۔ آپ اپنے اعصاب کو وقت کی زنجیروں میں کیوں جکڑ دیتے ہیں' جب کہ پریڈ میں شامل ہونے کی پابندی سے بھی آزاد ہیں۔ تاریخ پیشی کے عذاب سے بھی بری الذمہ ہیں اور انٹرویو کی فکر بھی دامن گیر نہیں ہے!؟"

میں بھی ہنس پڑا۔

"دراصل میں زمین کا آدمی ہوں اور زمین پر پائی جانے والی تمام خامیاں مجھ میں آئی ہیں۔ ہر چند کہ چوکس رہتا ہوں' پھر بھی بھول ہو ہی جاتی ہے۔"

عاطف نے مداخلت کی۔

"دراصل کل جانے کی تجویز میری ہے۔ میں ایک دن اور زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ یہ

صراط آج کے بجائے کل عبور کیا جائے!"

"مجھے آپ سے اتفاق ہے۔ میرا بس چلتا تو یہاں سے واپس ہی نہ جاتا۔ کیونکہ یہاں زندگی زیادہ محفوظ ہے۔ مائی حوا اور باوا آدم کا مستقبل ہم سے زیادہ درخشاں ہے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" اسل نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا...... "میرا خیال ہے اگر انسان کی فطرت کو قناعت پر راضی کر لیا جائے' تو دنیا سے سارا فساد ختم ہو جائے۔"

یوں باتوں باتوں میں شام ہو گئی۔

صبح ناشتہ کر کے ہم ناران سے چل پڑے۔ جھیل سیف الملوک سات میل اوپر رہ گئی تھی۔ ہماری جیپ فطرت کی دو سربلند دیواروں کے درمیان معلق ہو کر دریائے کنہار کے ساتھ ساتھ جا رہی تھی۔ دریا اور جیپ دونوں کا رخ جنوب کی طرف تھا۔

یہ دریا آگے جا کر دریائے جہلم کے پانیوں میں گم ہو جائے گا۔ چند سو میل کے بعد جہلم کی ساری سرکشی بھی دریائے سندھ میں ضم ہو جائے گی۔ خود دریائے سندھ آگے جا کر اپنی تمام جولانیوں کے ساتھ بحیرہ عرب کی گود میں سو جائے گا۔ بلندیاں پستیوں سے ہمکنار ہونے کے لئے کس قدر بے تاب ہوتی ہیں اور اس مقصد کے لئے کتنا طویل سفر طے کرتی ہیں...... شاید دونوں کا خمیر ایک ہوتا ہے!

حسب معمول بالاکوٹ تک یہ سفر پانچ گھنٹے میں ختم ہوا۔ تقریباً چار بجے ہم ایبٹ آباد پہنچ گئے۔ مسٹر ایبٹ کا آباد کیا ہوا یہ شہر ضلع ہزارہ کا ضلعی صدر مقام ہے۔ چاروں طرف سرسبز و شاداب پہاڑ ہیں۔ درمیان میں دس پندرہ مربع میل کا خوبصورت ہموار خطہ' جہاں ایبٹ آباد کا چھوٹا سا صاف ستھرا خوبصورت شہر' چھاؤنی اور پاک فوج کی مشہور کاکول اکیڈمی ہے۔ سطح سمندر سے ایبٹ آباد کی اونچائی تقریباً چھ ہزار فٹ ہے۔ مری جتنا ہنگامہ اور رونق نہیں ہوتی' لیکن متین قسم کے لوگ مری کے مقابلہ میں ایبٹ آباد کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جون جولائی میں بھی موسم خاصا خوشگوار ہوتا ہے۔ مری یہاں سے صرف چالیس میل دور ہے۔

رات ہم پیلس ہوٹل میں ٹھہرے...... صبح ناشتے سے فارغ ہوئے' تو جیپ ڈرائیور

نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ ہمارے ساتھ سوات جانے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ تقریباً نو بجے ہم ایبٹ آباد سے نکل گئے۔

ہری پور سے ہوتے ہوئے حسن ابدال سے ہم جی ٹی روڈ پر نوشہرو پشاور کی طرف ہو گئے..... کچھ دیر بعد ہم اٹک پہنچ گئے..... اٹک چھوٹا سا تاریخی قصبہ ہے۔ یہاں مغلوں کا بنایا ہوا وہ مشہور قلعہ ہے' جس کا ایک سرا پہاڑ پر اور دوسرا سرا دریائے سندھ کی موجوں کو چومتا ہے۔ یہیں پر دریائے کابل جسے دریائے لنڈا بھی کہتے ہیں' دریائے سندھ سے آملتا ہے..... یہیں پر وہ تاریخی پل بھی ہے جو پنجاب اور سرحد کو ملاتا ہے۔ یہاں کسٹم کی چیکنگ پوسٹ بھی ہے۔ لنڈی کوتل اور باڑہ میں غیر ملکی مال کی منڈیوں کی وجہ سے اس چیکنگ پوسٹ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس وقت بھی یہاں تین چار گاڑیاں کھڑی تھیں..... اسل کسٹم کے عملے کو گاڑیوں کی تلاشی میں مصروف دیکھ کر بولی۔

"عجیب تماشہ ہے۔ جس کی طرح لنڈی کوتل اور باڑہ بھی پاکستانی علاقے ہیں۔ وہاں غیر ملکی مال کی آمد پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ ان منڈیوں میں اس مال کی خرید پر بھی کوئی پابندی نہیں ہے۔ لیکن جب یہ مال خرید کر سرحد اور پنجاب کے اندرونی اضلاع میں منتقل کیا جاتا ہے' تو یہ جرم بن جاتا ہے اور سرکاری عملہ کارروائی شروع کر دیتا ہے۔"

"دراصل یہ قانونی نہیں سیاسی مسئلہ ہے۔" میں نے اپنی رائے دی۔ "حکومت قبائلیوں کو مصروف رکھنا چاہتی ہے' اور یہ جو پکڑ دھکڑ ہوتی ہے' سنجیدگی سے نہیں ہوتی۔ تھوڑا بہت مال پکڑا جاتا ہے۔ اخباروں میں اس کا ذکر آتا ہے۔ لوگوں کو باور کرایا جاتا ہے کہ پابندی اور گرفت موجود ہے' لیکن اکثر نظر انداز ہی کیا جاتا ہے۔ ایک حد تک یہ دانشمندانہ پالیسی کارگر ثابت ہو رہی ہے۔"

"ہاں....." اسل چڑنے کے بجائے ہنس پڑی..... "ایک لحاظ سے حکومت کا نقطۂ نگاہ بالکل منطقی ہے۔ بے آسرا کو پکڑ لو اور سفارشی کو چھوڑ دو۔ یہ منطق انسانی نفسیات اور فطرت کے عین مطابق ہے!"

اٹک کے اس پار خیر آباد کے بعد اکوڑہ خٹک کا قصبہ آیا۔ یہ وہی قصبہ ہے جس میں ایک جیالا خٹک سو رہا ہے۔

جب میں نے اسل کی توجہ اس قصبے کے پس منظر کی طرف مبذول کرائی' تو وہ فوراً بولی۔

"ہاں ہاں..... میں نے اقبال کی کسی نظم میں پڑھا تھا۔ آپ خوش حال خان خٹک کی بات کر رہے ہیں نا جس نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ میری قبر ایسی جگہ بنانا' جہاں میں مغلوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سن نہ سکوں' ورنہ میری روح بے چین رہے گی!"

"ہاں..... میں اسی خٹک کی بات کر رہا ہوں' جو بیک وقت تلوار اور قلم کا دھنی تھا۔ جو ساری زندگی مغلوں کے خلاف لڑتا رہا۔ دیوان خوشحال خان خٹک پشتو ادب میں آج بھی سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔"

"غالباً اس کی لڑائی اورنگ زیب عالمگیر کے خلاف ہی رہی.....؟" اسل نے پوچھا۔

"ہاں..... اس کی وجہ یہ تھی کہ پٹھانوں نے مغلوں کی برتری کو کبھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ پہلے شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو نکالا تھا۔ اس کے بعد خٹک یہ کام انجام دینا چاہتا تھا۔ مغلوں سے پہلے بھی پٹھانوں نے ہندوستان پر حکومت کی تھی۔"

"میرا خیال اس سے مختلف ہے۔" اسل بولی..... "خوشحال خان خٹک سچا شاعر تھا اور ایک حساس شاعر ایسے بادشاہ کو کس طرح گوارا کر سکتا تھا جس نے تاج و تخت کی خاطر باپ کو قید اور بھائیوں کو تہ تیغ کر دیا تھا۔"

مجھے یاد ہے' میں نے اس دور کے پشتو کے ایک اور مشہور شاعر رحمان بابا کا ایک منظوم ترجمہ پڑھا تھا۔ اس صوفی شاعر نے بھی اپنے کلام میں اورنگ زیب عالمگیر کی شدید مذمت کی تھی۔

اب ہم نوشہرہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اسل بولی۔

"سنا ہے خٹک بڑا شاعر تھا؟"

"یقیناً بڑا شاعر تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "جس کی عظمت کو علامہ اقبال نے تسلیم کیا ہے' وہ یقیناً بڑا ہی ہوگا۔ میں نے ایک کتاب پڑھی تھی۔ اس میں خوشحال خان و اقبال کے فلسفے کا تقابل کیا گیا تھا۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ ایک بار شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر بہ نفس نفیس لشکر جرار لے کر خوشحال خان خٹک کی سرکوبی کے لئے دہلی سے چل پڑا۔ خٹک نے پٹھانوں کو جمع کیا اور ان سے یوں خطاب کیا۔

"اے شاہین اور عقاب کی اولادو۔
کچھ سنا تم نے......؟
کووں کی فوج دہلی سے چل پڑی ہے۔
عقابوں کو زیر کرنے کے لئے!
ہاں ہاں یہ سچ ہے۔
شکار خود شکاریوں کی طرف آرہا ہے۔
اٹھو' آگے بڑھو' حملہ کرو۔
کووں کی سیاہ فوج کو اٹک کے اس پار ہی دبوچ لو۔
ان کے کالے پر نوچ لو۔
انہیں ایسا سبق سکھاؤ کہ آئندہ پھر کبھی زندگی میں "عقابوں کے نشیمن" کا رخ نہ کریں!"

"واہ خوب......! کیسا اچھوتا خیال ہے۔" اٹلی بے ساختہ بولی۔ میں نے بات جاری رکھی۔

"ایک بار مغل شہنشاہ نے اسے رنتھمبور کے قلعہ میں قید کر دیا تھا۔ صبح کا وقت تھا' ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ خوش حال خان خٹک نے ہوا سے یوں خطاب کیا:

"اے ٹھنڈی ہواؤ۔
مجھ سے اٹکھیلیاں نہ کرو۔
میں تمہیں محسوس نہیں کروں گا!

جاؤ...... دور...... باد شمال کے گلے لگ جاؤ۔
سرحد کے کہساروں سے ٹکرا کر آؤ'
میری محبوبہ کی زلفوں سے کھیل کر آؤ'
پھر واپس آؤ' اور میرے سینے سے ٹکراؤ'
پھر میں تمہیں محسوس کروں گا......!!

میں نے دیکھا...... اٹلی چپ ہوگئی تھی اور ٹکٹکی باندھے سامنے دیکھ رہی تھی......

میں نے مڑ کر عاطف کی طرف دیکھا۔ اس کا منہ کھلا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ گردن ایک طرف کو جھک گئی تھی۔ وہ مزے کی نیند سو رہا تھا۔ کیونکہ اب وہ کاغان کی پیچیدہ اور تنگ سڑک کی بجائے کھلی ہموار ہائی وے پر سفر کر رہا تھا اور اس کے دائیں ہاتھ کہنار کے بجائے ایک خاموش اور شریف دریا بہہ رہا تھا۔

اب ہم نوشہرہ پہنچ گئے تھے۔ یہاں ہم نے سرحد کے مشہور چپل کباب سے لنچ کیا...... بلوچستان کے "روز" کی طرح سرحد کا چپل کباب بھی اپنی ایک الگ حیثیت اور منفرد ذائقہ رکھتا ہے...... اور آپ کو فوراً محسوس کراتا ہے کہ آپ کا سفر رائیگاں نہیں گیا۔

لنچ کے بعد ہم نے اسی دکان سے قہوہ پیا۔ اس قہوے کی خوشبو اور ذائقہ ہی انوکھا تھا...... پنجاب اور سندھ بلکہ پورے برعظیم میں قہوے کا یہ ذائقہ نصیب نہیں ہوسکتا!

نوشہرہ کے کشتیوں کے پل سے ہم نے دریائے کابل کو عبور کیا اور دائیں ہاتھ مردان اور سوات جانے والی سڑک پر مڑ گئے۔ اب ہمارے بائیں ہاتھ رسالپور کی چھاؤنی تھی' جس میں پاک فضائیہ کا کالج ہے۔ یہ وہی مشہور کالج ہے' جس میں نہ صرف پاکستان بلکہ تمام عرب ممالک کے کیڈٹ تربیت کے لئے آتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد ہم زمین کے اس خطے میں داخل ہو گئے' جسے دنیا کی زرخیز ترین زمین کہا جاتا ہے...... مردان میونسپلٹی کا ایک بورڈ اس کی تصدیق کر رہا تھا۔ بورڈ پر لکھا تھا۔

دی لینڈ آف شوگر اینڈ تمباکو!

یہاں دنیا کا بہترین تمباکو پیدا ہوتا ہے اور گنا اس بہتات سے کہ ایشیا کی سب سے بڑی شوگر مل سال میں ایک تحصیل کا گنا ختم نہیں کر سکتی اور پھر اس علاقے کا گنا' اتنا میٹھا ہو چینی اتنی ذائقہ دار' چمکدار' خوشبودار کہ لاکھوں کا زرمبادلہ کمائے ------ یہاں تو گڑ بھی مٹھائی کا ذائقہ رکھتا ہے۔

ٹیکسلا سے لے کر سوات تک پرانے زمانے کے کھنڈرات' چٹانوں پر کندہ تحریریں' بدھ مت کی عبادت گاہیں' راہب خانے' قدم قدم پر گندھارا تہذیب کے نشان دیکھ کر اور ان آثار قدیمہ میں گھومتے ہوئے انسان عجیب و غریب احساسات میں گھر کر رہ جاتا ہے------ محسوس ہوتا ہے کہ یہ زندگی کتنی ناپائیدار ہے اور ہم سے پہلے کیسی کیسی تہذیبیں اور کیسے کیسے لوگ بسر ہو چکے ہیں۔

وہ بھی جنکی کوئی امید بر نہ آئی اور وہ بھی جن کی خواہش سپھل ہوئی ہوگی۔

لیکن آج ان کا کوئی نام لیوا نہیں ہے۔ دونوں مٹی میں مل چکے ہیں۔ وہ بھی جنہوں نے اس تہذیب پر احسان کئے ہیں اور وہ بھی جنھوں نے اس تہذیب کو داغ لگائے ہیں۔

دونوں ختم ہو چکے ہیں!

اب اس وادی میں سیدھی سادی بہادر قوم بس رہی ہے' جو نہیں جانتی کہ تہذیبیں کس طرح بنتی اور اجڑتی ہیں اور انسانی نسل کو تہذیبوں کی ضرورت ہے بھی یا نہیں------؟ لیکن وہ ایک بات ضرور جانتی ہے کہ عزت نفس کے لئے مرنا کتنا ضروری ہوتا ہے!

یہ نسل سنسناتی ہوئی گولیوں میں آنکھ کھولتی ہے اور شاذ و نادر ہی طبعی موت مرتی ہے۔ یہاں مردانگی سے مرنا زندگی کا سب سے البیلا کھیل سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ ان کا عقیدہ ہے کہ!

زندگی کا اصل مقصد ہی جی داری سے مرنا ہے!

مردان' سخاکوٹ اور تخت بائی سے گزر کر اب ہم ملاکنڈ کے بے آب و گیاہ' سنگلاخ اور اونچے پہاڑ پر چڑھ رہے تھے۔ اگر ہمارے جیپ ڈرائیور نے کاغان روڈ پر زندگی نہ

گزاری ہوتی' تو ایک بار یقیناً اس کا دل دہل جاتا۔ اگرچہ کاغان روڈ کے مقابلے میں یہ سڑک کھلی اور پکی تھی' مگر پھر بھی اس پہاڑ کی اپنی ایک شخصیت تھی۔

کچھ دیر بعد ہم اوپر ملاکنڈ پہنچ گئے------ یہاں ملاکنڈ ایجنسی کے دفاتر اور کھانے پینے کی دکانیں بھی ہیں۔ ہم چائے کے لئے رک گئے۔ یہ صاف ستھری اور خوبصورت جگہ ہے۔

یہاں سے سوات کے لئے اترائی شروع ہو جاتی ہے۔ چند میل کے سفر کے بعد ہی احساس ہونے لگتا ہے کہ اگلے موڑ پر ایک خوبصورت جادوئی وادی آنے والے مسافروں کے لئے سینہ وا کئے منتظر ہوگی------ اور ہوا بھی یہی------ جونہی ہماری جیپ ایک ڈھلان سے موڑ کاٹتی ہوئی اوپر پہنچی' نہایت ہی خوبصورت' پر فضا' کشادہ اور سرسبز و شاداب وادی اپنی تمام تر جولانیوں اور رعنائیوں اور اداؤں کے ساتھ دامن پھیلائے ہوئے تھی۔

یہ منظر اس طرح ہماری نظروں کے سامنے آیا' جیسے کسی انگریزی فلم کا رنگین منظر اچانک پردہ سکرین پر کھل گیا ہو------ اس وادی کے بیچوں بیچ دریائے سوات اژدہے کی طرح بل کھاتا ہوا اور اطراف کے شاداب کھیتوں کو چومتا ہوا منزل کی طرف رواں دواں تھا۔

ہمارے بائیں ہاتھ میلوں تک پھیلی ہوئی چراگاہ مخملیں گھاس کی چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ اس میں ہزاروں گائیں اور بھینسیں چر رہی تھیں اور ان کے فربہ جسم چمک رہے تھے۔

ہمارے بائیں ہاتھ ایک اور سڑک الگ ہو گئی تھی۔ یہ دیر کو جا رہی تھی۔ عاطف نے کہا۔

"اچھا ہوا' اطالین سیاح کے کہنے پر ادھر آ گئے------ واقعی یہ دنیا کتنی حسین ہے۔ دو آنکھوں کے بجائے چار آنکھوں سے دیکھنے کے لائق۔"

"اور یہ سڑک دیکھو۔" میں نے عاطف سے کہا------ "سفیدے کے سیدھے اور بلند و بالا درختوں نے کیا سماں باندھ رکھا ہے۔ میلوں تک دو رویہ درختوں کے درمیان کولتار

کی سڑک' کسی سمائی دلہن کی طرح گھونگھٹ کاڑھے ہوئے ہے!"

امثل ہنس پڑی۔

"اب تھوڑی سی کوشش کے بعد آپ شعر کہہ سکیں گے۔"

میں نے ہنس کر جواب دیا......

"نہیں......! میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ فطری طور پر میں فنکار نہیں ہوں۔ بقول اثالین سیاح' میں کینہ پرور اور انتقام لینے والا آدمی رہا ہوں۔ میرا سینہ فنکارانہ نور سے خالی ہے!"

امثل ہنس رہی تھی اور دائیں ہاتھ کے پہاڑوں کے لامتناہی سلسلوں کو دیکھ رہی تھی۔ بائیں ہاتھ باغات اور کھیت تھے جن میں کسان کام کر رہے تھے۔ سڑک کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد تھے۔ جگہ جگہ گوبر کے ڈھیر لگے ہوئے تھے جن میں مرغیاں ٹھونگیں مار رہی تھیں۔ گھروں کے ساتھ ساتھ' چھوٹی چھوٹی نالیوں میں دریائے سوات سے کٹی ہوئی نہر کا میٹھا میٹھا شفاف پانی سانسیں لیتا بہہ رہا تھا۔ نالیوں کے دائیں بائیں مختلف پودوں کی جھاڑیں پھیل گئی تھیں اور ان میں چھوٹے چھوٹے بنفشی رنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے۔

کچھ دیر کے بعد ہم مینگورہ پہنچ گئے...... مینگورہ سوات کا ضلعی صدر مقام ہے۔ دائیں ہاتھ کو سوات کا خوبصورت کالج' دائیں اور سامنے پہاڑ کے دامن میں سیدو شریف جہاں والئی سوات کے خوبصورت محلات ہیں۔ سوات ہوٹل' جہاں ہمیں آسانی سے کمرے مل گئے تھے' یہاں کا سب سے ماڈرن' مہنگا اور خوبصورت ہوٹل ہے۔ یہ کئی بلاکوں میں بنا ہوا ہے اور اس میں سائنسی دور کی ہر سہولت موجود ہے۔ لاہور کے فلیٹیز اور راولپنڈی کے فلیش مین کی طرح بڑے بڑے کمرے خوبصورت پردوں اور دبیز قالینوں سے آراستہ ہیں۔ پاکستانی اور یورپین کھانوں کے ساتھ ساتھ' چاق و چوبند بیرے' کرایہ لاہور اور کراچی کے اے کلاس ہوٹلوں کے برابر۔

ہوٹل کے ہر بلاک کے سامنے ماڈرن تراش خراش کے لان' جن میں رنگ برنگے

پھولوں کے علاوہ ناشپاتی اور سیب کے پیڑ بھی لگے ہوئے تھے' جن میں سرخ دموں والی بلبلیں چہک رہی تھیں۔

آج کا باقی دن ہم نے ہوٹل میں گزارا۔

ڈنر کے بعد ہم لان میں بیٹھ گئے...... چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ دھیمی دھیمی ہوا چل رہی تھی اور ہلکی ہلکی خنکی تھی...... گلاب کے تختوں اور رات کی رانی کے کنج سے خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں اور ہماری روحوں کو چھیڑ رہی تھیں۔

گلاب اور رات کی رانی کی مہکاروں نے مل کر دو آتشہ شراب کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔

روح کی گدگدی کے لئے بھی کیسے کیسے بہانوں کی ضرورت ہوتی ہے!

بیرہ کافی لایا...... چھ فٹ کے اس لمبے نوجوان کے چہرے پر بے پناہ حجاب تھا۔ اس کی ہر حرکت میں فطری شرمیلے پن کا حسن اور معصومیت تھی...... وہ شہر کے طرار اور چرب زبان بیروں سے بالکل مختلف تھا۔

جب وہ پیالوں میں کافی ڈالنے لگا' تو امثل نے اس سے تنخواہ کے بارے میں پوچھا...... میں نے دیکھا۔ اس بیرے میں ذرا بھی چالاکی نہیں تھی۔ حیا اس کی آنکھوں میں سے جھانک رہی تھی۔ اس نے دیکھے بنا غیر قدرتی لہجے میں کہا۔

"جی اسی روپے!"

"صرف اسی روپے!" امثل حیرت سے بولی...... "تمہاری تو عیالداری بھی ہوگی۔ گزر کیسے ہوتی ہے؟"

"جی بس ہو جاتی ہے۔ میرے تین بچے ہیں۔ ماں باپ زندہ ہیں۔ ایک بہن بھی ہے۔ ہم سب اکٹھے رہتے ہیں۔"

ہم نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ چھ فٹ کا یہ گرانڈیل جوان صرف اسی روپے کے عوض بندھا ہوا ہے۔

امثل نے پوچھا...... "تم کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"جی یہیں کا۔۔۔۔۔ یہاں سے چار میل پر مرغزار کے راستے میں میرا گاؤں ہے۔ و
دس بجے کے بعد میں گھر چلا جاتا ہوں اور صبح سویرے واپس آ جاتا ہوں۔ آپ اگر مر
کی سیر کو جائیں گے تو میرے گاؤں کے پاس سے گزریں گے۔"

"مرغزار کوئی اچھی جگہ ہے کیا۔۔۔۔؟" امل نے پوچھا

"جی بہت خوبصورت جگہ ہے۔ وہاں میاں جی بادشاہ گل کا محل ہے۔ سفید پتھر
ہوا' پانی کے چشمے ہیں۔ خوبصورت جھرنے ہیں۔ سوات آنے والا ہر سیاح وہاں ضرور
ہے۔"

"اچھا تو ہم بھی جائیں گے۔ مگر واپسی پر دوپہر کا کھانا تمہارے گھر کھائیں گے
تمہارے بچوں سے ملیں گے۔ کیا تمہیں چھٹی مل جائے گی؟"

ہیرے نے بوکھلا کر امل کی طرف دیکھا۔ ساری گفتگو میں پہلی بار اس نے امل
آنکھ ملائی تھی' مگر اس کی نظروں میں بے یقینی تھی۔

امل اس کی بوکھلاہٹ کو سمجھ گئی۔

"دیکھئے' روکھی سوکھی جو بھی ہو ہمیں منظور ہے۔ اور ہم آئیں گے بھی اس شرط پر
جو دال' روٹی آپ کھاتے ہیں' اسی میں ہمیں بھی شریک کریں گے' ورنہ اگر آپ تکلف
کریں گے' تو ہم نہیں آئیں گے۔"

"جی مجھے منظور ہے!" اس کا اعتماد بحال ہو رہا تھا۔۔۔۔ "لیکن دال روٹی کی شرط
رکھیں۔ میرا جو فرض ہے' وہ مجھ پر چھوڑ دیں۔"

"نہیں بھئی نہیں۔۔۔۔۔ دعوتیں تو ہم روز ہی کھاتے ہیں۔ اگر آپ کو ہماری خوشی
منظور ہے' تو ہماری بات مانیں' ورنہ تو کوئی فائدہ نہیں۔"

وہ ہنس پڑا۔

"اچھا۔۔۔۔ جیسی آپ کی خوشی!"

رات ہم کمروں کے اندر چادر اوڑھ کر سوئے۔۔۔۔۔ صبح حسب پروگرام مرغزار کے
لئے روانہ ہو گئے۔۔۔۔۔ مرغزار جانے والی سڑک والی ء سوات کے محل کے پاس سے

گزرتی ہے۔۔۔۔۔ سڑک پر جگہ جگہ سیب کے درخت تھے' جن میں سرخ سرخ سیب لگے
ہوئے تھے۔ یہ سیب سیزن ختم ہونے کے بعد بھی درختوں میں لگے رہتے ہیں' تاکہ
سیاحوں کے لئے راستہ دیدہ زیب بنا رہے۔

چوتھے میل پر وزیر خان کھڑا تھا۔ اس نے مسکرا کر ہمیں رکنے کا اشارہ کیا۔ اس کے
ہاتھ میں گہرے آسمانی رنگ کی کیتلی اور قہوے کی پیالیاں تھیں۔

ہم حیران اور خوش خوش جیپ سے اتر آئے۔ امل نے اس سے کہا۔

"ارے بھائی اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی۔ ہم واپسی پر کھانے کے لئے تو آ ہی
رہے تھے۔"

"نہیں جی' تکلیف کیسی' یہ پیچھے میرا گھر ہے۔ مجھے آپ کا انتظار تو کرنا ہی تھا۔"

اس نے پیالیوں میں قہوہ انڈیل کر باری باری سب کو پیالی تھما دی۔۔۔۔۔
پیار کے دو میٹھے بولوں نے وزیر خان کا من موہ لیا تھا۔۔۔۔۔ وہ کس قدر خوش تھا اور
اس کی آنکھیں کتنی روشن تھیں۔

قہوے کا ذائقہ بھی وہی تھا' جو اس سے پہلے ہم سرحد اور بلوچستان میں چکھ چکے تھے۔
وہی خوشبو' وہی نفاست' وہی نزاکت' قہوہ چاہے کسی پٹھان کی دوکان کا ہو' یا گھر کا۔۔۔۔۔
نیکی کی طرح اس ثقافت کا حسن ہے!

جوں جوں ہم اوپر چڑھتے گئے' دو پہاڑوں کے درمیان کی یہ گھاٹی تنگ ہوتی جا رہی
تھی۔ چیڑ کے لمبے درخت اونچے اور تناور ہوتے جا رہے تھے۔ سڑک کے دائیں بائیں
جنگلی ناشپاتی کے پیڑوں میں کچی ناشپاتیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہم سے چند رہ میں قدم نیچے
ایک مترنم ندی بہہ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہم مرغزار پہنچ گئے۔۔۔۔۔ یہاں گھاٹی ختم ہو گئی تھی۔۔۔۔ بائیں ہاتھ
بڑی بڑی دیو ہیکر چٹانیں اس طرح دست و گریباں تھیں' جیسے زمانہ قدیم کے دیو ایک
دوسرے سے لڑتے لڑتے منجمد ہو گئے ہوں۔ ان کی دراڑوں اور جوڑوں میں سے
چھوٹے چھوٹے جھرنے گر رہے تھے اور ان پر سبز کائی جمی ہوئی تھی۔

دائیں طرف سنگ مرمر کی بنی ہوئی محل نما ماڈرن کوٹھی تھی' جس کے دونوں طرف سرسبز خوبصورت لان تھے' جن میں سنگ مرمر کے بنچ لگے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ سنگ سفید کی ملائی کی طرح نرم ملائم چوکور میزیں رکھی ہوئی تھیں...... سرو کے پیڑوں کی تراش نہایت نفیس تھی اور رنگا رنگ مختلف اقسام کے پھولوں کے تختے بے حد دلکش لگ رہے تھے۔ ہمارے علاوہ اور بھی یہاں بہت سے لوگ تھے۔ ان میں زیادہ تر غیر ملکی سیاح تھے۔

سوات آنے والا ہر آدمی سب سے پہلے مرغزار پہنچتا ہے۔ کیونکہ یہاں پہنچنے کے لئے مینگورہ سے ویگنیں آسانی سے مل جاتی ہیں اور فاصلہ بہت کم ہے۔

کمروں کے اندر قیمتی قالین اور ماڈرن صوفہ سیٹ لگے ہوئے تھے' جو شاذ و نادر ہی استعمال ہوتے ہوں گے۔ چند سرونٹ کوارٹر بھی ہیں' جن میں والی ء سوات کے ملازم رہتے ہیں۔

کوٹھی کے تینوں اطراف اونچے اونچے پہاڑ ہیں' جو چیڑ کے درختوں سے اٹے ہوئے ہیں۔

کچھ دیر گھوم پھر کر ہم واپس چلے آئے۔

وزیر خان حسب معمول راستے میں کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں جھلمل جھلمل کر رہی تھیں۔ اس کے تینوں بچے بھی ہمارے استقبال کے لئے موجود تھے۔

ناشپاتیوں کے جھنڈ میں مٹی کا ایک کوٹھا تھا۔ جس میں آٹھ افراد پر مشتمل یہ کنبہ رہتا تھا۔ کوٹھے سے ذرا فاصلے پر آڑو کے درخت کے نیچے چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ جس پر وزیر خان کا بوڑھا باپ بیٹھا کچھ کات رہا تھا۔ بڑھیا بھی اس کے قریب زمین پر بیٹھی اس کی مدد کر رہی تھی۔

کوٹھڑی کے باہر صحن میں دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ جن پر صاف ستھرے تکیے لگے ہوئے تھے۔ قریب ہی ٹھنڈے پانی کا گھڑا پڑا تھا' جس پر کائی جم گئی تھی۔

دائیں ہاتھ کی دیوار کے ساتھ چھت کے بغیر چھوٹا سا باورچی خانہ تھا' جس کی دیواریں

ڈھائی فٹ اونچی تھیں۔ وزیر خان کی بہن اور بیوی باورچی خانے میں بیٹھی کھانا پکا رہی تھیں...... ہم چارپائیوں پر بیٹھ گئے تھے۔ وزیر خان دست بستہ کھڑا تھا اور اس کے تینوں گورے چٹے خوبصورت بچے' جن میں ایک لڑکی اور دو لڑکے تھے' چارپائیوں کے پاس کھڑے خوش خوش مگر شرما شرما کر ہمیں دیکھ رہے تھے۔

وزیر خاں کی بہن اور بیوی باری باری اٹھ کر کمرے میں جاتیں اور ضرورت کی چیزیں لا کر باورچی خانے میں گم ہو جاتیں...... یہ دونوں خوبصورت عورتیں تھیں۔

اتنے میں بوڑھا اور بڑھیا بھی آ گئے۔ دونوں نے پشتو میں خوش آمدید کہا۔ بوڑھے نے عاطف اور مجھ سے ہاتھ ملایا۔ دونوں سرخ اور سفید تھے...... بوڑھے کے ہاتھ پاؤں اس عمر میں بھی بے حد مضبوط تھے اور ستر بہتر کے لگ بھگ ہونے کے باوجود تندرست اور توانا تھا۔ بڑھیا کے بال کھچڑی تھے اور اس کے خدوخال نہایت نمایاں...... وزیر خاں کی شکل ماں سے بہت ملتی جلتی تھی۔ لگتا تھا' جوانی میں یہ عورت یکتا ہو گی......!

امثل اچانک کھڑی ہو گئی...... اور وزیر خاں سے بولی۔

"میں آپ کی بہن اور بیوی سے ملوں گی۔"

وزیر خان مسکراتے ہوئے امثل کو باورچی خانے کی طرف لے گیا۔ عورتیں امثل کو دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسنے لگ گئیں۔ وہ دونوں اردو نہیں جانتی تھیں۔ وزیر خاں نے انہیں پشتو میں کچھ کہا تو اس کی بہن نے فوراً امثل کو بیٹھنے کے لئے چوکی پیش کی...... اب وہ تینوں بیٹھ گئی تھیں۔

ہانڈی میں مرغی بھونی جا رہی تھی۔ امثل نے یہ سب کچھ دیکھا' تو اس نے وزیر خان سے کہا۔

"دیکھئے صاحب' آپ نے یہ سب تکلف کیوں کیا۔ ہم نے آپ سے کہا نہیں تھا کہ جو کچھ آپ کھاتے ہیں' وہی ہم بھی کھائیں گے۔"

"بی بی جی......!" اس کے لہجے میں بے حد نرمی تھی...... "ہم تو پیاز اور چٹنی سے گزارہ کرنے والے لوگ ہیں۔ مکئی کی روٹی گڑ کے ساتھ کھا لیتے ہیں' لیکن یہ ہماری

روایت نہیں ہے کہ مہمان کے سامنے سوکھی روٹی رکھ دی جائے۔ آپ نے یہاں آنے کی عزت بخشی ہے تو اسے بھی ہماری خوشی سمجھ لیجئے۔"

امثل ہنس پڑی------ اب وہ وزیر خاں کی وساطت سے اس کی بیوی اور بہن سے باتیں کر رہی تھی۔ آدھ گھنٹے کے بعد جب وہ واپس آئی تو بے حد خوش تھی۔ نہایت مسرور------!

وہ کہہ رہی تھی۔

"وسیم صاحب' بہت اچھا ہوا ہم یہاں آگئے۔ بہت ہی اچھا ہوا۔ میں نے دو کنواریوں کو دیکھا------ ایک تین بچوں کی ماں ہے۔ دوسری اصل کنواری ہے۔ لیکن تین بچوں کی ماں بھی بالکل اپنی نند کی طرح شرمیلی' تازہ اور شگفتہ اور پیاری ہے۔ ہنستی ہے' تو گلستاں کھل جاتے ہیں۔ سرخ سرخ ہونٹ موتیے کی کلیوں جیسے دانت' خاوند کو اس طرح دیکھتی ہے' جیسے آج ہی بیاہ کر آئی ہو۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں حجاب کی پریاں رقص کناں' ایسی شرم و حیا میں زندگی میں پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ عورت ہوں مگر اسے دیکھ کر مجھے سکون ملا ہے۔ ایسا بھرا' بھرا' ممتا ممتا حسن شاید پھر کبھی دیکھنے کو نہ ملے۔ وسیم صاحب' وہ عورت نہیں' پکاسو کی فاختہ ہے------!"

مجھے امثل کے شدید رد عمل سے خوشی ہوئی------ کہیں تو آکر وہ ایک دو لمحوں کے لئے رک گئی تھی۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

"شکر ہے۔ آپ امن کی قائل ہو گئیں۔"

"ہاں------ اگر امن اس عورت کا روپ ہے' تو میں قائل ہو گئی ہوں۔ اگر دنیا کی ہر آدمی کی بیوی وزیر خاں کی بیوی کا روپ لاتی' تو واقعی دنیا میں امن ہو تا۔ پھر وہ سونے کی کان کی تلاش نہ کرتا اور پیاز سے روٹی کھا کر بھی خوش رہتا!"

میں نے پوچھا------ "کچھ باتیں بھی ہوئیں؟"

"ہاں------ میں نے اس سے پوچھا' تمہیں اپنے شوہر سے محبت ہے؟ یہ بات وزیر خان نے اسے سمجھائی۔ پہلے تو اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پھر معاً ہنس پڑی اور پورا

منہ میں دبا کر ہنسی روکنے لگ گئی۔ وہ مجھ سے آنکھ نہیں ملا رہی تھی اور ہانڈی میں چمچ ہلانا بھول گئی تھی۔ مجھے یہ سب کچھ یوں لگا گویا میں کسی دوسرے سیارے کی مخلوق سے مخاطب ہوں' جہاں سکہ رائج الوقت کا رواج نہیں ہے اور نہ نوٹ چھاپنے کی مشین ایجاد ہوئی ہے!"

کھانے پر بیٹھے تو سوات ہوٹل کی نفیس پلیٹیں ہمارے سامنے سجا دی گئیں۔ وزیر خان نے کہا۔

"یہ پلیٹیں آپ کی خاطر ہوٹل سے مانگ کر لایا تھا۔ کیونکہ ہم لوگ تو مٹی کے برتنوں میں کھاتے ہیں۔"

امثل نے کہا۔

"مٹی کے برتنوں کے شوق میں تو ہم یہاں آئے تھے۔ آپ نے ہمارا شوق میزبانی کی نذر کر دیا۔"

وزیر خان لاجواب ہو کر باپ کو دیکھنے لگ گیا۔ باپ اپنی جگہ خفیف ہو رہا تھا...... دراصل یہ سارا کنبہ ہی بھیڑوں کا کنبہ تھا۔ چھل دل سے خالی۔ صاف ستھرے' کھرے اور سچے لوگ' تین بچے' تین جوان اور دو بوڑھے' سب ایک ہی درخت کے میٹھے پھل تھے۔

امثل بولی۔

"زندگی کی ضروریات کتنی کم ہیں۔ کتنے محدود ذرائع سے آدمی زندہ اور خوش رہ سکتا ہے۔"

عاطف نے کہا۔

"کیا مذاہب نے ایسی باتوں کی تلقین نہیں کی------؟"

"مذہب کے ذریعے جو بات ہم تک پہنچتی ہے' اس کا مزاج جذباتی ہو جاتا ہے۔ دنیا میں ایک ایسا نقطہ نگاہ رائج کرنا چاہیے جو محض انسانی ہو۔ اس کے وجود کی منطق یہ ہو کہ انسان کو انسان سے ورثے میں ملا ہے۔"

"مثلاً اشتراکی نقطہ نگاہ------؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں ......!" اس نے تردید کی...... "اشتراکی نظریہ پہلے سوچا گیا ہے۔ بعد میں اس پر عمل کیا گیا ہے۔ انسان کی روح پر اجتماع کی بالادستی کس طرح جائز ہو سکتی ہے...... میرا مطلب تھا' انسانی تجربے' زندگی کی اعلیٰ مثالیں مثلاً اس کنبے کا سکھ' ناران کی مائی کی مثال' یہ ہیں وہ سچائیاں جو انسان کو وراثت میں ملنی چاہئیں اور اس کے ذہن اور روح میں گھلا دینی چاہئیں۔"

امثل کا رویہ بہت مختلف تھا۔ میں نے خوش ہو کر کہا۔

"شکر ہے کہ آپ انفرادی مثالوں اور تجربوں کی قائل ہوتی جا رہی ہیں۔"

"دنیا میں کون ایسا شخص ہو گا' جو انسان کی بہبود پر خوش نہ ہو' لیکن یہ تو محض ایک خواہش ہے۔ اٹالین سیاح جتنے تجربے اور مشاہدے کے بعد ہی ایسی اچھی خواہش جنم لیتی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ایسی خواہش کے ساتھ ساتھ اس پر انسانی فطرت کے راز بھی پوری طرح کھل چکے ہوتے ہیں' چنانچہ ایسی خواہش ٹوٹے دل سے کی جاتی ہے!"

"لیکن اس میں جینے کی امنگ تو ہوتی ہے۔"

"ہاں...... جینے کا بہانہ' جیسے اس کنبے کو دیکھ کر میرے دل میں اُبھل پڑی ہے۔ میں ان جیسے رویئے کی خواہش رکھتی ہوں۔ مگر فطری طور پر ان جیسی نہیں ہوں۔ میں وزیر خان کی بیوی کی فطرت کس طرح اپنا سکتی ہوں یا آپ وزیر خان جیسے شاکر اور قانع کس طرح بن سکتے ہیں۔ ان کی روحوں پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔ کیونکہ ان لوگوں نے تاریخ نہیں پڑھی۔"

میں خاموش ہو گیا...... کھانے کے بعد قہوہ بھی پیا جا چکا تھا۔ امثل رخصت لینے کے لئے دوبارہ باورچی خانے کی طرف گئی۔ وہ دونوں ہنستی ہوئی اس کے قریب آ گئیں۔

امثل نے شکریہ ادا کر کے جب ہاتھ ملانے کے لئے آگے بڑھایا تو دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔

ہاتھ ملانے کی بجائے وزیر خان کی بیوی امثل کے گلے لگ گئی۔

امثل نے اس کی گردن چوم لی۔

اب امثل نے وزیر خان کی بہن کو بھی گلے لگایا...... ماں ایک طرف کھڑی اس منظر سے محظوظ ہو رہی تھی۔

امثل اس کی طرف بڑھی' تو بڑھیا نے آگے بڑھ کر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر اس کی پیشانی چوم لی۔

یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے امثل کو جذباتی روپ میں دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر گہری طمانیت تھی...... یہ بے حد خوبصورت لمحے تھے۔

ایسے ہی ہوتے ہیں وہ لمحے' جو اچانک' پلک جھپکتے میں جنم لیتے ہیں اور پھر ہمیشہ کے لئے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور پھر ایک خواب کی طرح دھندلی دھندلی یادیں چھوڑ جاتے ہیں۔ میں سوچ رہا تھا...... کہ اگر ایسے غیر متوقع خوشی کے جھونکے آتے جاتے رہیں' تو پھر یہ زندگی ایسی بری بھی نہیں ہے!

جب ہم ہوٹل واپس آ گئے' تو عاطف نے کہا۔

"وزیر خان آدمی نہیں سونے کا ٹکڑا ہے۔ اگر چاہو تو ہم اسے ساتھ لے جائیں اور ڈھائی تین سو روپے کی نوکری پر لگا دیں۔"

"نہیں بھائی جان نہیں......!" امثل نے تجویز رد کر دی...... "اسے بسی بسائی جنت سے نہ نکالیں۔ اسے قناعت کی بستی میں رہنے دیں۔ اسے ضرورتوں میں ملوث نہ کریں۔ اسے بہتر زندگی کا لالچ نہ دیں۔ کیونکہ اس کے پاس جو کچھ ہے' وہ خوب سے خوب تر ہے اور پھر ہم اس عورت کا حق کیسے چھین سکتے ہیں' جس کے منہ میں موتیے کی کلیاں اگی ہوئی ہیں اور جس کی آنکھیں جام جم کا تصور پیش کرتی ہیں!"

دراصل ہم تینوں اس حسین اور شریف خاندان سے پوری طرح متاثر ہو چکے تھے۔ باجرے اور مکئی کی روٹی کھانے والے اس خاندان کے چہروں پر مسرت اور شادمانی کی ایسی تازگی تھی' جیسے مالکوس کا راگ سن کر روح میں امن کی لہریں رواں دواں ہو جاتی ہیں۔

وزیر خان کی آنکھوں کا حجاب بلاوجہ نہیں تھا۔ جو لوگ بے باک اور زود آمیز ہوتے ہیں' دنیاوی طور پر بے شک کامیاب گردانے جاتے ہیں' لیکن ان کے سینے کھوکھلے اور ان کی

روحیں خالی ہوتی ہیں...... وہ وزیر خان کی طرح حیا و حجاب کی دولت سے مالا مال نہیں ہوتے اور نہ وزیر خان کی طرح ان کی روحیں شاداب ہوتی ہیں۔

یہ بات تو صرف اہل دل ہی جانتے ہیں کہ دونوں میں امیر کون ہوتا ہے؟

صبح ہم تیار ہو کر نکلنے والے تھے کہ دو یورپین سیاحوں نے ہم سے لفٹ کی درخواست کی۔ ان میں سے ایک انگریز تھا اور دوسرا سویڈن کا رہنے والا' امثل نے فوراً ہاں کر دی۔

آج ہم مدائن اور بحرین کی طرف جا رہے تھے۔ میں اور امثل آگے' وہ دونوں عاطف کے ساتھ پیچھے بیٹھ گئے۔

سڑک پکی تھی۔ بائیں ہاتھ سبزی مائل نیلگوں خوبصورت دریائے سوات مخالف سمت بہہ رہا تھا۔

دونوں سیاحوں کی داڑھیاں بڑھ گئی تھیں۔ مگر وہ ہپی نہیں لگ رہے تھے۔ کیونکہ وہ صاف ستھرے تھے اور شستہ لہجے میں بات کرتے تھے۔

امثل نے پوچھا۔

"آپ کون لوگ ہیں اور کس لئے سیاحت کر رہے ہیں؟"

سویڈش سیاح بولا۔

"میرا ساتھی بہت دکھی ہے۔ دکھوں کو بہلانے نکلا ہے۔ مجھے کوئی دکھ نہیں' مگر سکھ کی تلاش میں ہوں!"

امثل ہنس پڑی۔

"آپ بھی ہماری طرح کے لوگ ہیں!"

سویڈش بھی ہنس پڑا۔

"ہم نے آپ کو پہچان لیا تھا۔ اس لئے بلا جھجک لفٹ کی درخواست کر دی تھی۔"

"ٹھیک ہے۔" امثل بولی...... "زمین اتنی سمٹ گئی ہے کہ پہچاننا مشکل نہیں رہا۔ کیا وجہ ہے کہ زندگی میں تجسس بھی باقی نہیں رہا اور تلاش محدود ہو گئی ہے۔"

دونوں سیاح چونکے۔ امثل نے انگریز کی طرف دیکھا۔

"آپ تو اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں' جس کی روایات ضرب المثل ہیں۔ جو بہت بڑی قوم ہے اور جس کا نظم مثالی ہے۔ پھر کیا بات ہے کہ آپ بکھر گئے ہیں؟"

وہ چند لمحے خاموش رہا۔ پھر ہولے سے بولا۔

"میں قاتل ہوں...... قاتل کی باتوں سے آپ کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے!"

ہم سب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا' مگر سویڈش نے اس کی تردید کی۔ "یہ غلط کہتا ہے۔ اس نے کوئی قتل نہیں کیا۔ یہ محض ایک احساس گناہ ہے' جس نے اس کو جکڑ رکھا ہے۔"

انگریز سیاح نے بے حد تحمل سے کہا۔

"اگر زہر دے کر یا چاقو مار کر یا گولی مارنے سے ہی آدمی قاتل کہلا سکتا ہے' تو میں قاتل نہیں ہوں' لیکن اگر کوئی میرے انتظار میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے اور میں اس کی خبر نہ لوں' تو آپ مجھے کیا کہیں گے؟ اگر کوئی پیار کے دو بول سننے کے لئے تڑپ رہا ہو اور میں اس کی طرف جھانکنا بھی گوارا نہ کروں تو آپ مجھے کیا کہیں گے......؟ اگر کوئی آدمی اتنا نحیف و نزار ہو جائے کہ اپنا سوکھا حلق گیلا کرنے کے لئے تڑپ تڑپ کر جان دے دے اور کوئی اس کی مدد کو نہ پہنچے' تو آپ اسے کیا کہیں گے......؟ اور بالفرض ایسا شخص باپ ہو' تو کیا اس کا بیٹا قاتل نہیں گردانا جائے گا؟"

ہم کسی حد تک اس کی بات سمجھ گئے تھے۔ اس نے بات جاری رکھی۔

"دوستو...... میں قاتل ہوں۔ میرا پورا معاشرہ اس قتل میں میرا شریک ہے۔ وہ شخص جس نے مجھے جنم دیا' جس نے مجھ سے بے حد پیار کیا' جس نے مجھے پالا پوسا اور تعلیم دلائی...... وہ شخص جب مرا' تو ہم تین بہن بھائیوں میں سے کوئی بھی اس کے پاس نہ تھا۔ نہ جانے وہ کتنے دن بیمار رہا اور کتنے دن تڑپتا رہا۔ پورے چار دن اس کی لاش گلتی سڑتی رہی۔ اس کا فلیٹ اندر سے بند تھا۔ اگر دودھ کی بوتلوں کا ڈھیر نہ لگ جاتا' تو نہ جانے اس کی لاش کا مزید کیا حشر ہوتا۔ پڑوسیوں نے پولیس کو اطلاع کر دی اور یوں فلیٹ کا دروازہ توڑ کر اس کی متعفن لاش تک رسائی ہوئی' جو پلنگ سے نیچے پڑی تھی......

ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق وہ پیاس بجھانے کے لئے تپائی سے تھرماس لینے کی کوشش میں پلنگ سے گر پڑا تھا' لیکن جسم میں طاقت نہیں تھی کہ دوبارہ اٹھتا۔ لہٰذا وہیں فرش پر دو دن دو راتیں مسلسل تڑپتا رہا اور دم توڑ دیا۔۔۔۔۔ ایک شادی شدہ جوان بیٹی اور دو شادی شدہ جوان بیٹوں کا باپ یوں کسمپرسی کی موت مر گیا۔۔۔۔۔ جب میں نے اس کا کھلا منہ' کھلی آنکھیں اور اکڑا ہوا جسم دیکھا' تو مجھے سکتہ ہو گیا۔ یہ وہ شخص تھا جو اپنی صحت اور خوش پوشی کے لئے مشہور تھا اور جس کی خوبصورت تصاویر ہم تینوں بہن بھائیوں کے ڈرائنگ روموں میں لگی ہوئی تھیں۔ ہم نے یہ تصاویر محض روایتاً لگائی تھیں۔ اگر ہمیں اس سے ہمدردی اور محبت ہوتی' تو پیاسا نہ مرتا اور نہ اس کی لاش گلتی سڑتی۔ اگر ہم انسان ہوتے اور ہمارا احساس زندہ ہوتا تو وہ نہایت تسلی سے کسی بیٹے کے گھر مر سکتا تھا۔ اسے کم از کم یہ اطمینان تو ہوتا کہ اس بھری دنیا میں اس کا بھی کوئی ہے اور وہ اپنے پیاروں کے درمیان مر رہا ہے' جو عزت اور احترام سے اس کا جنازہ اٹھائیں گے اور اس کے لئے آنسو بہائیں گے۔۔۔۔۔ ہاں تو میں الزام دے رہا ہوں' اپنے آپ کو اور اپنے سماج کو' جس نے ہمیں بے درد' بے حس اور بے پرواہ بنا دیا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ میری اولاد جس سے آج میں اتنا پیار کر رہا ہوں' کل کیا میرے ساتھ یہی سلوک نہیں کرے گی۔۔۔۔۔؟ ہمارا سماج ہمیں یہ کیوں سکھاتا ہے کہ ہم صرف اپنے لئے جئیں اور اگر سماج نے ہمیں نہیں سکھایا اور ہم خود ہی ایسا کرتے ہیں' تو پھر ہم حیوان ٹھہرے نا۔ پھر ہم انسانیت کے دعوے اور پرچار کیوں کرتے ہیں۔ کتابیں کیوں لکھتے ہیں۔ ادب کیوں پیدا کرتے ہیں اور گداز دل کی باتوں کو کیوں سراہتے ہیں؟ دوستو۔۔۔۔۔ میں قاتل ہوں۔ اس سماج سے بھاگا ہوا قاتل جہاں روزانہ اسی طرح باپ مرتے ہیں۔ مائیں مرتی ہیں اور اخباروں کے ذریعے ان کی موت کی اطلاع ان کی اولاد تک پہنچتی ہے!"

اسل خاموش تھی' کیونکہ جو کچھ انگریز سیاح کہہ رہا تھا' خود اسل کے دل کی آواز تھی۔۔۔۔۔

میں نے اس سے کہا۔

"کاش آپ کل ہمارے ساتھ ہوتے اور دیکھتے کہ زندگی میں کتنی رعنائی ہوتی ہے۔"
انگریز کے بجائے سویڈش نے پوچھا۔

"آپ نے کیا دیکھا ہے؟"

"پکاسو کی فاختہ۔۔۔۔۔!" میں نے جواب دیا۔۔۔۔۔ "اس کے تنکوں کا گھونسلہ' گھونسلے میں زرد زرد کچی چونچوں والے بے بال و پر بچے' جو ماں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سن کر اپنی چونچیں کھول دیتے تھے۔ ان کی ماں اپنے منہ کی غذا ان کی چونچوں میں ڈال دیتی تھی۔ ہم نے کل وہاں زندہ رہنے کا سبق سیکھا اور یہ بھی کہ امن کس طرح ملتا ہے؟"

سویڈش سیاح بولا۔

"اپنا اپنا تجربہ ہے۔ میرے ملک کا مسئلہ جنسیت اور مشین ہے۔ جنس کی طرح مشین بھی بیس پچیس برس چلتی ہے۔ اس کے بعد اس کے کل پرزے گھس جاتے ہیں اور وہ بے کار ہو جاتی ہے۔ تب آدمی سوچتا ہے' اب میرا اس زمین پر کیا کام۔ کیونکہ روٹی' کپڑا اور مکان میرے ملک کے مسائل نہیں ہیں کہ انسان خود کو ان کے حصول کے لئے مصروف رکھے۔ اب بتایئے' میں اپنے ملک کے آدمی کو کس طرح بچاؤں؟"

"آپ اسے مرنے دیں۔" اسل چمک کر بولی۔۔۔۔۔ "آپ اسے کیوں بچانا چاہتے ہیں۔ اسے بے مقصد زندگی کے عذاب میں کیوں مبتلا رکھنا چاہتے ہیں۔ چالیس پینتالیس سال جی لیا۔ بہت جی لیا۔ بنی نوع انسان کی خدمت کرنے سے تو وہ رہا۔ جنس کی لذتیت بھی جاتی رہی' تو اب اسے بڑھاپے کی ہولناک موت تک کیوں زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔؟ یوں بھی تم یورپ والوں کے لئے بڑھاپا ایک مسئلہ بن چکا ہے' تو پھر کیا حرج ہے کہ آدمی وقت پر رخت سفر باندھ لے اور مرضی سے مرے!"

"اگر یہ غیر قدرتی عمل ہے۔ مس۔" سویڈش تڑپ کر بولا۔

"اگر یہ غیر قدرتی عمل ہے' تو پھر کیا وجہ ہے کہ سوئٹزرلینڈ کی طرح آپ کے ملک کا آدمی بھی پینتیس چالیس سال کے بعد عام طور پر خودکشی کرنا پسند کرتا ہے؟ میں سمجھتی ہوں کہ اس عمر تک پہنچتے پہنچتے اس کی تمام امنگیں پوری ہو جاتی ہیں اور تمام حسرتیں نکل

جاتی ہیں۔ اس لئے مزید جینے کا جواز باقی نہیں رہتا' ایک جیسی لذتوں سے اس کا دل بھر جاتا ہے اور ایک جیسی زندگی سے اکتا جاتا ہے۔ سونے' کھانے پینے اور نہانے اور شیو کرنے کے سوا اس کے پاس کیا باقی رہ جاتا ہے------؟ بازار' کلب' سینما' گھڑ دوڑ سب ایسے مشاغل ہیں۔ ان میں روح کے گداز کا عمل نہیں ہوتا۔ اس لئے آدمی اسے ہمیشہ جاری نہیں رکھ سکتا۔"

دونوں سیاح نہایت غور سے اسل کی باتیں سن رہے تھے۔ جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے' سوات کی وادی خوبصورت ہوتی جا رہی تھی۔ دریا کے ساتھ ساتھ زمینیں آباد تھیں اور اردگرد کے پہاڑ سرسبز و شاداب تھے۔

دونوں سیاح چپ ہو گئے تھے۔ سوئیڈش کچھ سوچ رہا تھا۔ میں نے اسل سے کہا۔

"آپ کی باتوں سے سیاح کچھ سوچ میں پڑ گیا ہے۔"

اسل نے مڑ کر دیکھا اور ہنس پڑی------ اور سیاح سے بولی۔

"میں آپ کے دکھ کو سمجھ رہی ہوں۔"

سیاح نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"یعنی آپ میرے دل کی بات سمجھ رہی ہیں؟"

"ہاں------ یورپ والوں کا مسئلہ یہ ہے کہ انہیں جمہوریت کی وجہ سے مکان' کپڑا روٹی اور جنس ہر چیز میسر آ گئی۔ سکھ اور آسائش کی بہتات نے انہیں تھکا دیا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ کثرت آسودگی بھی نفسیاتی بیماری بن جاتی ہے------ آپ کی بدقسمتی یا خوش قسمتی' کہ آپ کسی ڈکٹیٹر یا بادشاہ کی رعایا نہیں تھے۔ ورنہ آپ اشتراکیت میں بڑی اچھل پاتے اور ایک دن اپنی حکومت کا تختہ الٹ دیتے۔ پھر ایک دن آتا' آپ پر واضح ہو جاتا کہ آپ دنیا کے مصروف ترین انسان ہیں اور آپ مشین کے پرزے کی طرح کام کرتے ہیں اور جیسے کہ پرزے میں کوئی امنگ نہیں ہوتی' اسی طرح آپ کا سینہ بھی ہر خواہش سے خالی ہو چکا ہے۔ لیکن اس پرزے کی طرح جو تیل کی چکناہٹ کی وجہ سے حرکت جاری رکھتا ہے' آپ بھی مجبور ہوتے اور سفر جاری رکھتے------ مگر میں سمجھتی ہوں

ہ اس طرح کا سفر' جس میں آپ کی مرضی شامل نہ ہوتی' جاری رکھنا' مرنے سے زیادہ [illegible]کل کام ہوتا۔ تو اے میرے یورپ کے دوستو' شکر کرو کہ مرنا آپ کے اختیار میں ہے [illegible] زمین کا بوجھ کم کرنے میں آپ اپنی صلاحیتیں استعمال کر سکتے ہیں!"

"آپ کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو اشتراکی نقطہ نظر پسند نہیں؟"

"میں ذہنی طور پر اس نظریہ کی ایک حد تک قائل ہو گئی تھی' مگر میرے وجدان نے [illegible]سے قبول نہ کیا' کیونکہ وہاں فرد کے احساس کو پنپنے نہ دیا گیا۔ تھیوری اور عمل میں بہت [illegible]ق اور بعد نکلا۔ یورپ والے تو ہم سے زیادہ کیمونزم کو سمجھتے ہیں۔ ہم مشرق والے تو [illegible]ر بھی روٹی' کپڑے اور مکان کے لالچ میں آ جاتے ہیں' مگر یورپ کے لئے تو یہ نعرے [illegible]ے معنی ہو چکے ہیں------ ہاں یہ اور بات کہ کیمونزم کے جن سے بچ نکلے تو آپ کو [illegible]شحالی کے عفریت نے دبوچ لیا ہے اور آپ کی روحوں میں گھٹن کا احساس پیدا ہو چلا [illegible]ے' مگر آپ خبر نہیں رکھتے کہ آپ کے دکھوں کی بنیاد کیا ہے!"

اسل کی باتوں سے انگریز سیاح بھی چونک گیا تھا۔ وہ تشکیک کے لہجے میں بولا۔

"آپ کی باتیں مجھے عجیب و غریب لگ رہی ہیں' مگر مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرے دماغ [illegible]ہ کسی گوشے میں جگہ پا رہی ہیں۔ آپ نے جو خوشحالی کے عفریت کا ذکر کیا ہے' کیا آپ [illegible]ہ نہیں کریں گی کہ اپنا مفہوم یوں بیان کریں کہ خوشحال معاشرہ بے حسی کا دوسرا نام [illegible]ہ یا یہ کہ بے حسی خوشحال معاشرے کی بنیاد رکھتی ہے------؟"

اسل نے کہا------

"آپ اگر خوشحالی کو مادی خوشحالی کہہ رہے ہیں' تو پھر مجھے آپ کے مفہوم پر اعتراض [illegible]ں ہے۔ کیونکہ روحانی اور مادی خوشی میں بہت فاصلہ ہے۔"

"ہاں ہاں وہی------ میں اس فرق کو سمجھتا ہوں۔ میں مادی خوشحالی کی بات کر رہا ہوں' [illegible]ساد کی جڑ ہے۔ جس کے حصول میں ہم اپنے پیاروں سے بیگانے ہو جاتے ہیں۔ جس [illegible]خاطر ہم ہر بے ایمانی کو جائز اور ہر بے راہ روی کو وقت کا تقاضا کہتے ہیں۔"

سوئیڈش سیاح نے اس کی بات کاٹی۔

"ان باتوں سے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر خوشحالی بھی خوشی کا باعث نہیں بن سکتی' تو پھر جمہوریت بھی بے کار چیز ہے۔ پھر تو اشتراکیت پر ہی اکتفا کرنا پڑے گا!؟"

"ہرگز نہیں......!" ایمل نے سختی سے تردید کی...... "اشتراکی آدمی بالکل غیر فطری زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ جمہوریت بری بھلی' اشتراکیت سے بہرحال بہتر ہے۔ کم از کم انسان کی امنگوں پر تو پہرے نہیں ہوتے۔ آدمی اتنا تو بااختیار ہوتا ہے کہ اپنی مرضی سے زندگی گزارے۔ اپنی پسند کا پیشہ اختیار کرے۔ پاسپورٹ اور ویزہ ہی سہی' باہر کی دنیا میں تاک جھانک کے حق سے تو محروم نہیں رہتا' مگر آپ نے یورپ' افریقہ اور ایشیا میں کتنے سیاح دیکھے ہوں گے' جو اشتراکیت کے آہنی پردے سے باہر نکل سکے ہوں۔ غالباً ایک بھی نہیں۔ کروڑوں کی تعداد میں انسانوں کو پنجرے میں بند رکھنے والے نظام کو آدمی کس طرح پسندیدہ نگاہوں سے دیکھ سکتا ہے؟"

سویڈش اب بھی متذبذب تھا۔ بولا۔

"تو آپ کہنا چاہتی ہیں کہ ہوچی منہ کی مجاہدانہ جدوجہد بے کار تھی اور ماؤ نے چینیوں کے لئے کچھ نہیں کیا......؟"

"نہیں بالکل نہیں۔" ایمل نے پھر تردید کی...... "میرا مطلب یہ نہیں کہ یہ لوگ اپنے کام میں مخلص نہیں تھے۔ تاریخ ان کی عظمت سے انکار نہیں کر سکتی۔ میں تو کہتی ہوں کارل مارکس بھی سچا آدمی تھا۔ اس نے جو کچھ سوچا اور جو کچھ کیا' اس کی اساس بنی نوع انسان کی بہتری تھی...... یہ سب لوگ انسانی نسل کے بہترین لوگوں میں سے تھے' لیکن ان کے بعد جو لوگ برسراقتدار آئیں گے' وہ اس نظام کی شکل بدل دیں گے۔ جیسا کہ روس میں ہوا...... کرسی ملنے کے بعد اقتدار کی جنگ شروع ہو جاتی ہے اور انسان اپنے اصلی رنگ میں آ جاتا ہے۔ سٹالن نے اپنے ساتھیوں کا جو حشر کیا' وہی حشر خروشیف اور اس کے ساتھیوں نے اس کا کیا۔ پھر وہی حشر خروشیف کا ہوا...... ماؤ کے ساتھیوں نے بھی اس سے دغا کی' لیکن اصل جنگ ماؤ کے بعد شروع ہو گی...... اور پھر تماشہ یہ ہے کہ اس سارے ڈرامے میں عوام کا ذرا بھی حصہ نہیں ہوتا۔ اقتدار کی رسہ کشی جاری

رہتی ہے اور عوام کا عرصہ حیات تنگ ہو جاتا ہے۔ معاشرے کی برجستگی ختم ہو جاتی ہے۔ ولولے اور امنگیں سرد پڑ جاتی ہیں اور فرد کی بے ساختگی معدوم ہو جاتی ہے۔ اس میں ہوچی منہ اور ماؤ کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ یہ اس نظام کا تقاضا ہوتا ہے۔ ذاتی امنگ وہاں کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی جرمنی سے مشرقی جرمنی کو ایک آدمی نہیں بھاگا' لیکن مشرقی جرمنی سے مغربی جرمنی کو بھاگنے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے...... نتائج سامنے ہیں۔ آج مغربی جرمنی کی معیشت دنیا میں سرفہرست ہے۔ جبکہ یہی قوم مشرقی جرمنی میں اپنے نظام کی وجہ سے مفلس ہو گئی ہے...... تاریخ کا تو کام ہی یہی ہے کہ بے دردی سے کچل کر رکھ دے۔ جغرافیے کی اکھاڑ پچھاڑ اور نسلوں کا مزاج بدل دے اور قوموں کو اتھل پتھل کر دے اور نتائج آپ کے سامنے رکھ دے مگر کیا کیا جائے۔ انسان کی فطرت ہی ایسی ہے کہ اس پر غور نہیں کرتا' نہ نتائج سے سبق حاصل کرتا ہے اور نہ اصلاح کی خواہش رکھتا ہے اور نہ شاید اس کی گنجائش ہے...... تو پھر کیا کیا جائے......؟ یہی کہ منظر منظر گھومو۔ خوشی کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہو۔ لوگ کال کوٹھڑیوں میں بھی زندہ رہنے پر راضی ہیں۔ تو پھر کیا حرج ہے' ہم منظر منظر زندگی گزاریں......!؟"

میں نے دیکھا دونوں سیاح اس طرح مسحور ہو چکے تھے' جیسے ان کے جسموں پر جادو کی چھڑی پھر گئی ہو اور ان کے مسائل ختم ہو چکے ہوں۔

اب ہم مدائن سے آگے نکل گئے تھے۔ یہاں دریائے سوات پر پل عبور کرتے ہوئے ہمیں چھ سات لڑکیوں کی ایک ٹولی ملی جو سروں پر خشک لکڑیوں کے گٹھے اٹھائے قطار میں مدائن کی طرف جا رہی تھیں۔ یہ سب نوجوان تھیں۔ خوبصورت اور تندرست' خوبصورتی بھی ایسی' جیسے کوہ قاف کی ساری آبادی یہاں اتر آئی ہو اور یا یہ کہ کسی زمانے میں یہی علاقہ کوہ قاف کہلاتا ہو۔

عاطف جو بہت دیر سے خاموش بیٹھا تھا' بولا۔

"غربت اور حسن نے اس علاقے میں آگ لگا رکھی ہے!"

اصل ہنس پڑی۔

"بھائی جان کو موت کا خطرہ منڈلاتا نظر نہ آئے' تو یہ اچھی بات کہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ باتوں کی حد تک کبھی کبھی یہ سرمایہ دار سے سوشلسٹ بھی بن جاتے ہیں۔"

"یہ تو آج کل فیشن ہے۔" میں نے تائید کی...... "گلے میں ایک سو روپے کی ٹائی باندھنے والا شخص بھی تقسیم دولت کی تلقین کرتا ہے۔"

"اس لئے تو میں کہتی ہوں کہ سب فراڈ ہے۔ پہلے انکل سام پر سامراجی ہونے کا الزام لگتا تھا' اب سوشل سامراج کی پھبتی کسی جاتی ہے۔ دراصل سامراجیت شعور کی پیداوار ہے' جو راستے بتاتی ہے کہ پیسہ کس طرح اکٹھا کیا جاتا ہے' اور اسے کس طرح پھیلایا جاتا ہے۔"

پل کے اس پار ٹیلے پر مدائن ہوٹل تھا' جو محل وقوع کے اعتبار سے نہایت مناسب' موزوں اور خوبصورت تھا۔ اکثر سیاح یہاں ٹھہرتے ہیں۔

یہاں سے وادی تنگ ہو گئی تھی۔ دونوں طرف بلند و بالا شاداب پہاڑ' نیچے دریائے سوات کا نیلگوں پانی بڑی بڑی چٹانوں سے ٹکراتا اچھلتا جا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ سوات کا خوبصورت زمرد سبز پانیوں میں سے جھانک رہا ہے۔

کچھ دیر بعد ہم بحرین پہنچ گئے...... یہ چھوٹا سا خوبصورت قصبہ ہے' جس کے عین درمیان میں سے ایک تند و تیز برفانی نالہ گزر کر دریائے سوات سے جا ملتا ہے۔ یہاں بازار ہے۔ کھانے پینے کی دکانیں اور صاف ستھرے ماڈرن ہوٹل' یہاں پٹرول' ڈیزل' ہر چیز مہیا ہو جاتی ہے۔ تقریباً ہر ہوٹل میں ٹیلیفون کی سہولت بھی موجود ہے۔

ہم ایک ایسے ہوٹل میں بیٹھ گئے' جو دریائے سوات کے اوپر تقریباً معلق دکھائی دیتا تھا۔ لہریں اچھل اچھل کر ہم تک پہنچنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ دونوں غیر ملکی سیاح ہمارے ساتھ تھے۔ لنچ کے لئے ہم نے یہاں کے مشہور کڑاہی گوشت کا آرڈر دے دیا تھا۔

معدودے چند پاکستانی سیاحوں کے علاوہ ہوٹلوں میں ہر طرف ہپی بھرے ہوئے تھے۔

اسلام سے جیپیں آتیں۔ سیاح اترتے' منہ ہاتھ دھوتے' چائے یا قہوہ پیتے' کچھ دیر ادھر ادھر ٹہلتے' پھر مینگورہ کی طرف چل پڑتے۔

کھانے اور چائے کی دکانوں میں ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ پشتو' اردو اور پنجابی گانے بج رہے تھے...... اچانک ایک دکان سے سندھ کی مشہور لوک دھن شہباز قلندر کا یورپین آرکسٹرا سے آراستہ ریکارڈ بجنے لگا۔

دیکھتے ہی دیکھتے سڑک پر ہپیوں کا مجمع لگ گیا۔ سب دیوانہ وار ناچنے لگے۔ انہوں نے ایسا سماں باندھا' جیسے شہباز قلندر کے میلے پر مقامی فقیر دنیا و مافیہا سے بے خبر مست ہو کر ناچتے ہیں۔

ہپیوں کی جنونی کیفیت دیدنی تھی۔

میں نے ہنس کر کہا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیہون شریف کے ملنگ امریکہ اور یورپ کے ان ہپیوں کو ٹریننگ دے کر آئے ہیں!"

اصل بھی ہنس پڑی۔

"دراصل یہ اس دھن کا کمال ہے کہ لوگ از خود دیوانگی کے عالم میں پہنچ جاتے ہیں۔ میرا بھی دل ناچنے کے لئے مچل رہا ہے۔ درحقیقت لوک گیت یا لوک دھنیں' کسی زبان' کسی علاقے کے کیوں نہ ہوں' الفاظ اور معنی کے محتاج نہیں ہوتے۔ کیونکہ یہ ایک سیدھے سادے انسان کے بنیادی احساسات و جذبات کی ایک فطری رو ہوتی ہے' جو انتہائی عقیدت اور شدت جذبہ میں نمو پا کر انسان کے سینے سے باہر آ جاتی ہے۔ کیونکہ یہ علم اور مطالعے کے زور سے تخلیق نہیں ہوتے۔ اس لئے سیدھے جا کر روح سے سرگوشی کرتے ہیں۔"

میں نے موقع غنیمت جان کر کہا۔

"کہا جا سکتا ہے کہ اگر رنگ' نسل اور زبان نے دنیا کو گروہوں اور فرقوں میں بانٹ دیا ہے' تو لوک گیتوں کے ذریعے انہیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جا سکتا ہے۔ میرا خیال

ہے کہ انسانی جذبوں کا منبع ایک ہوگا؟"

"سیاست نے سب کچھ چاٹ لیا ہے۔ رحیم صاحب' کہتے ہیں تاکہ سیاست کا دل نہیں ہوتا۔ آج سے ہزاروں سال پہلے بھی بازار مصر کھلا تھا اور یوسف کے دام لگائے گئے تھے' تو پھر ہم اس دور میں اہل دل کہاں سے ڈھونڈیں گے؟"

عاطف ٹیلیفون کے لئے اٹھ گیا تھا۔ کیونکہ رات سوات ہوٹل سے اس نے راولپنڈی ٹیلی فون کیا تھا اور ایک دوست کو تاکید کی تھی کہ گلگت کے لئے ہوائی جہاز کی تین سیٹوں کا بندوبست کرے۔

اگرچہ عاطف اور میرے درمیان ایک غیر مرئی سمجھوتہ ہو چکا تھا اور میں جانتا تھا کہ امل کو جیتنے کے لئے وہ میری کسی بات کا برا نہیں مانے گا' پھر بھی مشرقی حجاب اور روایات آڑے آ جاتی تھیں اور میں ایک حد تک اس کے سامنے دل کی دھڑکنوں کے ذکر سے اجتناب کرتا تھا۔ چنانچہ جب وہ ٹیلی فون کے لئے اٹھ گیا' تو میں نے دھیرے سے کہا "اہل دل کی پہچان کس طرح ہوگی؟ امل' آپ کا تو معیار عجیب و غریب ہے۔ اگر کوئی دعویٰ کرتا ہے اہل دل ہونے کا' تو اس کا کہا مان لینے میں کیا حرج ہے؟"

"اہل دل ہونے کے دعوے کی کیا ضرورت ہے۔ لوگ اسے خود جان لیتے ہیں۔ اٹالین سیاح کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"اٹالین سیاح بہت خوش قسمت آدمی ہے کہ آپ اس کا ذکر بار بار کرتی ہیں۔ مجھے اس پر رشک آتا ہے اور کسی حد تک جلتا بھی ہوں کہ میں اس جیسا نہیں ہوں------!"

"نہیں------ آپ حسد نہ کیجئے------ وزیر خان کی بیوی جیسی میں بھی نہیں ہوں' مگر میں اس سے حسد نہیں کرتی۔ کچھ لوگ ہم سے اچھے ہوتے ہی ہیں۔ ان کی اس حیثیت کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ اس طرح ہمارا بار ہلکا ہو جاتا ہے۔"

سویڈش سیاح نے کہا۔

"آپ لوگوں کی باتیں سن کر ہمیں مشرق پر رشک آتا ہے۔ وضع داری قدرت نے آپ کے لئے ودیعت کر رکھی ہے۔ مغرب اور مشرق کے مزاج میں وہی فرق ہے جو

فلسفور اور پیغمبر کے خمیر میں ہوتا ہے۔"

سیاح کی مداخلت مجھے اچھی نہ لگی۔ کیونکہ میں موضوع کو جس طرف لے جانا چاہتا تھا' سیاح نے نادانستہ اس کا رخ پھیر دیا تھا------ امل نے اس سے کہا۔

"میں نہیں کہہ سکتی کہ روئے زمین کے انسانوں کی فطرت ایک نہیں ہے۔ آپ لوگ ہم سے اس لئے مرعوب ہیں کہ مشرق نے پیغمبروں کو جنم دیا ہے۔ ٹھیک ہے پیغمبروں کی سرزمین پر تھوڑی بہت رواداری تو ہونی چاہیے' لیکن آپ لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ ایشیا صرف پیغمبر پیدا ہی کرتا رہا' لیکن ان کے اصول آپ لوگوں نے اپنائے۔ ترقی یورپ کا مقدر بنی رہی------ ہم وضع داری میں وقت ضائع کرتے رہے' آپ وقت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے رہے------ ہمارے زمانے تلقین میں گزر گئے۔ آپ دن رات کام میں جتے رہے۔ لیکن فطرت انسانی وہیں کی وہیں رہی۔ ہم لوگ پسماندگی کا رونا رو رہے ہیں اور آپ کو خوشحالی کا روگ لگ گیا ہے!"

"خوبصورت بہت خوبصورت!" برطانوی سیاح پھڑک اٹھا------ "ہم مشرق سے پیچھے ہیں۔ بہت پیچھے۔ ہمیں روحانی رعبکا پہنچا ہے' تو واقعی ہم مشرق کی طرف دیکھتے ہیں' کیونکہ مشرق میں آپ جیسے لوگ بستے ہیں۔"

"دراصل بات یہ ہے۔" امل بولی------ "کہ رواداری نے ہمیں منجمد کر دیا ہے اور المیہ یہ ہے کہ آپ لوگوں کو ہمارا انجماد پسند آتا ہے۔ آپ کی سوسائٹی آزاد خیال ہے۔ آپ آگے بڑھتے ہیں۔ روایات پیچھے رہ جاتی ہیں۔ لیکن ہم لوگ اپنی روایات کے ساتھ ساتھ اپنی ثقافت کو محفوظ رکھنے کے موقف پر ڈٹے ہوئے ہیں------ آپ چاند کی سیر کر آئے ہیں۔ لیکن ہم یقین رکھتے ہیں کہ ایک دن خدا کا قہر آپ پر نازل ہوگا اور جب آپ مریخ سے بھی ہو آئیں گے' تو ہم آپ کی مایوسی پر تالیاں بجائیں گے------ کیونکہ آپ نے ہمارے تصورات کا مذاق اڑایا ہے------ اور جب مریخ پر پہنچ کر بھی آپ کی تسلی نہ ہوگی اور آپ کے پاؤں زمین پر لگیں گے' تو ایک بار پھر سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ زندگی کے اچھے دن تو بیت گئے ہیں------! یہ کیسا مذاق تھا' جس کے ہم شکار ہوئے اور

اب زمین پر ہمارے لئے کیا کام باقی رہ گیا ہے۔ تو اے دوستو!۔۔۔۔ ایسے میں آپ مشرق کی طرف ہی دیکھتے ہیں' جو خود آپ کی تقلید کے لئے سرگرداں ہے۔ مگر منجمد ماحول سے نکلنے کا یارا نہیں رکھتا۔۔۔۔ تو مطلب یہ ہوا کہ ہم جو ایک دوسرے کی تلاش میں نکلے ہیں' بے کار ہے۔ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہم وہی ہیں' جو ہم ہیں۔ آدمی کو اپنی نیت کا علم ہوتا ہے۔ اس لئے دوسرے کی نیت سے بھی باخبر رہتا ہے۔ کدورتوں کی دنیا میں اس کے سوا ہوگا بھی کیا۔۔۔۔!!"

اتنے میں کڑاہی گوشت آگیا۔ لڑکے نے میز پر ایک چھوٹی سی چنگیر رکھی۔ اس پر کڑاہی جمادی۔ دوسری چنگیر میں پانچ بڑی بڑی تنور کی خمیری روٹیاں تھیں۔ عاطف بھی آ گیا اور اس نے گلگت کی سیٹوں کی کنفرمیشن کی خبر سنائی۔

چونکہ الگ الگ پلیٹیں نہیں تھیں' اس لئے دونوں سیاح استفہامیہ انداز میں ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ گویا کھانے کا آغاز کیسے ہوگا۔ مگر عاطف نے ان کی مشکل حل کر دی۔ اس نے نوالہ توڑ کر اور اس میں بوٹی پکڑ کر منہ میں ڈال لی۔ سب نے اس کی تقلید میں یہی کیا۔

گوشت جو اپنی چربی میں پکا تھا اور جس میں نمک اور ٹماٹر کے سوا اور کوئی مصالحہ نہیں ڈالا گیا تھا۔۔۔۔ نہایت لذیذ تھا۔ دونوں سیاح مزے لے لے کر کھا رہے تھے اور تعریفیں کر رہے تھے۔

سویڈش نے کہا۔

"ہم پہلی بار اس ذائقے سے آشنا ہو رہے ہیں۔ اگر یہ ذائقہ آپ کی ثقافت کا حصہ ہے اور آپ اس کو محفوظ رکھنے کا ذکر کر رہے تھے' تو ہم آپ سے اتفاق کرتے ہیں۔"

"ہاں۔۔۔۔ یہ ذائقہ لوہے کی کڑاہی کا مرہون منت ہے۔" امل نے اسے جواب دیا۔۔۔۔ "یہ کڑاہی جو اندر اور باہر سے سیاہ ہو چکی ہے' یورپ کے چمکیلے برتنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی' لیکن آپ لاکھ کوشش کریں گے' یورپ کے چمکیلے برتنوں سے یہ ذائقہ حاصل نہ کر سکیں گے۔۔۔۔ لوہے کی اس کڑاہی کا اپنا مزاج اپنی فطرت ہے۔ چونکہ یہیں

میسر ہے' اس لئے آپ اسے ہماری ثقافت کا جزو بھی کہہ سکتے ہیں' مگر ثقافت کو محفوظ کرکے ہم کیا کریں گے۔ تہذیب اور ثقافت کو ہمیشہ ترقی پذیر رہنا چاہیے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ ہم اپنی ثقافت کو کمال تک پہنچانے کی صلاحیت سے عاری ہوں اور اپنے انجماد کا نام ہم نے "محفوظ رکھنا" رکھ دیا ہو۔۔۔۔!"

"عمدہ۔۔۔۔!" انگریز سیاح بوٹی چباتے ہوئے بولا۔۔۔۔ "آپ اتنی خوبصورت باتیں کرتی ہیں۔ دل چاہتا ہے' آپ بولتی چلی جائیں۔ آپ کی ایک دن کی رفاقت سے میرا کافی بوجھ ہلکا ہو گیا ہے اور میں پہلے سے بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ آپ کی باتیں مجھے سیدھی بھی لگتی ہیں اور پیچیدہ بھی' مگر اس کے باوجود ان میں کچھ ایسا سحر پوشیدہ ہے کہ وجدان فوراً ہی قبول کر لیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں زندگی کے قریب ہوتا جا رہا ہوں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" امل کی بجائے میں نے جواب دیا۔۔۔۔ "یہ دوسروں کو تو زندگی کے قریب کر دیتی ہیں' لیکن خود خلاؤں میں معلق رہتی ہیں۔ ان کی آواز سنائی دیتی ہے' وجود دکھائی نہیں دیتا۔۔۔۔ آپ ایک دن کا تجربہ بیان کر رہے ہیں۔ میں کم و بیش تیس سال کے مشاہدے کی حقیقت عرض کر رہا ہوں!"

امل ہنس پڑی۔

"جب بھی موقع ملتا ہے' آپ اپنے مطلب کی بات کہہ جاتے ہیں۔ زمین پر رہنے میں خوش ہیں۔۔۔۔ خلاؤں میں جانے سے گھبراتے ہیں۔"

"تقریباً تیس برس سے زمین پر چلنے کا عادی ہوں۔ خلاؤں میں تو پاؤں بھی نہیں جمتے۔ اگر پاؤں اکھڑ گیا' تو خدا جانے لہر کی طرح کس سمت نکل جاؤں۔ پھر آپ کو کہاں ڈھونڈوں گا۔ خلاؤں کے سمندر میں تو قسمت پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتا!"

سویڈش سیاح میرے جواب سے محظوظ ہو کر بولا۔

"میں بھی آپ کو یہی مشورہ دوں گا۔ زمین کے آدمیوں کو زمین پر رہنا چاہیے۔۔۔۔ خلاؤں کا کیا اعتبار اور خلاؤں سے اس پار کا کیا بھروسہ' بہت آگے نکل جانے والا بھی ہمیشہ پچھتاتا ہے!"

"لیکن ہجوم میں رہ کر تنہا رہنے کا المیہ سب پر بھاری ہے۔" امثل نے اسے بتا
دیا...... "جیسے آپ' جیسے آپ کا دوست اور جیسے ہم سب' مزہ یہ ہے کہ ایک طرح
ہم علم اور عقل کی انتہا کو چھو رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلنا چاہیے تھا کہ تمام دنیا متفق
الرائے ہو جاتی اور زندگی کو ارفع و اعلیٰ مقاصد سے مالا مال کر دیتی اور پورے کرۂ
امن کا دور دورہ ہوتا...... مگر نہیں' وہی خود غرضی' وہی نفسا نفسی...... ترقی ہے۔
خوشی نہیں۔ کمال ہے مگر جلال نہیں...... ہر طرف فرزانے ہی فرزانے' ایک عجیب
سے واسطہ پڑا ہے...... ذہین مگر مطلبی......! اسی لئے تو میں کہتی ہوں کہ ذہانت بنا
فساد ہے!!"

کھانا ختم ہو چکا تھا۔ اب ہم قہوہ پی رہے تھے۔ دریائے سوات اسی طرح بے خبر اچھل کود میں مصروف تھا' عاطف بتا رہا تھا۔

"کل ہمارا راولپنڈی پہنچنا بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ اگلے روز ہم نے چکلالہ ایئرپورٹ سے گلگت کے لئے روانہ ہونا ہے۔"

اس لئے ہم نے سوات کا سفر ادھورا چھوڑ دیا اور بحرین سے آگے نہ جا سکے۔ دونوں سیاح ہم سے یہیں الگ ہو گئے۔ کیونکہ انہوں نے کالام کی طرف بلکہ اس سے بھی آ جانا تھا۔

چک لالہ ایئرپورٹ پر ڈرائیور کا حساب بے باق کر دیا گیا' تو وہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا جیسے کسی عزیز کو جنگ پر بھیج رہا ہو...... عاطف نے اسے کچھ انعام بھی دیا' تو اس آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یقیناً یہ خوشی کے آنسو تھے...... اس نے ہم دونوں سے ہا ملایا اور امثل کو سلام کیا اور پھر آنسو پیتا اور ہونٹ چباتا ہوا جم غفیر میں گم ہو گیا۔

پرواز میں ابھی بیس منٹ باقی تھے' مگر میرا دل ایک انجانی خوشی سے سرشار تھا۔ جانے گلگت جانے پر میرا دل کیوں مچل رہا تھا۔

جوں جوں پرواز کا وقت قریب آ رہا تھا' مسافروں کی چہل پہل بڑھ رہی تھی۔ جن میں زیادہ تعداد غیر ملکیوں کی تھی......

آخر پرواز کا وقت ہو گیا...... عاطف کی سیٹ آگے تھی۔ مجھے اور امثل کو ہماری
ش کے مطابق دائیں ہاتھ کی سب سے پچھلی سیٹیں دے دی گئیں۔ فوکر جہاز کی یہ
یں بہترین سمجھی جاتی ہیں۔ کیونکہ یہ دائیں بائیں کے دونوں ونگوں سے ہٹ کر ہوتی
...... زمین اور فضا کے نظارے میں کوئی نظری رکاوٹ آڑے نہیں آتی۔

جہاز جونہی اسلام آباد کی فضاؤں میں بلند ہوا' پائلٹ نے اعلان کیا۔

"خواتین و حضرات' میں پاکستان انٹرنیشنل ائرلائنز کی طرف سے آپ کو خوش آمدید ہوں۔ ہم اٹھارہ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کریں گے۔ امید ہے آپ کا یہ سفر وار گزرے گا۔"

میں نے مسکرا کر امثل کی طرف دیکھا۔

"کم از کم میں تو اس سفر کے خوشگوار ہونے پر یقین رکھتا ہوں۔"

"آپ کا کیا......" وہ ہنس کر بولی...... "آپ تو ہر وقت پر امید ہی رہتے ہیں۔"

ہم سے اگلی نشستوں پر کوئی غیر ملکی جوڑا بیٹھا تھا' جو دائیں بائیں شاداب پہاڑوں' ں' گھاٹیوں اور ندیوں کا ذکر بہت بے ساختگی سے کر رہا تھا۔ ان کی یہ بے ساختگی اور ی میرے لئے تقویت کا باعث بن رہی تھی۔ اپنے ملک کی تعریف سن کر میں عموماً ی ہو جایا کرتا ہوں۔

انہوں نے سولہ ایم ایم کا کیمرہ نکالا۔ لینز وغیرہ صاف کرنے میں عورت مرد کا ہاتھ بٹا تھی۔ میں نے امثل سے کہا۔

"وزیر خان کی بیوی کے سلسلے میں آپ کا رویہ دیکھ کر میری بڑی ڈھارس بندھی ہے۔"

"کاش......! میں اس طرح خالی الذہن ہوتی۔ پھر میں ٹوٹ کر آپ سے محبت کرتی۔ لوگ دنیا میں صرف محبت کرنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ قدرت انہیں یہی فریضہ کر بھیجتی ہے۔ محبت کرنے کے سوا ان کے ذہنوں میں اور کوئی سودا نہیں ہوتا...... ری طرح فکر کے مارے ہوئے لوگ نہیں ہوتے!"

"کم از کم مجھے تو آپ خالی الذہن ہی سمجھیں۔ ہو سکتا ہے میں آپ کی طرح سوچوں کے مارے ہوئے آدمی کے بجائے ٹوٹ کر محبت کرنے والا آدمی ثابت ہو جاؤں۔"

"میں بھی تو سسی ہوتی نا' پھر تالی بجتی...... آپ لاکھ خام بنتے پھریں' آپ کی پختگی کی ایک منزل تعین ہو چکی ہے۔ شعر کہنے والا شعر کہنے کے بعد ہی اعتدال پر آتا ہے۔ شدت احساس کی اپنی ترنگ ہوتی ہے۔ ہر کام کے لئے الگ الگ لوگ ہوتے ہیں۔ جس طرح مجھ میں محبت کرنے کی صلاحیت نہیں ہے' اسی طرح بعض لوگوں میں جذبے کی سچائی نہیں ہوتی۔ میر کم شاعر نہیں تھا' مگر غالب جیسی قوت احساس سے محروم تھا۔ جذبے کے بغیر کو کن پیدا نہیں ہوتے۔ مگر تعلیم کے بغیر شکسپیئر پیدا ہو جاتے ہیں...... قدرت خود درجہ بندی کرتی ہے۔ خود عرفان سے نوازتی ہے۔ اس لئے اگر ہم وہ نہیں ہیں' جو بننے کی آرزو رکھتے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں......!"

جہاز اب کاغان کی وادی پر پرواز کر رہا تھا۔ دریائے کنہار جو اژدہے کی طرح پھنکارنے کا عادی تھا' اب سیال چاندی کی ایک پرسکون ندی کی طرح بہتا نظر آ رہا تھا۔

میں سوچ رہا تھا' قدرت جو خود درجہ بندی کرتی ہے اور خود عرفان سے نوازتی ہے' امثل کی قوت استدلال کو رد کرنے کے لئے مجھے اس عرفان سے کیوں نہ نواز سکی کہ اسے اپنے ڈھب پر لا سکتا اور اس کی حسین گردن کا بوسہ لے سکتا اور اس کے خوبصورت ہونٹوں پر انگلی پھیر سکتا اور اس کی گول گول آنکھوں کی حیرتیں دور کر سکتا؟"

اسی لمحے پائلٹ کی آواز سنائی دی۔

"خواتین و حضرات' ہم اس وقت تقریباً اٹھارہ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہے ہیں...۔ آپ کے بائیں ہاتھ انڈس ویلی ہے اور دائیں ہاتھ وادی کاغان' اسی ہاتھ پر مشہور عالم جھیل سیف الملوک بھی دیکھ سکتے ہیں۔"

ہاں...... یہ وہی جھیل سیف الملوک تھی' جس تک پہنچنے کے لئے ہم نے ناران سے سات میل کی عمودی چڑھائی گھوڑوں پر طے کی تھی...... اب یہ جھیل ہمارے پاؤں کے نیچے تھی۔ سفید دودھیا پہاڑوں کے درمیان نیلگوں سطح آب خاموش اور پرسکون نظر آ

ہی تھی۔

جہاز کی بلندیوں سے اونچے اونچے پہاڑ اور گھاٹیاں حقیر نظر آ رہی تھیں۔ اسی لمحے لٹ نے پھر اعلان کیا۔

"خواتین و حضرات' آپ کے دائیں ہاتھ دنیا کا مشہور سلسلہ ہائے کوہ نانگا پربت اور ں کی چوٹی نظر آ رہی ہے۔"

امثل ادھر ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ اس منظر میں بالکل جذب ہو گئی تھی۔ یورپین سیاح کیمرہ آن کر دیا تھا۔ شاید وہ اس لافانی منظر کو فلمانے آیا تھا۔

میں دیکھ رہا تھا' تقریباً ہر سیاح سحرزدہ سا ہو گیا تھا...... اب ہم نانگا پربت کی چوٹی کے ل قریب سے گزر رہے تھے...... یہاں ہم نے عجیب و غریب نظارہ دیکھا...... شمال سفید بادلوں کے پرے کے پرے جاتے اور چاروں طرف سے چوٹی کو ڈھانپ لیتے۔ ڑی دیر کے بعد یہ پرے آگے نکل جاتے۔ چوٹی نظر آ جاتی' مگر شمال سے بادلوں کی ری لہر آتی اور چوٹی سے لپٹ لپٹ جاتی......

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بادلوں کی یہ لہریں کسی کے تابع ہیں اور وہ نہیں چاہتیں کہ رے کی آنکھ اس منظر کو محفوظ کرے۔

یہ ماؤنٹ ایورسٹ سے کم بلندی کی چوٹی تھی' مگر ناقابل عبور گہری گھاٹیوں اور برف وسیع و عریض سمندر کی وجہ سے انسان کے پاؤں نے اسے ابھی تک نہیں چھوا تھا۔ ی وجہ تھی کہ اسے اپنی دوشیزگی کا احساس تھا اور سفید بادلوں کا براق آنچل بار بار ہ رہی تھی۔

یہ ایسے پراسرار لمحے تھے کہ میں امثل کی خوبصورت گردن سے بھی غافل ہو گیا تھا۔ یہ ر اس قدر دل آویز تھا اور اس میں جذب پذیری کا ایسا انوکھا احساس تھا کہ میں نے اپنی ی کو اس سے پہلے کبھی ایسی توانائی سے دوچار ہوتے نہیں دیکھا تھا...... اور نہ میں نے ل کبھی اس طرح شاداب پایا تھا۔

اور وہ جو "راکا پوشی" اور "کے ٹو" کی چوٹیاں دیکھنے کی حسرت تھی' اب اس میں اتنی

شدت نہ رہی تھی، کیونکہ میں محسوس کر رہا تھا کہ میری مسرت کی اگر کوئی حد متعین کی جا سکتی ہے، تو وہ یہی ہے۔ اس سے زیادہ کی تاب شاید مجھ میں نہ ہوتی!

اسل خاموش تھی۔ اس کا رنگ کچھ اور پیلا پڑ گیا تھا۔ اس لمحے اس کی آنکھوں میں حیرتوں کے بجائے ایک عجیب سی حسرت تھی......

شاید اس چوٹی کے دامن تک پہنچنے کی...... یا نور کی طرح صاف و شفاف نرم نرم برف پر سو جانے کی...... اور یا چوٹی کو چومنے والے براق بادلوں میں تحلیل ہونے کی......؟

کیونکہ اس طرح کے خیالات کا ایک جھونکا میرے ذہن کو بھی چھو کر نکل گیا تھا اور مجھے یہ بھی خیال آ رہا تھا کہ ہر وہ چیز جس کا حصول انسان کے لئے ناممکن ہو، اسے پانے کی خواہش کس قدر شدید اور طاقتور ہوتی ہے۔

آدمی ہر وقت رومینٹک رہنا پسند کرتا ہے۔ پریوں کی کہانیوں میں اس کی دلچسپی، جل پری کا تصور، یہ ہر دور کے انسان کے خواب ہیں۔ تعبیر ملے نہ ملے، وابستگی میں کیا مضائقہ......!

بے بسی کا رونا رویا جا سکتا ہے۔ مظلومیت کا ماتم بھی بجا، مگر خواب دیکھنے سے انسان کو کون روک سکتا ہے؟

مجھے ہمت نہ ہوئی کہ اسل سے بات کروں۔ اس کی آنکھوں کے ٹھہراؤ میں بلا کی گویائی تھی اور اس کی یکسوئی میں دنیا جہان کی بے نیازی کی واضح جھلک!!

نانگا پربت کے حسن اور پہنائیوں نے ہمیں وقتی طور پر ایک دوسرے سے جدا کر دیا تھا...... اور اب یہ احساس پیدا ہو رہا تھا کہ ہر قدم پر ایک نیا تجربہ جنم لے سکتا ہے اور ہر موڑ پر زندگی کی معنویت اپنے انداز بدل دیتی ہے۔

یہ کیفیت جانے اور کیا کیا رنگ دکھاتی کہ جہاز نے اپنا رخ بدل دیا اور اب برفانی چوٹیوں والے خشک اور سنگلاخ پہاڑوں کے سلسلے شروع ہو گئے مگر ہم ابھی پوری طرح اس تبدیلی سے مانوس بھی نہ ہوئے تھے کہ اچانک ایک خوبصورت اور شاداب وادی نظر

آ گئی۔ یقیناً یہ گلگت کی وادی تھی۔

جہاز دھیرے دھیرے نیچے ہو رہا تھا...... اب گھر، درخت اور کھیت واضح شکلیں اختیار کرتے جا رہے تھے۔ کھیتوں میں کام کرتے ہوئے اکا دکا آدمی بھی نظر آ رہے تھے۔

معاً جہاز رن وے کی طرف سیدھا ہونے کے لئے مڑا...... ایسے لگا جیسے جہاز کا دایاں ونگ پہاڑ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ یقیناً یہ فاصلہ انچوں میں نہیں تھا، لیکن چند فٹ سے زیادہ بھی نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ پی آئی کے پائلٹوں کا یہ روز کا معمول ہے۔

جہاز کے پیٹ سے پہیے باہر نکل آئے تھے اور وہ عقاب کی طرح رن وے پر جھپٹ رہا تھا...... دریائے گلگت کو ہمارا جہاز اس طرح چھو کر نکل گیا جیسے ابابیل جھیل کے پانیوں کو چھیڑتی چھوتی ہوئی نکل جاتی ہے...... حتیٰ کہ جہاز کے پہیوں نے گلگت کی زمین کو چھو لیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم خود اس جزیرے پر قدم رکھ چکے تھے جس کے چاروں طرف پانی کے بجائے اونچے اونچے پہاڑ تھے۔

ٹورسٹ ریسٹ ہاؤس غیر ملکی سیاحوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس لئے ہمیں کوئی کمرہ نہ ملا، لیکن تھوڑی سی دوڑ دھوپ کے بعد ہمیں پی ڈبلیو ڈی کے ریسٹ ہاؤس میں دو کمرے مل گئے۔ ان کا کرایہ بھی تیرہ روپے یومیہ کے حساب سے نہایت مناسب تھا۔ انگریزی لفظ ایل کی طرح یہ تین بلاکوں میں بنا ہوا تھا۔ ہر بلاک میں تقریباً پانچ پانچ کمرے تھے۔ اس میں دو سیٹ ایسے بھی تھے۔ جن میں فوجی افسر بمعہ بچوں کے رہائش پذیر تھے۔

بلاکوں کے سامنے وسیع و عریض لان تھے، جن میں خوبانی کے پیڑوں کے علاوہ بلند و بالا چنار کے درخت تھے، جن کے پھیلے ہوئے تنوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی عمریں سو سال سے کسی طرح کم نہ ہوں گی۔

اگرچہ ہم گیارہ بجے کے قریب گلگت پہنچ گئے تھے، لیکن آج کا دن ہم نے گلگت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد بازار کی سیر کو نکل گئے۔

یہاں درجہ حرارت ستر پچھتر کے قریب تھا۔ موسم خاصا خوشگوار تھا۔ بازار کی تقریباً ہر دکان میں پاکستان کے علاوہ جمہوریہ چین کا سامان مہیا تھا۔

بازار کی پچھلی طرف پولو گراؤنڈ تھا۔ پولو یہاں کا قومی کھیل ہے' جس کے سالانہ مقابلے ہوتے ہیں اور علاقے کی ساری ٹیمیں حصہ لیتی ہیں۔ دس بارہ ہزار کی آبادی کا یہ چھوٹا سا شہر پہاڑ کی ڈھلوان میں واقع ہے۔ دریائے گلگت اس کے پہلو میں بہتا ہے۔ دریا پر پانچ فٹ چوڑا جھولنے والا معلق پل بھی ہے' جس پر سے نلتر' ہنزہ' سکردو اور شاہراہ ریشم جانے والی جیپیں گزرتی ہیں۔

یہاں ناردرن سکاؤٹ گلگت کا ہیڈ کوارٹر بھی ہے۔

دریا کے کنارے چنار باغ میں یادگار شہدا بنی ہوئی ہے' جس پر گلگت اور تمام دوسرے علاقوں کے ان شہدا کے نام درج ہیں' جنہوں نے تقسیم ہندوستان کے وقت ریاست جموں وکشمیر سے بغاوت کر کے اس علاقے کو پاکستان میں شامل کرا دیا تھا۔

عاطف نے کہا۔۔۔

"یہ جو نام درج ہیں' میں انہیں سلام کرتا ہوں۔ یہ لوگ شہادت نہ پاتے' تو آج ہمارا جہاز نانگا پربت پر سے اڑ کر نہ آتا۔ راکاپوشی ہمارے حصے میں نہ آتی اور نہ دنیا کی دوسری اونچی چوٹی "کے ٹو" کی طرح ہمارا سر اونچا ہوتا!"

یہ سیاست کی باتیں تھیں۔ جنگ اور نفرت کی باتیں تھیں' لیکن امثل نے نہ جانے کس طرح غیر متوقع اس میں دلچسپی لی۔

"ٹھیک ہے۔ مظلوم کی شان یہی ہے کہ مر جائے' یا مار دے۔ مظلوم کا زندہ رہنا ظالم کو زندہ رکھنے کے مترادف ہے!"

میں نے موقع مناسب سمجھ کر کہا۔۔۔ "یہ انسان سے انسان کی نفرت کی باتیں تو نہیں؟"

"ہاں۔۔۔" اس نے تائید کی۔۔۔ "یہ انسان سے انسان کی نفرت کی باتیں تو نہیں ہیں کیونکہ جو آدمی آپ کی آنکھ پھوڑے گا' آپ اس کی پیشانی کا بوسہ لینا پسند نہیں کریں گے۔ جس دیس میں محبت کے معنی غرض کے معنی میں بدل جائیں' وہاں نفرت کے معنی کیا ہوں گے۔"

"آپ کو یاد ہوگا" میں نے اسے یاد دلایا۔۔۔ "زیارت کے مقام پر میں قبلی سیاح سے کہا تھا۔۔۔ کہ دھاندلی کو روکنا ضروری ہے' تو آپ نے اسے یہ کہہ کر چونکا دیا تھا کہ یہ انسان سے انسان کی نفرت کی تبلیغ ہے۔"

"ہاں۔۔۔ میں نے یہ بات کہی تھی اور میں اب بھی کہتی ہوں کہ انسان کو انسان سے دور نہیں رہنا چاہیے۔ یہ میری خواہش ہے۔ یہ میری شدید آرزو ہے۔ لیکن یہ پوری ہوتی نظر نہیں آتی' اور یا یہ کہ اسے پوری کرنے کی ہم میں اہلیت نہیں ہے' تو ہم نفرت کا شکار ہونے کے لئے سر کیوں جھکا دیں۔ یہ کیوں تسلیم کر لیں کہ ہم میں مظلوم بننے کی اہلیت ہے!"

ہاں۔۔۔ یہی بات تھی' جو اس دن زیارت کی نو ہزار فٹ کی بلندی پر نامکمل رہ گئی تھی اور میں سمجھ بیٹھا تھا کہ امثل اپنی تردید کر رہی ہے۔۔۔ مگر نہیں۔۔۔ اس کی گردن میں کوئی خم نہیں آیا تھا۔ خزاں کا کوئی جھونکا ادھر سے نہیں گزرا تھا اور وہ پہلے دن کی طرح تروتازہ تھی۔

ڈنر جو ریسٹ ہاؤس کے خانسامے نے تیار کیا تھا' بس واجبی سا تھا۔ عاطف کچھ کہنا چاہ رہا تھا' لیکن امثل جو کسی اور سوچ میں تھی' وارفتگی سے بولی۔

"وسیم صاحب' یہ جو فردوسی لکھے ہوتے ہیں یا فردوسی مناظر' جن کا شاعر اور ادیب ذکر کرتے ہیں' غالباً ان کا تصور ہی ہوتا ہوگا۔ بے چاروں نے برف کا سمندر کہاں دیکھا ہوگا۔ برف کا بھی کالا ہے کہ۔ میں تو اسے نور کہوں گی۔ سائبیریا کے برفانی میدانوں کا کتنا بھیانک تصور پیدا کیا گیا ہے۔ مگر نانگا پربت کا غیر فانی منظر دیکھ کر میں نے اپنے جسم میں اپنی روح کو پہلی بار محسوس کیا ہے۔ میں جو یہ سوچا کرتی تھی کہ روح کا جسم سے کیا رشتہ ہوتا ہے' اس کا راز میں نے نانگا پربت کے بادلوں میں سے گزر کر پا لیا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ میری رگوں میں لہو کی جگہ نور دوڑ رہا ہے۔ پہلے صرف میری آنکھوں میں نور تھا۔ اب میری روح مجسم نور ہو گئی ہے۔ کیونکہ اس سے میں ان سپید بادلوں کی طرح ہلکی پھلکی تھی' جو نانگا پربت کی چوٹی پر اپنے نورانی شہپروں سے سایہ فگن تھے۔ میری آنکھیں

بازار میری روح بھی ان نورانی لہروں سے ہمکلام تھی۔ بلکہ یوں لگ رہا تھا جیسے ہم ایک دوسرے میں تحلیل ہو گئے ہیں!"

عاطف امثل کے اس رویے سے بے حد خوش تھا۔ کہنے لگا۔

"واقعی----- وہ تو اتنا خوبصورت اور لازوال منظر تھا کہ مجھ جیسے دنیا دار آدمی نے بھی اسے پورا پورا محسوس کیا ہے۔"

امثل کا یہ انداز دیکھ کر مجھے بھی یک گونہ مسرت ہوئی۔ اس کی ایک ایک ادا سے اس کی روحانی لطافت اور مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کے پیلے رخساروں پر سرخی کی ہلکی ہلکی لہریں آتی اور جاتی رہیں۔ اس کے سیاہ بالوں کی لٹیں اس کی خوبصورت گردن سے کھیل رہی تھیں۔ اس کے جسم کا رواں رواں اس خوشی میں اس کا ہم جلیس تھا۔

دو چار نوالے کھا کر وہ اٹھ گئی۔ اس کی روح سرشار تھی۔ ایسے میں کام و دہن کی لذتوں کی پروا کون کرتا ہے۔

عاطف اور میری آنکھیں چار ہوئیں۔ ہم نے ایک دوسرے کی روحوں کی پاکیزگی کو برابر محسوس کیا----- ہم نے دل ہی دل میں اپنی اپنی شادکامیوں کا احساس ایک دوسرے کو منتقل کر دیا----- ایک نئی اور تازہ شاداب تسلی لے کر ہم اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

صبح ناشتے سے فارغ ہوئے' تو جیپ آ گئی۔ جیپیں وہاں ٹورسٹ بیورو والے مہیا کرتے ہیں۔ دو روپے میل کے حساب سے۔ ڈرائیور بھی انہیں کا ہوتا ہے۔

حسب معمول میں اور امثل آگے بیٹھ گئے اور عاطف پیچھے----- آج ہم پنیال وادی دیکھنے نکلے تھے' جو گلگت کے مغرب میں واقع ہے اور سرسبز و شاداب وادی مشہور ہے۔

گلگت سے نکلتے ہی بائیں ہاتھ کے پہاڑ سے گرتا ہوا ایک تیز رفتار نالہ عبور کرنا پڑا۔ یہی نالہ پورے گلگت کو سیراب کرتا ہے اور اس میں ٹراؤٹ مچھلی بھی ملتی ہے۔

دونوں طرف اونچے خشک پہاڑ ہیں۔ درمیان میں دریائے گلگت بہہ رہا ہے' جو آگے جا کر دریائے سندھ میں مل جاتا ہے۔ سڑک کچی اور تنگ ہے' جو بائیں ہاتھ کے پہاڑ کے

پہلو کو کاٹ کر بنائی گئی ہے۔ نیچے دریائے گلگت وہی دریائے کنہار والا نقشہ پیش کر رہا ہے۔

راستے میں باسین بالا' بسین پائیں' شیروٹ اور دوسرے چھوٹے چھوٹے گاؤں آتے رہے۔ عاطف نے ڈرائیور سے پوچھا۔

"کیا سارا سفر دریا کے کنارے کنارے طے ہو گا؟"

"ہاں جناب' یہاں آپ جس طرف بھی جائیں گے' کوئی نہ کوئی دریا آپ کے ساتھ ساتھ رہے گا۔"

"اچھا----!" عاطف مضطرب لہجے میں بولا----- "تو پھر دوستو۔ میرا آپ کے ساتھ یہ آخری سفر ہے۔"

امثل ہنس پڑی۔

"بھائی جان' آپ کاغان کے سفر میں بھی ایسے ہی گھبرا گئے تھے' لیکن جھیل سیف الملوک پہنچ کر آپ سب جو کچھ بھول گئے تھے۔ ہر تکلیف کے بعد راحت کا احساس بالکل فطری ہوتا ہے۔"

"امثی----- خدا کے لئے میرے حال پر رحم کیجئے۔ میں ان خونخوار دریاؤں کا سامنا نہیں کر سکتا۔ میرا پہلے ہی کافی خون خشک ہو چکا ہے۔ آپ دونوں سفر جاری رکھیں۔ میں گلگت ریسٹ ہاؤس میں آپ کا انتظار کروں گا۔"

"ٹھیک ہے' مگر آج تو آپ ہمارے ساتھ ہیں۔ اب تو واپسی کی بھی گنجائش نہیں رہی۔"

وہ بجھے دل سے بولا۔

"عجیب علاقہ ہے۔ جس طرف جاؤ کوئی نہ کوئی دریا منہ پھاڑے کھڑا ہے۔" ڈرائیور جو اس وقت عمودی چڑھائی چڑھ رہا تھا' کہنے لگا۔

"صاحب----- ابھی تو آپ نے سکردو جانے والی سڑک نہیں دیکھی۔ وہاں ڈرائیونگ کرنا ہوائی جہاز چلانے کے برابر ہے۔ کہتے ہیں' دنیا کی سب سے مشکل سڑک سکردو کی

ہے۔"

"لعنت ہے۔" عاطف بیزاری سے بولا۔ "میری مانو تو جہاز سے جاؤ۔"

"نہیں بھائی جان۔" ڈرائیور کی بات سن کر امثل مچل گئی۔۔۔۔۔ "سفر کا مزہ تو ایسے ہی راستے پر آئے گا۔ دیکھیں گے کہ دنیا کا مشکل ترین راستہ کس طرح کا ہوتا ہے۔ کیوں وسیم صاحب۔ آپ تو ساتھ دیں گے نا؟"

ساتھ دینے کا سوال اتنا اچانک تھا کہ میں سٹپٹا گیا۔ ان سڑکوں پر میری حالت عاطف سے کم بری نہیں ہوتی تھی' لیکن میں امثل کو اکیلا چھوڑ دینے کا گناہ کیونکر کر سکتا تھا۔ لہذا میں جذباتی ہو گیا۔

"میں آپ کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتا ہوں امثل۔ گو ان راہوں پر' عاطف کی طرح میں بھی ڈرتا ہوں' لیکن آپ ساتھ ہوتی ہیں' تو میں خوف پر قابو پا لیتا ہوں۔ آپ کی وجہ سے مجھے بہت تقویت پہنچتی ہے۔"

"اللہ۔۔۔۔۔!" وہ خوش ہو کر بولی۔۔۔۔۔ "کبھی کبھی جذباتی ہو جانے میں بہت فائدے ہوتے ہیں۔ آدمی دوستوں کے کام اسی طرح آ سکتا ہے۔"

"جی نہیں۔۔۔۔۔ اس میں آپ کا نہیں میرا فائدہ ہے۔"

امثل کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"ہاں ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ آپ ہی کا فائدہ سہی۔ آپ کی قربت اسی لئے تو پسندیدہ ہے کہ آپ جذباتی ہونے کے ساتھ ذہین بھی ہیں۔ جذبے اور عقل کا امتزاج مقابلتاً اچھے نتائج پیدا کرتا ہے۔"

میں اس کے میٹھے اور تیکھے انداز کو برابر پا رہا تھا' لیکن اس انداز میں طنز یا تضحیک نہیں تھی۔ اس لئے لطف اندوز بھی ہو رہا تھا۔

معاً ڈرائیور نے ایک ٹیلے کے قریب جیپ روک لی۔

"صاحب' یہ بدھ مذہب والوں کی عبادت گاہ تھی۔ اب مٹی کا ڈھیر بن گیا ہے۔"

امثل جو باہر کی طرف بیٹھی تھی' چھلانگ لگا کر اتر گئی۔ میں باہر آ گیا۔ امثل نے ٹیلے کے

چاروں طرف چکر لگایا اور بولی۔

"دیکھئے۔۔۔۔۔ مذہبی دیوانے ان ویرانوں میں بیٹھ کر پرچار کا دیا جلاتے رہے ہیں۔ پہاڑ پر بدھ کا دیو ہیکل مجسمہ اور دوسری یادگاریں دیکھ کر ثابت ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں بدھ مت کا دور دورہ تھا۔۔۔۔۔ حیرت کی بات ہے۔ آج تو یہاں جہاز بھی آتے ہیں۔ جیپیں بھی پہنچ جاتی ہیں۔ لیکن آج سے ہزاروں سال پہلے ان ناقابل عبور پہاڑوں' دریاؤں اور گھاٹیوں سے مذہب کس طرح پار اترا ہوگا۔۔۔۔۔؟ اور پھر اس سے زیادہ حیرانی کی بات یہ ہے کہ آج اس علاقے میں بدھ مت کا کوئی پیروکار نہیں ہے۔ لوگ کس طرح آسانی سے اصول بدل دیتے ہیں!!"

"سورج' سانپ اور آگ کو پوجنے والے لوگ اس صدی میں بھی موجود ہیں۔ طاقت جس رنگ میں بھی نظر آتی ہے' لوگ اس کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔"

"ہاں۔۔۔۔۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔" امثل نے میری تائید کی۔۔۔۔۔ "انسان کو ہمیشہ پناہ کا احساس ستاتا رہا ہے۔ مذہب بھی ایک جذباتی پناہ گاہ ہے۔ جس میں ہر دور کا آدمی پناہ لیتا رہا ہے۔ بس ان پناہ گاہوں کے گنبدوں کی شکلیں بدلتی رہی ہیں!"

عاطف چپ چاپ' جیپ میں بیٹھا رہا۔ اس نے ہماری گفتگو میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ جب۔۔۔۔۔ ہم دوبارہ جیپ میں بیٹھ گئے' تو امثل نے ہنس کر اس کی طرف دیکھا۔

"بھائی جان' موت کے خوف سے سفر کا مزہ کرکرا نہ کریں۔ کل کی بات ہے۔ آپ ان شہیدوں کو سلام کہہ رہے تھے' جنہوں نے اپنی زندگیاں نچھاور کر کے آپ کا سر "کے ٹو" کی طرح اونچا کر دیا تھا اور نانگا پربت پر سے سفر کی سہولتیں بہم پہنچائی تھیں۔ موت سے خائف ہونے کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ انسان زندگی میں بار بار مرے۔"

عاطف نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے ایک نظر بہن کی طرف دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا لیں۔ اب ہم ایسے گاؤں سے گزر رہے تھے' جہاں کھیتوں میں سبز گندم کھڑی تھی۔ حالانکہ پنجاب میں دو ماہ پیشتر فصل اٹھائی جا چکی تھی۔۔۔۔۔ سڑک کے دائیں بائیں اخروٹ اور شہتوت کے درخت کھڑے تھے' جن کے تنوں اور شاخوں سے انگور کی بیلیں اژدھوں

کی طرح لپٹی ہوئی تھیں۔

خوبانی کے پیڑ ادھ پکی خوبانیوں سے لدے ہوئے تھے۔

پچیس چھبیسویں میل پر دائیں ہاتھ دریا کے اس پار' ایک چھوٹا سا قلعہ اور گاؤں نظر آیا۔ ڈرائیور نے بتایا۔

"یہ شیر قلعہ کا گاؤں ہے۔ پنیال سٹیٹ کا راجہ یہیں رہتا ہے۔ بہت اچھا آدمی ہے...... سیاحوں کے ساتھ پیار و محبت سے پیش آتا ہے۔"

اشل جو اپنی افتاد طبع کی وجہ سے ایسے موقعوں سے کتراتی تھی' بولی۔ "چلیے دیکھتے ہیں۔ راجے کیسے ہوتے ہیں!"

یہاں ہم نے دریائے گلگت کو پھر معلق پل کے ذریعے پار کیا۔ تھوڑی دیر بعد جیپ چوگان کے میدان میں پہنچ گئی جہاں دائیں ہاتھ دریا کے کنارے راجہ صاحب کا گھر تھا اور سامنے قلعہ تھا۔

راجہ صاحب کو اطلاع کرائی گئی' تو وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر شلوار قمیص اور چترالی ٹوپی پہنے باہر آ گئے۔ وہ دبلے پتلے' بڑی بڑی مونچھوں والے نہایت سادہ اور منکسر المزاج آدمی لگے۔ ان کی ہنسی میں بچوں جیسی کشش اور معصومیت تھی۔ نہایت تپاک اور محبت سے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور شینا زبان میں نوکر کو چائے کا کہا۔

صوفے اور قالین اگرچہ قیمتی نہیں تھے' لیکن ہر چیز صاف ستھری اور قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ دروازے کے پاس دیوار پر راجہ صاحب ان کے باپ' دادا اور پردادا کی تصاویر لگی ہوئی تھیں۔

سنٹر ٹیبل پر دو رجسٹر رکھے ہوئے تھے' جن میں ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کے ایڈریس درج تھے۔ ہر سیاح نے نہایت دلچسپ پیرائے میں راجہ صاحب کی مہمان نوازی کی تعریف لکھی تھی۔ چائے آ گئی تو راجہ صاحب کہنے لگے۔

"اب تو ہم بس نام کے راجہ رہ گئے ہیں۔ کیونکہ حکومت پاکستان نے ہمارے وظیفے مقرر کر دیئے ہیں۔ اب ہمارا رعیت سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ کیونکہ اب یہاں تھانے بن

گئے ہیں۔ تحصیلدار آ گئے ہیں۔ پہلے ہم فیصلے کرتے تھے۔ اب حکومت فیصلے کرتی ہے۔"

اشل نے پوچھا۔

"راجہ صاحب...... پہلا نظام اچھا تھا یا موجودہ نظام اچھا ہے؟"

راجہ صاحب ہنس پڑے۔

"دیکھو خاتون' بادشاہی کسے پسند نہیں ہوتی۔ ہم بھی چھوٹے موٹے بادشاہ تھے۔ فصل' پھل' مویشی' دودھ' گھی' مرغی' انڈا ہر چیز میں ہمارا حصہ ہوتا تھا۔ سال میں لاکھ ڈیڑھ لاکھ مل جاتا تھا۔ اب تین ہزار روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہوا ہے اور اختیارات الگ ختم ہو گئے ہیں۔ ظاہر ہے' ہمیں تو پہلا نظام ہی پسند ہوگا' لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ عام آدمی کو موجودہ نظام سے ہی فائدہ ہوا ہے۔ اور پھر یہ کہ ہم اکیلے نہیں ہیں۔ ہمارے اور بھی کئی راجوں کی مطلق العنانی ختم ہو گئی ہے' اس لئے صبر آ گیا ہے۔"

اشل نے چھیڑنے کے انداز میں پوچھا۔

"راجہ جی...... جب آپ راجہ تھے' تب کیا محسوس کرتے تھے اور اب جب راجہ نہیں رہے' تو کیا محسوس کرتے ہیں؟"

"زمین و آسمان کا فرق...... پہلے ساری دنیا سلام کرتی تھی۔ ہمیں پروا نہیں ہوتی تھی...... اب ہم سلام گنتے ہیں۔ کون کرتا ہے کون نہیں کرتا اور ہمیں شدید اذیت ہوتی ہے۔ پہلے لوگ سر جھکا کر بات کرتے تھے' اب آنکھ ملا کر بات کرتے ہیں اور ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ واقعی انہیں بات کرنا آتی ہے۔ پہلے لوگ ہمارے سامنے ہنس کر بات نہیں کر سکتے تھے' اب قہقہے لگا کر بات کرتے ہیں اور المیہ یہ ہے کہ بظاہر ہم بھی ان کے قہقہوں میں شامل ہوتے ہیں۔ حالانکہ دل میں سوچتے ہیں کہ خود پر کتنا ظلم ڈھا رہے ہیں' لیکن پھر خیال آتا ہے' یہ المیہ صرف ہم تک محدود رہے گا۔ ہماری اولاد خود اذیتی کے اس احساس سے آزاد ہوگی۔ کیونکہ وہ نئے ماحول میں ڈھل کر جوان ہوگی اور احساس برتری کے گھمنڈ سے عاری ہوگی!"

"مگر آپ کی اولاد تاریخ تو پڑھے گی۔" اشل نے پھر سوال کیا۔ "جب انہیں معلوم

ہو گا کہ وہ راجاؤں کی اولاد ہے' تو کیا احساس محرومی کا شکار نہیں ہو گی؟"

"ہمارا خیال ہے' ان کی تکلیف ہم جیسی نہ ہو گی۔ رفتہ رفتہ حالات سے سمجھوتہ کر لیں گے۔ کیونکہ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ بڑی بڑی سلطنتیں صفحہ ہستی سے مٹ گئیں اور عظیم المرتبت شہنشاہ نان شبینہ کو محتاج ہو گئے۔"

انجل جو چسکے لے رہی تھی' ہنس پڑی اور جانے کی اجازت چاہی------ راجہ صاحب نے جس تپاک سے خوش آمدید کہا تھا' اسی محبت سے رخصت کیا۔ ڈرائیور نے ایک اور خوشخبری سنائی۔

"صاحب! ابھی میں آپ کو یہاں سے آٹھ میل آگے سنگل لے جا رہا ہوں۔ وہاں دریا کے کنارے جھیل ہے۔ جہاں آپ سانپ اور ٹراؤٹ مچھلی ہزاروں کی تعداد میں دیکھیں گے۔"

اس سفر میں عاطف نے پہلی بار دلچسپی لی۔

"کیا وہاں ٹراؤٹ مچھلی پکڑنے کی اجازت ہے؟"

"جی نہیں۔ اجازت لینا پڑتی ہے' جو مشکل سے ملتی ہے۔ کیونکہ سانپوں اور ٹراؤٹ مچھلی کا اکٹھا رہنا اور سیاحوں کے لئے محفوظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔"

اکیسویں میل پر پیلے رنگ کا ایک سانپ سڑک پر کچلا پڑا تھا۔ ڈرائیور نے کہا۔

"صاحب---- اس علاقے میں بہت سانپ ہے۔ یہ اوپر سے پانی کے لئے اترتے ہیں اور عام طور پر جیپوں کے نیچے کچلے جاتے ہیں۔ جیپ کو دیکھ کر سڑک پر بھاگنا شروع کرتے ہیں۔ باقاعدہ ریس ہوتی ہے۔ سانپ کا فرار نہایت دلچسپ ہوتا ہے۔ آدمی اسے مارنا بھی چاہتا ہے۔ دل میں خوف زدہ بھی ہوتا ہے۔ کبھی بچ کر نکل جاتے ہیں' مگر اکثر مارے جاتے ہیں۔"

ٹورسٹ بیورو کا ڈرائیور خاصہ تجربہ کار اور ہوشیار آدمی تھا۔ سیاحوں کے ساتھ رہ کر جان گیا تھا کہ وہ لوگ کیا چیز پسند کرتے ہیں۔

سانپوں کی باتیں ہو رہی تھیں کہ ڈرائیور نے اچانک جیپ روک لی۔ اس نے بائیں

ب اشارہ کر کے ہمیں متوجہ کیا۔ ایک چٹان پر سے خوبصورت چت کبرے سانپوں کا ڑا نیچے کی طرف رینگ رہا تھا۔ ہم نہایت اطمینان اور تجسس سے دیکھنے لگ گئے۔ ی دیر کے بعد وہ سڑک کے کنارے پہنچ گئے۔

اب ہمارے اور ان کے درمیان میں پچیس فٹ کا فاصلہ تھا۔ ڈرائیور نے بریک سے پاؤں اٹھا کر ایکسیلٹر پر پاؤں رکھا تو انجل نے اسے ٹوک دیا۔

"نہیں نہیں---- جانے دو ان کو۔"

اب وہ سڑک کراس کر رہے تھے۔ ان کا رخ نیچے دریا کی طرف تھا۔ ہماری خاموشی کی ے ان میں سراسیمگی اور فرار والی کیفیت پیدا نہ ہوئی۔ جب سڑک کراس کر کے وہ ڈھلان تک پہنچ گئے۔ تو ہم تینوں جیپ سے اتر آئے۔ عاطف جیپ میں بیٹھا رہا۔ ڈرائیور صبر نہ آیا۔ اس نے پتھر اٹھا کر ان کی طرف پھینکا۔

سانپوں کی رفتار یک لخت بدل گئی۔ وہ سیمابی اور اضطراری کیفیت میں تیزی سے گے۔ وہ جانور جس نے منہ میں موت کا راز چھپا رکھا تھا' انسان سے اتنا خوف زدہ تھا کہ ر پاؤں رکھ کر بھاگ رہا تھا۔

جیپ میں واپس آ گئے' تو عاطف نے کہا۔

"تم لوگ جو فلسفے کی باتیں کرتے ہو' منطق بگھارتے ہو' مگر سپیروں کی طرح سانپوں کھیلتے ہو اور بچوں کی طرح خوش ہوتے ہو۔"

انجل نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

"واقعی ہم بھائی جان کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ ہم جو ہر لمحہ اپنی مرضی کرتے پھر بھائی جان کی مرضی کا خیال کیوں نہیں رکھتے۔ ٹھیک ہے۔ ہمیں اتنا خودغرض نہیں نا چاہیے۔"

میں خاموش رہا۔ کیونکہ عاطف واقعی چڑ گیا تھا۔ اس وقت اس کی بات کی تائید یا تردید ے میں مزید چڑ جانے کا اندیشہ تھا۔

جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے' وادی مزید سرسبز و شاداب ہوتی جا رہی تھی۔ جگہ

جگہ کھیتوں' منڈیروں پر انگور' سیب' بادام' اخروٹ اور خوبانی کے درخت لگے ہو
تھے۔ خوبانی کے پیڑ تو اس بہتات سے تھے جس طرح پنجاب میں شیشم اور کیکر۔
چونکہ تازہ پھل ذرائع آمد و رفت کی کمی کی وجہ سے باہر نہیں جا سکتا' اس لئے
طور پر خوبانی سکھاری جاتی ہے' جو برف باری کے زمانے میں نہ صرف کھائی جاتی ہے
ٹھوس شکل میں باہر بھی بھیجی جاتی ہے۔

یہ سڑک اسی طرح پہاڑ کے پہلو بہ پہلو اور دریائے گلگت کے کنارے کنارے چتر
کی سرحدوں تک چلی جاتی ہے۔ اس علاقے میں شینا اور چترالی دونوں زبانیں بولی ج
ہیں۔

سنگل پہنچ کر ہم نے عجیب و غریب نظارہ دیکھا۔ دریائے گلگت کے کنارے یہ چھوٹی
جھیل واقعی ایک عجوبہ تھی۔ شاید دنیا میں کہیں اور ایسا نہ ہو۔

باریک چھڑی کی طرح گہرے سلیٹی رنگ کے شوخ و شنگ سانپ اس تیزی سے اد
ادھر لپک رہے تھے' جیسے ٹراؤٹ مچھلیوں سے کسی آبی کھیل کا آزمائشی مقابلہ ہو رہا
کیونکہ ٹراؤٹ مچھلیاں بھی پرے کے پرے قطار در قطار اور لہر در لہر اِدھر اُدھر بھاگ ر
تھیں۔

ٹراؤٹ مچھلی ---- دنیا کی سب سے قیمتی اور لذیذ مچھلی' جس کی تلاش میں شکا
مارے مارے پھرتے ہیں' ہزاروں کی تعداد میں اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ ہزاروں کی تع
میں سانپ بھی بھلا کسی نے کاہے کو دیکھے ہوں گے۔

یہ ایسا منظر تھا' جو اگر کتاب میں پڑھتے' تو شاید مشکل سے یقین کرتے' مگر ہم تو ا
آنکھوں سے دیکھ رہے تھے ---- انسان تصور نہیں کر سکتا کہ دنیا میں اتنے عجیب و غ
مشاہدوں سے بھی دامن بھرا جا سکتا ہے!

امثل جو حیرت اور تجسس سے سانپوں اور مچھلیوں کے کھیل سے محظوظ ہو رہی
دھیرے سے بولی۔

"سفر ہمیشہ جاری رکھنا چاہیے۔ ان سانپوں اور مچھلیوں کی طرح' جو ایک چھوٹی

329

ں میں بھی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں ---- کتنے متحرک ہیں یہ' کتنی بے قراری ہے
ں' کس قدر بے چینی ہے' کیسی تلاش ہے ان میں' واہ ----! سفر کتنا بڑا تجربہ
"!

جھیل سڑک سے کافی نیچے تھی۔ ہم سڑک کے کنارے کھڑے یہ سب کچھ دیکھ رہے
۔ امثل بولی۔

"چلئے نیچے چلتے ہیں' ذرا قریب سے دیکھتے ہیں۔"

مگر ملک نے اسے ٹوکا۔

"امثی ---- خدا کے لئے باز آ جاؤ۔ سب کچھ تو نظر آ رہا ہے۔ نیچے نہ جاؤ۔"

"بھائی جان' میں نے سانپوں سے ڈرنے کے بہت خواب دیکھے ہیں۔ ایسا منظر تو پھر
خواب میں بھی نہ دیکھوں!"

ڈرائیور نے کہا۔

"چلیے ---- میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

ملک کھڑا رہا' مگر میرے لئے اب وہاں کھڑا رہنا مشکل تھا۔

جونہی ہم کنارے پر پہنچے' مچھلیوں کا ایک متحرک حصہ ہماری طرف لپکا۔ یہ بھولا جانور
ٹا ٹا کر اور دمیں ہلا ہلا کر گویا ہمارا استقبال کر رہا تھا ---- لیکن اس کے برعکس سانپوں
ایک عجیب و غریب اضطراب پھیل گیا۔ وہ جو ہمیشہ انسان کا شکار بنتا ہے' انسان کے
ل میں لوٹ رہا تھا اور وہ جو انسان کا شکار کر سکتا ہے' مضطرب ہو کر انسان سے بھاگ
تھا ---- سانپ بجلی کی سی سرعت سے منتشر ہو کر' اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ ان کی
ٹری کا عجب عالم تھا۔ سارے کے سارے سانپ ٹوٹتے بنتے جال کی طرح پانیوں میں
ہ گئے ---- یہ احتجاج تھا یا خوف تھا' مگر ہم سے ان کی یہ اضطراری کیفیت دیکھی نہ
ہ امثل مسکرا کر بولی۔

"یہ اپنی جنت میں انسان کا آنا پسند نہیں کرتے' آؤ اوپر چلیں۔" اوپر سڑک کے
سے لنچ کرنے بیٹھ گئے' تو میں نے کہا۔

"جب ہم نانگا پربت سے گزرے تھے، تو وہ وجدانی کیفیت اور تھی، لیکن یہ جو ابھی ابھی تماشہ دیکھا ہے، میں اپنا ایکسپریشن بیان کرنے سے قاصر ہوں۔"

امثل نے کہا۔

"نہ جانے وہ ٹراؤٹ مچھلیوں کے لئے سرگرداں تھے، یا اپنے طور سے خوفزدہ تھے، لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ مچھلیوں سے زیادہ سمجھدار تھے...... نیچر کا یہ دفاعی نظام کچھ عجیب لگ رہا ہے۔ آپ نے دیکھا، ایسی سیمابی کیفیت تھی، ان سانپوں کی جیسے ابھی اڑ کر ہم سے لپٹ جائیں گے۔"

"ہاں واقعی..... میں تو خوفزدہ ہو گیا تھا۔ صرف وہی نہیں ڈر رہے تھے۔"

"وسیم صاحب، اس ڈر میں تو سارا فتنہ پوشیدہ ہے۔ ایک دوسرے کا خوف ہی ایک دوسرے پر وار کرنے کا باعث بنتا ہے۔ دراصل ہم اپنے آپ کو بچانے کے لئے دوسرے کا کام تمام کرتے ہیں، ورنہ کوئی کیوں کسی کو مارے۔ سانپ بھی آخر اکٹھے رہ رہے ہیں!"

ہمیشہ کی طرح امثل کی یہ بات بھی میرے دل میں اتر گئی۔

کھانا ختم ہوا، تو ڈرائیور نے پوچھا۔

"صاحب، آگے جانا ہے یا واپس چلنا ہے؟"

"واپس چلیں گے۔" عاطف نے فوراً جواب دیا..... "آگے بھی یہی دریا ہو گا، یہی پہاڑ ہوں گے اور یہی خون خشک کرنے والی سڑک ہو گی!"

امثل نے ایک بار پھر مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ امثل کی یہ مسکراہٹ جس میں بعض کے لئے بیک وقت احترام، تمسخر اور حجاب کی ملی جلی کیفیت تھی، بے حد ذو معنی اور دلکش تھی۔ یہ اس کے کردار کا عجیب و غریب پہلو تھا کہ جو لڑکی کسی کے زیر اثر نہیں تھی، بھائی کی جھنجلاہٹ کو محسوس کر رہی تھی۔ بلکہ اس طرح مسکرا مسکرا کر خاموش ہو جانا بجائے خود ایک اعزاز تھا۔

میرے لئے یہ روشنی کی ایک نئی کرن تھی، جو اس کے خوبصورت جسم سے پھوٹ نکلی تھی۔

جب ہم واپسی کے لئے جیپ میں بیٹھ گئے، تو عاطف ندامت آمیز لہجے میں بولا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے پروگرام میں مخل ہو رہا ہوں۔ یہ شاید پہلا موقع کہ میں امثل کی مرضی کے بغیر اپنا فیصلہ صادر کر رہا ہوں، مگر اس کا مطلب ہرگز یہ ہے کہ میں اس دھاندلی کو پسند کرتا ہوں۔ مجھے اس کا بھی افسوس ہے کہ میں نے پ جیسا ذہن نہیں پایا۔ میں مشکل پسندی کی بجائے احتیاط پسند ہوں۔ بلکہ ایک حد تک ل بھی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میرے بغیر آپ کی مہم جوئی کامیاب رہے گی۔"

"عاطف......!" امثل کے بجائے میں اس سے مخاطب ہوا..... "ہم آپ پر شک کرتے۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ ہم دونوں سے محبت کرتے ہیں۔ آپ جو لاکھوں کا بار کرتے ہیں، سب کچھ چھوڑ کر ہمارے ساتھ گھوم رہے ہیں، تو ہم جانتے ہیں کہ ا جذبہ ہے، جس کی خاطر آپ ہمارے ساتھ ہیں۔ کم از کم میں اور امثل اتنے احمق ہیں کہ آپ کو پہچاننے میں غلطی کریں۔ میرا خیال ہے، ہمیں ایک دوسرے کو صفائی کرنے کی ضرورت نہیں پڑنی چاہیے۔"

عاطف خاموش ہو گیا۔ امثل ہلکے پھلکے موڈ میں تھی۔ اس کے لبوں پر لطیف سی مسکان ۔ اس نے عاطف کی باتوں کو ذرا بھی محسوس نہیں کیا تھا۔

واپسی کے سفر میں بھی وہی چڑھائیاں، وہی اترائیاں، وہی خطرناک موڑ تھے..... اور ریائے گلگت۔

ام کو تقریباً سات بجے ہم گلگت پہنچ گئے۔

رے کے کپڑے اتار کر میں نہانے کی تیاری کر رہا تھا کہ عاطف اندر آ گیا۔ اس کا رنگ ہو رہا تھا۔ وہ کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے اس کی وحشت کو محسوس ئے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"وسیم صاحب!" وہ دھیرے سے بولا..... "میں آج کے رویئے کی معافی چاہتا ہوں۔ ل میں اس سفر اور سانپوں سے بہت سہم گیا تھا اور یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں یہ سفر خوشنودی کے لئے کر رہا ہوں۔ وہ بے حد حساس لڑکی ہے۔ مجھے خدشہ ہے، اس

نے میرے رویے کو محسوس نہ کیا ہو۔ آپ نے نوٹ کیا ہوگا واپسی پر وہ سارے راستے خاموش رہی۔"

میں نے پوچھا..... "اس وقت وہ کیا کر رہی ہے؟"

"باتھ روم میں ہے۔ گرم پانی منگوایا تھا۔ غالباً نہا رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ فکر نہ کریں۔ اس نے آپ کی کوئی بات محسوس نہیں کی۔ میں نے [illegible] کے رویے میں آپ کے لئے احترام ہی پایا ہے۔ وہ ہرگز اس طرح کی لڑکی نہیں ہے کہ چونکہ اس کی ہر بات مانی جاتی ہے' اس لئے وہ اپنی با اختیار پوزیشن سے فائدہ اٹھائے گی۔"

"وسیم صاحب..... المیہ یہ ہے' اگر میں آپ کے ساتھ سفر جاری رکھوں' تو اندیشہ ہے کہ میرا کام تمام ہو جائے گا کیونکہ آج کے سفر میں بھی میرا دل کئی بار ڈوبتے ڈوبتے بچا اور اگر سفر جاری نہ رکھ سکا تو یہ امر ستائے گا کہ میں نے امتی کو اکیلا چھوڑ دیا ہے۔ چہ جائیکہ امتی بھی سوچے کہ بھائی اپنی بہن سے بیزار ہو گیا ہے!"

"نہیں نہیں' یہ غلط ہے۔ کیونکہ آپ کی نیت ہی ایسی نہیں ہے۔ کم از کم مجھ پر یہ بات واضح ہے کہ آپ کو امتی سے کتنا لگاؤ ہے۔ امتی تو خیر مجھ سے بھی زیادہ آپ کو جانتی ہے..... آپ ساتھ ہوں گے تو بہتر ہے' لیکن اگر مجبوری ہو' تو امتی مجھ سے زیادہ آپ کی مجبوری کو سمجھتی ہے۔ ٹھیک ہے' وہ حساس لڑکی ہے' لیکن فرد سے روٹھنے والی لڑکی نہیں۔ ذاتی رنجشوں کی اس کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں ہے اور نہ وہ اس سطح کے [illegible] سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ آدمی کی نہیں' آدمی کی ذہنیت کی شاکی ہے۔ وہ انسان سے نفرت نہیں کرتی۔ انسان کے اندر کی خباثت سے نالاں ہے۔ اس کا دکھ روحانی ہے اور اس کا [illegible] آفاقی ہے' اس لئے آپ مطمئن رہیں عاطف' امتی ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے بہت آگے ہے۔"

عاطف کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

میں نے کہا "مگر پھر بھی میری حیثیت ایک ہمراہی سے زیادہ کچھ نہیں۔ آپ کی طرح

اپنائیت کا دعویٰ تو نہیں کر سکتا۔"

"ٹھیک ہے۔ تب ایک نیکی کا دعویٰ تو میں بھی کر سکتا ہوں کہ امتی کا بھائی ہوں!؟"

"ہاں..... مگر میں تو یہ بھی نہیں کہہ سکتا۔ میں تو کچھ بھی نہیں کہہ سکتا کہ گلگت کے بعد کونسا سفر ہوگا اور اس سفر میں ہمسفر بھی ہوں گا یا نہیں؟"

عاطف میرے لہجے اور لفظوں کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔ وہ کرسی کھینچ کر میرے اور قریب آ گیا اور پیار سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔

"اگر میری دوستی آپ کے کسی کام آ سکتی ہے' تو یقیناً دنیا میں آپ کا پہلا اور آخری دوست میں ہوں اور اگر امتی کے بعد مجھے کوئی آدمی عزیز ہو سکتا ہے تو یقیناً وہ پہلے اور آخری آدمی آپ ہوں گے' لیکن جیسے آپ بے بس ہیں' ویسے ہی میں بے بس ہوں۔ جو کچھ آپ چاہتے ہیں وسیم بھائی' دراصل یہ خواہش تو میری ہے..... میرا تو زندگی کا نصب العین ہی امتی کی خوشی ہے۔ آپ کی وجہ سے تو میں اپنا بار کچھ کم محسوس کرنے لگا تھا۔ آپ مایوس ہونے والے آدمی تو نہیں تھے.....؟ آپ نے تو کہا تھا' خدا سے لوگ مایوس نہیں ہوتے!"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ "نہ جانے میں نے یہ سب کچھ کیوں کہہ دیا۔ شاید آپ کی پریشانی نے مجھ پر بھی یاسیت طاری کر دی۔ ہاں یہی بات ہے' یہی بات ہوگی۔"

عین اس لمحے امتی اندر آ گئی۔

"کیا بات ہے جناب' کیا پروگرام بن رہے ہیں؟"

ہم دونوں اس اچانک حملے کے لئے بالکل تیار نہ تھے۔ اگرچہ کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق ہنسنے لگے' لیکن دل کا چور آنکھوں میں براجمان تھا۔

"ارے ارے.....!" وہ حیرت سے بولی..... "آپ دونوں اس قدر گھبرا کیوں رہے ہیں۔ اگر بھائی جان کو ساتھ لے جانے کی سکیم طے ہو رہی ہے' تو میں بتا دوں کہ سکیم بنانے کی ضرورت نہیں۔ یہ یہیں رہیں گے!"

"کیوں------ یہ کیوں یہاں رہیں گے------؟" میں نے الناچور کوتوال کو ڈانٹنے والا ہتھیار استعمال کیا۔

"اس لئے کہ یہ ہمیں سانپوں سے ڈرائیں گے۔ دریاؤں کی طغیانی کی باتیں کریں گے۔ مستقبل کا پرچار کریں گے اور سفر کا مقصد ادھورا رہ جائے گا۔"

"مگر اصل یہ سارا دن ریسٹ ہاؤس میں کیا کریں گے------؟" میں نے ایک خاص ادا سے پوچھا۔

"چاہیں تو ڈپٹی کمشنر سے مل سکتے ہیں۔ کراچی ٹیلیفون بھی کر سکتے ہیں۔ ورنہ سوئیں گے' پڑھیں گے' کھائیں گے۔ بازار میں گھومیں گے۔ غیر ملکیوں سے ملاقاتیں کریں گے اور ہماری واپسی کا انتظار کریں گے۔"

"چلئے' مجھے منظور ہے۔" عاطف سادگی سے بولا۔

اصل نے جس خوبصورتی سے صورت حال کو سنبھالا' میرا دل خوش ہو گیا۔ وہ نہا کر آئی تھی۔ گرم پانی سے نہانے کا نکھار اور تازگی اس کے چہرے پر کھل رہی تھی اور رات کے کپڑوں پر گاؤن پہنے وہ بے حد پیاری لگ رہی تھی۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

صبح جب میں اور اصل جیپ میں بیٹھ گئے' تو عاطف نے کہا۔

"اگر اس وقت میں رائے دوں کہ آپ جیپ کے بجائے جہاز میں سکردو جائیں تو ظاہر ہے آپ نہیں مانیں گے۔"

"بھیا------ ہم واپسی پر ضرور جہاز میں آئیں گے' لیکن سڑک سے جانا بے حد ضروری ہے۔ ورنہ کیا آنا کیا جانا' سفر کا مقصد تو پورا نہ ہو گا۔"

"پنیال کی وادی میں چونتیس میل کا سفر اور کاغان کی وادی میں اکیاون میل کا سفر آپ کو یاد ہو گا۔ نہ بھولئے کہ سکردو یہاں سے ڈیڑھ سو میل دور ہے اور یہ سفر دنیا کے تیز رفتار دریا کے پہلو بہ پہلو ہو گا۔"

اصل نے ہنس کر کہا------ "آپ ہمارے لئے دعا کریں۔"

جیپ چل پڑی۔ عاطف خاموش کھڑا رہا۔ اس وقت وہ بے حد سنجیدہ اور گمبھیر تھا۔

دریائے گلگت پر جھولنے والا معلق پل عبور کر کے ہم دائیں ہاتھ مڑ گئے------ دو تین میل کے بعد ایسے ہی معلق پل کے ذریعے دریائے ہنزہ کو عبور کیا۔

دریائے ہنزہ کے اس پار سے ایک سڑک بائیں ہاتھ نکلتی تھی۔ یہ شاہراہ ریشم تھی------ دائیں ہاتھ کو چھوٹی سی سرنگ تھی۔ معلوم ہوتا تھا کسی جانور کی غار ہے۔ لیکن اگلے لمحے ہماری جیپ اس میں گھس گئی۔

ہاں------ تو یہ سکردو جانے والی سڑک تھی۔ ہم دائیں ہاتھ مڑ گئے تھے۔ یہاں سے دس بارہ میل تک ہو شکن' جلال آباد اور محمبو گر کا علاقہ بے حد سرسبز و شاداب تھا۔ ہر طرف خوبانی کی بہار تھی------ پیڑ پھلوں سے لدے ہوئے پیلے نظر آ رہے تھے۔

برفانی نالوں کا صاف و شفاف پانی کھیتوں اور باغات کو سیراب کر رہا تھا۔ محمبو گر سے آگے کا علاقہ خشک اور پہاڑی تھا۔ دریائے ہنزہ اور گلگت ایک دوسرے سے مل گئے تھے------ دریا کے اس پار پہاڑ کے دامن میں شاہراہ قراقرم نظر آ رہی تھی' جس نے گلگت کو سوات سے ملا کر وادی بلتستان اور گلگت کی مشکلات ایک حد تک ختم کر دی ہیں۔ یہ سڑک دریائے سندھ کے کنارے کنارے تین سو میل لمبی ہے اور تمام سال کھلی رہتی ہے------ برفباری کے دنوں میں جب گلگت اور سکردو ہر طرف سے کٹ جاتے ہیں' یہ سڑک ایسے پل کا کام دیتی ہے' جو زندگی کی علامت ہو۔

جہاں ہوائی جہاز کے ذریعے ستر روپے من کے حساب سے کھانے پینے کا سامان اور دوسری ضروریات زندگی پہنچتی تھیں' وہاں اس سڑک کے ذریعے راولپنڈی سے گلگت تک صرف دس روپے من کے حساب سے اخراجات باقی رہ گئے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد ہم عالم پل پہنچے۔ یہ لوہے کا پل تھا۔ جو شاہراہ قراقرم اور سکردو روڈ کو ملاتا تھا۔ چند میل کے بعد دریائے گلگت کو چھوڑ کر ہم بائیں ہاتھ مڑ گئے------ اب ہم انڈس ویلی میں داخل ہو چکے تھے------ دو سربفلک خشک پہاڑوں کے درمیان دریائے چناب' ٹھاٹھیں مارتا ہوا' چوکڑیاں بھرتا ہوا جانب جنوب رواں دواں تھا۔

نیلاب...... دریائے سندھ کا قدیم نام' ممکن ہے سردیوں میں نیلاب یا نیل آب ہو' مگر اس موسم میں تو اس کا پانی نہایت گدلا اور مٹیالا تھا۔

سکردو کی سڑک بائیں ہاتھ کے پہاڑ کی بغل میں بنائی گئی تھی۔ دریا دائیں طرف بہہ رہا تھا...... سڑک بہت تنگ تھی۔ اگر آمنے سامنے جیپیں آ جاتیں' تو عموماً اترائی پر آنے والے ڈرائیور کا فرض ہوتا تھا کہ وہ کسی موڑ پر گنجائش دیکھ کر جیپ کھڑی کر دے اور اوپر جانے والی جیپ کو پہلے گزرنے دے۔ یہ اصول طے تھا اور سارے ڈرائیور اس پر عمل کرتے تھے۔

جوں جوں آگے بڑھتے گئے' سڑک تنگ اور عمودی ہوتی چلی گئی۔ ہر موڑ ایک تجربہ تھا اور ہر چڑھائی کے بعد آنے والی اترائی انکشاف کی حیثیت رکھتی تھی۔

سامنے کا پہاڑ' جس کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں' دو چار میل کے بعد ایک طرف ہٹ جاتا تھا اور اس کی جگہ دوسرا پہاڑ راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ یہ پریکٹس مسلسل جاری رہی۔ سامنے کے پہاڑ نامعلوم انداز میں دائیں بائیں سرکتے رہے' مگر اس وادی کا جادو نہ ٹوٹا۔

نیچے دریا' اوپر نیلا آسمان' دائیں بائیں پہاڑ' گویا ہم ایک طویل و عریض طلسماتی قلعے میں سفر کر رہے تھے۔

ڈرائیور نے بتایا۔

"سکردو سے آگے بھی جہاں تک پاکستان کی سرحد ہے' دریائے سندھ کی ساری گزرگاہ یہی نقشہ پیش کرتی ہے۔ بلکہ اس سے آگے بھی یہی کیفیت ہے۔ بعض جگہ حیرت انگیز طور پر پراسرار ہو جاتی ہے۔"

امثل باہر کی طرف بیٹھی تھی اور بے خطر دریا کی جولانیوں سے محظوظ ہو رہی تھی۔ مجھے اس لڑکی کے دل گردے پر حیرت ہو رہی تھی۔ کم از کم میں اس سائیڈ پر اس تسلی سے کبھی نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ بلکہ درمیان میں بیٹھے ہوئے بھی میرا کلیجہ دہل جاتا تھا...... سانس رک رک جاتا تھا۔ اعصاب تن تن جاتے تھے...... پانی کے گرداب دیکھ کر میں

شدت خوف سے آنکھیں بند کر لیتا تھا۔

لیکن ان تمام اذیتوں کے باوجود ایک ایسی راحت بھی تھی' جو میرے خوف اور اذیت پر غالب آ جاتی تھی۔ یہ راحت امثل کا نازک بدن تھا اور اس بدن سے اٹھتی ہوئی خوشبوئیں تھیں' اور ان خوشبوؤں سے پھوٹتا ہوا نغمہ تھا۔

اس نغمے میں پورے سات سر تھے!

ہر موڑ پر' دائیں بائیں کے ہر موڑ پر' میں اس کے کندھے سے لگ جاتا تھا...... یا اس کا سر میرے شانے پر آ جاتا تھا...... کئی بار ایسے خطرناک موڑ بھی آتے کہ میں اس کے شانوں پر ہاتھ پھیلا کر اسے احتیاطاً سنبھال لیتا۔ خدا جانے وہ کیا محسوس کرتی لیکن میں ہر خطرہ بھول جاتا۔ بدی کا تصور ختم ہو جاتا اور میرا سینہ خوشی اور نیکی کے گوناگوں احساسات سے بھر جاتا۔ میرا دل مضبوط ہو جاتا اور میرا وجدان نور کی طرح بکھر جاتا......
کوئی گناہ' کوئی خلش' کوئی گراں باری' کوئی خطرہ امثل کی قربت کے احساس پر غالب نہیں آ سکتا تھا۔

یہ ایسی روشنی تھی کہ ذہن کے سارے اندھیرے دور ہو جاتے۔

یہ ایسی توانائی تھی کہ ہر مصیبت زیر ہو جاتی۔

موت اور زندگی کی باتیں دور...... بہت دور پیچھے رہ جاتیں۔

تقریباً ایک بجے ہم سسی پہنچ گئے...... سسی آٹھ دس گھروں پر مشتمل مختصر سا گاؤں تھا۔ یہاں اوپر جانے والی اور اوپر سے آنے والی چار پانچ جیپیں کھڑی تھیں اور ڈرائیور ایک درخت کے نیچے چارپائیوں پر سستا رہے تھے۔

بالکل ان کی پشت پر پچاس گز کے فاصلے پر تقریباً سو گز کی بلندی سے ایک آبشار گر رہی تھی اور اس کی پھوار سے ڈرائیوروں کے کپڑے اور بان کی چارپائیوں پر بچھائے ہوئے گدے گیلے ہو رہے تھے۔

ان لوگوں کے بالوں پر ننھے ننھے موتی جم گئے تھے اور یہ لوگ مزے سے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

میں اور اسل بھی اس طرف گئے' تو انہوں نے ایک چارپائی ہمارے لئے خالی کر دی۔

اب آبشار کی پھوار ہم پر بھی پڑنے لگ گئی تھی...... یہ عجیب خوش رنگ پھوار تھی' جیسے سیال قوس قزح زمین پر اتر آئی ہو۔

ڈرائیور ایک دو گھنٹے یہاں ضرور ٹھہرتے۔ دوپہر کا کھانا بھی یہیں کھاتے اور راستے کی ساری کوفت دور کرتے۔

مسی اس گاؤں میں ہو نہ ہو' مگر مسی کی روح اس خوش رنگ پھوار کی شکل میں ہر آنے جانے والے پر محبت اور نور کی نکہتیں برساتی رہتی ہے۔

ہمارے لئے بھی کھانا آگیا...... مکئی کی روٹی اور گرم ساگ' میں نے لسی کا پوچھا تو فوراً مہیا کر دی گئی۔

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں کی وہ سائیڈ گیلی ہو گئی' جو آبشار کی طرف تھی' مگر ہم وہاں سے نہ اٹھے' کیونکہ اسل نے فیصلہ دے دیا تھا۔

"یہ موقع ہمیں زندگی نے پہلی اور آخری بار دیا ہے۔ کپڑے تو سوکھ جائیں گے مگر کسی کی نکہت بار روح سے دوبارہ ملاقات نصیب نہ ہو گی!"

اور یہ واقعہ بھی تھا۔ میں اٹھائیس برس کی عمر میں ایسا قدرتی منظر پہلی بار دیکھ رہا تھا--- بلندی سے پستی کی طرف گرنے والی آبشار اور شمال سے جنوب کی طرف چلنے والی ہواؤں کے اتصال سے جنم لینے والی یہ ہفت رنگ پھوار اپنی ایک الگ کیفیت رکھتی تھی۔

دراصل یہ ایک گیت تھا جسے نیچر گا رہی تھی۔

اور ایسا سر--- جسے پہاڑ نے اگلا تھا۔

جب ہمارے ڈرائیور کے کپڑے بھیگ گئے' تو اس کا جانے کا موڈ بن گیا---

آگے راستہ برابر خطرناک ہوتا جا رہا تھا۔ کئی جگہ ڈرائیور کو رکنا پڑتا اور جیپ کا سپیشل گیئر لگا کر اوپر چڑھنا پڑتا۔

اس طرح کی چڑھائی نہایت صبر آزما ہوتی' لیکن اس کے بعد جو اترائی آتی وہ چڑھائی کو

بھی مات کر دینے والی ہوتی۔ وہی سپیشل گیئر ہی کام آتا۔ چاروں ویل کام کرنے لگتے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیپ کو سیدھا دریا ہی میں اترتا ہے۔

اچانک موڑ آ جاتا۔ جیپ ٹرن کرتی اور ہمارے سامنے ایک نیا منظر کھل جاتا۔ وہی دریا' وہی پہاڑ اور وہی دریا کی بغل میں معلق سڑک' اور وہی نہ ختم ہونے والی انڈس ویلی۔

ڈرائیور کے اعصاب اور چابکدستی پر حیرت ہوتی۔ اس روڈ پر چلنے والے ڈرائیوروں کی تنخواہیں کمیشن وغیرہ ملا کر ہزار نو سو روپے ماہوار بن جاتی تھیں' جو ایک اچھے خاصے گزیٹڈ افسر کی تنخواہ تھی' لیکن واقعہ ہے کہ یہ تلوار کی دھار پر چلنے والے لوگ تھے اور روزانہ اس سڑک پر کامیاب سفر کرنا انہی کا حصہ تھا۔

گلگت سے سکردو تک ہوائی جہاز کا کرایہ تیس روپے تھا۔ لیکن ہمیں جیپ کے ذریعے ایک طرف کا یہ سفر تین سو روپے میں پڑ رہا تھا...... مگر جو تجربہ اور مشاہدہ سڑک کے ذریعے حاصل ہو رہا تھا' جہاز میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ہم یہ بات کب جان سکتے تھے کہ:

پربت بھی گیت گاتے ہیں......!

اور چٹانوں میں ردھم ہوتا ہے......!

اور قوس قزح جل پری بن کر زمین پر اتر آتی ہے...!!!

شام کے تقریباً پانچ بج رہے تھے' اسی میل کا سفر طے ہو چکا تھا کہ ایک نیا تماشا دیکھا۔

آسمان صاف تھا--- بادلوں کا نام و نشان نہیں تھا' لیکن سڑک سے تقریباً ساٹھ ستر گز بلندی سے سیلاب کا ایک طوفانی ریلا لوہے کی تیز چادر کی طرح سڑک پر گر رہا تھا۔ بلکہ اس کی ایک تیز دھار' موسلا دھار بارش میں بہتے ہوئے پرنالے کی طرح سیدھی دریا میں گر رہی تھی۔ اس سیلابی آبشار میں پاؤ اور آدھ آدھ سیر وزن کے پتھر ڈھیروں کی تعداد میں برس رہے تھے۔

سڑک کے دونوں اطراف جیپیں رک گئی تھیں۔

ہم بھی حیرت سے یہ تماشا دیکھنے لگ گئے۔

سڑک سے اوپر اور آبشار سے ذرا ہٹ کر بائیں طرف چٹان پر ایک سفید ریش بزرگ کھڑا نہایت متانت اور ٹھہراؤ سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔

معلوم ہوا کہ اوپر چوٹیوں پر پگھلی ہوئی برف کے پانیوں پر کسی برفانی تودے کے دباؤ نے یہ صورت حال پیدا کر دی ہے اور ایسا پہلی بار نہیں ہوا' بلکہ یہ تماشا اکثر ہوتا رہتا ہے' اور یہ ہنگامی آبشار ایک دو دن کے لئے راستہ بلاک کر دیتی ہے۔ ڈرائیور اس کے عادی تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنی اپنی گاڑیوں کو بریک لگا دیئے تھے اور پہیوں کے آگے پیچھے پتھر رکھ دیئے تھے۔

اور یہ جو اسی پچاسی سال کا تنومند بوڑھا سنجیدگی سے چٹان پر کھڑا ہے' اس ہنگامی آبشار کے انتظار میں رہتا ہے۔ اس وقت بھی بوڑھے نے چٹان کے پیچھے ایک چھوٹے سے خیمے میں دکان سجا رکھی ہے اور ضرورت کی سب چیزیں موجود ہیں۔

اس آبشار سے ایک میل اوپر ایک چھوٹے سے گاؤں میں اس بوڑھے کا گھر ہے اور یہ سب چیزیں ضرورت کے وقت اس ہنگامی دکان میں پہنچ جاتی ہیں۔

انسان ایک رات بھی اگر اس کے بس میں ہو' بھوکا رہ کر سونا پسند نہیں کرتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں پکنک کا سا سماں بندھ گیا۔

بوڑھے نے سب کو دودھ کے بغیر کالی چائے کا قہوہ پلایا۔ اس کے بعد کچھ لوگ ایندھن کی تلاش میں نکل گئے۔ کوئی آٹا گوندھنے لگا۔ کوئی دال صاف کر رہا تھا کوئی برتن مانجھ رہا تھا۔ کوئی پیاز کاٹ رہا تھا اور کوئی پتھر پر نمک پیس رہا تھا۔ جس کو جس چیز کی ضرورت پڑتی بن پوچھے دکان سے اٹھا لاتا اور تصرف میں لاتا۔ بوڑھا کسی سے باز پرس نہیں کر رہا تھا اور نہ کسی کو چیک کر رہا تھا...... یہ نرالی دکان تھی۔ انوکھے گاہک تھے اور نرالا دکاندار تھا۔

میں اور احل مزے سے ایک کمبل پر بیٹھے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔

ڈرائیور مذاق کر رہے تھے اور ایک دوسرے پر پھبتیاں کس رہے تھے' لیکن ایک

قابل احترام لڑکی کی موجودگی کا احساس چاروں طرف رچا بسا ہوا تھا۔ اس لئے مذاق میں سوقیانہ پن نہیں تھا۔

احل بولی۔

"اچھا ہوا۔ رات یہاں آ گئی۔ ابھی ستر میل کا راستہ باقی ہے۔ کل مزے سے سب کچھ دیکھتے ہوئے جائیں گے۔"

"لیکن۔" میں نے ہنس کر کہا: "آپ کی زندگی میں شاید یہ پہلی رات ہو گی کہ زمین پر سوئیں گی؟"

"سارا مزہ تو اسی میں ہے۔ میرے ساتھ ہیں پچیس آدمی اور بھی ہیں۔ میں ان سے برتر ہرگز نہیں اور پھر آپ بھی ہیں۔ صرف افسوس ہے تو بھائی جان کا ہے کہ وہ تجربہ حاصل نہیں کر سکے۔"

کچھ دیر بعد جب پتھربازی کی رفتار ذرا دھیمی پڑ گئی' تو اس پار کے ڈرائیور اور کلینر سروں پر پٹرول کے خالی کین رکھے بھاگ کر ہماری طرف آ گئے۔ رونق اور زیادہ بڑھ گئی۔

اب اندھیرا ہو چکا تھا۔ سورج غروب ہونے کا وقت ابھی نہیں ہوا تھا۔ جہاں ہمارا کیمپ لگ گیا تھا' اس کی بلندی سطح سمندر سے سات آٹھ ہزار فٹ سے کم نہ ہو گی' مگر ہمارے سروں پر دائیں بائیں کے سولہ سترہ ہزار فٹ بلند پہاڑوں نے اندھیرا کر رکھا تھا۔ اس لئے ایک طرح سے ہم زمین کے پاتال میں بیٹھے تھے' یا کم از کم محسوس یہی کر رہے تھے۔

بوڑھے نے لالٹین جلا دی تھی اور ہمارے قریب رکھ دی تھی۔ وہ بار بار ہماری طرف آتا اور احل سے پوچھتا۔

"بیٹی' کوئی تکلیف' کسی چیز کی ضرورت؟"

احل اس کا شکریہ ادا کرتی۔ اس کی آنکھوں میں بوڑھے کے لئے ممنونیت کا جذبہ ہوتا۔

ایک بار وہ اشل کے لئے شربت بنا کر لایا۔ سادہ چینی کا شربت ۔۔۔۔ اشل نے ایسا شربت زندگی میں کاہے کو پیا ہوگا' مگر بوڑھے کی پیش کش میں اتنی سادگی اور خلوص تھا کہ اشل انکار نہ کر سکی۔ اس نے اس اشتیاق سے گلاس ہونٹوں سے لگایا جیسے آب حیات کا پیالہ ہو۔

کھانا تیار ہو گیا۔۔۔۔ ڈرائیوروں کے ہاتھوں کی پکی ہوئی آدھ جلی آدھ کچی روٹیاں' سالن میں وہی گرم ساگ۔۔۔۔

میں اور اشل دو دو نوالے لے کر ہٹ گئے' تو بوڑھا دوڑا دوڑا آیا۔

"کیوں بیٹی۔۔۔۔ بھوک نہیں ہے کیا!؟"

اشل ہنس پڑی۔۔۔۔ "ہاں بابا بھوک نہیں ہے۔"

میں نے اشل کی ہنسی سے اندازہ لگایا کہ وہ بوڑھے کا دل نہیں دکھانا چاہتی۔ دراصل روٹی اور سالن بالکل بے مزہ تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اشل نے ذائقے کو تھوڑی بہت عزت دی تھی۔

کچھ ڈرائیوروں اور کلینروں نے اپنی اپنی جیپوں میں بستر لگا دیئے اور باقی اس چٹان کے نیچے لیٹ گئے۔ جو خیمے کے قریب سائبان کی طرح آگے کو نکل آئی تھی۔

خیمہ اشل کے لئے ریزرو ہو چکا تھا۔

خیمے کے اندر بوڑھے نے زمین پر کمبل بچھایا۔ اس پر دری اور کھدر کی چادر۔ ایک تھیلے میں دو تین سیر چاول پڑے تھے۔ اسے تکیہ بنا کر اشل کے لئے رکھ دیا۔ جب اشل لیٹ گئی تو بوڑھے نے خیمے کے پردے گرا دیئے اور خود خیمے کے دروازے کے باہر اپنا پرانا کوٹ بچھا کر لیٹ گیا۔

میں بوڑھے کی ساری کارروائی کو تحسین و محبت سے دیکھتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ آج کی رات اشل بوڑھے کی پناہ میں ہے اور آج تو بوڑھے کی اجازت کے بغیر ہوا بھی خیمے میں جھانک نہ سکے گی۔۔۔۔! ویرانے کی یہ رات' بے حد تسلی اور اطمینان کی رات تھی۔

صبح منہ اندھیرے ہی سب لوگ اٹھ گئے تھے۔ طوفانی نالہ جو رات بھر پتھر برساتا رہا تھا' اس کا غصہ اتر چکا تھا۔ اس کا گدلا پانی صاف ہو چکا تھا اور اب وہ بے ضرر جھرنے کی ۔۔۔ کر رہا تھا۔ کچھ آدمی اس کے نیچے نہا رہے تھے۔

بوڑھے کے چولہے میں آگ جل رہی تھی اور وہ دودھ کے بغیر چائے تیار کر رہا تھا۔۔۔ ڈرائیور اپنی جیپوں کا تیل پانی اور ہوا چیک کر رہے تھے۔

چائے تیار ہو گئی۔ تو بوڑھے نے اشل کو بھی جگا دیا۔ اشل باہر آئی تو اس نے مسکرا کر ۔۔۔ی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ قمیص اور ۔۔۔ہی میں سو کر اٹھی تھی۔ معلوم ہوتا تھا وہ پوری نیند سو نہیں سکی ہے۔

بوڑھے نے اندر سے کمبل نکال کر باہر چٹان پر بچھا دیا۔ وہیں بیٹھ کر ہم دونوں نے ۔۔۔ے پی۔ اشل کے بازوؤں اور پیروں اور گردن پر سرخ سرخ نشان پڑے ہوئے تھے۔ ۔۔۔ل میرا تھا کوئی کیڑا ہمیں ڈس گیا تھا اور اب ہم ان جگہوں کو کھجا رہے تھے۔

سب لوگ چائے کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ ایک ڈرائیور نے تمام ڈرائیوروں سے ۔۔۔ روپے فی ڈرائیور جمع کئے اور یہ سارے روپے بوڑھے کے حوالے کر دیئے۔ ہم نے ۔۔۔کچھ دینا چاہا تو نہ صرف ڈرائیور نے لینے سے انکار کیا' بلکہ بوڑھے نے تو ہمیں تقریبا ڈانٹ دیا۔

"واہ بھئی واہ۔۔۔۔ اب ہم مہمانوں سے بھی پیسے لیں گے!؟"

مجھے بہت خفت ہوئی۔ اشل مسکرا رہی تھی۔

میں نے سوچا۔۔۔۔ پہاڑ کا آدمی ابھی شہر کے آدمی کی سطح پر نہیں آسکا ہے۔ یہاں آکسیجن کی کمی ہو سکتی ہے۔ مگر ہوا کثافت سے پاک ہے!

تقریبا چھ بجے ہم وہاں سے چل پڑے۔۔۔۔ وہی عجیب و غریب ۔۔ب اور وہی جنونی ۔۔۔ دریا کے اس پار دریکو کا گاؤں تھا۔ دریا کے آرپار دو رسے بندھے ہوئے تھے۔ جو ۔۔۔کے پردوں کو چلانے والے رسوں کی طرح متحرک تھے۔ ایک رسے کے ساتھ لکڑی کا ۔۔۔چھ کھٹا لگا ہوا تھا۔۔۔۔ جس پر ایک آدمی بیٹھ کر دریا کے آرپار جا سکتا تھا۔

پہاڑ کے دامن میں یہ معلق گاؤں دیکھ کر اٹل بولی۔

"انسان کو پانی اور زمین کا ٹکڑا جہاں بھی مل گیا' وہاں جھونپڑا بنا کر رہنے لگ گیا۔ یہ زمین ہی ہے' جو ماں کی گود کی طرح آغوش وا کر دیتی ہے' اور اپنی اولاد کو دودھ پلا ہے۔ یہ کتنا نیچرل عمل ہے۔ سڑک تو اب بنی ہے۔ لیکن آج سے سو پچاس سال' نہ سال پہلے کا تصور کیجئے۔ جب یہاں سے انسان کا گزر نہ ہوتا ہو گا۔ تب بھی یہ گاؤں ا ہو گا۔ اس پہلے آدمی کی ہمت اور جرأت کا اندازہ کیجئے' جس نے یہاں رہنے کا فیصلہ ہو گا۔ شاید اس کا خیال ہو کہ کائنات صرف اسی تک محدود ہے۔ ہو سکتا ہے' اس نے ا زندگی ایک پرندے کے وجدان کے ساتھ گزاری ہو؟"

خوبانی کے درختوں کے قریب کھیت میں دو بیل چر رہے تھے۔ مجھے یہ سوچ پریشان رہی تھی...... کہ وہ پہلا آدمی جس کا ذکر اٹل کر رہی ہے' اس پار کیسے پہنچا ہو گا اور ا ساتھ بیل کس طرح لے گیا ہو گا......؟ وہ عورت کہاں سے لایا ہو گا اور یہ نسل ' طرح بڑھی ہو گی؟

اچانک ہماری جیپ ایسے علاقے میں پہنچ گئی' جہاں سخت پتھر اور چٹانوں کے بجا ریتلا پہاڑ شروع ہو گیا...... سڑک دریا سے قدرے ہٹ گئی تھی اور ہم مسلسل چڑھ چڑھ رہے تھے۔ دو چار میل کے بعد پہاڑ کا یہ ریتلا حصہ دھیرے دھیرے کم ہوتا جا رہا اور پہاڑ اپنی اصل فطرت میں پھر سر نکال رہا تھا۔

یہاں چھوٹے چھوٹے موڑ تھے۔ جونہی ہم نے ایک بڑا موڑ کاٹا' دور نیچے دو چھ چھوٹے گاؤں نظر آئے' جو بالکل ماڈل کی طرح لگ رہے تھے۔ یہاں شہتوت' انگور ا خوبانی کے درختوں کے جھنڈ ایک دوسرے کی شاخوں میں شاخیں پھنسائے ہو تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے شہتوت کے درخت میں خوبانیاں اور خوبانی کی شاخوں میں شتو لگے ہوئے ہیں۔

سڑک کے ساتھ ساتھ برفانی پانی کا نالہ بہہ رہا تھا۔ یہ نالہ اس ماڈل سے گاؤں' باغات اور کھیتوں کو سیراب کرتا تھا۔

اٹل خوابیدہ آنکھوں سے ان باغات کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اسے نیند ہی ہے۔ دراصل رات وہ سکون کی نیند نہیں سو سکی تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح باہر کی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ہر لحہ اس کے سو جانے اور گر جانے کا احتمال تھا۔ لیکن میں ں بیٹھا تھا اور منتظر تھا کہ اس کی آنکھ لگ جائے...... چنانچہ چند منٹ بعد اس کی ں بند ہو گئیں۔ میں نے اس کے دائیں شانے پر ہاتھ رکھا اور اس کا سر اپنے کندھے لگا دیا...... وہ ایک لمحے کے لئے چونکی' آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا' لیکن اگلے مسکرا کر آنکھیں بند کر دیں...... اور سر میرے شانے پر رکھ دیا۔

کیا تھا وہ لمحہ...... جسے ہمیشہ کے لئے رک جانا چاہیے تھا۔ شاید یہی تھا وہ ...... جس کے لئے اٹھائیس برس تک میری روح منتظر رہی تھی۔

ہاں...... یہی وہ لمحہ تھا...... کہ ساری کائنات ہی میری ہو گئی تھی۔

میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اسی لمحے کے لئے انسان جیون کا بھاری بوجھ اٹھاتا

ہاں...... وہ سو گئی تھی...... وہ بے قرار روح سو گئی تھی۔ میرا دایاں ہاتھ اس کے ں شانے پر تھا۔ اس خوبصورت شانے پر' جس سے خوبصورت شانہ دنیا میں دوسرا تھا۔

وہ ابریشمی پلکیں بند تھیں' جن میں اس صدی کی دو بے چین آنکھیں لرزا کرتی ...... اور وہ ہونٹ' میرے قریب بہت قریب تھے' جن میں زندگی کی ساری لطافتیں ں گئی تھیں...... اور اس ننھی سی ناک سے اٹھنے والی عطر بیز سانسیں میری روح کو رہی تھیں اور وہ سیاہ مہین ریشمی بال' شیر خوار بچے کی نرم نرم انگلیوں کی طرح اچنے پر گدگدی کر رہے تھے۔

مرمر جیسی نازک گردن میرے شانے پر تھی...... اور وہ انا اور تمکنت سے بھرا ' میرے سر کو چھو رہا تھا......

تھا وہ لمحہ' جو میرا اور صرف میرا تھا۔

ڈرائیور جو کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا' ہولے سے بولا۔

"سو گئی......؟"

کتنی حسرت تھی ڈرائیور کے لہجے میں..... وہ اس کے ذکر ہی سے شاد کام ہو جاتا تھا۔

میں بھول گیا کہ اس سے پہلے بھی مجھے کبھی خوشی ملی تھی..... جھیل سیف الملوک کی ٹھنڈی ہواؤں کی لوریاں' نانگا پربت پر نور کی پھیلی ہوئی وسعتیں سب بھول گیا۔

امل کے بدن کی خوشبو سے بڑا سچ کوئی دوسرا نہیں تھا۔

اس کا چونکنا اور دوبارہ مسکرا کر آنکھیں بند کر لینا اور شانے پر سر رکھ دینا' اس سے بڑی حقیقت' اس سے بڑا اصول اور اس سے بڑا سچ' میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

تاج محل مکمل ہونے کے بعد شاہجہاں کو جو خوشی ہوئی ہوگی' میری خوشی اس سے ارفع اور اعلیٰ تھی۔ کیونکہ وہ اپنی خوشی کو صرف دیکھ سکتا تھا۔ صرف محسوس کر سکتا تھا' کو میں تو اپنی خوشی کو نہ صرف محسوس کر رہا تھا' نہ صرف دیکھ رہا تھا' بلکہ اسے چھو بھی رہا تھا۔

ایک زندہ ممتاز محل میرے سینے سے لگی ہوئی تھی۔

اور پھر یہ کہ میری خوشی شاہ جہاں کی خوشی کی طرح حسرت آمیز نہیں تھی۔ وہ منزل عشق طے کر کے منزل وفا پر آ کر رک گیا تھا' مگر میں تو ابتدائے عشق کے مرحلے پر تھا..... میرے سامنے مسرتوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا' جس میں غوطہ لگا کر اپنا کوئی مقصود حاصل کرنا تھا..... میں ہندوستان کا بادشاہ نہیں تھا کہ جو چاہتا حاصل کر لیتا۔ میں ویرانوں' پہاڑوں اور جنگلوں میں اپنی محبت کا پیچھا کر رہا تھا۔ شاہجہاں کو یہ مواقع کم حاصل تھے۔ اسے میری طرح ابتدا کیونکر میسر آ سکتی تھی..... شاہی تمکنت کے ساتھ ایک اجنبی لڑکی کو یہ جرأت کیسے ہو سکتی تھی کہ شاہ وقت کے شانے پر اپنا سر رکھ دے..... یہ میں تھا..... یہ میری سطح کے آدمی کی تقدیر تھی۔

تاج شاہی نہ سہی' تاج محبت سہی!

کل کیا ہو خدا جانے' لیکن آج میرا ہے۔ صرف میرا!

چھوٹے چھوٹے گاؤں آتے گئے اور گزرتے گئے۔ باغیچہ' تونگس اور دوسرے کئی گاؤں' مگر مجھے ان کا دھیان نہیں رہا تھا..... احساس ہی کب تھا۔ تین چوتھائی کائنات تو میرے پہلو میں سمٹ کر آ گئی تھی۔

میں تو یہ بھی بھول گیا کہ خونی اور جنونی دریا اپنی تمام وحشتوں اور دہشتوں کے ساتھ منہ پھاڑے مجھے ڈرا رہا تھا۔ یہ وہ لمحہ نہیں تھا کہ میں ڈر جاتا..... یہ تو وہ گھڑی تھی کہ تقدیر نے مجھے ایک حسین روح کی حفاظت پر مامور کر دیا تھا۔

یہ میری قسمت تھی کہ اس کام کے لئے منتخب ہوا تھا۔

خوشی جب یلغار کرتی ہے' تو یوں کرتی ہے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ "لمحہ" آ جاتا ہے اور پھر خبر ہی نہیں ہوتی کہ لمحہ جا چکا ہوتا ہے۔ انسان کتنا بے بس ہے۔ رونے اور چیخنے کے مواقع بھی اس کے بس میں نہیں ہیں۔

سفر جاری تھا..... دریا کی مچلتی سرکش لہریں اب خوفزدہ کرنے کی بجائے مجھ سے سرگوشیاں کر رہی تھیں..... اور کہہ رہی تھیں۔

ہماری بے تابی' میدانوں اور انسان تک پہنچنے کے لئے ہے۔ یہ جو ہم چٹانوں سے ٹکراتی ہیں' ہنگامہ کرتی ہیں اور شور مچاتی ہیں..... دراصل فریاد کرتی ہیں۔ انسانوں سے دادرسی کی بھیک مانگتی ہیں..... کہ ہمارا راستہ روک لو۔ ہم سے شاد کام ہو جاؤ۔ ہمیں میدانوں میں پھیلا دو۔ ہمیں زمین پر اس طرح پرو دو جیسے انسان کے جسم میں رگیں..... اگر ہم تمہاری دنیا کو شاداب بنا دیں..... اے انسانو' ہمیں سمندر تک پہنچنے نہ دو' وہ بڑا اژدہا ہماری فطرت میں زہر گھول دے گا۔ پھر تم ہمارے سینے پر چپو چلا سکو گے۔ مگر اپنے حلق کے کانٹے دور نہیں کر سکو گے۔ پھر تمہاری زمینوں کے سینے شق ہو جائیں گے اور تم دانے دانے کے لئے ترس جاؤ گے..... پھر تم آسمان کی طرف دیکھو گے اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھاؤ گے..... کہ آسمان ذرا نیچے اتر..... اپنے سورج سے کہہ کر سمندر کے کھارے پانی کو اٹھا اور اسے میٹھا بنا کر زمین پر برسا' تاکہ خشک زمینوں کے شق سینے

پیاس بجھالیں...... تو اے مسافر' تیرا سفر ختم ہو تو ان بے تاب لہروں کا پیغام انسانوں تک پہنچا...... کہ انسان کا بھلا ہو۔ انسان سے شکست کھانے میں ہمیں کوئی عار نہیں!

فطرت جب انسان کے زیر اثر آتی ہے تو یہ اس کی خوشی کا لمحہ ہوتا ہے۔ یہ انوکھا اور عجیب خیال تھا جو اس وقت لہروں کے شور سے پھوٹ نکلا تھا...... اور یا یہ کہ سنگ پارس میری گود میں آگیا تھا اور میری سوچوں کا دھارا سنہری ہو گیا تھا۔ یہ لڑکی' جب باتیں کرتی تھی اور خیالوں کے پھول سجاتی تھی' تب بھی متاثر کرتی تھی' اور اب...... جب کہ بے خبر سو رہی ہے' تو ایک دنیا جگا دی ہے اس نے۔ میری روح میں ایک الاؤ روشن ہو چکا ہے اور میں نے سچائی کو پہچان لیا ہے۔ اور

یہ کہ جینا ضروری ہے۔

کیونکہ زندگی مواقع بہم پہنچانے میں بخل سے کام نہیں لیتی!

اب سری کچھورا کا گاؤں آگیا تھا۔ یہ بالکل مری کے مضافات جیسا علاقہ تھا۔ ڈرائیور نے کہا۔

"صاحب...... یہاں کا سیب بہت مشہور ہے۔ بالکل سرخ' لذیذ اور میٹھا۔ لوگ اسے دور دور تحفے کے طور پر بھیجتے ہیں۔" ڈرائیور نے جونہی موڑ موڑا' اسے اچانک بریک لگانا پڑ گئی۔ سامنے ٹریکٹر کھڑا تھا۔ اس کی آنکھ کھل گئی اور وہ چونک کر سنبھل گئی۔ پھر میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"شاید میں بہت دیر تک سوئی رہی؟"

"ہاں...... تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ۔"

"میں نے عجیب و غریب دنیا دیکھی۔ بہت حسین خواب ٹوٹ گیا۔"

"خواب تو میرا ٹوٹا ہے' جو میں نے جاگتے میں دیکھا ہے۔"

وہ ہنس پڑی۔

"آپ تو شکم کے مریض ہیں۔ جھوٹے ڈراؤنے خواب دیکھنے کے عادی۔"

"شکم کا مریض نہیں' آشوب چشم کی شکایت ہے۔ بس ٹکر ٹکر دیکھنے کی عادت پڑ گئی

ہے۔ پلکوں نے جھپکنا چھوڑ دیا ہے۔"

وہ پھر ہنسی۔

"یہ تو غیر فطری عمل ہے اور آپ ٹھہرے وضع دار آدمی' مہذب اور متمدن' آپ کو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں......"

"مجھے کیا زیب دیتا ہے' وہ راستہ بھی تو بتا دیں؟"

"راستہ تو آپ کو خود ہی تلاش کرنا پڑے گا۔ یہ تنہائی کی صدی ہے۔ لوگوں نے گھروں کو چھوڑ دیا ہے اور ہجوم سے باہر نکل آئے ہیں۔"

"ہجوم میں واپسی کے لئے تو میں جہاد کر رہا ہوں۔"

"ہجوم میں رہ کر بھی آپ اکیلے رہیں گے۔ کیونکہ کندھے سے کندھا ملانے سے احساس کا تبادلہ نہیں ہو جاتا۔"

"کبھی نہ کبھی تو انسان کو عقل آ جائے گی۔"

"وہ بیوقوف لوگ ہیں' جو اس بات کے منتظر ہیں کہ ایک نہ ایک دن روئے زمین کے انسانوں کی روح ایک ہو جائے گی۔"

"کیا یہ قطعی ناممکن ہے اصل......؟"

"کوئی شاعر اس مضمون کو شعر میں باندھ لے' اس حد تک تو ممکن ہے' لیکن غیر حقیقی رجائی پن کا نتیجہ......!؟"

"اگر کچھ نہیں نکلتا تو آؤ' دونوں احمق بن جائیں اور ایک نئی زندگی کا آغاز کریں۔"

"میرے بس میں ہوتا تو کب کی بن چکی ہوتی۔"

"جو آپ کے بس میں ہے' کم از کم اس کا تو علم ہو جائے۔"

وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔

"کچھ نہیں' کچھ نہیں' میرے بس میں کچھ نہیں۔ بس آپ کے ساتھ سفر کر رہی ہوں۔ یہی میرے بس میں ہے۔ میں آپ کے ساتھ سفر کرنے سے نہیں اکتاتی۔"

"تو پھر میری بدبختی کہ اس پر اکتفا کرنے کا عہد کر چکا ہوں۔"

"آپ شریف آدمی ہیں۔ یہ تو میں جانتی ہوں۔"

"شرافت کے یہاں بہت کم دام لگتے ہیں۔ اس دور میں شریف ہونے کے معنی ہیں کہ ہم نے زمانے کے ساتھ چلنا نہیں سیکھا۔ اس صدی میں اس لفظ کے معنی بدل گئے ہیں۔"

"ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔" وہ بے دلی سے بولی۔۔۔۔۔ "مگر میں تو پھر بھی آپ کو شریف ہی سمجھوں گی۔ کیونکہ آپ کے خمیر میں کوئی ایسی بات ضرور ہے جسے میرے مزاج نے قبول کیا ہے۔"

"اٹھائیس برس ایک طرف' اور یہ چند دن جو آپ کی معیت میں گزرے ہیں' دوسری طرف۔ یہ چند دن ہی حاصل زندگی ہیں۔ میں کوئی بڑا کارنامہ سرانجام نہیں دے سکا۔ کیونکہ میں اس کے لئے پیدا نہیں ہوا۔ میرے ظرف میں وسعت اور کشادگی نہیں ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر آپ کی ذات سے عقیدت کا مسئلہ درپیش ہو تو پھر شاید ہی کوئی ظرف ہو گا جو میرے ظرف سے بڑا ہو گا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آپ نے میرے خمیر میں اپنائیت محسوس کی ہے۔"

"ہاں۔۔۔۔۔ کوئی وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ انسانی تضادات سر کے بالوں کی طرح ڈھیر اور باریک ہیں۔ انہیں الگ الگ کرنا بہت مشکل کام ہے۔ آنکھ جھپکنے میں محبت ہو جاتی ہے اور پلک جھپکنے میں نفرت۔۔۔۔۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ چشمہ پھوٹتا ہے تو پھر خشک کیوں ہو جاتا ہے؟"

اچانک سامنے پل آ گیا۔ دریائے سندھ پر یہ پہلا پل تھا' جو اس علاقے میں نظر آیا تھا۔ جیپ پل کی طرف مڑ گئی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

"سونے کی کانیں ختم ہو جاتی ہیں۔ نمک کے پہاڑ ختم ہو جاتے ہیں۔ زمین کی تہہ میں چھپی ہوئی گیس اور تیل کے ذخیرے ختم ہو جاتے ہیں۔ انسان ختم ہو جاتا ہے۔ جب ہر چیز ختم ہو سکتی ہے' تو محبت کا سرچشمہ خشک ہونے پر آدمی کیوں کڑھتا رہے۔ ہمارے حصے میں فطرت نے جو محبت ودیعت کر رکھی ہے' ہمیں اسی پر اکتفا کرنا چاہیے۔ ہم اپنے حق

سے زیادہ کیوں مانگیں۔"

"ہاں' ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔" وہ جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی ہو۔ "ہم اپنے حق سے زیادہ نہیں مانگتے۔۔۔۔۔ بلکہ ہم اپنا حق بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ مگر اس کے عوض ہم دائمی محبت کا حق مانگتے ہیں۔ ابدی محبت کا حق' اس پر فطرت کو اعتراض بھی نہیں ہونا چاہیے۔۔۔۔۔ ہاں کیا مضائقہ ہے اس میں' کیا نقصان ہے اس میں فطرت کا؟ مرنے کے بعد تسلی ملے۔ زندگی میں کیوں نہ ملے۔ کیوں صاحب کیا حرج ہے اس میں۔۔۔۔۔؟"

میں خاموش' چپ چاپ اسے تک رہا تھا۔

میں کیا جواب دوں اس لڑکی کو! میں جو دریاؤں کو روک رہا تھا اور ان کے سامنے بند باندھ رہا تھا۔ اس لڑکی کے اندر کی دنیا کا کیا کروں۔ اس کی روح میں جو اتھل پتھل ہو رہی ہے۔۔۔۔۔ اس تک کیسے پہنچوں؟

جس طرح ہوا نے کرۂ ارض کی وسعتوں کو محیط کیا ہوا ہے' وہ کائنات کی وسعتوں اور رفعتوں میں ایسی ہی تسلی کا تسلط چاہتی ہے۔ وہ محبت کا حق مانگتی ہے اور یہ کوئی ایسی بری خواہش بھی نہیں ہے!

مگر میرے بس میں کیا ہے۔ میں کس طرح روئے زمین کے کل انسانوں کے خون سے نفرت کے ذرے چن چن کر علیحدہ کر سکتا ہوں؟

مجھے پریشان سوچوں میں ڈوبا ہوا پا کر بولی۔

"اس میں آپ کا کیا قصور ہے کہ آپ سوچنے لگ جاتے ہیں اور خود کو اذیت میں جکڑ لیتے ہیں۔ میں جو اپنی ذات کا عرفان نہیں رکھتی' آپ کی روح کا دکھ پا لیتی ہوں۔ آپ اتنے اچھے ہیں کہ اپنا غم بھی چھپا کر نہیں رکھ سکتے۔"

"مجھے افسوس ہے کہ ایسا ہو جاتا ہے۔ میں اپنے غم آپ پر تھوپنا نہیں چاہتا لیکن آپ کی خوشیوں کی بنیاد بننے کی خواہش ضرور رکھتا ہوں۔ میرے بس میں ہوتا تو اس کائنات کو الٹ پلٹ کر رکھ دیتا اور جیسا آپ چاہتی ہیں' ویسے دوبارہ اس کی تعمیر کرتا۔"

اچل ہنس پڑی۔

"اچھا ہوا آپ خدا نہیں بن سکے۔ ورنہ میرا سفر مکمل ہو جاتا اور وقت سے پہلے سب کچھ نمٹ جاتا۔"

میں بھی ہنس پڑا۔

"آپ تکمیل کی خواہش بھی رکھتی ہیں اور تکمیل سے ڈرتی بھی ہیں؟"

"شاید اسی الجھن کا نام زندگی ہو...... شاید اسی الجھن کو حل کرنے کے لئے ہم اپنی سوچ نئی نسل کے حوالے کر دیتے ہیں' تاکہ وہ اسے ترقی دے کر اگلی نسل کو منتقل کر سکے۔"

"ہم اس الجھن کو امید کیوں نہ کہیں؟"

"ہاں...... کہنے میں کیا حرج ہے۔ الجھن نہ سہی امید سہی۔ شک' شبہ نہ سہی' رجائیت سہی...... مگر راز تو پھر بھی نہیں کھلتا۔ اب تک تو نہیں کھلا۔ تہذیب تہی دامن ہے۔ علم بے بس ہے۔ آگہی لاچار ہے۔ ابھی تک مقصد کا تعین نہیں ہوا۔ ہوا ہے تو خام ہے۔ خام نہ ہوتا تو جنگ کیوں ہوتی۔ ہم شور و ہنگاموں میں اور چیخ و پکار میں اور توپ و تفنگ میں مالکوس کا راگ کس طرح سن سکتے ہیں کہ ہماری روح میں شانت ہو جائیں؟"

اب میں کیا کہتا...... اس بے چین روح کے سفر کا تسلسل ٹوٹا' تو کچھ کہنے کو آگے بڑھتا۔ بلکہ اب تو میں اس نتیجے پر پہنچتا جا رہا تھا کہ سفر جاری رہنا چاہیے۔ اس کی بے چینی انتہائی مقدس ہے اور اس کا کرب انتہائی پاکیزہ' میں اس بے چینی اور کرب کا خون کر کے کچھ حاصل کروں گا' تو یہ نہایت سفلہ پن ہو گا!

جیپ اچانک گچورا کے ایک ہوٹل کے سامنے رک گئی۔ ہم نیچے اترے اور ڈرائیور کی رہنمائی میں ہوٹل کے اندر چلے گئے۔

ہوٹل ایک ٹیلے کے اوپر واقع تھا۔ اس کی ساخت عجیب و غریب تھی۔ اس کی بھول بھلیاں دیکھ کر ہم حیران رہ گئے...... معلوم ہوا کہ یہاں عام مکانوں کی ساخت اسی اصول پر ہے۔ برفانی موسموں میں یہ کچے مکان تنور کی طرح گرم رہتے ہیں...... ہوٹل کا پچھلا حصہ جو ڈھلوان کی طرف تھا' کھلا تھا اور یہیں بیٹھنے کے لئے بنچ رکھے ہوئے تھے۔

پیچھے نہایت پر فضا وادی تھی اور شاداب وادی کے عین درمیان میں نیلے شفاف پانی کی خاصی بڑی جھیل تھی۔ مجھے آنکھوں کو جھیل سے تشبیہ دینے والی بات یاد آ گئی۔ بس اسے اتفاق کہیے کہ صانع قدرت نے کتاب کی بات زمین پر اس جھیل کی شکل میں مجسم کر دی تھی' بلکہ مجھے تو ایسا لگا کہ یہ واقعی آنکھ تھی۔ زمین کی آنکھ!

اس جھیل کو چاروں طرف سے سبز گھاس کے قدرتی لان نے اس طرح گھیر رکھا تھا' جیسے آنکھ میں کاجل کا دائرہ......!

دائیں طرف ایک چھوٹا سا خوبصورت ڈاک بنگلہ تھا۔ بے ساختہ اس انجینئر کو داد دینے کو جی چاہ رہا تھا' جس نے ڈاک بنگلے کے لئے یہ جگہ منتخب کی تھی۔

چائے آ گئی۔ گرم چائے' ٹھنڈی ہوا میں اور جھیل گچورا کا روح پرور نظارہ سہ آتشہ شراب کا مزہ دے گیا۔

سکردو یہاں سے بیس پچیس میل دور تھا۔ امثل بے حد خوش تھی۔

اب ہم دائیں ہاتھ کے پہاڑ کے دامن میں جا رہے تھے۔ جوں جوں آگے بڑھتے گئے' وادی کھلتی چلی گئی...... اور دریائے سندھ پھیلتا چلا گیا۔ بعض جگہ تو اس پر سمندر کا گماں ہوتا تھا۔ اس کا جنون ختم ہو گیا تھا۔

شاید یہی وجہ ہو کہ شوریدہ سری کے بجائے اس میں ٹھہراؤ اور تمکنت آ گئی تھی۔

اب سڑک چند فٹ اوپر سندھ کے کنارے کنارے جا رہی تھی' لیکن ڈرنے والی بات نہ رہی تھی۔ کیونکہ اب وہ غنڈے کی طرح چھاتی تان کر نہیں جا رہا تھا' بلکہ کسی متین آدمی کی طرح آنکھیں جھکائے دبے قدموں جا رہا تھا۔

گچورا کی جھیل کے متعلق جو کچھ میں نے سوچا تھا...... کچھ ایسے ہی احساسات امثل کے بھی تھے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ کسی منظر سے ہم ایک ہی انداز میں متاثر ہوئے تھے۔

اب دریا ایک طرف رہ گیا تھا اور ہم سکردو کی ریتلی زمین میں داخل ہو گئے تھے۔

امثل جو پہاڑوں کی برفانی چوٹیاں دیکھنے میں محو تھی' اچانک میری طرف دیکھ کر بولی۔

"وسیم صاحب...... مجھے ایسا لگتا ہے کہ کبھی پتھر کی بھی آنکھیں نکل آئیں گی اور وہ

دیکھنے لگ جائے گا!"

میں نے ہنس کر کہا۔

"یہ خیال آپ کو کیسے آیا؟"

تو وہ بولی۔

"دیکھئے نا آسمان کی بھی آنکھیں ہیں۔ وہ دن کو سورج کی آنکھ سے اور رات کو چاند کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔۔۔۔ میں کہہ سکتی ہوں کہ زمین کی بھی آنکھیں ہیں۔ ایک آنکھ جھیل سیف الملوک ہے' تو دوسری آنکھ کچورا کی جھیل۔ آپ دیکھتے ہیں' یہ بڑے بڑے پتھر' یہ دیو ہیکل چٹانیں' کروڑہا سال سے سجدہ ریز ہیں۔ بالکل چپ اور خاموش۔ کیا ان کی نہیں سنی جائے گی۔۔۔۔؟ میرا تو خیال ہے' کسی دن ان کی بھی آنکھیں پھوٹ پڑیں گی۔"

میں پھر ہنسنے لگا' تو وہ بولی۔

"میں مذاق تو نہیں کر رہی۔ آپ سوچیں نا۔ یہ جو پہاڑوں سے ہیرے اور زمرد نکلتے ہیں' دراصل پہاڑوں کی آنکھیں ہیں۔ فطرت سے ضرور کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ جان ڈالنے کے بجائے جامد کرنے کی غلطی!"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اچھا ہوا یہ غلطی ہو گئی۔ نیچر کی یہ غلطی کائنات کے مفاد میں ہے۔ ہو سکتا ہے آنکھیں ملنے کے بعد پہاڑوں کو چلنے پھرنے اور دنیا کو دیکھنے کا شوق چرائے۔ وہ دس قدم بھی چلتے' تو ساری دنیا الٹ پلٹ جاتی اور سمندر کا کھارا پانی ماؤنٹ ایورسٹ کے سر سے گزر جاتا۔"

اب وہ بھی ہنسنے لگی۔

"ہاں واقعی۔۔۔۔ یہ جو ہمالہ ہے' ایک قدم اٹھاتا' تو قیامت نہ ڈھاتا۔ بے چارہ روز ازل سے برف کے کفن میں لپٹا ہوا ہے۔۔۔۔ چاہتا تو ہو گا دنیا کو دیکھے۔ چاند کی چاندنی اور سورج کی کرنوں کو محسوس کرے۔ ہو سکتا ہے' آپ کا خیال صحیح ہو۔ قدرت قیامت کی منتظر ہو اور تب پہاڑوں کو آنکھیں ملیں' اور انہیں چلنے کی ترغیب ہو' اور کائنات کا نظام

درہم برہم ہو۔"

"تب صرف زمین کے پہاڑ کیوں ہوں گے۔" میں نے بات بڑھاتے ہوئے کہا۔۔۔۔ "چاند کے پہاڑ ہیں۔ مریخ کے پہاڑ ہوں گے۔ دوسرے سیاروں کے پہاڑ ہوں گے۔ جب سب قدم کام بڑھیں گے' تو ظاہر ہے۔۔۔۔ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔"

"یہ تو وہی ہوا نا جیسے انسان کو شعور ملا اور پہاڑ کو آنکھیں' اور نتیجہ ایک ہی نکلا۔ تباہی و بربادی' نیچر کی عادتیں بھی عجیب و غریب ہیں۔ زلزلے' سیلاب' آتش فشاں پہاڑوں کے لاوے' بیماریاں' سب کے سب منفی اختیار!"

"لیکن پھر بھی جیت انسان کی ہوتی ہے۔ وہ ہر بلا اور ہر آفت کا مقابلہ کرتا ہے اور آخر اسے زیر کر لیتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم مقابلہ کرتے ہیں۔ کبھی کبھی غالب بھی آ جاتے ہیں' لیکن اپنے کی ایک ذرا سی فطرت کے ہاتھوں بالکل بے دست و پا ہوتے ہیں۔ قانون' تہذیب اور مذہب کوئی بھی اس کو فتح نہ کر سکا۔"

"مگر ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ابھی انسان کی عمر ہی کیا ہے۔ دس ہزار سال' یعنی کائنات کی عمر کے لحاظ سے ماؤ زیرہ ماہ کا بچہ' بلکہ اس سے بھی کم' شیر خوار بچے سے آپ نے توقعات کیوں باندھ رکھی ہیں؟"

اس نے سر جھٹک کر میری طرف دیکھا۔ اس نے عینک اتاری تھی۔ اس کی حیرت زدہ آنکھیں اگربتی کی طرح جل اٹھی تھیں اور ان سے مہکاریں اٹھ رہی تھیں۔

یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اس کا چہرہ اتنا پرجوش دیکھا تھا۔ اس نے مسکرا کر سکردو کی وادی کو طائرانہ نگاہوں سے دیکھا اور بولی۔

"ہاں۔۔۔ چھوٹے بچے پر تو پیار آ ہی جاتا ہے۔"

اب ہم سکردو کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے۔ جیپ ایک ایسی سڑک سے گزر رہی تھی جس کے دونوں طرف نئے اور انوکھے قسم کے درخت لگے ہوئے تھے۔ بلکہ دائیں بائیں دور دور تک پھیلے ہوئے تھے اور ان سے مست کر دینے والی خوشبوؤں کی لپٹیں اٹھ رہی

تھیں۔

یہ درخت صرف اور صرف سکردو میں پایا جاتا ہے۔

ہماری روحیں غالباً ان نکہت باریوں میں غسل صحت کر چکی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اسل بولی۔

"واقعی یہ دنیا دیکھنے کے لائق جگہ ہے۔"

"ہاں۔۔۔۔ تو یہ ہوتا ہے سفر۔" میں نے پرجوش ہو کر کہا۔ "کبھی کبھی انسانوں کی جگہ درخت بھی متاثر کرتے ہیں۔ یہ جو رنگ ہوتے ہیں' خوشبوئیں ہوتی ہیں' جینے کے سندیس لاتی ہیں۔ فطرت صرف لاوے ہی نہیں اگلتی' نکہتیں بھی بکھیرتی ہے۔"

اس نے ایک بار پھر مجھے نرم نرم نگاہوں سے دیکھا۔

"کیا بات ہے وسیم صاحب' آپ پہلے تو ایسے نہیں تھے۔ آپ نکھرتے جا رہے ہیں۔ آپ کی باتیں مجھے متاثر کرتی جا رہی ہیں۔۔۔۔؟"

"زہے نصیب۔۔۔۔" میں ہنس پڑا۔۔۔۔ "شاید یہ اس مٹی کی تاثیر ہے۔ جیسے پرانے زمانے کا واقعہ ہے۔ ایک فرمانبردار ہندو نوجوان بہنگی کے ایک جوڑے پلڑے میں ماں کو اور دوسرے پلڑے میں باپ کو سوار کر کے یاترا کے لئے جا رہا تھا۔ سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے جب وہ سیالکوٹ پہنچا' تو اس نے بہنگی زمین پر رکھ دی۔ اور والدین سے بولا۔۔۔۔ بس ہو چکی یاترا' میں آگے نہیں جا سکتا کیونکہ تمہارا بوجھ اٹھانے کی ہمت اب مزید مجھ میں نہیں رہی۔۔۔۔ بوڑھے والدین سخت پریشان ہوئے' لیکن اس کا باپ جہاں دیدہ شخص تھا۔ نرمی سے بولا۔۔۔۔ واقعی بیٹا' تم نے جتنی سیوا ہماری کی' دوسرا نہیں کر سکتا تھا۔ ہم تمہارے بے حد مشکور ہیں۔ لیکن تم نے ہمارے لئے جہاں اتنا کشٹ اٹھایا ہے۔ ایک تکلیف اور کرو۔ ہمیں ایک میل اور آگے لے جاؤ۔ بھگوان نے چاہا' تو کوئی نہ کوئی آسرا بن جائے گا۔۔۔۔ لڑکا رضامند ہو گیا' مگر جونہی وہ ایک میل کا سفر طے کر کے سیالکوٹ کی سرحد سے باہر ہوا' تو اپنے سلوک پر سخت شرمندہ ہوا۔۔۔۔ والدین کے پاؤں پڑ گیا اور رو رو کر معافی مانگنے لگا۔ باپ نے اسے تسلی دی کہ بیٹا تیرا کوئی قصور نہیں تھا۔ یہ اس مٹی کا

قصور تھا جس پر تم نے بہنگی روک لی تھی۔ سو اب بات ختم ہو گئی۔ کیوں کہ وہ مٹی پیچھے رہ گئی ہے!"

اسل کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"واہ خوب۔۔۔۔! یہ قصہ میں نے بھی کہیں اس سے ملتے جلتے رنگ میں پڑھا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے' آب و ہوا اور زمین کو انسان کے مزاج میں بہت دخل ہے؟"

"یقیناً ہو گا۔۔۔۔ آپ جو کراچی میں تھیں' نانگا پربت سے گزرتے ہوئے کچھ اور تھیں۔ انسان پتھر تو نہیں ہوتا کہ قیامت تک آنکھیں پھوٹنے کا انتظار کرے!"

"ہاں یہ تو ہے۔" وہ جیسے اپنے آپ سے بولی۔۔۔۔ "انسان کی عمر پتھر جتنی نہیں ہوتی۔ وہ آنکھیں ساتھ لے کر آتا ہے۔ اسے کچھ کرنا چاہیے۔ ہاں اسے کچھ کرنا ہی ہو گا۔ کیونکہ وہ آنکھوں کی ذمہ داری ساتھ لے کر آیا ہے۔"

ہاں۔۔۔۔ تو یہ سکردو تھا۔۔۔۔ جھیل ست پارہ سے نکلنے والی ندی کے اس پار' چاروں طرف پہاڑ' برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں' توت اور خوبانیوں کے باغات' ریتلے ٹیلے کھیت' اور ریتیلے راستے' کبھی یہ علاقہ سندھ کی گزرگاہ تھا۔۔۔۔ دریا نے راستہ بدل لیا' تو زرخیز زمین نکل آئی اور لوگ آباد ہو گئے۔

کہتے ہیں بوخہ نامی راجے نے پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں اسے آباد کیا تھا۔۔۔۔ "دو" بلتی زبان میں اس پست جگہ کو کہتے ہیں جو بلندیوں کے درمیان میں واقع ہو' اور اسکر گیلپو اس خاندان کا مورث اعلیٰ تھا۔ اس لئے بہت اغلب ہے کہ بوخہ نے اپنے مورث اعلیٰ کے نام کا پہلا لفظ "اسکر" لے کر اس کے ساتھ "دو" لگا کر اسکردو کر دیا ہو۔

اگرچہ یہاں کی آبادی کا مذہب اسلام ہے' لیکن کسی زمانے میں پورے بلتستان میں بدھ مذہب کا دور دورہ تھا۔ اب بھی بدھوں کی بہت سی روایات یہاں موجود ہیں اور لوگ نہایت ملائم مزاج کے ہیں۔

لداخ جس کی سرحدیں اس علاقے سے ملتی ہیں' اب بھی بدھ مت کا پیرو ہے۔ تبت

کی تہذیب کے دھیمے دھیمے اثرات بھی ملتے ہیں۔

تبت جو وسط ایشیا میں واقع ہے اور دنیا کی چھت کہلاتا ہے' اس کے شمال میں کوہستان کوین لون ہے' جو اسے مشرقی ترکستان سے جدا کرتا ہے۔ مشرق میں چین ہے۔ جنوب میں سلسلہ کوہستان ہمالیہ ہے' جو اس ملک کو ہندوستان' بھوٹان اور نیپال سے الگ کرتا ہے۔ مغرب میں لداخ' کشمیر اور سکردو ہیں۔

اس کی سطح مرتفع سطح سمندر سے اوسطاً سولہ ہزار فٹ بلند ہے۔ اسی سطح مرتفع میں ایشیا کے بڑے بڑے دریاؤں کے منبع اور بالائی وادیاں واقع ہیں۔ یہیں سے دریائے برہم پتر' ستلج اور گھاگھرا ہندوستان کی طرف' سندھ پاکستان کی طرف اور میکانگ' کوانگ ہو' اور یانگ سی کیانگ' چین کی طرف جانکلتے ہیں۔

اگرچہ تبت اب چین کا حصہ ہے' لیکن کسی دور میں سکردو' لداخ کا علاقہ تبت کی تہذیب کا ایک حصہ تھا۔

یہی وجہ ہے کہ تبت کی طرح سکردو میں آج بھی اخلاقی یا سماجی جرائم برائے نام ہیں۔

ایک روایت یہاں اور بھی مشہور ہے کہ کسی زمانے میں تبت سمندر کے نیچے دبا ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ پانی نیچے اتر گیا اور زمین برآمد ہونے لگی۔ حتیٰ کہ سارا تبت سمندر کے نیچے سے برآمد ہوگیا...... پھر سردی نے پہاڑوں کو ڈھانپ لیا اور چوٹیوں پر برف جمنے لگی اور اس سے ندی نالے جاری ہو گئے...... آہستہ آہستہ جنگل پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ درختوں' پودوں اور گھاس پھونس کے پھلنے پھولنے سے جنگل گھنا ہو گیا۔ تو جنگلی جانور پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ ان جانوروں میں درندے بھی تھے اور چرند پرند بھی۔ چنانچہ دیوتاؤں کو خیال ہوا کہ اب اس ملک میں انسان پیدا ہونا چاہیے۔ چنانچہ دیوتا چن رس زیکس نر بندر کی شکل میں نمودار ہوا اور دیوی ڈولما ایک خونخوار قسم کی مادہ بندریا کی شکل اختیار کر کے ظاہر ہوئی۔ ان دونوں کے اختلاط سے چھ بچے پیدا ہوئے۔ ان میں سے تین کی خصلت باپ کی طرح نرم تھی اور تین ماں کی طرح خونخوار تھے۔

ان کی نسل نے بہت ترقی کی۔ تعداد بھی بڑھ گئی اور بتدریج دماغی اور جسمانی ترقی

کرتے ہوئے ہزاروں لاکھوں سالوں کے بعد یہ آبادی انسان کے درجہ پر پہنچ گئی...... اور انسان نے جابجا چھوٹے چھوٹے گروہوں میں رہنا شروع کیا۔

یہ روایت علم طبقات الارض کے انکشاف اور ڈارون کے نظریہ ارتقاء کی پوری تصدیق کرتی ہے۔

یہ ساری باتیں ہمیں کراچی کے آئی سپیشلسٹ ڈاکٹر نے بتائیں' جو گزشتہ دو ماہ سے گلگت اور بلتستان کے مختلف علاقوں میں آنکھوں کے کیمپ لگاتا رہا تھا اور اس عرصے میں اس نے وہاں کی کئی تاریخی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔

ڈاکٹر جس نے ڈاک بنگلے کے قریب آئی کیمپ لگا رکھا تھا' خود بھی اپنے سٹاف اور مریضوں کے ساتھ خیموں میں رہتا تھا۔ مفت علاج کرتا تھا۔

وہاں کے لوگ اسے دیوتا کی طرح پوجتے تھے۔

امثل نے اس کی باتیں سن کر کہا۔

"جو کچھ آپ نے کہا' اگر واقعی تبت کی تاریخ میں لکھا ہے' تو پھر نظریہ ارتقاء کا سارا کریڈٹ ڈارون کو جاتا ہے اور نہ ہی طبقات الارض کے عالموں کو' کیونکہ تبت والوں کا نظریہ نہایت قدیم بلکہ قبل از تاریخ کا لگتا ہے۔"

"بالکل بالکل......!" ڈاکٹر بولا...... "دراصل ان لوگوں کو نہ پبلسٹی کی ضرورت تھی اور نہ ان کے پاس ذرائع تھے اور نہ وہ اس کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔ اب بھی لوگوں کے اعتقادات اور سادگی دیکھ کر گماں گزرتا ہے کہ یہ بیسویں صدی کے لوگ نہیں ہیں!"

"گویا ہم لوگوں نے انہیں تباہ کر دیا ہے؟" امثل تجسس سے بولی۔

"ہاں ہاں' ہم نے......!" ڈاکٹر نے تائید کی...... "کمیونزم' سوشلزم اور جمہورازم کے نعروں نے' جابر اور ذہین آدمی نے اظہار تشخص کے جنون میں دنیا کو لوٹا ہے۔"

امثل نے ذومعنی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ گویا ڈاکٹر ہمارے لئے کام کا آدمی ثابت ہو رہا تھا۔

ہمیں ڈاک بنگلے میں دو کمرے مل گئے تھے۔ دوپہر کا کھانا بھی ہم نے ڈاکٹر کے ساتھ

کھایا۔

ڈاکٹر جس کی عمر پینتالیس چھیالیس سال کے لگ بھگ تھی' کراچی کے بوہرا خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ زرد رنگ کا یہ چھوٹا سا منحنی آدمی بلا کا خوش باش' نفیس اور بذلہ سنج آدمی تھا۔ چلتا تھا تو ایسا لگتا کہ اس کے پاؤں میں سپرنگ لگے ہوئے ہیں اور یا یہ کہ جیسے اڑنے کے لئے پر تول رہا ہو۔ اس کے لڑکیوں کی طرح نرم نرم اور کمزور ہاتھوں میں بلا کی شفا تھی۔ اس کی آنکھیں بھوری اور چمکدار تھیں۔

وہ ہنستا تھا' تو اس کے مسوڑھے اوپر تک نظر آتے تھے۔ تب وہ غیر موثر آدمی لگتا تھا' لیکن جب وہ بات کرتا' تو اپنے قد سے چوگنا بڑا لگتا...... کیونکہ اس کی باتیں نہایت اثر انگیز ہوتی تھیں۔

شام کی چائے کے بعد وہ ہمیں جھیل ست پارہ لے گیا' جو سکردو سے پانچ میل اوپر دیواسائی روڈ پر تھی۔ وجہ تسمیہ یہ تھی کہ سات برفانی نالوں کا پانی اس میں جمع ہوتا تھا...... یہاں ڈاک بنگلہ بھی تھا۔ جھیل خاصی وسیع خشک پہاڑوں میں گھری ہوئی تھی۔

مگر وہ جھیل سیف الملوک والی بات کہاں!

جھیل سے ایک زوردار ندی سکردو کی طرف نکلتی ہے' جو سارے علاقے کو سیراب کرتی ہوئی دریائے سندھ میں جا ملتی ہے۔

جب ہم واپسی کے لئے جیپ میں بیٹھ گئے' تو امثل نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"ڈاکٹر...... آپ نے جو اظہار تشخص والی بات کی تھی' اس کے کیا معنی تھے؟"

"اس کے معنی بے حد وسیع ہیں۔" ڈاکٹر بولا...... "مثلاً ایک فاتح ہے۔ وہ اس شوق میں کشتوں کے پشتے لگا دیتا ہے کہ تاریخ اسے غیر معمولی جنرل کے روپ میں یاد رکھے۔ مثلاً سکندر' چنگیز خان' نپولین اور اسی قبیل کے دوسرے' مگر افسوس ہے کہ تاریخ ایسے لوگوں کا مقصد پورا کرتی رہی ہے اور ان سے غیر معمولی سلوک روا رکھتی رہی ہے...... اسی طرح ایک شاعر' ایک ادیب جو عام آدمی سے زیادہ ذہین ہوتا ہے' بلکہ بہت زیادہ حساس ہوتا ہے' ایک فاتح سے زیادہ اظہار ذات کے جنون میں مبتلا ہوتا ہے۔ کیونکہ جب

وہ وسیع و عریض کائنات میں' اربوں آدمیوں کی موجودگی میں انہیں کی طرح خود کو عام سطح پر یوں کیسے کہ حقیر سطح پر پاتا ہے' تو تلملا اٹھتا ہے۔ ذرے کی کم مائیگی کا احساس اسے اظہار تشخص کے لئے مجبور کر دیتا ہے۔ نہیں مانتا کہ وہ حقیر ہے' کم تر ہے' بلکہ ثابت کرتا ہے کہ وہ لافانی ہے' امر ہے' اور اس کی ذات نہایت اہم ہے اور یوں وہ تخلیق کا لاوہ اگلتا ہے' لیکن جب مرنے کے قریب آتا ہے تو روتا ہے اور اپنے چھوٹے سے معصوم بچے کو دیکھ کر بلکتا ہے' کہ یہ ننھی منی جان اس کے اظہار تشخص کے جنون کو زندہ رکھ سکے گی یا نہیں......؟"

امثل نے کہا۔

"ڈاکٹر...... آپ نے جو خیراتی کیمپ لگا رکھا ہے' میں کہہ سکتی ہوں کہ آپ بھی شخصیت کا اظہار کر رہے ہیں! اور دنیا کو فتح کر رہے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے۔" ڈاکٹر جلدی جلدی بولا...... "لیکن میرا رویہ منفی نہیں ہے اور نہ مصور کی حد تک بے مقصد ہے۔ یعنی یہ کہ مصور جب اپنی شخصیت کا اظہار ایک تصویر کی شکل میں کرتا ہے' تو اس سے انسانیت کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟ ایک اندھا اس تصویر سے کس طرح محظوظ ہو سکتا ہے۔ بلکہ آنکھوں والے بھی محروم رہتے ہیں۔ کیونکہ تصویر گلاب کے قدرتی پھول سے خوبصورت نہیں ہوتی۔ فیشن یا افتخار کے طور پر کروڑ پتیوں کے ڈرائینگ روموں میں سجائی جا سکتی ہے۔ کیونکہ اس میں بھی اظہار تشخص کا ایک پہلو ہوتا ہے۔ ورنہ عام آدمی کا اس تصویر سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ میں مونالیزا کی مسکراہٹ میں آج تک کوئی معنی پیدا نہیں کر سکا۔ اسی طرح پکاسو کے تصویری احساسات کو میں کس طرح عزت دے سکتا ہوں...... جس شخص کی موثر دردزہ میں مبتلا بیوی کو ہسپتال پہنچانے کی بجائے ایک موسیقار دوست کو خوش آمدید کہنے کے لئے بھیج دی جائے' اس کی تصاویر میں جذبے کی سچائی کس طرح آ سکتی ہے۔ کروڑوں روپے کمانے والے پکاسو نے انسان کے لئے کیا کیا......؟ میں تو پھر بھی ایک کام کر رہا ہوں۔ نگر نگر گھومتا ہوں۔ لوگوں کی آنکھوں سے پردے اٹھاتا ہوں۔ پکاسو کی تصویر کی تو ایک قیمت لگ جاتی

ہے۔ لاکھ دو لاکھ' پانچ لاکھ روپے۔ مگر وہ آنکھ جو ایک کروڑ میں بھی نہیں خریدی جا سکتی' میں اس میں بلامعاوضہ رنگ بھرتا ہوں۔ اس لئے میرا اظہار تشخص نسبتاً تعمیری ہے۔"

"آپ کو اپنے کام پر فخر ہے؟" اسٹل نے پوچھا۔

"ہاں' ہاں کیوں نہیں------ کیونکہ میرا اظہار تشخص نپولین کی طرح نہیں ہے اور نہ میں پکاسو کی طرح سوداگر ہوں------ میں نے اپنی روح کی بالیدگی کے لئے یہ کام شروع کیا ہے۔ جس طرح کسان سال بھر ہل جوتتا ہے۔ پھر زمین کا نم دیکھ کر اس میں دانا ڈال دیتا ہے۔ پھر انتظار کرتا ہے کہ زمین کے بھورے سینے سے کونپل پھوٹے------ آخر وہ لمحہ آ جاتا ہے جب اس کی سال بھر کی محنت سپھل ہوتی ہے اور زمین سے سبز کرنیں پھوٹنے لگتی ہیں' تب اس کی روح شاد کام ہوتی ہے۔ میں اپنی زندگی میں یہی عمل دہراتا ہوں۔ کیونکہ میرا عقیدہ ہے کہ ایک اندھے کی آنکھ میں جب نور کی کرن پھوٹتی ہے' تو گویا خدا کا اظہار ہو جاتا ہے!"

اسٹل نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

"آپ خدا کو مانتے ہیں؟"

"خدا کو نہ مان کر مجھے کیا فائدہ ہے۔ یعنی کہ میں ہر ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤں۔ حیوان بن جاؤں' مگر اس کا کیا فائدہ؟ میرے خیال میں کوئی فائدہ نہ ہوگا! میں نے اس پر بہت سوچا ہے۔ بہت سوچا ہے------ مجھے ایک خدا کی ضرورت ہے۔ اسے میرے سینے میں موجود ہونا چاہیے۔ تاکہ میں اس سے فیض کی توقع رکھوں۔ کیونکہ میرے نزدیک خدا اور مذہب کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ زندگی کی سطح کو بلند کرنے کے لئے ایک مربوط نظام اور سیرت انسانی کے لئے ایک خوش نما اسلوب پیدا کیا جائے۔ اگر بہتر زندگی کی ضرورت پوری ہوتی ہو اور اس کے لئے مابعد الطبیعات پر یقین کرنے کی شرط عائد ہوتی ہو' تو اسے قبولنے میں کوئی عذر نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ زندگی کے حسن اور رعنائی کی یہ بہت کم قیمت ہے۔"

اسٹل چپ ہو گئی تھی------ جیپ نیچے اتر رہی تھی۔ کیمپ تک اس نے کوئی بات نہ

کی۔

شام کو کھانے سے پہلے میں کمرے میں بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ اسٹل آ گئی۔ رات کا کھانا ہم نے ڈاکٹر کے ساتھ کیمپ میں کھانا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے کتاب بند کر دی' تو وہ بولی۔

"ڈاکٹر خاصا خطرناک آدمی معلوم ہوتا ہے۔"

میں نے ہنس کر تائید کی۔

"کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔ وہ جو ایک ہزار آدمیوں کی تلاش تھی ہمیں' غالباً اطالین سیاح کے بعد یہ دوسرا آدمی ہے۔"

"کم بخت شعر و ادب پر بھی تنقید کر رہا تھا۔ میں تو اسے یہ بھی نہ کہہ سکی کہ شعر میں زندگی کا پرچار ہو نہ ہو' مگر خوبصورت شعر میں روح کے گداز کا احساس تو ہوتا ہے۔"

"میں شاعری کو بالکل رد نہیں کرتا۔" ڈاکٹر نے اندر آتے ہوئے کہا۔

"کبھی کبھی شعر بالکل الہام کی طرح اترتا ہے' جیسے کسی الہڑ دوشیزہ کی زبان سے لوک گیت جنم لیتا ہے------ لیکن قافیہ ردیف کی فہرستیں سامنے رکھ کر شعر کہنا شاعری نہیں ہوتی اور نہ نظریات کے کنوئیں میں بند ہو کر شاعری کی جا سکتی ہے۔ اصل شاعر شعر کہتا نہیں' شعر اگلتا ہے' جیسے سمندر اپنے کناروں پر موتی چھوڑ جاتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے شاعری پر آپ کی تنقید ناجائز ہے؟"

"کس طرح ثابت ہوتا ہے خاتون؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"آپ فطری شاعری کو تسلیم کرتے ہیں؟"

"مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں خاتون۔ جس دنیا میں لوگ پیغمبروں کی باتیں نہیں سنتے' الہامی کتابوں کو نہیں مانتے' وہاں شاعری کی صداقت کون مانتا ہے۔ آخر یہ بھی تو ایک حقیقت ہے کہ خوبصورت سے خوبصورت شعر بھی پنسلین کے انجکشن کا نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا۔ کتنی صدیاں گزر گئیں' شاعری انسان کے دکھ ختم نہیں کر سکی؟"

"میں سمجھتی ہوں۔ ایک فطری شاعر بھی اتنا ہی قابل احترام ہے' جتنا پنسلین کا موجد۔"

دونوں نے انسان کے بہتر مستقبل کے لئے سوچا ہے۔ ایک انسانی جسم کے زخموں کا علاج کرتا ہے۔ دوسرا اس کے مجروح جذبوں کو تسکین بخشتا ہے۔ ایک جسمانی احتیاج ہے، دوسرا روحانی احتیاج' ہاں ------ یہ اور بات ہے کہ دونوں موجود ہیں اور دنیا سکھی نہیں ہے!"

"میں مانتا ہوں خاتون۔ میں مانتا ہوں' لیکن جہاں تک اظہار ذات کا تعلق ہے' ہر فنکار کا بڑا مسئلہ اظہار ذات کا مسئلہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی انا کے اظہار میں انتہا پسند ہوتا ہے۔ اگر وہ سماج سے نہ ڈرتا' تو بلادریغ خدائی کا دعویٰ کر بیٹھتا۔"

امثل ہنس پڑی۔

"شکر ہے ہمارا عقیدہ ایک خدا پر ہے۔ ورنہ خداؤں کی اتنی بڑی فوج سے کس طرح نمٹتے۔ حرف آخر کہلوانے کے ذوق نے دنیا کو کس قدر تہہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے۔"

رات کے کھانے کے لئے ڈاکٹر کے کیمپ میں پہنچے تو وہاں کڑھی ہماری منتظر تھی۔
یعنی ڈاکٹر ہمیں دعوتی کھانے میں کڑھی کھلا رہا تھا۔ ایک ایسا آدمی جس میں ذرا بھر تکلف نہیں تھا۔ کہنے لگا۔

"تیس پینتیس روپے کا مرغ کھلاتا' تو آپ کو ہضم ہی نہ ہوتا۔ کیونکہ یہ اسراف ہے۔ اتنے روپے سے انجکشن خریدنا زیادہ بہتر کام ہے۔"

امثل کو اس کا یہ رویہ بہت شاندار لگا۔

"انجکشن خریدنے کے لئے جتنے روپوں کی ضرورت ہو' میں اور وسیم صاحب آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے خاتون' اس کام کے لئے پیسہ جہاں سے بھی ملے' ہم لینے میں باک نہیں سمجھتے۔ لیکن ابھی میرے پاس وہ پیسہ ختم نہیں ہوا' جو اچھے وقتوں میں انکم ٹیکس سے بچایا تھا۔ میں معمولی ڈاکٹر نہیں ہوں۔ لاکھوں روپیہ کمایا ہے۔ اس زمانہ میں بڑا جغادری قسم کا کیمونسٹ تھا اور ملحد بھی ------! کئی کیمونسٹ ممالک کا دورہ کر چکا ہوں۔ پبلسٹی کی مد میں لاکھوں روپے کا ہیر پھیر کر چکا ہوں۔ ایک زمانہ تھا' چائنہ ڈش سے کم پر طبیعت نہیں

ٹھہرتی تھی' لیکن ایسی رت بدلی کہ اب کڑھی میں جان آ گئی ہے۔"

"شراب بھی چھوڑ دی ہوگی؟" امثل نے بے ساختہ پوچھا۔

"شاید نہ چھوڑتا۔ اگر ہاتھوں میں لرزا پیدا نہ ہوتا۔ سوچا۔ میرے پاس ہاتھ ہی تو ہیں' جو بجھی ہوئی آنکھوں میں تار بھرتے ہیں------ چنانچہ بے ایمانی کی آخری حدوں کو چھو کر مجھے خیال آ گیا تھا کہ اب اس سے آگے تو کوئی مقام ہی نہیں ہے۔ لہٰذا پر جلنے سے پہلے لوٹ آیا!"

"پر جلنے کا تماشا بھی دیکھ آتے۔ کیا حرج تھا؟"

"پھر میں سکردو کیسے پہنچتا۔ آپ سے ملاقات کیونکر ہوتی۔ پھر میں بنجارہ بھی نہ کہلا سکتا۔ آپ نہیں جانتیں۔ بنجاروں سے مجھے کس قدر لگاؤ ہے۔ کیونکہ میری طرح ان کا بھی کوئی وطن نہیں ہوتا۔ نہ کسی قومیت کا دعویٰ کرتے ہیں نہ کسی نسل کا' جہاں جاتے ہیں' وہی ان کا وطن ہوتا ہے۔ دنیا کی کوئی نسل ان کے لئے اجنبی نہیں ہوتی۔ یہ عالمی برادری کے لوگ ہوتے ہیں۔ دنیا کے تمام انسانوں کے ساتھ ان کا رابطہ ہوتا ہے۔ کوئی زبان' کوئی تہذیب' کوئی خطہ ان کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ کیونکہ بنجارے میں انسان دوستی کی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ اپنے خلق سے دنیا کو فتح کرتا ہے۔"

میں نے امثل کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ڈاکٹر نے وہی بات کی ہے' جو آپ نے بلوچستان کے خانہ بدوشوں کے خیمے دیکھ کر کہی تھی۔"

"اچھا------ تو گویا آپ مجھ سے متفق ہیں۔" ڈاکٹر نے میری بات سن کر امثل سے کہا------ "ہاں ٹھیک تو ہے۔ بنجارے کو گھر کی کیا ضرورت ہے جبکہ وہ ہر اس زمین پر خیمہ اگا دیتا ہے' جہاں کوئی دوسرا ایک تنکا بھی نہیں اگا سکتا۔ کتنے مزے کی بات ہے۔ کوئی اسے نہیں ٹوکتا کہ یہ زمین میری ہے۔ وہ اپنی مرضی سے بسیرا کرتا ہے اور اپنی مرضی سے چل پڑتا ہے۔ بنجارے سے کوئی آدمی خطرہ محسوس نہیں کرتا۔ کاش------! انسان جس طرح بنجارے سے سلوک روا رکھتا ہے' دنیا کے دوسرے انسانوں سے بھی یہی رویہ اختیار

کر سکتا۔"

امل نے خوش ہو کر کہا۔

"پچھلے دنوں ہمیں ایک اٹالین سیاح ملا تھا۔ وہ بھی آپ کی طرح پختہ کار بنجارہ تھا۔ ایک ہی نشست میں ہمارا دوست بن گیا تھا۔ تیسرے وسیم صاحب ہیں۔ چوتھی میں ہوں۔ چار درویشوں کی ٹولی تو بن گئی ہے۔ اگر ہماری تعداد ایک ہزار ہو جائے تو ایک نئی بستی بسائی جا سکتی ہے۔ ہم اپنی چلتی پھرتی بستی کو لے کر ساری دنیا میں پھیل سکتے ہیں......"

"ایک شرط پر میں اس بستی میں آ جاؤں گا کہ سارے درویش اپنے آبائی مذہب اپنے اپنے گھروں میں چھوڑ آئیں۔ ورثے میں ملے ہوئے تعصب کا جامہ وہیں اتار دیں۔ باپوں کے عقیدوں کو ہماری بستی تک نہیں پہنچنا چاہیے۔ ہمیں اپنے طور پر خدا کو پہچاننا ہوگا۔"

"ڈاکٹر.....!" امل تحکمانہ لہجے میں بولی۔ "جو درویش ایک ہزار گنتی میں آنے کی اہلیت رکھتے ہوں' وہ اتنی بات ضرور جانتے ہوں گے کہ وہ کس کام کے لئے گھر سے نکلے ہیں۔"

"ہاں ہاں' یہ تو ہے۔" ڈاکٹر نے فوراً اقرار کر لیا...... "لیکن ہزار کی گنتی پوری کرنا بہت مشکل ہے۔ ہاں' ہم آرزو کر سکتے ہیں کہ گنتی تو پوری ہو۔ جیسے شاعر اور ادیب بہتر مستقبل کا سندیسہ دیتے رہتے ہیں۔ بس ایسے ہی ہم بھی ایک نہ ختم ہونے والا انتظار کرتے رہیں۔"

"گویا آپ بھی میری طرح انتظار کا تکلف پسند نہیں کرتے۔ ہم دونوں سے مستقل مزاج تو وسیم صاحب ہیں۔ وہ انسان سے مایوس نہیں ہیں۔"

"تو پھر یہ درویش نہ ہوئے نا؟" ڈاکٹر نے ہنس کر کہا۔

میں نے پرعزم لہجے میں ڈاکٹر کی بات کاٹی۔

"اگر درویشوں کی فہرست میں شامل ہونے کے لئے یہ شرط ضروری ہو کہ آدمی یقینی مستقبل پر یقین نہ رکھے' تو پھر میرا نام نکل ہی جائے گا۔ کیونکہ میں انسان کے یقینی مستقبل کا خواب ذہن سے نہیں نکال سکتا۔ آپ جس طرح کے خدا کی تلاش میں ہیں'

میں اسے بھی مان لوں گا' بشرطیکہ انسان کے بہتر مستقبل کی ضمانت مل سکے۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ زندگی پر یقین رکھنا چاہیے۔" ڈاکٹر بولا۔ "لیکن اگر کنفیوژن بھی رہے' تو کیا حرج ہے۔ تامل' تجسس' تشکیک اور تذبذب زندگی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ جس طرح شفاف ندی کا پانی انسانوں کو فائدہ پہنچاتا ہے' اسی طرح شہر کا گٹر بھی تمام گھروں کی گندگیاں شہر سے دور لے جاتا ہے۔ آپ کا یقین شفاف ندی سہی وسیم صاحب' مگر ہمارا کنفیوژن بھی گٹر کی طرح اچھے نتائج کی تلاش میں سفر جاری رکھتا ہے۔"

"یعنی ایک حد تک آپ ذوقِ یقین کو معیار نہیں مانتے؟" امل نے پوچھا۔

"ہاں میں نہیں مانتا' لیکن میں محض علم کو بھی معیار نہیں مانتا۔ میں علم اور یقین کا امتزاج چاہتا ہوں...... اس کی مثال خود میری زندگی ہے۔ جو میرے خیالات ہیں' میں وہی ہوں اور میں جو بننا چاہتا ہوں' وہ میں بن گیا ہوں۔ میں نے دنیا نہیں چھوڑی اور نہ میں نے انسان کو چھوڑا ہے۔ نہ میں نے نیک آدمی کی تلاش کی اور نہ برے آدمی سے بھاگا ہوں۔ میں مسلمان کے علاوہ بھی ہر مذہب کے آدمی کی آنکھ کو چھوتا رہا ہوں۔ مجھے کبھی احساس نہیں ہوا کہ میں نے اپنے ضمیر کے خلاف کام کیا ہے۔ کیونکہ میں انسانوں کو چھوتا رہا ہوں۔ ایسے میں اگر انہوں نے جلا پائی ہے' تو مجھے بھی روشنی ملی ہے۔ یہ علم اور یقین کے اشتراک کا ثمر ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"تو آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کا رویہ آفاقی ہے اور آپ کے متامل اور متذبذب کردار سے دنیا کی اصلاح ہو جائے گی؟"

"میں کوئی دعویٰ نہیں کرتا' کیونکہ مجھ میں نہ بدھ کی شکتی ہے اور نہ عیسیٰ کا صبر' اور نہ میں محمدؐ کی طرح مکمل انسان ہوں کہ کائنات کے رمز جانوں اور انسان کی اصلاح کا بیڑہ اٹھاؤں۔ البتہ زمین کی گردش' چاند اور سورج کی فعالیت اور کائنات کا منظم کردار مجھے ایک سپرپاور کا احساس دلاتا ہے...... یہی احساس ہے جو مجھے انسان سے پیار کی تلقین کرتا ہے اور میرا مزاج اسے قبول کرتا ہے۔ اب اس سے انسان کی اصلاح ہو یا نہ ہو' مگر میں

اپنے حصے کا کام کرتا ہوں اور اسے جاری رکھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ جس طرح بعض لوگ پیسہ پیدا کر کے خوشی حاصل کرتے ہیں' بعض عبادت سے مسرت حاصل کرتے ہیں' میں بھی اس طرح خوشی حاصل کرتا ہوں------ اب اس میں کس حد تک آفاقیت اور ملامت ہے' نہیں جانتا لیکن میں اپنے اس عقیدے کے لئے کام کرتا رہوں گا کہ اندھے کی آنکھ میں جب نور کی کرن پھوٹتی ہے' تو گویا خدا کا ظہور ہو جاتا ہے؟"

امثل نے کہا۔

"یہ بھی تو ایک چھوٹی موٹی خدائی ہوئی نا کہ آپ نے اپنی الگ جنت بسا رکھی ہے؟"

"ہاں------ مجھے کوئی اعتراض نہیں' اگر کوئی اپنے سینے کے اندر کی سچائیوں اور کدورتوں سے خدا بن کر نمٹے اور نمٹ سکے' تو پھر جنت بسانے میں کیا حرج ہے۔"

امثل چپ ہو گئی اور سوچ میں پڑ گئی۔ ڈاکٹر نے بات جاری رکھی۔

"ہمارے سینے میں دوزخ اور جنت دونوں موجود ہیں۔ میں اسے مقدر تو نہیں کہوں گا۔ ہاں اہلیت کہہ سکتا ہوں کہ دوزخ سے بچ نکلیں اور جنت میں داخل ہوں۔ جس طرح مادام کیوری نے دنیا کے تمام مفاد ٹھکرا کر اپنے من کی جنت میں داخلہ لیا تھا اور سرخرو ہو گئی تھی۔"

میں نے پوچھا۔

"مادام کیوری سے زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے' جو مفاد کی خاطر دوزخ قبول کرتے ہیں۔ کیا علاج' اور کیا کیا جائے' اگر دوزخ سے بچنے کی اہلیت نہ ہو؟"

"یہی تو رونا ہے وسیم صاحب' تبھی تو میں کہتا ہوں کہ ایک ہزار پورے نہیں ہوں گے' لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم اپنا کام چھوڑ دیں۔ کیونکہ ہم تو اپنی مسرت کے لئے کام کر رہے ہیں۔ اگر ہم مر کر بھی کسی کے کام نہیں آ سکتے' تو پھر جینے میں کیا مضائقہ ہے۔ کیوں کہ جن لوگوں کے دلوں میں جینے کی امنگ ہے' ہم ان کے کام آ سکتے ہیں۔ ان کی امنگ کو تقویت پہنچانا بھی ایک کام ہے اور یہ دنیا کے بہت سے کاموں سے زیادہ اچھا کام ہے۔"

میں محسوس کر رہا تھا کہ ڈاکٹر اٹالین سیاح سے بھی زیادہ خوبصورت آدمی ہے۔ کیونکہ وہ لمحہ بہ لمحہ میرے دل میں اترتا جا رہا تھا------ اس کا ابھرا ہوا ماتھا جو پہلی ملاقات میں بے ڈول اور مضحکہ خیز معلوم ہوا تھا' اب اپنی انفرادیت کے نور سے جگمگا رہا تھا۔

اٹالین سیاح کو میں نے ایک طرح سے بالواسطہ پہچانا تھا' لیکن ڈاکٹر کو میں بلاواسطہ پہچان رہا تھا------ کیونکہ دونوں میں اتنا فرق تو واضح نظر آ رہا تھا کہ ایک کے ہاتھ میں ٹراؤٹ مچھلی پکڑنے کی ڈور اور کانٹے تھے' تو دوسرے کے ہاتھ میں نورانی کرنوں کے گچھے------ جس سے وہ اندھوں کی آنکھیں رفو کرتا تھا

اور کڑھی میں ٹراؤٹ مچھلی کے مزے اڑاتا تھا------!

امثل حسب معمول چپ تھی۔ اسے جب بھی کوئی بات پسند آتی تھی' سوچوں کے سمندر میں اتر جاتی تھی۔ میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ ایک آدمی تو ایسا ملا' جو امثل کی طرح ذہین ہے۔ امثل کی طرح زندگی کو سمجھتا ہے اور امثل کی طرح زندگی سے شاکی بھی ہے۔ لیکن ایک بات میں امثل سے بھی افضل ہے کہ زندگی سے شدید پیار کرتا ہے۔ پیار بھی ان معنوں میں کہ انسان کے روگ دور ہو سکیں۔

اور پھر مجھے اس پر بھی خوشی ہو رہی تھی کہ امثل اس کے رویے کو انفرادی فعل سمجھ کر رد نہیں کر رہی تھی' بلکہ چپ ہو گئی تھی۔

کھانا کھا چکے تو ڈاکٹر نے کہا۔

"کل آپ دیوا سائی جائیں۔ یہ نہ پوچھیں کہ وہاں کیا ہے۔ بس آپ چلے جائیں۔ آپ جو کچھ دیکھیں گے' ساری دنیا میں کہیں نہ دیکھیں گے۔"

امثل بولی۔

"جھیل سیف الملوک بھی ایسی ہی ایک جگہ ہے۔ جو دنیا میں کہیں اور نہیں دیکھی جا سکتی۔"

"بہت سی ایسی جگہیں ہیں' جو کہیں اور نہیں ہیں۔ مثلاً نیاگرا' راکاپوشی------ آپ لوگ ہنزہ نہیں گئے نا' راکاپوشی دیکھئے۔ چاندی کے پہاڑ کا گمان ہوتا ہے۔ سفید برف ایسے

چمکتی ہے‘ جیسے ابھی ابھی دست قدرت نے چاندی کا پانی پھیر دیا ہو۔ یہ منظر جو لمحہ لمحہ تازہ لگتا ہے‘ ہر سانس تازہ لگتا ہے۔ صدیوں سے ایسا ہی تازہ ہے۔ برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں تو اور بھی ہیں‘ موئنٹ ایورسٹ ہے۔ کے ٹو ہے۔ لیکن نہ جانے فطرت نے اس کا زاویہ متعین کرنے میں کیا چالاکی برتی ہے کہ گویا سیال چاندی کا پہاڑ کھڑا ہے اور ایسا کھڑا ہے کہ نہ گرتا ہے‘ نہ ختم ہوتا ہے نہ بہتا ہے۔ لگتا ہے‘ آئینہ ہے۔ جس میں فطرت اپنا چہرہ دیکھتی ہے۔"

امل نے ڈاکٹر کو نرم نرم نگاہوں سے دیکھا۔

"کل آپ ہمارے ساتھ دیوسائی نہیں جائیں گے؟"

"نہیں خاتون‘ کل میرے دو آپریشن ہیں اور ویسے بھی وہاں کسی کو ساتھیوں کی ضرورت نہیں رہتی۔ فطرت آپ سے ہمکلام ہوگی اور خدا کا وہ روپ دکھائے گی‘ جو جلانے کی بجائے جلا دے گا!"

امل ہکا بکا ڈاکٹر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا خوبصورت دہانہ کھلا تھا اور اس کی حیرت زدہ آنکھیں پتھرا سی گئی تھیں۔

عین اس لمحے ڈاکٹر کی نرس نے کلفی ہمارے سامنے رکھ دی اور نہایت پیار سے بولی۔

"کیوں امل جی! آپ کو میری کڑھی اچھی لگی؟"

امل کی بوکھلاہٹ عقیدت میں بدل گئی۔ اس نے مسکرا کر نرس کی طرف دیکھا۔

"بہت اچھی‘ بہت اچھی تھی‘ مگر تمہارے طرز تخاطب سے ہرگز اچھی نہیں تھی۔"

"واہ جی...... آپ بھی ڈاکٹر جی کی طرح باتیں کرتی ہیں۔"

"اچھا......؟" امل حیرت اور خوشی سے بولی...... "میں اب سمجھی ہوں کہ ڈاکٹر کے مریضوں کو اس قدر جلد آنکھیں کس طرح مل جاتی ہیں۔ ان کا آدھا روگ تو تمہاری باتوں سے دور ہو جاتا ہوگا۔"

ڈاکٹر نے ہنس کر کہا۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ یہ عورت نہیں نیکی کی علامت ہے۔ اس کے رویے سے میں

نے زندگی کو پیار کیا ہے‘ بلکہ زندگی کو پایا ہے۔ یہ وہی لڑکی ہے‘ جس نے مجھ جیسے پاپی کے سینے میں انسان سے پیار کی جوت جگائی ہے۔"

"واہ‘ ڈاکٹر جی‘ آپ تو مجھے خواہ مخواہ سر چڑھاتے ہیں۔"

"اس کو نیلیا کے رنگ پر نہ جائیے۔ اس کے سینے میں نور ہی نور بھرا ہوا ہے۔"

ڈاکٹر کا لہجہ بے حد شیریں ہو گیا تھا۔ "میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ میں نے شراب ہاتھوں کے لرزنے کی وجہ سے چھوڑی تھی۔ میں اور سلطانہ ایک ہی ہسپتال میں کام کرتے تھے۔ ایک یتیم بچے کے آپریشن کے وقت میرا نشتر اس کو غلط جگہ لگ گیا تھا۔ اور وہ بچہ ہمیشہ کے لئے اندھا ہو گیا تھا۔ میں نے اسی وقت اپنے ساتھیوں کے سامنے اعتراف کر لیا تھا۔ سب خاموش ہو گئے تھے۔ کیونکہ میں سب سے سینئر ڈاکٹر تھا‘ لیکن یہی سلطانہ تھی‘ جس نے میرے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا تھا اور چیخ چیخ کر کہا تھا......

"شراب پیتا ہے۔ شراب پیتا ہے اور آپریشن تھیٹر میں آ جاتا ہے!"

سلطانہ جو مضطرب کھڑی تھی جھنجھلا کر بولی۔

"ڈاکٹر جی‘ آپ کیوں ایسی باتیں کرتے ہیں۔ کیوں ایسی باتیں کرتے ہیں؟"

ڈاکٹر مسکرا پڑا۔

"تب سے سلطانہ میرے ساتھ ہے۔ اس کے ایک تھپڑ سے میری ساری خباثتیں اس طرح ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں‘ جس طرح درخت کی شاخ کو ہلانے سے خزاں رسیدہ پتے جھڑ جاتے ہیں۔"

امل نے پیار سے سلطانہ کے شانوں پر ہاتھ پھیلا دیئے تھے۔ سلطانہ ہونٹ چبا رہی تھی اور دونوں ہاتھوں سے اپنے کپ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی۔ میں سوچ رہا تھا دبلی اور لانبی‘ متناسب خدوخال کی اس کالی سی لڑکی میں کتنی شکتی ہے کہ ایک ہی تھپڑ سے اس نے ڈاکٹر جیسے درویش کو جنم دیا ہے! سلطانہ کے ذکر سے ڈاکٹر جذباتی ہو گیا تھا۔ کہنے لگا۔

"میں وہ لمحہ نہیں بھول سکتا‘ جو اِدھر تھا نہ اُدھر تھا۔ سارے ڈاکٹروں کو سکتہ ہو گیا

تھا۔ سلطانہ ٹرالی کے ساتھ کھڑی سسک سسک کر رو رہی تھی' لیکن وہ لمحہ جو نہ اِدھر تھا نہ اُدھر تھا' آری کی طرح چیر کر میرے دو ٹکڑے کر چکا تھا۔ میرا ماضی ایک طرف پڑا تھا اور مستقبل دوسری طرف' لمحہ گزر گیا تھا۔ لمحہ مر چکا تھا' لیکن سلطانہ کی سسکیوں میں ایک نئے لمحے نے جنم لے لیا تھا...... میں آگے بڑھا۔ میں نے سلطانہ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے سہمے سہمے انداز میں میری طرف دیکھا...... شاید اس نے بھی میرے چہرے پر نئے لمحے کے جنم کو پالیا تھا۔ ڈاکٹر جی! وہ چیخی اور بے ساختہ مجھ سے لپٹ گئی اور میری چھاتی پر سر رکھ کر زار و قطار رونے لگ گئی...... دوستو' تصور کرو۔ وہ کیا ساعتیں ہوں گی! ہاں' یہی وہ گھڑیاں تھیں' جب میں نے خود کو پہچانا تھا...... ایک یتیم بچے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بصارت سے محروم کر کے میری جون بدل گئی تھی!!"

"ڈاکٹر جی!"

اب کے سلطانہ چیخی اور بے اختیار رو پڑی۔ امثل نے اسے سنبھالا تو ڈاکٹر نے کہا۔

"اسے رو لینے دو۔ اسے رو لینے دو۔ یہ کبھی کبھی روتی ہے۔ یہ رونا نہیں روشنی ہے۔ یہ روشنی کبھی کبھی نظر آتی ہے۔ اور جب یہ تھک جائے گی' رونا بند کر دے گی۔ اندھیرا ہو جائے گا' تو نادانستہ "جی" کے دیئے روشن کر دے گی۔ ڈاکٹر جی' امثل جی' رام جی' اللہ جی اور پھر جس لہجے اور جذبے سے جی بولتی ہے' پگھلا کر رکھ دیتی ہے۔ میرا بس چلتا' تو امریکہ سے کہتا' روس سے کہتا' گولیوں اور بندوقوں کی فیکٹریاں بند کر دو۔ ایٹم اور فیشم کا خیال بھی ترک کر دو۔ ذرا اس "جی" کی طرف توجہ دو۔ کیا حضوری ہے۔ کیا لہجہ ہے۔ کتنا پیار ہے اور کس قدر امن ہے اس جی میں!"

"لیکن امریکہ اور روس آپ کی بات نہیں مانیں گے۔" امثل بولی۔ "کیونکہ اس طرح ان کے احساس برتری اور ناموری کی تاریخ نہیں بن سکے گی اور ان کی معیشت نہیں چل سکے گی۔"

"نہیں خاتون' انہیں سمجھایا جائے' انہیں کہا جائے کہ بدھ نے کونسی لڑائی لڑی تھی؟ عیسیٰ نے کونسی لڑائی لڑی تھی؟ مگر تاریخ پھر بھی مرتب ہوئی تھی۔ انہوں نے تلوار کی جگہ

پیار کی جنگ لڑی تھی۔ مگر چنگیز اور سکندر سے زیادہ دنیا فتح کی تھی...... انہوں نے علاقے فتح نہیں کئے تھے۔ انسانوں کے دل مسخر کئے تھے۔"

"جبھی تو میں کہتی ہوں۔ ہم ایک ہزار ہو جائیں تو ساری دنیا میں پھیل جائیں۔ یہ آپ کی سلطانہ بھی تو ہے۔"

"ہاں...... میری سلطانہ بھی ہے۔ یہ تو سرفہرست ہوگی' مگر آپ نے کیسے جانا کہ یہ میری ہے۔ کیونکہ یہ واقعی میری ہے!"

امثل ہنس پڑی...... اس نے سلطانہ کو اپنی طرف کھینچا اور اس کے بال چوم لئے۔ ڈاکٹر نے کہا۔

"یہ نرس میری بیوی ہے دوستو' یہ میری بیوی ہے!"

امثل اور میں نے بیک وقت ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر ہنس پڑا۔

"ارے صاحب' انکشافات ہی انکشافات ہیں۔ یہ کونلیا کہتی ہے' بیوی تو میں ہوں ہی' مگر مریضوں پر ہمیشہ یہ ظاہر ہو کہ میں نرس ہوں۔ تاکہ ڈاکٹر کی بیوی کا سماجی رتبہ آڑے نہ آئے اور مریض یہ سمجھیں کہ میں انہی میں سے ہوں۔ ان کی خدمت گزار ہوں اور اس خدمت کے صلے میں تنخواہ پاتی ہوں۔ گویا فرض پورا کرتی ہوں!"

"ڈاکٹر......!" امثل بے حد متاثر سے بولی...... "آپ نے تو فرشتوں کا ٹولہ جمع کر رکھا ہے۔"

"یہ سب کچھ اس کونلیا کے رہین منت ہے خاتون! یہ نہ آتی میری زندگی میں' تو نہ جانے کس پگڈنڈی پر نکل جاتا ہے۔ شاید کہیں سراغ ہی نہ ملتا۔ عورت کے بغیر زندگی کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ میں خدا کو اس لئے بھی مانتا ہوں کہ اس نے مادہ اور نر پیدا کئے ہیں۔ یہ سوچا ہوا عمل لگتا ہے۔ عورت کو پستان دیئے کہ بچے کو دودھ پلائے۔ ماں کو ممتا دی کہ اولاد سے یگانگت برتے۔ انسان کو جنسی جذبہ دیا کہ تخلیق جاری رہے۔ مادے میں اتنی عقل کہاں کہ اس تنظیم سے زندگی کو جاری و ساری رکھے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ خدا ہے۔ سلطانہ جیسے خوبصورت لوگ اس کی علامت ہیں۔!!"

"ڈاکٹر------!" امل کے لہجے میں اضطراب تھا...... "یہ خوبصورت لوگ دیر سے ملتے ہیں۔ بہت دیر سے ملتے ہیں۔ خدا اتنی دیر کیوں کر دیتا ہے؟"

ڈاکٹر نے برجستہ جواب دیا۔

"وہ پیغمبری دینے میں بھی چالیس سال لگا دیتا ہے۔ میرا خیال ہے' انسان اچھے آدرش کے لئے جتنا تڑپتا ہے' خدا اتنا ہی لطف اندوز ہوتا ہے۔ شاید مدنظر یہ ہو کہ جستجو اور حرکت جاری رہے' اور پھر خاتون' سوچو تو کوئی خاص دیر بھی نہیں ہوتی۔ کیونکہ بیس پچیس برس تو تعلیم میں گزر جاتے ہیں۔ دس پندرہ سال عملی زندگی کی نذر ہو جاتے ہیں۔ تجربے ملتے ہیں۔ مشاہدے ہوتے ہیں۔ تب کہیں آدمی اس قابل ہوتا ہے کہ خوبصورتی کو پہچان سکے۔ اس لئے کوئی خاص دیر بھی نہیں ہوتی۔ کیوں آپ کا کیا خیال ہے؟"

امل چپ ہو گئی...... میں خاموش تھا کہ ڈاکٹر نے اسے گھیر لیا ہے۔ مگر خلاف معمول وہ مسکرا پڑی۔

"ڈاکٹر...... آپ کی باتیں مجھے اچھی لگتی ہیں۔ جب سے میں سکردو کی سرزمین میں داخل ہوئی ہوں' مجھے ہر چیز اچھی لگنے لگی ہے۔ وسیم صاحب کی باتیں بھی مجھے اچھی لگنے لگی ہیں...... درخت' پہاڑ' پانی' ریت ہر چیز سے وابستگی محسوس کر رہی ہوں یا تو میری قوت مدافعت کمزور پڑتی جا رہی ہے۔ لگتا ہے' جیسے میں فطرت سے سمجھوتہ کرتی جا رہی ہوں۔"

امل کی باتیں سن کر میری رگ و پے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

ڈاکٹر نے کہا۔

"تو کیا اس سے پہلے آپ زندگی کو رد کر چکی ہیں؟"

"ہاں ڈاکٹر صاحب!" امل کے بجائے میں نے جواب دیا------ "یہ مشتعل روح ہے۔ روٹھی ہوئی روح ہے۔ کیونکہ دنیا اس طرح کی نہیں ہے' جیسے یہ چاہتی ہے۔ مثلاً بیماری نہ ہو' دھوکہ نہ ہو' حق تلفی نہ ہو۔ استحصال نہ ہو' صرف "جی" ہو پیار کی جی' سلطانہ والی جی!!"

"یہ بری خواہش تو نہیں ہے' جو پوری نہ ہو سکے' یہ اور بات ہے' لیکن یہ تو ہر اچھے آدمی کی آرزو ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ ہر اچھے آدمی کی آرزو ہونی چاہیے' لیکن بروں کا کیا کریں۔ اگر وہ ختم نہیں ہو سکتے' تو کیا اچھے بھی نہ رہیں؟ کیا اچھوں کو لازم ہے کہ بروں کے لئے دنیا خالی کر دیں؟ کیونکہ وہ بروں کے ساتھ رہنے کی صلاحیت نہیں رکھتے' اور یا یہ کہ وہ زندگی کو ہی رد کر دیں؟ اور یا یہ کہ وہ اس زمین پر بوجھ کیوں ہیں؟ مگر میں اس منطق کو کیوں مانوں کہ زندگی بے معنی ہے۔ میرے سینے میں امنگ ہے۔ جذبہ ہے' احساس ہے۔ میں اگر نفرتوں اور کدورتوں سے الگ رہ سکتا ہوں' تو جینے کا حق کیوں نہ مانگوں!؟"

امل ذو معنی انداز میں مسکرا رہی تھی۔

ڈاکٹر نے کہا۔

"کون آپ سے حق چھین سکتا ہے۔ آپ تو اتنی خوبصورتی سے جینے کا حق ادا کر رہے ہیں کہ چھیننے والے بھی دس بار سوچیں گے...... دنیا میں ہر چیز مغلوب ہو سکتی ہے' انسان کی انا مغلوب نہیں ہو سکتی' موت کے خوف سے یا رزق کے خوف سے بظاہر ہر انسان مغلوب ہو جاتا ہے' مگر اس کی انا پھر بھی باقی رہتی ہے اور یہی چیز اسے زندہ رہنے کا حق دیتی ہے!"

"تو پھر میں زندہ ہوں اور امل سے کہیے کہ مجھے زندہ رہنے کا حق دے!"

امل ہنس رہی تھی۔

"آج تو میں آپ کی ہر بات مانتی ہوں' کیونکہ آج تو میرے پہلو میں نیکی کی علامت ہے!"

اس نے سلطانہ کو چوم لیا۔

"امل جی------!" سلطانہ نے شرما کر منہ اس کی گود میں چھپا لیا۔

ڈاکٹر بہت خوش تھا۔

"آج کی شام بھی ہمیشہ یاد رہے گی۔ اگر چار ذہین آدمی متفق ہو جاتے ہیں' تو کہئے'

دنیا کے اچھے دن آنے والے ہیں۔"

امثل بھی بے حد مسرور تھی۔ ہم نے اجازت چاہی ------ ڈاک بنگلے پہنچ کر ہم اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

یہ سکردو میں ہماری پہلی رات تھی۔

صبح ناشتے کے لئے امثل کے کمرے میں گیا' تو وہ بیزار بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں' جیسے وہ رات کو سوئی نہ ہو' یا بہت کم سوئی ہو۔ یہ بالکل خلاف معمول تھا' کیونکہ کل وہ سارا دن انتہائی خوش رہی تھی۔

میں نے پوچھا۔

"کیا بات ہے' طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

وہ ہونٹ چبانے لگی اور نگاہیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ میں ایک لمحہ کے لئے گھبرا گیا۔

"آپ نے یہ تاریخ پڑھی ہے؟" اس کے لہجے میں اضطراب تھا ------ "یہ سرخ کتاب دیکھ رہے ہیں۔ یہ سیاحوں کے لئے ڈاک بنگلے میں رکھی ہوئی ہے۔"

"میرے کمرے میں تو نہیں ہے۔"

"نہیں ہے تو اسے لے کر پڑھ لیں۔ یہاں کی تاریخ بھی خون سے لت پت ہے۔ یہ سامنے پہاڑی دیکھ رہے ہیں' جو دریائے سندھ اور سکردو کو الگ کرتی ہے اور اس پر پہاڑی پتھروں کا پختہ قلعہ' یہ انسان' جس پر ہر آدمی اعتماد کرنے کے لئے لیکچر دیتا ہے' ان بے آب و گیاہ پہاڑوں کے حق ملکیت کے لئے جنگ و جدل کرتا رہا ہے۔ ان برف پوش چوٹیوں اور گھاٹیوں میں جگہ جگہ انسانوں کا لہو منجمد پڑا ہے!"

"یہ المیہ تو انسان کا مقدر ہے امثل' آپ اتنا اثر کیوں لیتی ہیں؟"

"واہ ------! یعنی جس سرزمین پر میں نے زمین کی آنکھیں دیکھی ہیں' اب ان آنکھوں

سے خون کے قطرے بھی ٹپکتے دیکھنے ضروری ہیں۔ بارود اور نیزوں سے بھرے ہوئے پتھر کے قلعے کو کیا حق پہنچتا ہے کہ جھیل کچورا کے بے داغ پانیوں میں اپنا عکس دیکھ کر اسے داغدار کرے۔ ان چاروں طرف چمکتی ہوئی نورانی چوٹیوں کو دیکھئے' جہاں سے خدا جھانکتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور پھر بھی لہو گرتا ہے۔ یہ سب کچھ عجیب ہے۔ کھانے کو مکی کے بھونے ہوئے دانے میسر نہیں ہیں' مگر لڑتے ہیں۔ مرتے ہیں اور کہتے ہیں یہ سب کچھ ہمارا ہے۔ وہ چوٹیاں بھی جن پر چڑھنے کی ان میں سکت نہیں ہے۔ وہ دریا بھی' جس کی ایک بوند بھی ان کے کھیت تک نہیں پہنچ سکتی ------ آخر یہ راجے مہاراجے کیوں ہیں۔ کس لئے ہیں کہ لوگوں کو اکٹھا کر کے مرگ انبوہ کا جشن منائیں ------؟ میں پوچھتی ہوں بکھرا ہوا انسان اچھا تھا کہ ایک ایک مرتا تھا اور طبعی موت مرتا تھا ------ یا ہجوم اچھا ہے کہ غیر طبعی موت مرتا ہے اور بے مقصد مرتا ہے؟ انسان کام کرے۔ اپنے لئے روزی پیدا کرے اور عمر طبعی تک پہنچے۔ کیا یہ سادہ سی حقیقت انسان کی سمجھ میں نہیں آتی؟"

"آ جائے گی امثل' کسی دن ضرور سمجھ میں آ جائے گی۔ ہمارے کڑھنے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو گا' بلکہ خود ہم بھی الجھ جائیں گے۔"

"آپ الجھ جائیں گے تو یہ کہہ کر الجھن سے نکل آئیں گے کہ ابھی تو انسان کی عمر صرف دس ہزار سال ہے۔ اور کائنات کی عمر کے مقابلے میں یہ شیر خوار بچہ ہے۔ لیکن مجھے کون سمجھائے گا۔ میرے من سے یہ خوف کون نکالے گا کہ اگر شیر خوار بچہ کشتوں کے پشتے لگا سکتا ہے' ایٹم بم چلا سکتا ہے' تو جوان ہو کر یہ کیا کچھ نہیں کرے گا ------؟"

دیوسائی جانے کا وقت ہو چکا تھا۔ ڈرائیور ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے چلتے ہوئے ٹالنے کے انداز میں کہا۔

"یہ صدی ختم ہو گی' تو ہم بھی ختم ہو جائیں گے۔ زیادہ سے زیادہ تیس پینتیس سال اور جئیں گے۔ ہمیں سوچنا یہ ہے کہ آنے والے تیس سال کے ایک ایک لمحہ کو کس طرح برتنا ہے؟ کس طرح سکھ حاصل کرنا ہے؟ آنے والی صدی سے آنے والی نسل خود نمٹ لے گی۔ جب اربوں کی تعداد میں انسان جینے پر آمادہ ہیں' تو ہمارا بھی فرض ہے کہ

ان کے ساتھ جئیں۔ کیونکہ یہ اکثریت کا فیصلہ ہے۔"

"یعنی سو احمق کہیں کہ سورج مشرق سے نہیں مغرب سے طلوع ہوتا ہے' تو باقی کے پانچ دانشور بھی ان کا کہا مان لیں' کیوں کہ یہ اکثریت کا فیصلہ ہے؟"

"ہاں ایسا ہوتا آیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔۔۔۔۔ "ایک روایت ہے کہ پرانے زمانے میں کسی حکیم نے ایک خاص قسم کا شربت تیار کیا۔ جو آدمی بھی اس شربت کا گلاس پیتا تھا' دنیا کے سارے غم بھول جاتا تھا اور قہقہے لگانے لگ جایا کرتا تھا۔ ہوتے ہوتے سارے شہر نے شربت نوش کرلیا اور شہر قہقہوں میں ڈوب گیا۔۔۔۔ بادشاہ کو معلوم ہوا۔ محل کے جھروکوں سے دیکھا' تو ہر طرف قہقہوں کا طوفان برپا تھا۔ وزیر اعظم کو بلا کر مشورہ کیا۔ دونوں نے مل کر رعایا کو سمجھانے کی کوشش کی' تو قہقہے لگاتی ہوئی رعایا نے نعرے لگائے کہ ہمارا بادشاہ اور وزیر اعظم پاگل ہو گئے ہیں۔ لہٰذا نئے بادشاہ اور نئے وزیر اعظم کا انتخاب کیا جائے۔۔۔۔۔ بادشاہ نے یہ سب کچھ سنا' تو کنکھیوں سے وزیر اعظم کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔ وزیر اعظم نے چپکے سے کہا۔۔۔۔ بادشاہ سلامت' بہتری اسی میں ہے کہ ہم بھی شربت کے گلاس پی لیں۔ جونہی دونوں نے شربت پی لیا' بے اختیار قہقہے لگانے لگ گئے۔ رعایا خوش ہو گئی بادشاہ زندہ باد' وزیر اعظم زندہ باد کے نعرے بلند ہوئے۔۔۔۔۔ اور یوں دو دانشمند اکثریت میں گم ہو گئے!"

"یہی تو رونا ہے وسیم صاحب کہ یہ شربت پینے والوں کی دنیا ہے۔ زہر کا پیالہ کوئی کوئی پیتا ہے۔"

"لیکن جو چیز نہیں ہے' اس کی جستجو پاگل پن نہیں ہے' تو اور کیا ہے۔ ہم آخر ایک نامعلوم شے کی تلاش ہی کیوں کرتے ہیں۔ ہم خود اندھیروں کو پکڑتے ہیں اور پھر اندھیروں کے خلاف احتجاج بھی کرتے ہیں۔ تاریخ کا بوجھ لاد کر ہم کیونکر خوش رہ سکتے ہیں۔۔۔۔؟"

"یہی تو میں کہنا چاہتی ہوں کہ تاریخ کے دکھ کا بوجھ ہمارے سروں پر لادنے کی بجائے

لوگ اپنی ساری سائنس فطرت انسانی کو سمجھنے پر صرف کیوں نہیں کرتے۔ انسان کے اندر ہی اندر جو زلزلے آتے ہیں' کدورتوں اور نفرتوں کے طوفان اٹھتے ہیں اور انسان کی روح میں ہلچل مچاتے ہیں' اس طرف لوگ کیوں توجہ نہیں دیتے؟ ریشمی لباس سے روح کے زخم مندمل ہو سکتے' تو آج کا یورپ اور امریکہ کپڑے پھاڑ کر نروان کی تلاش میں نہ نکلتا۔۔۔۔ میں کہتی ہوں۔ اگر مذہب روح کے دکھ کو نہیں پا سکا' تو سائنس یہ کام کیوں نہیں کرتی۔ اتنی بڑی کائنات کے فاصلوں کا علم رکھتی ہے۔ ایک ذرا سے انسان کے سینے کے رازوں میں کیوں الجھ کے رہ گئی ہے؟"

"ابھی ہمارا سفر جاری ہے امل' آج ہم نے دیوا سائی جانا ہے۔ جب تک سفر جاری ہے' انکشافات کی توقع بھی رکھنی چاہیے۔"

"ابھی تو آپ اندھیروں پر تنقید کر رہے تھے۔ جستجو کو پاگل پن کہہ رہے تھے اور اب انکشافات کی توقع کر رہے ہیں؟"

"میں دل کے اندھیروں پر تنقید کر رہا تھا جہاں ہم کسی نامعلوم شے کی تلاش کرتے ہیں' جو ملتا نہیں ہوتی' لیکن ہم اس کے ملنے تڑپتے ہیں۔ میں جستجو پر اعتراض نہیں کرتا۔ اگر وہ مسرت حاصل کرنے کے لئے ہو۔ میں سفر پر بھی اعتراض نہیں کرتا۔ چاہے وہ دل کا ہو' چاہے روح کا اور چاہے جیب کا۔۔۔۔۔ سفر ہمیشہ نتیجہ خیز ہی ہوتا ہے۔"

"تو پھر چلیئے۔ کیونکہ میں ان دنوں اس کشمکش سے گزر رہی ہوں کہ دوسروں کے لئے جی کر اپنے حصے میں بھی کچھ آتا ہے یا نہیں۔۔۔۔۔؟"

"دوسروں کے لئے جینے میں اپنے حصے کا خیال کچھ پسندیدہ نہیں ہے اور امل جیسی لڑکی کے لئے تو بالکل ہی پسندیدہ نہیں ہے۔"

"آپ مجھے ماورائیت کا سبق دیتے ہیں۔ فرشتہ بناتے ہیں۔ آدمی نہیں رہنے دیتے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"آپ تو وجدان کی باتیں کرتی تھیں۔ پرندوں کے عرفان کی باتیں کرتی تھیں۔۔۔۔۔

احساس اور جذبے کی باتیں کرتی تھیں۔ مجھے تو خوشی ہوئی کہ آپ آدمی بن کر رہنا چاہتی ہیں؟"

اس نے سینے کو چھید جانے والی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا......؟ میں اگر پرندوں کے عرفان کو آدمی کے ذہن میں گھلا دینا چاہتی ہوں' تو اس میں کیا حرج ہے۔ میں عقل کو نہیں مانتی کہ بنائے ہوس ہے۔ میں خالص روحانیت کو بھی نہیں مانتی کہ راہ فرار ہے۔ میں گھونسلا بنانے کی قائل ہوں۔ مگر پرندے کے عرفان سے' میں انسان کی سوجھ بوجھ کے ساتھ پرندے کا سارا رویہ کیوں نہیں اختیار کر سکتی؟"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ کیونکہ اس رویے سے آپ کے گم ہو جانے کا اندیشہ کم ہو جاتا ہے۔ کم از کم میرے لئے اس سے بڑی سچائی دوسری نہیں ہو سکتی کہ آپ زندہ رہیں اور میں آپ کو جی بھر کر دیکھتا رہوں۔"

وہ ہنس پڑی اور اس کے ماتھے کی شکنیں معدوم ہو گئیں۔

"چلئے چلتے ہیں۔ جہاں تک ممکن ہے' میں آپ کے ساتھ ہوں۔ میں دل سے چاہتی ہوں کہ سفر جاری رہے۔ آگے میرا اور آپ کا مقدر!"

جیپ تک گنتی کے چند قدم...... جیسے کائنات سمٹ کر میرے پاؤں کے نیچے آ گئی تھی۔ خوشی سے میری نسیں گویا پھٹ جانے کو تھیں۔ وارفتگی کا یہ عالم کہ بے چاری زمین میرے پاؤں کے نیچے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

اے میرے خالق......! یہ کیسی خوشی ہے؟ کیا ایسی ہوتی ہے مسرت؟

ست پارہ جھیل سے آگے چڑھائی نہایت عمودی ہو گئی تھی۔ سڑک نہایت تنگ اور خستہ حال تھی۔ دو نوجوان لڑکے' جو ڈرائیور نے احتیاطاً سکردو سے بٹھا لئے تھے' پیچھے سے اتار کر بونٹ پر بٹھا دیئے' تاکہ جیپ پیچھے کی طرف الٹ نہ جائے۔

جیپ چیونٹی کی چال چل رہی تھی۔

ہمیں اچانک' بالکل عموداً سات آٹھ ہزار فٹ کی بلندی سے تقریباً چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچنا تھا۔ ہر دو چار فرلانگ کے بعد ریڈی ایٹر کا پانی ابل جاتا تھا اور جیپ کھڑی کر کے اس میں ٹھنڈا پانی ڈالنا پڑتا تھا۔

گیارہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچے' تو یہاں ٹیلوں اور چٹانوں پر ذرا ذرا سی برف جمی ہوئی تھی...... یہیں پر ہم نے نسوانی آواز میں ایک جلتی گیت سنا...... آواز دائیں ہاتھ کی پہاڑی کے اس پار سے آ رہی تھی۔ اٹل کے اشارے پر ڈرائیور نے جیپ روک لی۔

آواز دھیرے دھیرے آ رہی تھی۔ بولوں کا مفہوم سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ لیکن آواز میں ایسا ایکسپریشن تھا اور طرز میں ایسی پکار تھی کہ بپتا کی ماری ہوئی اس پہاڑن کی فریاد نے ہمیں دم بخود کر دیا تھا۔ بول نہ سمجھنے کے باوجود آواز کے ایکسپریشن کے معنی کچھ یوں تھے۔

اے بلتستانی شہزادے
میرے کان ان قدموں کی چاپ سے آشنا ہیں۔
جو نرم نرم برف پر چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔
تم جب بھی آؤ گے' میں جان جاؤں گی۔
کیونکہ میں جس اونچی چٹان پر بیٹھی تمہاری راہ تک رہی ہوں۔
وہاں سے قراقرم کی ساری گھاٹیوں پر میری نگاہوں کی حکومت ہے!
تم جو نیلاب کے اس پار چلے گئے ہو
کبھی تو لوٹو گے......
راکاپوشی کو چھو کر آنے والی مہکتی ہوائیں'
کسی نہ کسی دن تمہارا سندیس ضرور لائیں گی!
کبھی تو لوٹو گے تم'
نیلاب کے اس پار جانے والے مسافر' برف پر جمی ہوئی نگاہوں کے پگھلنے سے پہلے آ

جاؤ'

کہ یہی قسم کھائی تھی تم نے......!!

میں اور امثل دبے قدم چند چٹانیں عبور کرکے اس چٹان تک پہنچ گئے' جہاں وہ لڑکی دنیا و مافیہا سے بے خبر جاگتی آنکھوں سے زندگی کا سب سے حسین خواب دیکھ رہی تھی۔

چند بھیڑیں اس کے قریب چر رہی تھیں۔ ہماری طرف لڑکی کی پشت تھی' مگر اس کی نقرئی گردن سے شعلے نکل رہے تھے...... وہ ایسی مگن تھی' ایسے سوز سے گا رہی تھی...... جیسے یادِالٰہی میں مصروف ہو......

ہم نے اس کی محویت سے متاثر ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا' تو ایک بھیڑ کو ہماری یہ ادا پسند نہ آئی۔ اس نے ہماری طرف سر اٹھا کر دیکھا اور اپنی بھولی بھولی آنکھوں سے بولی۔

"کیوں تنگ کرتے ہو برہن کو......؟"

اچانک دیومالائی کے پہاڑ کا سحر ٹوٹ گیا اور آواز کا دیا بجھ گیا...... لڑکی بدک کر چٹان پر کھڑی ہو گئی...... وہ تیز تیز پلک جھپک رہی تھی اور دہشت زدہ ہرنی کی طرح ہمیں گھور رہی تھی...... اس کی عمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ منگول خدوخال کی تر و تازہ اور شگفتہ کلی...... جس کے رخساروں کو قراقرم کی ٹھنڈی ہوا اوس کے علاوہ کسی نے نہیں چھوا تھا۔

اس کی حیرت اور دہشت کو دیکھ کر امثل مسکرا پڑی۔

لڑکی کے چہرے کا کھچاؤ قدرے کم ہوا اور اس کی آنکھوں میں خوف کی جگہ کتوہل نے لے لی۔ امثل نے ہنس کر کہا۔

"تمہاری آواز ہمیں کھینچ لائی۔"

لڑکی کچھ نہ بولی۔ وہ امثل کی بات سمجھی ہی کب تھی۔ لیکن اپنائیت کا کوئی نہ کوئی احساس اس تک پہنچ گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے چہرے پر ایک معصومانہ تبسم کھل گیا

تھا۔ میں نے امثل سے سرگوشی میں کہا۔ "لوک گیت اسی طرح جنم لیتے ہوں گے......؟"

"ہاں......" امثل ہولے سے بولی...... "یہ لڑکی تو خود مجسم لوک گیت ہے۔ جب تک نیلاب کے اس پار گیا ہوا پردیسی لوٹ کر نہیں آتا' یہ گیت پہاڑ کے ہر پتھر کے سینے میں گرمی پہنچاتا رہے گا اور جب پردیسی واپس آ جائے گا' تو ہر پتھر رو دے گا کہ برہن کہاں کھو گئی!؟"

Love with People.

میں سوچ رہا تھا کہ شاید اسی برہا کا گیت سننے کے لئے ڈاکٹر نے ہمیں بھیجا تھا۔ لیکن ابھی ہم چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر نہیں پہنچے تھے۔ ابھی چند ہزار فٹ کی مسافت اور باقی تھی۔

لڑکی کھڑی تھی...... کبھی ہونٹ چباتی' کبھی سوں کر کے ناک سکیڑتی اور کبھی پلکیں جھپکاتی...... اس کے قدموں کے نیچے برف آہستہ آہستہ پگھل رہی تھی۔

امثل نے کہا......

"کاش میں لڑکا ہوتا اور وہی لڑکا ہوتا' جس کے انتظار میں یہ معصوم لڑکی کھڑی گیتوں کی لڑیاں پرو رہی ہے!"

میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"کاش......! اس لڑکی کی جگہ آپ ہوتیں۔ اور وہ لڑکا میں ہوتا' جو نیلاب کے اس پار سے برہا کا گیت سن کر دوڑا چلا آتا!"

امثل مسکرائی......

"کاش' ایسا ہوتا یا ویسا ہوتا۔ کچھ تو ہوتا۔ ایسے تہی دامن نہ ہوتے!"

مسکراہٹ کے باوجود امثل کی آنکھوں میں حسرت آمیز گمبھیرتا تھی۔ میں نے دل ہی دل میں بلتستانی لڑکی کو دعا دی' جس کی محبت کی مہک نے ان حسین لمحوں کو زندگی بخشی تھی۔

"آؤ چلیں۔" امثل جذبے سے رچے ہوئے لہجے میں بولی...... "برہن سے تنہائی

چھن گئی' تو گناہ ہمارے سر ہوگا"

ہم واپس آکر جیپ میں بیٹھ گئے۔

اب امثل چپ ہو گئی تھی۔ وہ ڈھائی ہزار فٹ کا سفر خاموشی میں گزرا۔ وہ گمبھیر بیٹھی رہی' جیسے ایک لفظ بھی اس کے دامن میں نہیں رہا۔

اچانک ڈرائیور نے جیپ روک لی۔ امثل جیسے خواب سے چونک پڑی۔

ہم دیواسائی پہنچ گئے تھے۔

بخدا......! یہ کیسا نظارہ تھا!!

یقین نہیں آ رہا تھا کہ روئے زمین پر ایسا منظر بھی دیکھا جا سکتا ہے اگر اطلس یا چینی سیاح نے یہ نظارہ دیکھا ہوتا تو یقیناً اس نتیجے پر پہنچتے کہ...... خدا ہے...... اور یہی اس کا گھر ہے۔

سطح سمندر سے تیرہ چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر' ہتھیلی کی طرح طویل و عریض میدان...... تاحد نظر...... رنگ برنگ پھولوں کا لہراتا ہوا گلزار۔

ہم دم بخود رہ گئے...... حیرت زدہ ہی نہیں خوفزدہ بھی ہوئے۔ جنوں اور پریوں کا دیس ایسا نہ ہوگا' تو پھر کیسا ہوگا......؟ اربوں اور کھربوں' بلکہ اس سے بھی زیادہ مسکراتے ہوئے تروتازہ شگفتہ پھول ہمیں خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

تقریباً سو مربع میل کے چاروں طرف برف پوش چوٹیوں کی نورانی فصیل کھڑی تھی۔

زمین تو کیا' پوری کائنات میں ایسا منظر دوسرا کاہے کو ہوگا!

لیکن انسان کا المیہ......!

ماؤنٹ ایورسٹ اور چاند پر پہنچنے والے' دیواسائی نہ پہنچ سکے!!

انسان کو ورطہ حیرت میں ڈالنے کے لئے یہی کیا کم تھا کہ چودہ ہزار فٹ کی سطح مرتفع میں اتنا لمبا چوڑا میدان پایا جائے اور اس پر طرہ یہ کہ نظر کی حد ختم ہو جائے' مگر پھولوں کی سرحد ختم نہ ہو...... گویا پاؤں میں بھی پھول' اور تا بہ افق پھول ہی پھول......!

یعنی زمین پر بھی پھول اور زمین سے گلے ملتے ہوئے آسمان پر بھی پھول......!!

کاش...... یہ خواب ہوتا......

مجھے یاد ہے جھیل سیف الملوک کے پانیوں کو بھی چھونے سے میں گریز کرتا رہا تھا کہ حقیقت تصور بنا رہے...... مگر اس کا کیا علاج' دیواسائی کے پھول تو میرے دامن کو چھو رہے تھے' بلکہ چھو چکے تھے۔ میرے قدموں میں لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔

اے خدا...... تو یہ ہے تیری خدائی! ایسی ہوتی ہے دنیا!!!؟

کس نے بیج بوئے یہاں؟ کون لایا تھا یہ بیج؟ کس نے بھرے ہیں رنگ ان میں؟ کاسنی' نیلے پیلے اودے' کالے سرخ گلابی اور سفید' کون گوڈی کرتا ہے ان کی؟ اور کون پیاس بجھاتا ہے ان کی؟ کس نے سجایا ہے اتنا عظیم گلدان اور کس نے رنگ چھڑک دیئے ہیں ان پہنائیوں میں؟؟؟

پانی کا سمندر دیکھا تھا۔

ریت کا سمندر دیکھا تھا

برف کا سمندر دیکھا تھا

مگر کبھی نہیں سنا تھا کہ پھولوں کا بھی سمندر ہوتا ہے۔

یہ پھولوں کا سمندر تھا......!

امثل ایک طرف چپ چاپ کھڑی تھی۔ اس کے بال سیاہ آبشار کی طرح ہوا میں اڑ رہے تھے۔ اس کی خوبصورت گردن پوری نظر آ رہی تھی...... کانوں کے پیچھے' بالوں کے نیچے' سیاہ نرم ملائم بالوں کے ریشمیں تاگوں نے سفید جلد میں ایسا حسین اور مربوط جال بن رکھا تھا کہ انسانی روح اس میں الجھ الجھ جاتی تھی۔

جس طرح چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر دس پندرہ میل لمبے اور دس بارہ میل چوڑے گلستان کے وجود کی بنیاد سمجھ میں نہیں آ رہی تھی' اسی طرح بالوں کے نیچے صانع فطرت کی گلکاری سمجھ میں نہیں آئی۔

اس کی خوبصورت کشیدہ گردن کی کشش دیکھ کر میں فیصلہ نہ کر پایا کہ اس منظر کو دیکھوں' جو پھر کبھی نہ دیکھ سکوں گا' یا اس گردن کو دیکھوں جس کی کشش مجھے اس منظر تک لے آئی ہے؟

اس لمحے میرے اندر اس حسین گردن کو چومنے کی زبردست خواہش پیدا ہوئی...... یہی وہ لمحہ تھا' جب میں آورشوں کے بوجھ سے آزاد ہوا چاہتا تھا' جب مجھے غار میں واپسی کی شدید خواہش نے پیس کر رکھ دیا۔ میں ایک ہی زقند میں دس ہزار سال پیچھے کی مسافت طے کرنا چاہتا تھا۔

آج میں اپنی فطرت کو پوری طرح پا گیا تھا اور دل ہی دل میں اس لڑکی سے متفق ہو گیا تھا' جو قدم قدم پر مجھے انسانی فطرت کی بوقلمونیوں سے آگاہ کرتی رہی تھی...... وہ لڑکی مجھ سے صرف دو قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی' لیکن ہمارے درمیان دس ہزار سال کی تہذیب کی دیوار حائل تھی۔

میں اندر ہی اندر اتنے زور سے چیخا کہ میری روح میں دراڑیں پڑ گئیں۔ کے ٹو اور راکاپوشی کی چوٹیوں نے میری چیخ سن لی ہو گی' لیکن مجھ سے دو قدم پر کھڑی لڑکی کو میری روح کی ٹوٹ پھوٹ کی خبر نہ ہوئی۔

تو یہ تھا میرا دکھ' جسے میں نے آج پا لیا تھا...... ڈاؤر کے پہاڑ پر بادشمال کے ٹھنڈے جھونکوں کو اور جھیل سیف الملوک کے دودھیا پہاڑوں کی طلسماتی ہواؤں کو محسوس کر کے میں نے یہ مفہوم پایا تھا کہ انسان کی زندگی میں چند لمحے ایسے بھی آتے ہیں کہ وہ ساتھی کے بغیر بھی مسرت سے ہمکنار ہو جاتا ہے' لیکن آج یہ مفہوم میری مٹھی سے کھسکا جا رہا تھا' کیونکہ خوشبوؤں سے مہکتے ہوئے سمندر میں غوطے لگانے کے باوجود میرا دامن خشک تھا...... میں اکیلا تھا۔ بالکل تنہا! مجھے ساتھی کی ضرورت تھی...... اور میں ایک بوسے کے لئے ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔

لیکن میرا ساتھی بے خبر تھا۔

میں ہٹ گیا۔ میں وہاں سے پیچھے ہٹ گیا۔ کیونکہ اب وہ لمحہ آنے والا تھا کہ اس گردن کی تپش کی تاب نہ لا کر پگھل جاتا!

میں ایک چٹان سے ٹیک لگا کر زار و قطار رو پڑا...... کسی کو کچھ خبر نہ تھی کہ کیسا رن پڑا اور کتنا کشت و خون ہوا۔ عالمگیر جنگیں ایک طرف اور انسان کے نفس کی جنگ دوسری طرف......

ملک ہار جائے تو کچھ نہیں ہارتا' آدمی مر جائے' کچھ نہیں مرتا' انسان کی امنگ مار دی جائے تو سب کچھ مر جاتا ہے!

مجھے سکردو میں بیٹھے ہوئے ڈاکٹر کی بات یاد آ گئی کہ دیوسائی میں آدمی کو ساتھیوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔

کتنا غلط تجربہ تھا ڈاکٹر کا......

وہ اپنی کوبلیا سی بیوی کے ساتھ دیوسائی آیا تھا۔ بیوی کے ہمدوش رہ کر وہ اس طرح کے نتیجے پر پہنچا تھا...... بیوی کو ساتھ رکھ کر امتحان دینے کے کیا معنی......! یہ تسلی کہ سب کچھ میرا ہے' کیونکر تسلی کہلا سکتی ہے؟

مجھے آج جس قدر تنہائی کا احساس ہوا کبھی نہ ہوا تھا۔ یہ خوف کہ جو کچھ ہے' شاید میرا نہیں ہے' انتہائی تکلیف دہ تھا۔

سب کچھ مل جانا' اور سب کچھ چھن جانا' ایک ہی کیفیت کے دو نام ہیں۔ جب دامن بھیگ گیا' میں اچھی طرح رو چکا تو ایسا محسوس ہوا کہ ٹھنڈے پانی سے غسل کر کے نکلا ہوں...... یہ آنسو جب بہنے پر آتے ہیں' تو ان کو بہہ جانا چاہیے۔ کیونکہ ان کے ساتھ بہت سے اندھیرے اور ناقابل برداشت قسم کی روشنیاں اور بے پناہ طاقتیں بھی بہہ جاتی ہیں...... تب آدمی معتدل اور ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے اور دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو کر یہ کہنے کے قابل ہو جاتا کہ میں زندگی کی قدروں کا علمبردار ہوں......! اور تہذیب کے سائے میں جی سکنے کی ہمت رکھتا ہوں!!

امل آگے بڑھ گئی تھی---- وہ گھٹنے گھٹنے پھولوں میں کافی دور نکل گئی تھی۔ اگر وہ حرکت کرتے ہوئے نہ ملتی' تو ایسا معلوم ہوتا' جیسے دہقان نے اپنے کھیت میں پرندوں کو اڑانے کے لئے ڈھارا کھڑا کر دیا ہے۔

ڈرائیور لپک کر میرے پاس آیا۔

"صاحب جی' بی بی جی کو واپس بلاؤ۔ پھولوں کے اندر سانپوں کے گھروندے ہیں!"

میں نے گھبرا کر اسے آواز دی۔

"امل...... واپس آ جاؤ۔ پھولوں کے اندر سانپوں کے گھروندے ہیں۔"

اس نے طوفانی قہقہہ لگاتے ہوئے ہماری طرف دیکھا۔

"وسیم صاحب...... سنا ہے سانپ کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔"

"نہیں نہیں امل' واپس آ جاؤ۔" میں چیخا۔

"وسیم صاحب---- آپ تو جانتے ہیں' میں موت سے نہیں ڈرتی' زندگی سے ڈرتی ہوں!"

"امل......!" میں اور زور سے چیخا۔

اس نے ایک اور زوردار قہقہہ لگایا۔

"وسیم صاحب---- یہ مرنے کے لئے بہت خوبصورت جگہ ہے۔ قسمت سے آ گئی ہوں' تو آپ مجھے واپس بلاتے ہیں؟"

"نہیں نہیں----!" میں اس کی طرف بھاگا اور ایک سانس میں اس کے پاس پہنچ گیا---- وہ ہنس رہی تھی۔

"واہ---- آپ تو سچ آ گئے!"

"امل----!" میں نے ہلکا سا احتجاج کیا۔

"تو چلئے واپس چلتے ہیں۔ آپ اتنے جذباتی کیوں ہو رہے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ کو اکیلا کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔"

"امل----!" میرے ہونٹ کپکپا گئے۔ میری آواز تھرا گئی۔

"ارے واہ----! سانپوں کے گھروندوں پر کھڑے ہو کر آپ کی یہ کیفیت ہو گئی---- ٹھیک ہے۔ میں اس لئے تو آپ کے ساتھ سفر کر رہی ہوں۔ آیئے چلتے ہیں۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا---- "آیئے نا---- میں نے بہت پہلے آپ کو پہچان لیا تھا اور آج آپ نے مجھے سانپوں سے بچا لیا۔ آپ چاہتے ہیں نا کہ میں زندہ رہوں' تو ٹھیک ہے۔ اس میں حرج بھی کیا ہے۔ آدمی زندہ رہے' تو دیواسائی پہنچ ہی جاتا ہے!!!"

یہ عجیب و غریب لڑکی......

سانپوں سے زیادہ خوبصورت' پھولوں سے زیادہ با "حسن" اور دیواسائی سے زیادہ پراسرار' کس طرح بچوں کی طرح بہلا رہی ہے مجھے......

کہاں تو بہلاوے کے لئے زندگی بھر کا انتظار گوارا تھا اور کہاں یہ کہ وہ مخلص میرے لئے کیوں بنے۔ اسے اپنے طور پر زندگی کا سامنا کرنا چاہیے...... مجھ پر رحم کھا کر میرے لئے بنے' تو یہ کونسا جینا ہوا؟

مجھے سوچوں میں ڈوبا ہوا پا کر بولی۔

"کیا ہو گیا آپ کو......؟ ابھی تو آپ کے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور اب آپ کو کسی اور دکھ نے گھیر لیا ہے؟"

میں نے نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"امل...... پہلے میری صرف اتنی خواہش تھی کہ آپ کی قربت ملے۔ کیونکہ اس وقت اتنے کی بھی توقع نہیں تھی---- یہ توقع پوری ہوئی' تو یہ امید بندھ گئی کہ آپ میری بن جائیں گی؟"

"میں کوشش تو کر رہی ہوں وسیم صاحب' آپ کی خاطر سانپوں کے گھروندوں سے باہر نکل آئی ہوں۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ جبھی تو شکایت کر رہا ہوں۔ آپ مجھ پر ترس کھاتی ہیں۔ خدا بن کر

رحم کرتی ہیں۔ بھیک دیتی ہیں۔ بھلا یہ کونسی کوشش ہوئی۔ آپ میری وجہ سے زندگی کو نہ پہچانیں۔ زندگی کی وجہ سے مجھے پہچانیں۔

"ہاں...... یہ بات تو ہے۔ یہ بات تو ہے۔" وہ ہولے ہولے بولی۔

"اگر آپ کو اس کا احساس ہے' تو پھر یہ بات ضرور ہوگی...... ہاں تو پھر کیا کیا جائے وسیم صاحب' کیا کیا جائے؟"

"کچھ دیر پہلے میں آپ کے بوسے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا۔ میرے سینے میں بہت توڑ پھوڑ ہوئی تھی۔ میں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے والا تھا کہ آپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بہلاتے ہوئے سانپوں کے گھروندوں سے باہر لے آئیں۔ میں آپ کو بہکانے گیا تھا۔ وہ کچھ اور جذبہ تھا۔ آپ مجھے بہلانے کے لئے جینا چاہتی ہیں...... بس اس فاصلے کو میرا دل نہیں مانتا!"

امثل چپ ہو گئی...... کچھ سوچتے ہوئے اور ہونٹ چباتے ہوئے ایک چٹان پر بیٹھ گئی۔ میں نے جیپ سے تھرماس لا کر سب کو چائے دی۔ ڈرائیور اور اس کے ساتھی آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا۔

"یہ پھول تیرہ ہزار سے سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر زندہ رہتا ہے۔ سکردو میں' جو سطح سمندر سے آٹھ نو ہزار فٹ کی بلندی پر ہے' یہ پھول نہیں پنپ سکا اور یہ کہ اس کی عمر صرف تین ماہ ہے۔ مئی میں برف پگھلنی شروع ہوتی ہے' تو برف کے نیچے دبا ہوا پودا پھوٹنے لگتا ہے۔ جون تک اس میں پھول نکل آتے ہیں اور پھر جولائی اگست تک ان پر جوبن رہتا ہے۔ ستمبر اکتوبر میں پھر برف باری کا آغاز ہوتا ہے' تو یہ سارا میدان برف سے ڈھک جاتا ہے اور پھول برف کے نیچے دب کر سڑ جاتے ہیں۔"

امثل چائے پی رہی تھی' اور ان نوجوان لڑکوں کی باتیں غور سے سن رہی تھی...... بادِ شمال لہر در لہر آ رہی تھی اور پھولوں کے سمندر کو چومتی ہوئی' لہریں بناتی ہوئی' نانگا پربت کی طرف بڑھ رہی تھی۔ امثل کے بال حسب معمول اڑ رہے تھے اور اس کی

خوبصورت گردن اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ اس کے گول حسین شانوں کے درمیان ایستادہ تھی۔

لیکن ابھی ابھی جس نئے احساس نے مجھے ڈسا تھا...... وہ پیار جو مجھے بھیک کے ٹکڑوں کی طرح ملے' میری انا کو قبول نہیں تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انا اور بوسے کی جنگ نے ایک نئی کیفیت کو جنم دیا تھا۔ یہ کیفیت بیک وقت فکر انگیز تھی' لذت بخش بھی' اور اذیت بخش بھی......!

میں امثل کو کسی اور وسیلے سے نہیں' اپنی شخصیت کے زور سے زیر کرنا چاہتا تھا۔ شاید میری خواہش یہ تھی کہ وہ میری طرف بڑھے' تو اس کے قدموں میں وہی والہانہ پن ہو' وہی وارفتگی ہو جو انسانی جبلت کا خاصہ ہے...... جس طرح میں تڑپتا ہوں' وہی تڑپ اس میں بھی پیدا ہو...... میں اب اس تقدس کا بھی قائل نہ رہا تھا' جو اس بے چین روح کی معاونت میں موقع بموقع ودیعت ہوتا رہا تھا۔ تقدس اور تکلف کی بجائے مجھے فطری بے ساختگی جکڑتی چلی جا رہی تھی اور محسوس ہو رہا تھا کہ غیر فطری تقدس میری روح کو جیتے جی فنا کر دے گا۔

چائے پی کر وہ کپ سے کھیلتی ہوئی میرے پاس آ گئی اور سادہ لہجے میں بولی۔

"آپ کی باتوں سے میری توجہ اس خوبصورت منظر سے ہٹ گئی ہے' لیکن اگر میرے رویے میں خود رفتگی نہیں ہے' تو اس میں میرا کیا قصور۔ میں ارادتاً آپ کو پریشان نہیں کرتی...... آپ کو پسند کرتی ہوں۔ کئی بار اس کا اقرار کر چکی ہوں' لیکن نہ جانے میرے سلوک میں کونسا احساس ہے' جسے پا کر آپ مجھے اجنبی محسوس کرتے ہیں...... ٹھیک ہے۔ میں وزیر خاں کی بیوی جیسی نہیں ہوں' اور نہ اس بلتستانی لڑکی کی طرح لوک گیتوں کو جنم دینے والی' لیکن ہوں تو آپ کی دوست! میں بھروسے کی لڑکی ہوں وسیم صاحب!!"

میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ میں اسے کیا کہتا۔ کیوں کہ جو کچھ وہ کہہ رہی تھی' سچ کہہ رہی تھی۔ یہی اس کا کردار تھا۔ اس کی فطرت لکڑی کی طرح نہیں تھی کہ تیشے سے تراش

لی جاتی۔

وہ اس بھری دنیا میں مجھے دوست کہہ رہی تھی۔

مجھے خاموش پا کر اس نے دوبارہ بات کا آغاز کیا۔

"تنہائی تو صرف خدا کو زیب دیتی ہے وسیم صاحب۔ کہ مختار کل ہے اور کسی بھی شکل میں رہنے پر قادر ہے۔ ہم جو اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہیں' تو یہ ہماری طاقت نہیں' بلکہ اس کا احساس ہوتے ہی ہمارے دکھوں کی کہانی شروع ہو جاتی ہے۔ میں یا کوئی دوسرا اپنی مرضی اور خوشی سے تنہائی کے غار کی طرف نہیں بڑھتا' بلکہ دوسرے انسانوں کا برتاؤ ہمارے اندر ردعمل پیدا کرتا ہے اور یوں ہماری بدنصیبی کا آغاز ہوتا ہے۔ اگر دنیا میں آپ جیسے' ڈاکٹر جیسے' سلطانہ جیسے' وزیر خان کے سارے کنبے جیسے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہے' تو زندگی سے تلخی کا نام و نشان مٹ جائے اور کیا نہیں' انسان کے ساتھ تو جنس جیسی ضرورت لگی ہوئی ہے۔ فطرت نے اسے ایک ہمسفر' ایک ہم نشین کے احتیاج سے وابستہ کر دیا ہے...... تب یہ تو واضح ہے کہ آپ کی دوستی میرے لئے سطحی نہیں ہو سکتی۔ ہاں...... اس میں شدت کتنی ہے' اس کا اندازہ تو ابھی مجھے خود بھی نہیں ہے۔"

میں اس کی باتیں ہمیشہ کی طرح نہایت غور سے سن رہا تھا۔ یہ سچ کہنے والی لڑکی ایک بار پھر مجھے مقدر کی راہ پر ڈال رہی تھی...... میں طاقت یا عیاری سے اس کے دل میں نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ میں صرف اتنا کر سکتا تھا کہ پیار کی اس ننھی سی کونپل کی' جو اس کے سینے میں پھوٹ چکی تھی' صبر' تحمل اور استقامت سے آبیاری کرتا رہوں...... یہ جرعہ جرعہ' قطرہ قطرہ سچائی خود...... اس کونپل کو ایک دن شجر بنا دے گی۔

"اچھا...... اگر یہ رجعت پسندی ہے تو رجعت پسندی سہی......!" میں نے سوچا۔ میں اس کے سوا کر بھی کیا سکتا ہوں...... وہ نظروں سے اوجھل ہو جائے' یہ بھی تو برداشت نہ ہوگا۔"

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟" اس نے اچانک پوچھا۔

میں نے مسکرا کر کہا۔

"سوچ رہا ہوں' آپ کتنی لطیف اور نازک ہیں' مگر آپ کے سینے میں کتنا سخت دل ہے!"

اس نے ہنس کر کہا۔

"آپ کتنے گرانڈیل اور مضبوط ہیں' مگر آپ کے سینے میں کتنا نرم دل ہے!"

"یہ سب کچھ الٹ کیوں ہے......؟" میں نے پوچھا۔ "دریا بھی الٹے نہیں بہتے۔ سورج بھی مغرب سے نہیں نکلتا۔ سب کام طبعی نظام کے مطابق چلتے ہیں' پھر یہ انسانوں کے دل ایک جیسے کیوں نہیں ہوتے؟"

"جس دن انسانوں کے دل اور روحیں ایک ہو جائیں گی وسیم صاحب' وہ اس کائنات کا آخری دن ہوگا!"

"تو کیا سارے پیغمبر' اوتار اور دانشور کائنات کے آخری دن کے لئے تگ و دو کرتے رہے ہیں۔"

"شاید......! کیونکہ غالباً وہ جانتے ہوں گے کہ جب روئے زمین کے سارے انسانوں کی روح ایک ہو جائے گی' ایک کے معنی واحد کے ہیں اور واحد صرف خدا کا روپ ہوتا ہے۔ گویا ہم خدا کے روپ میں ضم ہو جائیں گے!!"

"کیا آپ چاہتی ہیں کہ وہ آخری دن آ جائے؟"

"میں کیوں نہیں چاہتی۔ کون نہیں چاہے گا کہ خدا کے روپ میں ضم ہو جائے' لیکن ایسا ہوگا نہیں۔ میرا دل کہتا ہے' ایسا نہیں ہوگا۔ آخر خدا یہ کیوں چاہے گا کہ کائنات ختم ہو جائے؟"

"اگر خدا نہیں چاہتا کہ کائنات ختم ہو تو بنجاروں کے گیت کا فائدہ؟"

"یہی تو کہتی ہوں کہ جو دو چار دن جینا ہے جی لو۔ لیکن جب احساس ہو جائے کہ جینے کا مقصد کیا ہے' تو پھر مقصد ڈھونڈ نکالو۔ ورنہ زمین پر بوجھ بننے کا کیا فائدہ......؟"

"مگر اس طرح تو ہر آدمی اپنی سمجھ کے مطابق مقصد ڈھونڈے گا؟"

وہ ہنسنے لگی۔

"یہی تو……! ہندو کا اپنا مقصد' یہودی کا اپنا مقصد' کافر کا اپنا اور مومن کا اپنا---- لینن کا آدمی ہو تو اس کا سب سے الگ مقصد' بو سٹرناک اور سولژے نٹسن جیسے تو صدی میں ایک دو ہی پیدا ہوتے ہیں۔ جو سچ کے بدلے خاک ہو جاتے ہیں۔"

ڈرائیور اور اس کے ساتھی ہماری باتیں سن کر مسکرا رہے تھے۔ ہماری گفتگو کا مافی الضمیر سمجھنے سے وہ قاصر تھے اور نہ ان باتوں کا مفہوم پانے کے لئے بے تاب تھے۔

اچانک سیٹیاں بجنے لگیں' تو وہ تینوں خوفزدہ ہو کر کھڑے ہو گئے۔ ہم نے بھی حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ ڈرائیور بولا۔

"صاحب یہ سانپوں کی آوازیں ہیں!؟"

ان تینوں کی طرح میں بھی خوفزدہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ میں نے بھی اس طرح کی سیٹیوں کی آوازیں پہلی بار سنی تھیں' مگر امل ذرا بھی پریشان نہ ہوئی۔ ہنس کر بولی۔

"جانے بھی دیجئے ڈرائیور صاحب' جہاں خدا کا روپ نظر آتا ہے' وہاں سانپوں کا کیا ٹھکانہ۔"

"نہیں بی بی جی' ان سے پوچھئے۔" اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ یہیں کے رہنے والے لوگ ہیں۔ ان آوازوں کو پہچانتے ہیں۔"

"تو بجانے دیجئے سیٹیاں' ملانے دیجئے سر' اگر ہم لوگ لوک گیتوں کو جنم دیتے ہیں' تو ان کی سیٹیوں پر کیسے پابندیاں عائد کر سکتے ہیں۔"

ڈرائیور اور اس کے ساتھی امل کی بات کو نہ سمجھ سکے۔ وہ اسی طرح خوفزدہ تھے۔

میں نے کہا۔

"یہ لوگ آپ کی باتوں کو نہیں سمجھیں گے۔"

"تو ان سے کہیے۔ سانپ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ دنیا کا ہر سانپ جانتا ہے کہ انسان

کا ذہن ان کے زہر سے زیادہ طاقت ور ہے۔"

میرے بجائے ڈرائیور آگے بڑھا۔

"بی بی جی---- اگر آپ یہاں سے نہیں جائیں گی' تو یہ میرے آدمی بھاگ جائیں گے۔"

"اچھا……" وہ ہنس پڑی۔ "تو آپ لوگ نہیں مانیں گے۔ نہیں سنیں گے۔ نغمے سننے دیں گے۔ تو چلو چلتے ہیں۔ موت سے بھاگنے کا کھیل بھی کتنا دلکش ہوتا ہے!"

ڈرائیور نے جلدی سے جیپ سٹارٹ کر دی۔

ہم نے پھر پاتال کی طرف سفر شروع کر دیا تھا۔ کتنی بلندیوں سے نیچے اتر رہے تھے۔ اونچی بلڈنگ کی چھت سے نیچے دیکھتے ہوئے بھی آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔ انسان دراصل پستیوں ہی میں خوش رہتا ہے۔ کیونکہ وہاں گرنے کا احتمال نہیں ہوتا۔ امل بولی۔

"اگر ان لوگوں کی بات مان لی جائے کہ پھولوں میں سانپ رہتے ہیں' تو کوئی حرج بھی نہیں' کیونکہ گندی نالی کے کیڑے کو مہک سے کیا واسطہ' لیکن مجھے ایک بات بار بار ستاتی ہے کہ زمین کی تاریکیوں میں رہنے والا سانپ' زمین کی رفعتوں تک کیسے پہنچ گیا۔ یہ ایسا ہی ان نیچرل ہے' جیسے ہم خود دیوداسائی میں گھر بسالیں!"

اس کی تمام باتوں کی طرح یہ بات بھی تازہ اور خود اس کی اپنی تھی۔

"وسیم صاحب۔" اس نے بات جاری رکھی۔ "اس کا مطلب ہوا' وہ تین مہینے پھولوں کے ساتھ زندہ رہتے ہیں اور نو مہینے کے لئے برف میں دفن ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی غیر فطری بات ہے۔ سانپوں کی دمیں' پھولوں کی جڑوں کی طرح زمین میں دفن نہیں' کہ وہ موت کے سائے دیکھ کر بھاگ بھی نہ سکیں۔ ہاں ٹھیک ہے۔ یہ لوگ پھولوں سے نکلے ہوئے راگوں کو سانپوں کی سیٹیاں کہتے ہیں!"

ہاں…… یہ امل ہی تھی' جو ذہن کے سارے وسوسے ختم کر دیتی تھی اور نئی نئی راہیں سجھاتی تھی۔ ہر لمحہ اور ہر قدم پر ایک نیا پھول چٹکتا تھا اور زندگی کو نئی مہک سے آشنا

کر دیتا تھا۔

اب ہم خاصے نیچے آ گئے تھے...... پھولوں کی جھیل ہمارے سروں پر تیر رہی تھی، مگر اسے دیکھ نہیں سکتے تھے اور وہ سیٹیاں بھی سنائی نہیں دیتی تھیں جنہیں امل نے پھولوں سے نکلتے ہوئے راگ کہا تھا۔ نیچے اترتے ہوئے وہ خاموش ہو گئی تھی، مگر معاً سر اٹھا کر بولی۔

"ہم پستی کی طرف جا رہے ہیں۔ انسان آخر اپنے اصل کی طرف لوٹ جاتا ہے۔"

میں نے اس کی تائید کی، لیکن ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

"پانی بھی تو پستی میں جا کر مرتا ہے۔"

"ہاں...... مگر اس کا سفر طبعی ہوتا ہے۔ ہمارا سفر شعوری ہوتا ہے۔ البتہ ہماری واپسی غیر شعوری ہوتی ہے۔"

"لیکن امل، شعوری سفر یا شعور کے ساتھ جینا ایک طرح سے ہمارا مقدر ہے۔"

"ہاں...... یہی ہمارا المیہ ہے۔"

میں دیکھ رہا تھا۔ امل ایک بار پھر ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی...... وہ کل والی اور پرسوں والی امل نہ رہی تھی...... وہ جو شعور اور جذبے کے امتزاج پر راضی ہو گئی تھی، ایک بار پھر شعور کو رد کر رہی تھی۔

جب ہم اس موڑ پر آئے، جہاں بلتستانی لڑکی کا گیت سنا تھا، تو امل نے جیپ رکوالی، لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ بھیڑیں بہت دور...... نیچے ایک پگڈنڈی سے اتر رہی تھیں۔ ان کے پیچھے بھوری چٹانوں میں بلتستانی لڑکی کا سیاہ سایہ رینگ رہا تھا......

امل کھوئی ہوئی بیٹھی تھی اور سیاہ سائے کو رینگتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ میں نے موقع غنیمت جان کر کہا۔

"یہ لڑکی جو اس وقت گھر کو لوٹ رہی ہے، کل پھر اوپر آئے گی۔ اس امید کے ساتھ کہ کسی چٹان پر بیٹھ کر کسی نئے گیت کو جنم دے سکے۔"

"ہاں...... اسے آنا ہی ہو گا۔ متانت کی طرح رومانویت بھی انسان کے لئے ضروری ہے۔ یہ خون ہے، جو ہمیشہ سچ بولتا ہے اور ہم ہمیشہ اس سچ کو روندتے چلے آئے ہیں۔"

جیپ پھر چل پڑی۔ میں نے اس سے کہا۔

"آپ نے تو پودے کو رد کیا تھا، اور اب اسے ضروری بھی سمجھتی ہیں۔ کونسی بات سچ ہے؟"

"سچ......!" وہ جیسے اپنے آپ سے بولی۔ "سچ تو کہیں نہیں ہوتا اور جھوٹ بھی کہیں نہیں ہوتا۔ یہ ہمارا اپنا نقطہ نظر ہے کہ لفظوں کے معنی مل گئے ہیں۔ کسی کا گلا گھونٹ دو یہ قتل ہے۔ کسی کی انا کا گلا گھونٹ دو یہ بھی قتل ہے، لیکن ہمارے ہاں صرف پہلا جرم سنگین سمجھا گیا ہے۔ دراصل یہ نقطہ نگاہ کا فرق ہے، جس نے سچ اور جھوٹ کی الگ الگ شکلیں متعین کر لی ہیں۔ اگر میرا بس چلتا، تو میں انسانی قتل کے مقابلے میں انا کے قتل کو بڑا جرم قرار دیتی۔ تب سچ کی یہی شکل حقیقی ہوتی۔ یہی حال رومان کا ہے۔ بعض لوگ رومان کی خاطر مر جاتے ہیں۔ یہی ان کا سچ ہوتا ہے۔ بعض لوگ اسے مضحکہ خیز قرار دیتے ہیں۔ یہ ان کے نزدیک سچ ہے۔ بعض لوگ زندگی کے ہر رویے کو محض معاشی نقطہ نگاہ سے ماپتے ہیں۔ یہ ان کا سچ ہوتا ہے۔ اس زمین پر اتنے سچ بکھرے پڑے ہیں کہ اصل سچ ہاتھ ہی نہیں آتا، مگر اس کے باوجود میں سچ کو ضرور مانتی ہوں، جو ہمارے لہو میں بستا ہے، لیکن جسے ہم نے جانکنی میں مبتلا کر رکھا ہے۔"

"پھر تو میں بھی ایک سچ کا دعویٰ کر سکتا ہوں کہ اپنے لہو کے اشارے پر آپ کا ہمسفر ہو گیا ہوں۔"

وہ ہنس پڑی۔

"میں نے آپ کو کب جھٹلایا ہے۔ میں تو خود آپ کی ہمسفر بن گئی ہوں۔"

میں نے اس کی گول گول آنکھوں میں جھانکا...... وہاں بھی ہنسی کا پرتو موجود تھا۔ وہی رویہ جو بادشاہ اپنے جانثاروں سے روا رکھتے ہوں گے۔

شام ہونے سے پہلے ہم سکردو پہنچ گئے۔

ڈاکٹر آپریشنز سے فارغ ہو چکا تھا' اس لئے سلطانہ اور وہ دونوں ہمارے استقبال کے لئے موجود تھے۔ چائے کے لئے بیٹھے' تو ڈاکٹر نے کہا۔

"دیواسائی کیسی لگی؟"

امثل نے جواب دیا۔

"انسان نے ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی سر کرلی۔ چاند تک بھی پہنچ گیا کہ ناموری کی تاریخ مرتب ہوتی تھی' لیکن نہ آیا' تو دیواسائی' کہ خدا کا روپ دیکھتا۔"

ڈاکٹر ہنسنے لگا۔

"بالکل یہی بات میں نے سلطانہ سے کہی تھی۔ ہم کتنے بدقسمت ہیں۔ دنیا کو اس عجوبے کی خبر تک نہ پہنچا سکے۔ خود اپنے ملک میں اس کے متعلق کون جانتا ہے۔"

شام کے کھانے پر ڈاکٹر نے ہمیں مار خور کا گوشت کھلایا جو ان کا کوئی مداح شکار کر کے لایا تھا۔۔۔۔ مار خور وہ سینگے کے قدیمت کا جانور ہوتا ہے' جو گلگت اور سکردو کے علاقے میں عام پایا جاتا ہے اور جس کے متعلق روایت ہے کہ وہ سانپ بھی کھا جاتا ہے۔ اس لئے اس کا نام مار خور پڑ گیا ہے۔ گوشت نہایت نرم خستہ اور لذیذ تھا۔ سلطانہ نے اسے مختلف ذائقے دے دیئے تھے۔ کچھ انگاروں پر بھون لیا تھا۔ کچھ کے شاہی کباب اور باقی کا سالن تیار کیا تھا۔

امثل جو مزے لے لے کر کھا رہی تھی' بولی۔

"اس کوبلیا کے ہاتھوں میں کتنا نمک ہے۔ یہ لڑکی نہیں' فطرت کا عطیہ ہے' جو ڈاکٹر کے حصے میں آیا ہے' لیکن کیا یہ بے انصافی نہیں ہے کہ ایسے گنوں کی عورت ہر مرد کے حصے میں نہیں آتی؟"

ڈاکٹر ہنس رہا تھا۔ سلطانہ بہت خوش تھی' مگر اس نے احتجاج بھی کیا۔

"امثل جی۔۔۔۔۔!"

"میں سچ کہتی ہوں سلطانہ' آپ جیسی ایک عورت میں نے سوات میں بھی دیکھی تھی۔ بس اس میں اضافی خوبی یہ تھی کہ خوبصورت بہت تھی۔"

ڈاکٹر بولا۔

"کیا میری کوبلیا کسی سے کم خوبصورت ہے؟"

"ڈاکٹر صاحب۔۔۔۔۔ سلطانہ کا اپنا الگ حسن ہے' لیکن کم بخت وزیر خان کی بیوی تو چیز ہی دوسری ہے۔ فاختہ ہے فاختہ' امن کی فاختہ' زندگی کی علامت ہے وہ!"

"آپ خود کچھ کم ہیں کیا۔" سلطانہ بولی۔ "میں مرد ہوتی تو اپنے کالے رنگ کے باوجود آپ کو اپنانے کی خواہش میری آخری خواہش ہوتی۔"

"زہے نصیب۔۔۔۔۔!" امثل ہنسنے لگی۔ میں اور ڈاکٹر بھی ہنس رہے تھے۔ رات دس بجے تک سلطانہ اور ڈاکٹر سے باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد ہم دونوں ریسٹ ہاؤس آ گئے۔

چاندنی نے پوری وادی کو پر نور بنا رکھا تھا۔ ست پارہ جھیل سے آنے والی ندی چاندی کی طرح چمک رہی تھی۔ یہاں پانی پھیل گیا تھا اور ہاتھوں کی انگلیوں کی طرح الگ الگ حصوں میں بہہ رہا تھا' جیسے ریل کی پٹڑیاں ایک دوسرے کو کراس کر کے الگ ہو جاتی ہیں۔ سکردو کی لائٹیں پانی میں جگمگ کر رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی آبی ٹرین کا اسٹیشن ہو اور ٹرین کی آمد آمد ہو۔

امثل برآمدے کے ستون سے ٹیک لگا کر اس منظر میں کھو گئی تھی۔

سکردو کا قصبہ جو اونچے ٹیلوں پر پھیلا ہوا تھا صاف نظر آ رہا تھا۔ سکردو کے راجہ کا مٹی کا پرانا محل بھی ہمارے سامنے تھا اور وہ نہر بھی' جس کے ذریعے جھیل ست پارہ کا پانی سامنے والے پہاڑی قلعے تک پہنچایا گیا تھا۔ اس نہر میں بیس بیس اور تیس تیس من کا ایک ایک پتھر لگا ہوا تھا۔ حیرت ہوتی تھی کہ اس زمانے میں جبکہ بار برداری کے ذرائع بھی محدود تھے' ہزاروں کی تعداد میں بڑی بڑی چٹانیں کس طرح پہنچائی گئی تھیں اور پھر کس

طرح ان چٹانوں کو ایک دوسرے پر جما کر رکھ دیا گیا تھا؟

ندی کے اس پار خوشبودار درختوں کے جھنڈ سے خوشبوؤں کی لپٹیں آ رہی تھیں۔ شہر کے آدمیوں کے لئے قدرت کا یہ عطیہ ایک انوکھا مشاہدہ تھا۔ شاید ہم زندگی میں پہلی بار چاند رات کے جادو سے آشنا ہوئے تھے۔ نور اور نکہتوں کی ایسی وسیع اور طوفانی چادر بھی پہلی بار دیکھ رہے تھے۔

ہم اس منظر کا ایک حصہ تھے' جسے ہم مکمل قلبی واردات کے ساتھ محسوس کر رہے تھے...... ہم اس دھرتی پر کھڑے تھے' جہاں سے بہت کم فاصلے پر سکردو کا راجہ اور اس کے گھر والے محو خواب تھے۔

اب یہاں کے راجہ کا بھی حکومت کے وظیفے پر گزارہ تھا' مگر کبھی تو اس کے آباؤ اجداد یہاں کے مطلق العنان مہاراجے تھے' جنہوں نے یہ نہر' محل اور قلعے تعمیر کئے تھے اور عوام کے پٹھوں پر بوجھ لادتے رہے تھے اور ان کی گردنیں کٹواتے رہے تھے۔

میں سوچ رہا تھا...... فطرت کی رعنائیاں باقی رہ جاتی ہیں۔ انسان مٹی ہو جاتا ہے۔ ختم ہو جاتا ہے۔ وہ جو خود کو ان سب رعنائیوں کا مالک کہلانا چاہتا ہے' مالک بننے کے باوجود زیر زمین چلا جاتا ہے اور اس کا احساس ملکیت ان فطری رعنائیوں کو ذرا بھی گزند نہیں پہنچاتا۔

پھر نئی نسل آتی ہے' تگ و دو کرتی ہے' ان چیزوں کے لئے جو ٹھوس ہیں' جو موجود رہتی ہیں' جو کروڑوں سال سے موجود ہیں' مگر ایک فانی انسان ان غیر فانی چیزوں کی ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے۔

عجیب ہے کہ مالک ختم ہو جاتا ہے' مگر ملکیت کا کچھ بھی نہیں بگڑتا! لیکن انسان ہے کہ دعویٰ ملکیت سے باز نہیں آتا!

اور نہ یہ مسئلہ اس کی سمجھ میں آتا ہے کہ زندگی اتنی مختصر ہے کہ دعویٰ ملکیت ثابت ہونے سے پہلے ختم ہو جاتی ہے!

اس لمحے مجھے یہ بھی خیال آیا کہ اشتراکیت اس لحاظ سے کتنی اچھی ہے کہ احساس ملکیت کے عذاب سے انسان کو آزاد کر دیتی ہے۔ کاش' روٹی کے ساتھ انسان کی انا اور خودی کا بھی اسے پاس ہوتا...... کارل مارکس یہ مسئلہ بھی طے کر جاتا تو فرد کی بے ساختگی مجروح نہ ہوتی......

دنیا کے ہر نظام میں کوئی نہ کوئی خامی موجود ہے۔ جس طرح انسان نامکمل ہے' اسی طرح ہر نظام کسی نہ کسی پہلو سے نامکمل ہے!

اسل جو کافی دیر تک ستون سے ٹیک لگائے خاموش کھڑی تھی' مجھ سے کچھ کہے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی...... میں اس کے چپ چاپ کھڑے رہنے اور پھر خاموشی سے چلے جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اسے کیا معنی پہناؤں۔ یہ کہ وہ میرے متعلق سوچ رہی تھی' یا اپنی تنہائی کے عذاب میں مبتلا تھی؟ یا چاندنی کے مد و جزر میں غوطے کھا رہی تھی؟

میں کافی دیر تک ریسٹ ہاؤس کے لان میں ٹہلتا رہا۔ بے مقصد' پراگندہ ذہن' چاندنی رات کی خوبصورتی کا اثر بھی اب کم ہوتا جا رہا تھا۔ کیونکہ ایک حسین وجود کا احساس اس چاندنی سے رس کر اندھیرے میں جذب ہو گیا تھا۔ اچانک اسل کا دروازہ بند ہونے کی آواز نے مجھے چونکا دیا...... میرا دل زور سے دھڑکا...... اسل کو تو سونا ہی تھا' مگر جانے کیوں میں نے اس لمحے تضحیک محسوس کی۔

رات کو دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ اس رات میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ آدمی جس قدر زیادہ توقعات باندھتا ہے' اتنا ہی زیادہ دکھی بھی ہوتا ہے' کیونکہ انسان کی ہر توقع پوری نہیں ہوتی۔

بلکہ شاذ و نادر ہی کوئی توقع پوری ہوتی ہے اور کبھی تو کوئی توقع بھی پوری نہیں ہوتی!

آج کی رات' پچھلی رات سے زیادہ سرد اور مختلف تھی!!

صبح خوش قسمتی سے جہاز آ گیا تھا اور ہمیں آسانی سے سیٹیں مل گئی تھیں' حالانکہ

سکردو کی فلائیٹ موسم کی وجہ سے عموماً غیر یقینی سمجھی جاتی ہے اور کبھی کبھی ہفتہ دس دن تک جہاز نہیں آتا۔

ڈاکٹر اور سلطانہ ہمیں ایئرپورٹ تک چھوڑنے آئے۔ کراچی کا یہ جوڑا، جس سے صرف دو دن کی ملاقات تھی، ہمارے دلوں میں اتر گیا تھا۔ میں اور ڈاکٹر گلے ملے۔ سلطانہ اور امثل نے بھی ایک دوسرے کو پیار کیا۔

پھر ہم بھرے دلوں اور نم آنکھوں سے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ آدھ پون گھنٹہ میں ہم گلگت پہنچ گئے۔

پی آئی اے کی ویگن کے ذریعے ہم ریسٹ ہاؤس پہنچے۔ عاطف لان میں فوجی افسروں کے ساتھ بیٹھا خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ اچانک ہمیں دیکھا تو لپک کر آیا۔ امثل کو گلے لگایا۔ مجھ سے بھی ہاتھ ملایا۔ وہ بہت خوش تھا۔ فوجی افسروں اور ان کی بیگمات سے تعارف کے بعد ہم بھی وہیں بیٹھ گئے۔ چائے آگئی، تو ایک صاحب نے کہا۔

"اگر آپ نلتر نہیں گئے، تو ضرور جائیں، ورنہ آپ کا دورہ نامکمل رہے گا۔"

"ہم وہاں ضرور جائیں گے۔" امثل نے جواب دیا۔ "ہم کوشش کریں گے کہ دورہ نامکمل نہ رہے۔"

عاطف نے پوچھا۔

"نلتر جانے کے لئے غالباً کوئی دریا بھی سڑک کے ساتھ ساتھ بہہ رہا ہوگا؟"

"ہاں......" فوجی افسر نے جواب دیا...... "بیس پچیس میل تک دریائے ہنزہ اور سڑک ہمرکاب رہتے ہیں۔ اس کے بعد سڑک بائیں ہاتھ مڑ جاتی ہے اور مسلسل دس بارہ میل چڑھائی ہے۔"

عاطف خاموش ہو گیا۔ فوجی افسر بولا۔

"لیکن جو لوگ سکردو تک سڑک سے جا چکے ہوں، ان کے لئے نلتر کا سفر بہت معمولی ہے۔"

"مسئلہ ان کا نہیں میرا ہے۔" عاطف بولا۔ "ان دریاؤں سے میری جان جاتی ہے۔"

امثل ہنس پڑی۔

"آپ فکر نہ کریں بھائی جان، ہم آپ کو ایسی خوبصورت کمپنی سے الگ نہیں کریں گے۔"

دونوں خواتین مسکرائیں، کرنل خلیل اور میجر رفیق ہنسنے لگے۔ امثل نے بات آگے بڑھائی۔

"برا نہ مانیے گا، میجر صاحب اور کرنل صاحب، ہمارے ملک میں دو طبقے بہت خوش نصیب ہیں۔ ایک فوجی افسر، دوسرا سی ایس پی طبقہ، ان کو بیویاں ہمیشہ خوبصورت مل جاتی ہیں۔"

کرنل خلیل نے ہنستے ہوئے صفائی پیش کی۔

"میری بیوی تو میری کزن بھی ہیں۔"

"خیر یہ تو اتفاق ہوا کہ آپ کی فیملی خوبصورت لوگوں پر مشتمل ہے، مگر میجر صاحب ایسا نہیں کہہ سکتے کہ ان کی شادی لو میرج ہے۔ کیوں مسز رفیق آپ ہی سچ بتا دیں؟"

سانولی سلونی مسز رفیق جو تین بچوں کی ماں تھیں، ہنستے ہوئے بولیں۔

"آپ نے تو امتحان کا پرچہ سامنے رکھ دیا ہے۔ بہتر ہوگا، میجر صاحب ہی اس کا جواب دیں، کیونکہ یہ اکثر امتحان دیتے رہتے ہیں۔"

میجر رفیق ہنس رہا تھا۔

"خاتون، آپ نے تو مجھے احساس کمتری میں مبتلا کر دیا ہے۔ اب کم از کم ایک ہفتہ میں اپنی بیوی کا سامنا نہیں کر سکوں گا!"

سب ہنس پڑے۔ کرنل بولا۔

"لیکن بنیادی طور پر آپ کی بات صحیح ہے۔ کمیشن ملنے کے بعد ایک سے ایک اچھا رشتہ مل جاتا ہے۔"

"مگر میں اس بات کو نہیں مانتی کہ اقتصادی خوشی' روحانی خوشی کا بدل ہو سکتی ہے۔ کم از کم میں تو کسی ایسے شخص کا دم ہرگز نہیں بھر سکتی' جسے میری روح اور دل قبول نہ کرے۔ چاہے اگلے دن اس کی رسم تاج پوشی کیوں نہ ہو رہی ہو!"

"امثی......!" عاطف نے اسے ٹوکا۔

"نہیں عاطف صاحب' انہیں بات کرنے دیں۔" میجر رفیق بولا۔ "میں ان سے صرف یہ پوچھوں گا کہ ہم جو قدرت کی ستم ظریفی سے گلفام نہ ہوئے' تو کیا گلفاموں کی خواہش بھی نہ کرتے؟"

"میرے ابا نے بھی آپ جیسی خواہش کو پورا کرنے کے لئے میری ماں سے شادی کی تھی اور انجام کار مجھ جیسی بے چین روح کو جنم دیا تھا۔ ماں کی ناخوشی اور باپ کی خوشی کی سزا مجھے کیوں دی گئی؟"

میجر رفیق کے پاؤں ایک لمحے کے لئے اکھڑ گئے' مگر امثل نے اس کی طرف دھیان نہ دیا۔ حسب عادت بولی۔

"وہ اولاد' جو قلبی واردات کی بجائے مادی حادثے کی پیداوار ہو' اچھے سماج کی ضامن کس طرح بن سکتی ہے۔ اگر جذبہ اور احساس کوئی چیز ہے' تو سمجھئے کہ وہاں انسان بھی ہوگا' ورنہ تو پھر جنگل کا قانون کیا برا ہے؟"

دونوں عورتوں اور دونوں افسروں نے امثل کے وجود کو پہلی بار محسوس کیا۔ شاید عاطف نے انہیں نہیں بتایا تھا کہ اس کی بہن کس مٹی کی بنی ہے۔

میں فوجی افسروں کے چہرے دیکھ کر ہنس پڑا۔ عاطف بھی ہنس کر بولا۔

"ہر پڑاؤ کے بعد ایک نیا سفر شروع کر دیتی ہو۔ کسی جگہ دو گھڑی قیام بھی تو کرو امثی۔"

وہ تسلی سے بولی۔

"سکردو میں ایک ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی بھائی جان۔ وہ کہیں بھی قیام کرنے کا قائل

نہیں ہے۔ وہ آنکھوں کا ڈاکٹر ہے۔ اس کا خیال ہے' آنکھیں دنیا کے حسن کو دیکھنے کے لئے ہوتی ہیں۔ مجھے اطالین سیاح کی طرح وہ شخص بھی اچھا لگا تھا۔ وہ کہتا ہے' زندگی کو بنجارے کے نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیے۔"

"اور یہ بھی۔" میں نے اضافہ کیا۔ "کہ بنجارے سے روئے زمین پر کوئی آدمی خطرہ محسوس نہیں کرتا۔"

وہ بولی۔ "بنجارے کی کوئی نسل نہیں ہوتی۔ وہ ہر تہذیب کا فرد ہے۔ ہر سماج کا آدرش ہے۔ ہر صدی کی سچائی ہے۔ وہ جغرافیے کے ہر خط کو کاٹتا ہے اور کوئی اس سے باز پرس نہیں کرتا۔ پرندے کی طرح ہر سرحد پار کر جاتا ہے۔"

میجر اور کرنل ہکا بکا بیٹھے تھے اور شاید سوچ رہے تھے کہ وہ جو روز صبح یونیفارم پہن کر نکل جاتے ہیں' اپنے کونسے احساس کو تسکین پہنچاتے ہیں اور رائفل ایکسرسائز کے معنی کیا ہیں؟

اور وہ جو دو پڑھی لکھی خوبصورت خواتین بیٹھی تھیں' پہلی بار سوچوں کے بھنور میں گھر گئی تھیں کہ یہ چھوٹی سی ناک والی لڑکی' زندگی کی کونسی تسکین کے لئے سرگرداں ہے......؟

امثل کمرے میں چلی گئی' تو کرنل سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔

"معاف کیجئے گا۔ یہ لڑکی نظریاتی مریضہ معلوم ہوتی ہے؟"

"جی ہاں۔" عاطف ہنس کر بولا...... "اس کی باتوں کا جواب جن لوگوں سے نہ بن پڑے' وہ اسے پاگل بھی کہہ دیتے ہیں!"

"کرنل صاحب۔" اب میں بولا۔ "اس نظریاتی مریضہ کا روگ یہ ہے کہ سارے جہاں کا درد اس کے سینے میں سمٹ آیا ہے...... ہم اس لئے تندرست ہیں کہ محض اپنی ذات کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔ بس ہم میں اور اس میں یہی فاصلہ ہے کہ ایک دوسرے کو پہچاننے میں مشکل درپیش ہے۔"

کرنل' جس کی نظریں خود اعتمادی سے مجھ پر جمی ہوئی تھیں' بولا۔

"یعنی ہم جو سینہ سپر ہو کر دشمن کی گولی کو آپ تک نہیں پہنچنے دیتے' گویا اپنی ذات کے لئے جی رہے ہیں------؟"

"نہیں------ ایک حد تک آپ رائج سچائی کے لئے جی رہے ہیں' مگر وشل اس سچائی کو نہیں مانتی۔ وہ کہتی ہے' گولی چلتی کیوں ہے؟ گولی بنتی کیوں ہے؟ وہ گولی کی ضرورت کو رد کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے' انسان سینہ سپر ہی کیوں ہوتا ہے۔ سینے سے سینہ کیوں نہیں ملاتا؟"

کرنل کی چبھ جانے والی نگاہوں کی سختی کم ہو گئی۔ وہ جیسے ٹوٹتے ہوئے دل سے بولا۔

"تو پھر یہ سب بیکار ہوا نا؟"

"ہاں کرنل صاحب' اس نظریاتی مریضہ کا خیال ہے کہ جارحیت اور مدافعت دونوں قابل مذمت ہیں۔ ان دونوں سوچوں کو ہمارے خون سے نکال باہر کر دینا چاہیے۔ وہ چاہتی ہے' سائنس گولی بنانے کی بجائے انسان کے اندر جھانکے------!"

کرنل اب بھی مجھے دیکھ رہا تھا' لیکن اس کے چہرے کا تاثر بتا رہا تھا' جیسے خلاؤں میں جھول رہا ہو۔ کیونکہ اس کی آنکھوں میں وہ پہلے کی سی خود اعتمادی نہ رہی تھی۔

عاطف اٹھ کر اندر گیا' مگر جلدی واپس آ گیا۔ وہ خوش تھا۔

"وسیم صاحب' وہ تو گہری نیند سو رہی ہے۔"

مجھے اس اطلاع سے خوشی ہوئی۔ کیونکہ پچھلی رات میں نے بھی آنکھوں میں کاٹی تھی------ تو کیا وشل بھی جاگتی رہی تھی------؟ نہ جانے میں کیوں ان چور دروازوں سے اس کے من کے بھیدوں تک پہنچنا چاہتا تھا!

کیسی دور کی تسلی تھی یہ؟ مگر میرا من مچل گیا تھا' جیسے خوشبو کا کوئی جھونکا روح کو چھو جائے اور توانائی کی لہریں پورے جسم میں رواں دواں ہو جائیں۔

کیسی کیسی باتوں میں خوشی پنہاں ہوتی ہے!

کھانے کا وقت ہو گیا' تو کرنل کی بیوی نے اسے جگانے کے لئے کہا' مگر عاطف نے منع کر دیا۔

"نہیں اسے سونے دیجئے۔ وہ وقت کی قید سے آزاد ہے۔ وہ ہر کام اپنی مرضی سے کرتی ہے۔ وہ اپنی بے ساختگی میں مداخلت پسند نہیں کرتی۔"

"یعنی وہ ہر معاملے میں مختار اور مجاز ہے۔" کرنل کی بیوی نے پوچھا۔

"ہاں------ میں اس پر بھروسہ کرتا ہوں۔" عاطف نے جواب دیا۔ "کیونکہ وہ بھروسے کے قابل لڑکی ہے۔ آپ دیکھتے نہیں' وہ وسیم صاحب کے ساتھ اکیلی گئی تھی۔ آپ کے ہاں شاید یہ بات قابل اعتراض ہو' مگر میں اسی کو جانتا ہوں۔ اس کے ہاں اپنی صداقتیں ہیں۔ وہ اس بات کی پرواہ نہیں کرتی کہ کون اس کے متعلق کیا کہتا ہے۔ کسی کا الزام اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا' کیونکہ وہ ایسی ان دیکھی سچائی ہے' جس کا شعور ابھی ہمیں نہیں ہوا۔"

"دراصل اسے ایک صدی بعد پیدا ہونا چاہیے تھا۔" میں نے مداخلت کی۔ "ممکن ہے ایک صدی بعد وہ شعور پیدا ہو جائے۔"

"گویا وہ وقت سے پہلے پیدا ہونے کی سزا بھگت رہی ہے؟" کرنل کی بیوی نے پوچھا۔

"کسی حد تک۔" میں نے جواب دیا------ "جیسے کسی ترقی یافتہ سیارے کا آدمی زمین پر اتر آئے اور ہمارے اصول اسے ہیچ لگیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی سندر معاشرے کی سندر فرد ہے' جو بھٹک کر زمین کی تہذیب میں گھر گئی ہے۔"

کھانے سے فارغ ہوئے تو کرنل بولا۔

"شام کا کھانا بھی آپ ہمارے کھائیے۔ ہم اس غیر معمولی خاتون کی باتیں سننا چاہتے ہیں۔"

"شام کا ہی کیوں۔" کرنل کی بیوی بولی۔ "جب تک آپ لوگ یہاں ہیں' کھانا ہمارے ساتھ ہی کھائیے۔ ریسٹ ہاؤس کے خانسامے کے تیار کئے ہوئے کھانے سے تو گھر کا کھانا

بہرحال اچھا ہی ہو گا۔"

میں نے سوچا...... یہ اسل کی شخصیت تھی کہ ہر طرف پیار بکھرا پڑا تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ ایک کروڑ بیوقوف اپنے سر کٹوا کر وہ مقصد حاصل نہیں کر سکتے' جو سچا شاعر ایک شعر میں حاصل کر لیتا ہے۔ اسل جیسے لوگ ہی ہوتے ہیں کہ زندگی گنگنانے لگ جاتی ہے اور جینے کی امنگ دو چند ہو جاتی ہے۔

شام کو وہ نہا دھو کر نکلی تو اس کے زرد چہرے پر زندگی اور بشاشت تھی۔ وہ کرنل اور میجر کے بچوں کے ساتھ کھیل میں مصروف ہو گئی تھی۔ ہم لان میں بیٹھے تھے۔ موسم خوشگوار تھا۔ بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ اس لیے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ بچوں کے ساتھ بچہ بن کر کھیلنے والی اس لڑکی کو زندگی سے کتنے گلے اور شکایتیں ہیں......!

تھک گئی' تو ہنستی ڈولتی ہوئی آ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ سب کی نگاہیں اس پر جم گئی تھیں۔ سب اسے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ بچے اس کے اردگرد کھڑے ہو گئے تھے۔ شاید ان کا دل ابھی کھیل سے نہیں بھرا تھا۔ اس نے میجر رفیق کی چھوٹی بچی کو گود میں اٹھا لیا تھا۔ کرنل کی بیوی جو متجسس نگاہوں سے اسل کی طرف دیکھ رہی تھی' بولی۔

"تو کل آپ نلتر جا رہے ہیں؟"

"ہاں' چلئے نا' آپ سب لوگ بھی چلیں۔" اسل نے کہا۔ "چونتیس پینتیس میل کا تو سارا فاصلہ ہے۔ شام تک لوٹ آئیں گے۔"

کرنل نے ہنس کر کہا۔

"ہم آپ کی طرح بااختیار لوگ نہیں ہیں۔ اتوار ہوتا تو شاید چلے بھی جاتے۔ نوکری کا' رزق کا معاملہ ہے۔"

"اور بیگمات آپ کے بغیر جا نہیں سکتیں۔ کیونکہ یہ تہذیب کا معاملہ ہے!"

کرنل زچ ہو کر بولا۔

"کیا کیا جائے۔ ہم آپ کی طرح ٹھوس لوگ نہیں ہیں۔ سماج سے خوف زدہ ہونے کی

تربیت ہمارے خون میں رچ بس چکی ہے۔"

"کچھ رزق کا خوف اور کچھ سماج کا خوف' آپ اس زندگی سے خوش ہیں؟"

"خوشی اور ناخوشی کا کبھی احساس ہی نہیں ہوا۔ لوگ ہماری پوزیشن پر رشک کرتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ہم خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں اور بظاہر صحیح بھی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ حال اور مستقبل محفوظ ہیں...... آپ جس خوف کا ذکر کرتے ہیں' وہ تو گویا زندگی کا لازمہ ہے۔ اس لئے کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ ہم مظلوم ہیں۔"

اسل ہنس پڑی۔

"اچھی تنخواہ' اچھا کھانا۔ اچھی رہائش' آپ اپنے قلعے میں محفوظ بیٹھے ہیں...... ہاں' یہ دنیا آپ جیسے لوگوں کے لئے ٹھیک ہے!"

کرنل کا چہرہ فق ہو گیا۔ اسل نے بات جاری رکھی۔

"دراصل یہ زندگی آپ کے لئے نہیں ان کے لئے عذاب ہے' جو سوچتے ہیں کہ اگر ایسا ہے تو ویسا کیوں نہیں' اس طرح ہے تو اس طرح کیوں نہیں؟ خالق ہے تو خلق کیوں نہیں؟ مگر جہاں بشر' بشریت کے واسطے سے نہیں رزق کے واسطے سے زندہ ہو' تو دکھ اور سوا ہو جاتا ہے۔ پھر آدمی کی پہچان نہیں رہتی اور وہ ہجوم میں گم ہو جاتا ہے۔" کرنل کو جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔ دوسرے لوگ بھی ہمہ تن گوش تھے' مگر اسل جو کھیل کر آئی تھی اور تازہ آکسیجن اس کے پھیپھڑوں میں پہنچ گئی تھی' بولی۔

"آپ نے سولزنیتسن کا نام سنا ہے کرنل صاحب؟"

"جی ہاں۔" کرنل نے چونک کر کہا۔ "وہی نا' جسے روسی حکومت نے ملک بدر کر دیا ہے؟"

"ہاں وہی۔" اسل بے حد ٹھہراؤ سے بولی۔ "ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں' یہ شخص نہ سماج سے ڈرا' نہ رزق چھن جانے کے خوف سے' نہ قید و بند کی صعوبتوں سے' قید ہوا' بیمار ہوا۔ سائبیریا گیا' لیکن واپس آیا' تو پھر سچ بول رہا تھا...... کہنے لگا جھوٹ'

جھوٹ ہے۔ جھوٹ کا اور کوئی نام نہیں ہو سکتا...... زبان کاٹ دو' گولی مار دو۔ واپس سائبیریا بھیج دو۔ میں جھوٹ کو سچ نہیں کہوں گا...... دنیا کا کوئی لالچ اس کی راہ نہ بدل سکا۔ اس زمین کا کوئی خوف اس کا ذہن نہ بدل سکا...... وہ انسان ہے۔ وہ ایک چٹان ہے۔ وہ اس صدی کا ضمیر ہے کرنل صاحب......!"

میجر اور کرنل کی آنکھیں چمک اٹھیں' خود میرے سینے میں بھی ولولہ سا جاگ اٹھا۔ امثل بولے جا رہی تھی۔

"تو وہ سٹالین' جس نے مارکس ازم کے لئے یا اپنے اقتدار کی خاطر چالیس لاکھ انسانوں کا خون کیا تھا' انسانی ضمیر کو ختم نہیں کر سکا...... اس لافانی ضمیر نے کوئی سمجھوتہ نہ کیا اور روس سے نکال دیا گیا...... دراصل ایک منجمد سماج میں ایک سبک سیر بنجارے کا کیا کام......!؟

میں جو غیر متعصبانہ سا ہلکا پھلکا مذہبی رجحان رکھتا تھا' مگر اشتراکیت کو بھی بالکل رد نہیں کرتا تھا' سولزینٹسن کے ذکر سے جذباتی ہو گیا تھا۔ مجھے اس بہادر شخص سے ہمدردی ہو گئی تھی' بلکہ ایک حد تک اس کی ہمت اور جرأت کا قائل ہو گیا تھا۔

امثل نے کہا تھا۔

"ایک منجمد سماج میں ایک سبک سیر بنجارے کا کیا کام؟"

میں اس فقرے کے تاثر کو دل و دماغ میں سمیٹ رہا تھا کہ امثل بولی۔

"کرنل صاحب' اس لئے میں سمجھتی ہوں کہ انسان کو خوف اور مصلحتوں کی آڑ میں زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ انسان کا فرض ہے کہ اگر وہ مرنا پسند نہیں کرتا تو پھر ضرور جئے' مگر سولزینٹسن کے ضمیر کے ساتھ جیئے!"

کرنل کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک عود کر آئی تھی۔ شدت جذبات سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس کے لہجے اور آواز میں لرزش تھی۔

"خاتون......! میں بیان نہیں کر سکتا کہ آپ کے الفاظ نے میرے من میں کیسی ہلچل

برپا کر دی ہے۔ ایک انجانی سی ترنگ اور امنگ نے میری روح کو سمیٹ لیا ہے۔ شرافت اور بغاوت کی ملی جلی کیفیت نے مجھے جکڑ رکھا ہے۔ اس سے پہلے میں نے خود کو ایسا پُرجوش اور سرشار کبھی نہیں پایا۔ میرے اندر ایک نئے آدمی نے جنم لیا ہے۔ میں آپ کا ممنون ہوں۔ آپ نے مجھے ایک نیا عزم دیا ہے!!"

"ہاں ہاں...... یہ بھی ایک روپ ہے انسان کا" امثل جذبے سے بولی...... "کاش! یہ روپ قائم رہتا' ہمیشہ قائم رہتا!!"

"سولزینٹسن جیسے لوگ تو پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں امثل۔" میں نے کرنل کی تائید میں کہا۔

"ہاں...... صدی میں ایک دو...... چار سہی' دس سہی' مگر یہ کافی نہیں ہیں۔ دس آدمی مثال بن سکتے ہیں۔ دس آدمی اتنی بڑی زمین پر پھول نہیں اگا سکتے۔ جب تک سائبیریا سے آخری قیدی بھی ماسکو واپس آ نہیں جاتا' یہ دنیا سکھی نہیں ہوگی۔ جب تک افریقہ کا حبشی اپنے سیاہ رنگ کے احساس میں مبتلا رہے گا' زمین عذاب میں مبتلا رہے گی۔ جب تک ایشیا کے ہاتھ میں کشکول رہے گا' زمین کا ضمیر بے چین رہے گا۔ جب تک یورپ مصلحتوں کا شکار ہوتا رہے گا' دنیا سے دھاندلی ختم نہیں ہوگی۔ جب تک امریکہ کے احساس برتری کا جنازہ نہیں اٹھے گا' دنیا میں امن قائم نہیں ہوگا...... یہ اصول طے ہونا چاہیے کہ پیسہ طاقت نہیں ہے' بلکہ پیار بڑی طاقت ہے۔"

"ہم اس اصول کو مانتے ہیں۔" کرنل پرجوش لہجے میں بولا۔

"بات سائنس کی ہے کرنل صاحب' سائنس اس اصول کو مانے۔ سائنس' جو ایٹم کا سینہ چیرتی ہے' انسان کے وجدان تک پیغام پہنچائے۔ انسان کی روح میں اس اصول کو کھپائے۔ مریخ اور اس سے بھی آگے پہنچنے سے پہلے اسے یہ نزدیک کا کام ختم کرنا چاہیے۔ احترام آدمیت ہر چیز پر مقدم ہے!"

دونوں خواتین اور افسر بیگانہ حیرت اور معصومیت سے امثل کی باتیں سن رہے تھے۔

امل نے بات آگے بڑھائی۔

"کرنل صاحب' ایسی ترقی کا فائدہ کہ ہمارے دل گھر کے فریج اور ہمارے ولولے کولڈ سٹوریج میں محفوظ ہو جائیں! ہم اس تہذیب کا کیا کریں گے کہ آدمی آدمی سے برگشتہ ہو جائے؟ نہیں' مجھے ایسی زندگی نہیں چاہیے۔ مجھے ایسے شعور کی ضرورت نہیں' جو ہمارے سینے حرارت سے خالی کر دے! زمین کو اب بھی ایسے آدم کی ضرورت ہے جو حوا کے بہکاوے میں آجائے!"

بچے جو ناقابل فہم گفتگو سے بور ہو رہے تھے' اشاروں ہی اشاروں میں خاموشی سے کھسک گئے تھے اور دوبارہ کھیل میں مصروف ہو گئے تھے۔

میں نے سوچا تم ان کا جن کو غم کا شعور ہو' کوئی رنجیدہ ہو' ان کی بلا سے' وہ اپنا کھیل جاری رکھیں گے۔ شاید یہی ثبات زندگی کی دلیل ہو؟

ڈنر کے بعد کافی کا دور چل رہا تھا' تو کرنل کی بیوی نے پوچھا۔

"آپ کی باتیں اتنی اچھی ہیں کہ فوراً سمجھ میں آجاتی ہیں۔ آپ نے بھی تو سوچا ہوگا کہ زندگی کیسے گزارنی چاہیے؟"

"میرا تو کوئی ٹھکانہ نہیں' زندہ رہنے کا ڈھنگ ہی نہیں آتا۔ کبھی کچھ بھی اچھا نہیں لگتا اور کبھی سب کچھ بہت اچھا لگتا ہے۔ کبھی مرنے کے لئے لپکتی ہوں اور کبھی ولولوں سے سرشار ہو جاتی ہوں۔ کبھی سوچتی ہوں' خدا نہیں ہے۔ کبھی بجلی سی کوندتی ہے کہ خدا بہت ضروری ہے اور خوف خدا اس سے زیادہ ضروری ہے۔ سرمایہ داری کو پسند نہیں کرتی' لیکن بالکل رد بھی نہیں کرتی کہ انسانی امنگ کا اس سے گہرا تعلق ہے۔ اشتراکیت کے وسیع تر مفاد کو مانتی ہوں لیکن یوں رد بھی کرتی ہوں کہ انسانی بے ساختگی کا خون ہو جاتا ہے۔ پھر سوچتی ہوں کہ اگر مذہب' سرمایہ داری اور اشتراکیت تینوں میں اپنی اپنی خوبیاں ہیں' تو تینوں کی منتخب خوبیاں یکجا کر لی جائیں اور ایک نیا تجربہ کیا جائے؟"

میں نے خوش ہو کر کہا۔

"ان تینوں کا امتزاج تو اسلامی سوشلزم ہوا نا۔۔۔۔؟"

"اچھا" وہ حیرت سے بولی۔ "پھر تو کچھ لوگ بدک جائیں گے۔ مذہب سے میرا مقصد خدا کا احساس ہے۔ جیسے کافی کا ذائقہ ہوتا ہے اور اسے ہماری زبان محسوس کرتی ہے' اسی طرح خدا کے احساس کا ذائقہ ہر دل کو محسوس کرنا چاہیے۔"

"امل' مجھے خوشی ہوئی کہ آپ کو خدا کی ضرورت محسوس ہوئی۔"

"وسیم صاحب' مجھے ڈاکٹر کی بات اچھی لگی تھی کہ خدا کو نہ مان کر انسان کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ میرا خیال ہے' فائدہ کی بجائے نقصان ہی ہوگا۔ اس طرح درندگی عود کر آئے گی۔ ضمیر کی گرفت ختم ہو جائے گی اور احساس زیاں باقی نہیں رہے گا۔ میں خدا کے احساس کو مذہب نہیں کہتی۔ کیونکہ مذہب تو کسی خاص گروہ' طبقہ یا قوم کی فلاح و بہبود تک محدود ہو جائے گا۔ خدا کے احساس سے میری مراد یہ ہے کہ یہ احساس ہماری روح میں گھل مل جائے۔ دنیا کے ہر آدمی کے قلب و ذہن میں یہ احساس جاری و ساری رہے۔ پوری نوع انسانی کی سربلندی ہو۔ پوری انسانی تہذیب کی معاشی' سیاسی' فکری اور اخلاقی راہ ایک ہو جائے' اور ہم ایک نئی بصیرت اور نئی روشنی کے احساس سے نئی زندگی تخلیق کریں۔"

کرنل پھڑک اٹھا۔

"ہاں ایسا ممکن ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے ایسا!"

"کاش ایسا ہو جائے۔" وہ حسرت اور مایوسی کے لہجے میں بولی۔ "میرے لہجے میں بے یقینی اس لئے ہے کہ میں انسانی ذہن پر اعتقاد نہیں رکھتی۔ بس یہ میری خواہش ہے۔ ان خواہشوں میں سے ایک' جو شاید کبھی پوری نہ ہوں اور جو عموماً پوری نہیں ہوا کرتیں!"

کرنل کی آنکھوں کے دیئے پھر بجھ گئے۔ امل بولی۔

"میں نہیں سمجھتی کہ جو کچھ میں کہہ رہی ہوں' حرف آخر ہے۔ انسان کی بھلائی ضرور چاہتی ہوں۔ کچھ نیک تمنائیں میں بھی رکھتی ہوں' لیکن جہاں تک مذہب کا سوال ہے'

مذہب کوئی بھی ہو' مذہب سے دیوانگی کی حد تک شیفتگی نے زمین پر فساد ہی پھیلائے ہیں۔ مذاہب نے رابطے کی بجائے تعصب بڑھایا ہے...... اسی طرح سرمایہ دارانہ تجربہ بھی جنگوں کو روکنے کی بجائے جنگوں کی بنیاد بنا ہے۔ یہی نہیں' سرمایہ دارانہ تہذیب نفسانفسی کی تہذیب ہے اور اب گویا موت کے دروازے پر کھڑی ہے۔ تیسرا محض عقلی تجربہ ہے..... مارکسیت کا" اس کی بنیادی خامی یہ ہے کہ انسان سے پرندے والا وجدان چھین لیتا ہے۔ اس سے الہامی کیفیت اور روحانیت کا خون ہو جاتا ہے' جو انسان کی سب سے قیمتی متاع ہے...... اس لئے میں کہتی ہوں کہ کسی نئی سوچ کو جنم دینا ہو گا۔ اجتماع اور اتحاد و اشتراک کی کوئی نئی بنیاد ڈھونڈنی ہو گی۔ یہ بنیاد عقلی ہو یا وجدانی' سائنسی اور روحانی یا ان سب کا امتزاج...... بہرحال اس کی تلاش لازمی ہے۔ ورنہ کتنی بھی ترقی کر لیں' آسمان کے تارے توڑ لائیں' ہر انسان کے ہاتھ میں ایک ایک ستارہ تھما دیں' پھر بھی اس کی ہوس ختم نہیں ہو گی اور نہ اس کی فطرت بدلے گی!"

میجر رفیق نے ایک چپ سادھ رکھی تھی' جیسے موضوع اس کی سمجھ سے بہت آگے نکل گیا ہو۔ عورتوں نے بھی صبر چارہ کر لیا تھا۔ البتہ کرنل کی حالت عجیب تھی۔ کبھی اس کے چہرے پر جلالی کیفیت ہوتی' کبھی مایوسی اور کبھی جھنجلاہٹ۔ امل کے رویے کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھیں مختلف ایکسپریشن کا اظہار کر رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس شخص کے اندر سادگی' سچائی اور ذہانت کا ہر عنصر موجود ہے اور اس کے خمیر میں اثر پذیری کی پوری پوری صلاحیتیں ہیں۔

بچے کھیل سے اکتا کر واپس آ گئے تھے۔ ان کی اجلی اجلی آنکھوں میں نیند کی پریاں ناچ رہی تھیں اور ماؤں کے لئے اچھا بہانہ تھا کہ شوہروں کو اس بے مثل لڑکی کے سحر سے آزاد کرا سکیں۔ اس لئے سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

کمرے کی بتی جلا کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں مجھے اپنی شکل بہت اچھی لگی۔ میں نے مسکرا کر اپنی آنکھوں میں جھانکا...... یہ آنکھیں آج فروزاں فروزاں تھیں۔ امل کے

نئے روپ سے میرے من میں جو کرن پہنچی تھی' اس نے میرے سارے وجود میں اجالا بھر دیا تھا۔

اناطین سیاح کا اعلیٰ سفر' جھیل سیف الملوک کے دامن میں کوہستانی عورت کا جھونپڑا اور اس کا سکون' وزیر خان کے کنبے کا گداز' ڈاکٹر کا بے ریا کردار اور اس کی بیوی کی دل میں اتر جانے والی "ہی!"

اس سفر میں تو میں نے پایا ہی پایا تھا۔ ہر پڑاؤ پر قندیل روشن ہوئی۔ ہر قدم پر زندگی نے نمو پائی۔ ہر موڑ پر راز واں ملے۔ ہر منظر نے نیا ولولہ دیا اور ہر صبح نے نئی منزل کی نوید دی۔

امل جو نئی نوع انسان کی یکانگت کے لئے سرگرداں تھی' کسی دن انسان کی محدود تلاش کے مفہوم کو پا جائے گی اور من تن کو اجالوں سے بھر دے گی۔ جیسے کہ آج ہوا' آئندہ بھی ہو' ہمیشہ کے لئے ہو جائے۔

گزشتہ رات مجھے نیند اس لئے نہیں آئی تھی کہ امل نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ کمرہ کیا بند ہوا تھا' جیسے کسی نے منہ پر تھپڑ مار دیا تھا' لیکن آج مجھے نیند اس لئے نہیں آ رہی تھی کہ میں بے حد خوش تھا۔ کیونکہ امل خدا کے احساس کی باتیں کر رہی تھی۔ وہ انسان کی نفی کرتے کرتے' انسان کو بنجارے جیسا حق حیات دینے پر راضی ہو گئی تھی...... مگر میں نے تو یہ بات پہلی ملاقات میں پہلے دن ہی پا لی تھی کہ اس نفی میں جس انداز کی جھنجلاہٹ اور برہمی ہے اس کے بطن سے انجام کار ایک سچائی جنم لے کر رہے گی۔

سچائی ہر صدی میں زندہ رہی ہے۔ کبھی سقراط کے نام سے' کبھی حسینؑ کے روپ میں اور کبھی سولزنیٹسن کے انداز میں...... یہ وہ لوگ تھے' جنہوں نے پیغمبری کے دعوے نہیں کئے' مگر دنیا ان کی معترف ہے۔ ان کی عظمت کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے انسان کے پندار نفس کی خاطر جینے مرنے کا بیڑا اٹھایا اور انسان کے دل و دماغ کو تحیر کے

احساس سے نوازا اور اس کی روح کو تقویت پہنچائی اور زندگی کو سہارا دیا۔

صبح میں اور امثل ہی ہم سفر تھے۔ نلتر جانے کے لئے آج ٹورسٹ بیورو والوں نے ہمیں نیا ڈرائیور اور نئی جیپ دی تھی۔۔۔۔۔ دریائے ہنزہ کا پل عبور کرنے سے پہلے ہم بائیں ہاتھ مڑ گئے۔۔۔۔۔ اب دریائے ہنزہ ہمارے دائیں ہاتھ خاصی گہرائی میں بہہ رہا تھا۔ دریائے ہنزہ کے اس پار دو سڑکیں' جن میں سے ایک دریا کے ساتھ ساتھ ہنزہ کو جا رہی تھی اور دوسری پہاڑ کی بلندیوں میں غائب ہو گئی تھی' شاہراہ ریشم تھی' جو آگے جا کر چین کی سرحدوں سے مل جاتی ہے۔ یہی وہ راستہ تھا' جس پر پرانے زمانے میں گھوڑوں اور خچروں کے قافلے چلتے تھے اور تجارتی اشیاء کے تبادلے ہوتے تھے۔ اب یہ کھلی سڑک بن گئی ہے' جس پر جیپیں اور ٹرک چلتے ہیں اور نئے چین کے لوگ آتے جاتے ہیں۔

کچھ دیر بعد ہم ضبل اور نومل پہنچ گئے۔ یہاں وادی پھیل گئی تھی اور باغات کی کثرت تھی۔ اس گاؤں میں پولوگراؤنڈ بھی تھا۔ ایک باغ کے باہر سڑک کے کنارے ادھیڑ عمر کا آدمی کھڑا تھا' جس کے پاس سیر سیر کی ٹوکریوں میں اناس بھری ہوئی تھی۔ قیمت پوچھی' تو ڈھائی روپے سیر بتائی۔ ہم نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا کیونکہ پنجاب میں یہ پھل چودہ پندرہ روپیہ سیر بکتا ہے۔ ہم نے ایک ٹوکری خرید لی اور سارا راستہ مزے سے کھاتے رہے۔

بیس بائیس میل کے بعد ہم بلند و بالا پہاڑوں کی ایک تنگ گھاٹی میں داخل ہو گئے۔۔۔۔۔ دریا اب پیچھے رہ گیا تھا۔۔۔۔۔ آمنے سامنے کے یہ پہاڑ اتنے قریب تھے کہ ان پر نر اور مادہ کا گمان گزرتا تھا۔۔۔۔۔ مگر جن کو فطرت کے بے رحم ہاتھوں نے ہم آغوش ہونے سے پہلے پتھر کر دیا تھا۔

چھ سات میل کے بعد پہاڑ کی ان گلیوں کا اسرار ختم ہوا اور کھلا آسمان دکھائی دیا اور گھاٹی کی کشادگی کا احساس پیدا ہوا۔ سامنے دو برف پوش چوٹیاں اس طرح ایک دوسرے کے سامنے کھڑی تھیں' جیسے دو خوبصورت اپسرائیں رقص کے لئے پر تول رہی ہوں۔

جوں جوں جیپ اوپر جا رہی تھی' نلتر کے حسن کا جادو بے پایاں ہوتا جا رہا تھا۔ ساڑھے سات ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ کر ہماری جیپ ایک حسین زمردیں خطے میں رک گئی۔ دائیں ہاتھ مختصر سا بکھرا ہوا گاؤں تھا۔ اس گاؤں کے گھروں کا فاصلہ ایک دوسرے سے ساٹھ ستر گز سے کم نہیں تھا اور اس سے ہٹ کر بلند و بالا پہاڑوں کے لامتناہی سلسلے تھے۔ بائیں ہاتھ چھوٹی سی گھاٹی کے اس پار ڈھلوان سبزہ زار پر ایک خوبصورت ریسٹ ہاؤس تھا۔ ریسٹ ہاؤس سے تین چار فرلانگ پر پاکستان ائیر فورس کا کیمپ تھا۔ بائیں ہاتھ پہاڑ کے دامن میں پی اے ایف کا سکیٹنگ جھولا تھا۔ سردیوں میں جب یہ سارا علاقہ برف سے ڈھک جاتا ہے' تو پاکستان ائیر فورس کے پائلٹ سکیٹنگ کی تربیت کے لئے یہاں آتے ہیں۔ موسم گرما میں یہ کیمپ خالی رہتا ہے۔۔۔۔۔ دونوں چوٹیاں تقریباً سو سو گز تک برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد دامن کوہ تک چیڑ اور دیار کا جنگل پھیلا ہوا تھا۔۔۔۔۔ سبز اور نرم گھاس کا قدرتی قالین پوری گھاٹی کو محیط کئے ہوئے تھا اور اس پر لوٹ پوٹ ہونے کو جی چاہتا تھا۔

ریسٹ ہاؤس کے نوجوان چوکیدار نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ لان میں ایک یورپین جوڑا بیٹھا تھا' جنہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں وش کیا۔ ایل کی شکل کے ریسٹ ہاؤس میں دو کمرے تھے۔ ایک کمرہ یورپین جوڑے کے پاس تھا۔ دوسرا کمرہ چوکیدار نے ہمارے لئے کھول دیا۔ اس میں دو بیڈ لگے ہوئے تھے۔ امثل کو نلتر بہت پسند آیا۔ چائے بن گئی' تو ہم لان میں یورپین جوڑے کے پاس بیٹھ گئے۔ یہ دونوں ڈچ تھے۔ انہیں نلتر اس قدر پسند آیا تھا کہ گزشتہ پندرہ دن سے یہیں براجمان تھے۔ لڑکی کی عمر بائیس بیس سے زیادہ نہیں تھی۔ نوجوان کی عمر بھی یہی پچیس چھبیس سال کے لگ بھگ ہو گی۔ مرد کے مقابلے میں لڑکی نہایت نازک اندام اور البیلی تھی۔ معلوم ہوا کہ گو وہ چوٹی تک نہیں پہنچ سکے' مگر برفوں تک ہو آئے ہیں۔

پروگرام کے مطابق ہمیں آج ہی گلگت واپس جانا تھا۔ کیونکہ ابھی دن بہت پڑا تھا اور

فاصلہ صرف چوتیس میل تھا...... لیکن یہ جگہ ایسی پرفضا اور حسین تھی کہ ٹھہرنے کو دل مچل رہا تھا، مگر میں اپنے طور پر اسّی سے اس خواہش کا اظہار اس لئے نہیں کر سکتا تھا، کہ ہم دونوں کے سونے کے لئے کمرہ ایک تھا۔

چائے کے بعد ڈچ جوڑا ہمیں پی اے ایف کیمپ لے گیا۔ جہاں پی اے ایف والوں نے رام چکور اور مرغ زریں پال رکھے تھے۔ رام چکور عام چکور سے قدرے بڑا ہوتا ہے اور اس علاقے میں عام پایا جاتا ہے۔ وہیں ہم نے سبز سنہری رنگ کا مرغ زریں دیکھا، جو صرف برفانی علاقوں کا پرندہ ہے۔ ریسٹ ہاؤس واپس آئے تو چوکیدار نے پوچھا۔

"صاحب، اگر آپ نے رات یہاں ٹھہرنا ہے، تو کھانے کا انتظام کروں؟"

اسّی نے جھٹ میری طرف دیکھا۔ میں نے ہنس کر کہا:

"بہتر ہے واپس چلے جائیں۔ ایک کمرے میں شاید آپ میرے ساتھ رات گزارنا پسند نہ کریں!"

"کیا مطلب......؟" اسّی بھڑک اٹھی...... "کیا میں آپ کو بتا نہیں چکی کہ آپ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے......؟"

"میں نے کبھی آپ کی تردید نہیں کی۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے چوکیدار کی طرف دیکھا...... "چوکیدار ہم ٹھہریں گے!"

چوکیدار سلام کر کے چلا گیا۔ ڈچ جوڑا ہماری باتوں کو تو نہ سمجھ سکا، لیکن اسّی کے بولنے کا انداز ان سے مخفی نہ رہ سکا۔ لڑکی نے ہنس کر اسّی سے کہا۔

"ہمیں یہاں پندرہ دن ہو گئے ہیں، لیکن یہ ایسی خوبصورت جگہ ہے کہ ابھی تک تلخی کی نوبت نہیں آئی۔"

اسّی ہنس پڑی۔

"دراصل میں پندار نفس کی ماری ہوئی لڑکی ہوں اور شاید یہی میری بدقسمتی ہے۔ غلطی وسیم صاحب کی نہیں میری ہے۔"

"ایسے کھلے دل سے اعتراف تو معافی سے بھی زیادہ قابل عزت ہے۔"

"آپ لوگ موت کے وقت اعتراف کرتے ہیں۔ میں موت کا انتظار نہیں کر سکتی!"

"یہ تو بہت خوبصورت بات ہے۔" ڈچ نوجوان بولا۔ "مگر تلخی کی وجہ بھی تو معلوم ہو؟"

اسّی چپ ہو گئی۔ میں نے کہا۔

"وجہ یہ ہے کہ ہم مشرقی لوگ ہیں۔ ایک کمرے میں رات گزارنا معیوب سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ہم میاں بیوی نہیں، محض دوست ہیں۔"

"ہم بھی تو محض دوست ہیں مگر چھ ماہ سے میاں بیوی کی طرح رہ رہے ہیں۔"

اسّی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے ہنس کر کہا۔

"آپ ڈی ایچ لارنس کو پڑھنے والے لوگوں میں سے ہیں اور فطرت کی برتری کو تسلیم کرتے ہیں، مگر ہمارے ہاں ابھی فطرت اور اقدار کی جنگ ختم نہیں ہوئی۔"

"آپ کیا چاہتے ہیں؟" نوجوان نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کس کی جیت پسند کریں گے۔ فطرت کی یا اقدار کی؟"

"اگر بات فیشن کی ہو تو پھر آپ کی بات سچی ہے، لیکن فطرت کو زیر کرنا ہی اصل جیت ہوتی ہے۔"

"فطرت کو زیر کرنا، کیا فطرت کشی کے مترادف نہیں ہوگا؟"

"یعنی آپ پسند کرتے ہیں، ایک مرد جب چاہے اور جس عورت کا چاہے بوسہ لے لے، کیونکہ یہ عین اس کی فطرت کے مطابق ہوتا ہے؟"

"اس میں حرج بھی کیا ہے؟"

"یہ حیوانی سطح کی اپروچ ہے۔ وہ لوگ جو اپنی بہنوں کا احترام کرتے ہیں، دوسری عورتوں سے بھی انسانی سطح پر ملنا پسند کریں گے۔"

"مگر محترم، جنسی احتیاج بھی تو انسانی فطرت ہے۔ کیا جنسی احتیاج پر قدغن، معاشرے

میں گھٹن کا باعث نہ ہوگی؟"

"قدغن کون لگاتا ہے جنسی احتیاج پر' ہر مذہب اور ہر تہذیب نے میاں بیوی کا رشتہ تسلیم کیا ہے' مگر یکطرفہ ٹریفک کے کیا معنی کہ جو مرد چاہے وہی فطرت ہے۔ اس سلسلے میں اصل کردار تو عورت کا ہے۔ عورت کب یہ پسند کرے گی کہ ہر سال ہونے والے بچے کا باپ مختلف آدمی ہو۔ کون ایسے بچوں کا والی وارث ہوگا اور کس طرح کے معاشرے میں ایسے بچے پروان چڑھیں گے؟"

"یہ جو آپ کی دوست ہیں' میں ان سے پوچھتا ہوں کہ بحیثیت ایک عورت' کیا وہ اپنے بچے کی ماں اور باپ دونوں کا کردار ادا کر سکتی ہیں؟"

لڑکی ہنسنے لگی۔ نوجوان بولا۔

"آپ چونکا دینے والی باتیں کرتے ہیں!"

"آپ چونکنا چاہیں تو اس کا کیا علاج' ورنہ بوسے میں اشتراک تو لینن کے نزدیک بھی گھناؤنا فعل تھا۔ وہ جو ذاتی ملکیت کو رد کرتے ہیں' محبوبہ کو ذاتی حیثیت دیتے ہیں اور عورت کے معاملے میں فطرت پسندی کو گردن زدنی قرار دیتے ہیں!"

"ان کی مثال نہ دیجئے۔" نوجوان بیزاری سے بولا۔ "لینن کے معاشرے کا انسان سو سال تک بالکل حیوان بن جائے گا۔ اس کے تمام جذبے دھیرے دھیرے ختم ہو جائیں گے۔ بس صرف چارہ کھانے کی حس باقی رہ جائے گی!"

امل مسکرائی۔ میں نے اسے کہا۔

"چلو آپ کے دل میں انسان کے حیوان بننے کا خوف تو موجود ہے۔ اس کا مطلب ہے' آپ تہذیب اور سماج کو مانتے ہیں اور زندگی کی ذمہ دارانہ سطح کو تسلیم کرتے ہیں؟"

"ہاں' میں اسے ضروری سمجھتا ہوں۔"

"تو پھر فطرت پسندی کا فیشن بے معنی ہے۔ کیونکہ اس لڑکی کی گود میں بچہ ڈال کر آپ اسے نظرانداز نہیں کر سکتے۔ تہذیب آپ کو اس کی اجازت نہیں دیتی کہ باسی مال کو فٹ

پاتھ پر پھیلا دیں اور تازہ مال کی تلاش میں آگے نکل جائیں۔ کیوں خاتون' اس طرح کی فطرت آپ کی حفاظت کر سکے گی؟"

"نہیں' ہرگز نہیں۔" لڑکی چمک کر بولی۔ "یہ فطرت کے خلاف ہے کہ میں اکیلی رہ جاؤں۔ مجھے ایک ساتھی کی ضرورت ہے کہ یہی فطرت ہے!"

"تو پھر آپ کی دوستی کی یہ آخری رات ہے۔ کل اپنے ساتھی کو گلگت لے جائیے اور کسی پادری کے سامنے دو زانو ہو جائیے----- گو یہ سفر زیادہ رومانٹک نہیں ہوگا' لیکن محفوظ ضرور ہوگا۔"

لڑکی کی آنکھوں کے گوشے سمٹ گئے تھے' اور ان میں سوچ کی لو ابھر آئی تھی۔ وہ اپنے ساتھی کو دیکھ رہی تھی' جو متذبذب کیفیت میں بیٹھا تھا اور آنے والے کل کے غم سے بوجھل ہو گیا تھا۔

شاید سوچ رہا تھا کہ جس فطرت کو وہ اتنے برس سے پال پوس رہا تھا اور ایک خاص ڈگر پر چلا رہا تھا' سدھرنے پر آمادہ کیا جا سکے گا؟

امل ٹھہرنے کو تو ٹھہر گئی تھی' مگر اب خاموش تھی۔ خود میں بھی عجیب سا محسوس کر رہا تھا کہ آنے والی رات میرے ساتھ کیا سلوک روا رکھتی ہے----- ایک دلفریب اور بے مثال لڑکی کے ساتھ ایک کمرے میں رات گزارنے کا تصور بجائے خود ایک امتحان تھا اور اس پس منظر کے ساتھ اس کی اہمیت اور بڑھ گئی تھی کہ اقدار کے احترام میں میں نے چند لمحے پہلے یورپین جوڑے کو خاموش کر دیا تھا۔ بہرحال شعوری یا غیر شعوری سہی' میں نے ایک ذمہ داری قبول کر لی تھی۔

شام کو چوکیدار نے دونوں کمروں کے لیپ روشن کر دیئے' لیکن پورے گاؤں میں ایک گھر کے سوا کہیں دیا نہ جلا۔ ہمیں حیرت ہوئی۔ چوکیدار سے پوچھا' تو اس نے بتایا۔

"پہاڑ کے اس طرف خوبصورت چراگاہیں اور جھیلیں ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں یہاں کے سب لوگ مال مویشیوں سمیت اُدھر چلے جاتے ہیں۔ برف باری سے چند دن

پہلے واپس گاؤں آجاتے ہیں۔ پھر ساری سردیاں یہیں رہتے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔

"ایک دیا ٹمٹما رہا ہے۔ شاید وہ تمہارا گھر ہے؟"

"جی ہاں...... وہ میرا ہی گھر ہے۔ ریسٹ ہاؤس کی ملازمت کی وجہ سے میں گاؤں میں رہتا ہوں۔ چھ برس ملازمت کو ہو گئے۔ میں نتتر سے باہر نہیں گیا۔"

"دل تو کرتا ہو گا باہر جانے کو؟"

"نہیں صاحب نہیں۔ گھر کی نوکری ملی ہے۔ تنخواہ کے علاوہ سیاحوں سے خاصی بخشش مل جاتی ہے۔ افسر لوگ بھی بہت خوش ہیں۔ اس نوکری کی وجہ سے گزشتہ سال میری شادی ہو گئی' ورنہ ابھی دس سال اور شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ سب لوگ کہتے ہیں' اس گاؤں میں مجھ سے زیادہ سکھی آدمی دوسرا نہیں۔"

آج ایک بار پھر مجھ پر یہ بات واضح ہو رہی تھی کہ سکھی لوگ کیسے ہوتے ہیں۔ اجل جو چوکیدار کو جاتا ہوا دیکھ رہی تھی' بولی۔

"دراصل دکھ سکھ کے پیمانے ہر آدمی کے اپنے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر آدمی اپنے ڈھنگ سے جیتا ہے' اپنے ڈھنگ سے خوشی حاصل کرتا ہے اور اپنے پیمانے پر دکھوں سے دوچار ہوتا ہے۔ ہم لاکھ جتن کریں' کڑھتے رہیں اپنے احساسات دوسروں پر نہیں لاد سکتے۔ جس طرح اربوں انسانوں کی شکل ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے' اسی طرح دکھ سکھ کے پیمانے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ یہی نہیں' انسان وقتی طور پر قائل ہوتا ہے' مگر جلد ہی اپنی اصلیت کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ تازہ ہوا کا جھونکا اسے چند ساعتوں کے لئے فرحت پہنچاتا ہے' مگر اس کی اصل خوشی یہی ہے کہ اپنے ڈربے میں بند رہے۔"

تقریباً نو بجے چوکیدار کھانا لایا۔ اس نے ذبح ہونے کے لئے مرغی روسٹ کی تھی۔ ہمارے لئے مصالحے میں بھون کر لایا تھا۔ مرغی نہایت لذیذ تھی۔ اجل نے اس سے کہا۔

"آپ کے مہمان اس لئے یہاں پندرہ پندرہ دن ٹھہرے رہتے ہیں کہ آپ اتنا لذیذ

کھانا کھلاتے ہیں۔"

چوکیدار خوش ہو کر بولا۔

"بی بی جی' اس اچھے کھانے کی وجہ سے مجھے ریسٹ ہاؤس میں نوکری ملی ہے۔ سینکڑوں ہزاروں سیاحوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ خدا کے فضل سے آج تک کوئی مہمان ناراض واپس نہیں گیا۔ بعض نے تو مجھے شکریے کے خط لکھے ہیں اور کچھ لوگوں نے اپنی تصویریں بھیجی ہیں اور کچھ ایسے بھی تھے' جنھوں نے یہاں میری تصویریں کھینچی تھیں اور پھر گھر پہنچ کر بھیج دی تھیں۔ یہ باہر کے لوگ عجیب ہوتے ہیں۔ مجھ جیسے غریب آدمی کو بھی نہیں بھولتے۔"

"کسی اجنبی کا خط ملتا ہو گا' تو آپ کو بہت خوشی ہوتی ہو گی؟"

"ہاں بی بی جی' یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ دیر تک ان کی شکلیں سامنے آتی رہتی ہیں اور دل محبت سے بھر جاتا ہے۔ اگر میں ان سے اچھا سلوک نہ کرتا' جی بھر کر ان کی خدمت نہ کرتا' تو کون یاد کرتا مجھ غریب کو' اصل بات یہ ہے جی کہ میٹھے بولوں میں بہت برکت ہوتی ہے!"

اجل نے میری طرف دیکھا...... ایک چوکیدار کی چھوٹی سی دنیا میں پھیلی ہوئی محبت کو دیکھ کر اس کا حیران ہونا قدرتی تھا۔

کھانے سے فارغ ہوئے' تو اس نے جگ میں پانی بھر کر تپائی پر رکھ دیا۔ جانے سے پہلے اس نے بیڈ ٹی اور ناشتے کے لئے پوچھا اور پھر سلام کر کے چلا گیا۔

کچھ دیر بعد میں بھی باہر نکل گیا۔ اس خیال سے کہ اجل ایزی ہو جائے اور شاید اس خیال سے بھی زیادہ احساس اس بات کا تھا کہ میں اجل کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اکیلے میں اس سے بات کرتے ہوئے کترا رہا تھا۔ جس انداز اور تیور سے اس نے یہاں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا تھا' وہ قطعی ایک چیلنج تھا۔ گو مجھے اس چیلنج سے بس اتنا ہی تعلق تھا کہ جو کچھ اس نے کہا ہے' وہی اصل حقیقت ہے اور یہ کہ میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

لیکن وہ تلخی' وہ کھچاؤ' جو اس فقرے کا قدرتی ردعمل بنتا تھا' اطل کو اس ردعمل سے بچانا میرے لئے ضروری تھا۔

باہر اندھیرا تھا۔ ابھی چاند نہیں نکلا تھا۔ ڈچ جوڑے کے کمرے میں بتی جل رہی تھی اور وہ کسی گرما گرم بحث میں مصروف تھے----- البتہ سیاہ جنگل کے اوپر دونوں برفانی چوٹیاں روشن تھیں' جیسے دور اندھیروں میں دو موم بتیاں جل رہی ہوں۔

تقریباً ایک گھنٹہ میں باہر رہا۔ اندر آیا' تو اطل سو رہی تھی۔ اس نے کمبل اوڑھ رکھا تھا' مگر اس کا چہرہ ننگا تھا اور اس کا رخ میرے پلنگ کی طرف تھا۔ دونوں پلنگوں کے درمیان تپائی رکھی ہوئی تھی۔ میں حیرت اور تاثر کے ساتھ خاموشی سے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اطل اتنی جلدی سونے کی عادی نہیں تھی۔ میں اگر اس کا سامنا نہیں کر رہا تھا' تو وہ دوسرا جذبہ تھا' لیکن خود اطل کا سامنا نہ کرنے کا یہ انداز' میں دل ہی دل میں مسکرایا اور اس کے بند ہونٹوں کے شگوفے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔

میں سوچ رہا تھا' پندار نفس کا وہ کیسا گراں لمحہ تھا' جس نے اسے یہاں رکنے پر مجبور کر دیا تھا اور پندار نفس کا یہ کیساں گراں لمحہ ہے کہ اس کی تجسس اور متحرک آنکھیں بند ہیں اور پلکوں کے بوجھ تلے لرزاں ہیں!

کیا اس کا وجدان جانتا ہے کہ میں اسے جی بھر کے دیکھ رہا ہوں؟

کیا اس کا احساس میری پیار بھری نگاہوں کے لمس سے بے خبر ہوگا؟

کیا اس کی روح کو میرے جذبوں کی یلغار کا علم ہوگا؟

یہ عجیب بحران تھا۔ ڈھیر ساری نفسیاتی خلیجوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔

اور وہ سو رہی تھی۔ جاگ رہی تھی یا خواب دیکھ رہی تھی----- میں بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی خوبصورت گردن کو' اس کے رس بھرے ہونٹوں کو' اس کی ننھی منی ناک کو۔ میری نگاہوں میں پیار تھا۔ خواہش تھی' جھنجلاہٹ تھی----- نہ جانے کتنی دیر میں اسی عالم میں بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ کتنے طویل سفر طے ہوئے۔ کتنے خواب دیکھے۔ کتنے

خواب ٹوٹے۔

یہ وہی بے مثال لڑکی تھی' جو سرخ قمیص پہن کر مانسہرہ کے ڈاک بنگلے سے پہلی بار میرے ساتھ سفر پر نکلی تھی اور جس نے پہلے دن ہی اپنی اثر آفریں شخصیت کی دھاک بٹھا دی تھی----- یہ وہی لڑکی تھی' جو ہر صبح ایک نیا جادو جگاتی تھی۔

اور ہر طلوع ہونے والا سورج اس کے حسن میں اضافہ کرتا تھا۔ وہ خوبصورت تھی' خوبصورت ترین تھی۔ کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ کس قدر خوبصورت تھی؟

بس یہی کہ وہ بے مثال تھی!

اور میں جو نصیبے کا سکندر تھا اور پوری دنیا کو فتح کرنے کا خواب اور اس کی تعبیر کا داعی تھا' اپنی آخری مہم کا علم آگے بڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں متذبذب تھا----- شاید اپنے اندر کے لشکر پر میرا اعتماد متزلزل تھا----- میں کبھی تو خالی الذہن ہو جاتا اور جو چہرہ میرے سامنے تھا' دور بہت دور----- چلا جاتا----- اور کبھی ایسا ہوتا کہ خوف' مسرت اور جوش سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ میرا جسم تھر تھر کانپنے لگ جاتا----- جنون و ہیجان کا ایسا طوفان کھڑا ہو جاتا کہ میرے پاؤں اکھڑنے لگتے تھے۔

یہ پہلا اور آخری وار ہو تک۔ اگر کامیابی مقدر ہوتی' تو میں دنیا کا فاتح کہلا سکتا تھا' لیکن یہ میری مسرتوں کا آخری دن بھی ہو تک۔ اگر وار اوچھا پڑتا' پھر زندگی ختم تھی!

ایک لحاظ سے مجھے افسوس بھی ہو رہا تھا کہ میں ہوش و خرد کا آدمی کیوں ہوں' مگر دوسرے لمحے یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ میں مذہب کو مانتا ہوں۔ تہذیب کا داعی ہوں اور اقدار و اخلاق کا پرچار کرتا ہوں----- ایسا وقت آن پڑا تھا کہ کبھی یہ سچ لگتا اور کبھی وہ سچ معلوم ہوتک۔ اتنی ڈھیر ساری سچائیاں تھیں اور ہر سچ میں ڈوبنے کو جی چاہ رہا تھا۔

اور وہ خدا کی بندی----- اسی کروٹ لیٹی تھی۔ دو گھنٹے گزر گئے اس نے کروٹ نہ بدلی----- کبھی کبھی اس کے غلافی پپوٹوں میں ذرا سا ارتعاش پیدا ہو جاتا' تو میرا دل ڈوب ڈوب جاتا۔ میں خوفزدہ ہو جاتا' کہیں وہ آنکھ کھول نہ دے اور مجھے اس کیفیت میں دیکھ نہ

لے۔

ایک بار اس کے سرخ انگور کی طرح رس بھرے ہونٹوں میں لرزش سی ہوئی' لیکن وہاں کوئی بھونرا نہیں تھا کہ کلی پر بیٹھتا۔۔۔۔۔ ہاں میری نگاہوں کی کرنیں تھیں' جو اس کے پپوٹوں اور ہونٹوں کو چھو رہی تھیں اور وہ گدگدی محسوس کر رہی تھی۔

یہ بالکل نئی کیفیت تھی' جو دو دھاری تلوار کی طرح طرفہ ضربیں لگا رہی تھی۔ کروڑوں میں ایک بار شاید زندگی ایسا مواقع فراہم کرتی ہے کہ سب کچھ انسان پر نچھاور ہو جائے مگر تشنہ لبی ہی اس کا مقدر ہو۔۔۔۔۔

یہ وہی لڑکی تھی' جو سکردو کے سفر میں میرے کندھے پر سر رکھ کر سوتی رہی تھی' لیکن آج اس کی انگلی کی ایک پور بھی چھونے کی ہمت کھو بیٹھا تھا۔۔۔۔۔ یہ اقدار کی کشمکش تھی یا میری فطرت کی کمزوری تھی' یا اس کے چیلنج کا خوف تھا اور یا یہ کہ ہمارے رویوں میں بے ساختہ پن نہ رہا تھا' جو پیار محبت کے فطری ماحول کی تسکین کا باعث بنتا ہے۔ شاید وہ خواہش جو لاشعور میں ہوتی ہے' شعور تک پہنچتی ہے تو اس کی شکل و صورت بدل جاتی ہے اور اس پر ملمع کاری ہو جاتی ہے اور تحمل رخصت ہو جاتی ہے۔

ٹھیک ہے زندگی کی مقصدیت سے انکار نہیں کرنا چاہیے' لیکن زندگی کا ہر ہر لمحہ محض مقصدیت کے لئے وقف بھی نہیں ہونا چاہیے' کیونکہ جس طرح کام کرنا ضروری ہوتا ہے' اسی طرح سونا بھی ضروری ہوتا ہے اور بالکل ویسی ہی رومانویت بھی ضروری ہوتی ہے۔ حسن جمال کا خون کر کے شاید زندگی کے دوسرے مقاصد بھی ادھورے رہ جاتے ہیں؟

سوئی ہوئی امثل نے میرے سینے میں عجیب سا تلاطم برپا کر رکھا تھا اور میں کچھ کچھ اس نتیجے پر پہنچ رہا تھا کہ عورت صرف عورت ہوتی ہے اور اس کی شان یہی ہے کہ وہ عورت رہے!

میں ایک ایسے پل صراط پر سے گزر رہا تھا' جس کے ایک طرف امثل کا حسین وجود تھا اور دوسری طرف زندگی کی حسین راہیں تھیں اور پل صراط کے اس طرف باب جنت وا

تھا۔۔۔۔۔ مگر میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ زندگی کی حسین راہوں کو نظرانداز کر دوں اور امثل کے حسین وجود کو چھوئے بغیر باب جنت میں داخل ہو جاؤں۔ کیونکہ زندگی کے ان گنت مقاصد کے ساتھ شاید ایک مقصد یہ بھی تھا کہ گندم کا ذائقہ چکھا جائے اور خود کو سزاوار حیات ٹھہرایا جائے۔

یہ عجیب خیال تھا۔۔۔۔۔ کہ بجلی کے کوندے کی طرح میرے دل میں اتر گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں کچھ طاقت ور ہو گیا ہوں اور مجھے کسی ایسی وارفتگی نے اپنے سحر میں لے لیا ہے کہ بظاہر کانپ رہا ہوں' لیکن روح میں عجیب سی ہلچل مچی ہے اور جوش و امنگ کا یہ عالم کہ پہاڑ سے بھی ٹکر لینے کو تیار ہوں!

یہی وہ لمحہ تھا کہ میں تیزی سے اٹھا اور سب کچھ بھول کر اس کے خوبصورت ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔۔۔۔۔!

لیکن اگلا لمحہ قیامت کا لمحہ تھا۔ امثل اٹھ چکی تھی اور اس نے ایک زور دار طمانچہ میرے منہ پر رسید کر دیا تھا۔ دوسرا اور پھر تیسرا۔ میں بت بنا کھڑا رہا۔

امثل نے وحشیانہ انداز میں اپنے ہونٹ کاٹے اور پھر تڑپ کر اوندھے منہ گر پڑی اور سسکیاں لے کر رونے لگ گئی۔

کھیل ختم ہو چکا تھا۔ زندگی کی ساری نفسیات دھری کی دھری رہ گئیں۔ میری ساری توانائی بکھر چکی تھی۔ اخلاقیات کا کچا دھاگہ پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا۔ اب ندامت تھی اور ذلت تھی اور معافی مانگنے کی ہمت ختم ہو چکی تھی۔ معافی بھی کیسی۔۔۔۔۔ آنکھ سے گرا ہوا آنسو واپس آنکھ میں کیونکر آ سکتا ہے؟

"ہاں۔۔۔۔۔ پانی سر سے گزر چکا تھا۔۔۔۔۔ اور میں بازی ہار چکا تھا۔ چنانچہ غیر ارادی طور پر چپ چاپ' بوجھل اور کانپتے قدموں سے باہر نکل گیا۔۔۔۔۔ باہر کی دنیا بھی بدل چکی ہے۔ ڈھائی گھنٹے پہلے باہر بالکل اندھیرا تھا' لیکن اب ساری وادی بقعہ نور بن گئی تھی۔ برف پوش چوٹی کے اوپر آدھی رات کا چاند چمک رہا تھا۔ یہ عجیب سا تضاد تھا کہ ایک

طرف حسین اور نورانی رات تھی' تو دوسری طرف میرا رنجور دل اور شرمندہ روح تھی۔
مجھے بار بار خیال آ رہا تھا کہ کیا اس لمحے کے لئے میں نے زندگی کا سفر شروع کیا تھا' کیا میرے جنم کا مقصد اس لمحے سے عبارت تھا؟ اور کیا یہی تھا میرا مقدر کہ پلک جھپکتے میں ذلیل و خوار ہو جاؤں؟

میں نے چاند کی طرف دیکھا' جو کچھ دیر پہلے پہاڑوں کے اس طرف اوجھل تھا۔ کیا میرا بھی یہی فرض تھا کہ چاند کی طرح تما ساری زندگی طواف جاری رکھتا اور کروڑ سال کی زندگی پاتا؟

وہ کونسی طاقت تھی' جس نے مجھ جیسے مہذب و متمدن آدمی کو آنکھ جھپکتے میں اس کے ہونٹوں تک پہنچا دیا۔ میں جو ذیج جوڑے کو پادری تک پہنچنے کی تلقین کر رہا تھا' خود کیوں حیوانی ترغیب کا شکار ہو گیا؟

یہ عجیب و غریب شے' جو انسان کی تمام شعوری قوتوں کو مغلوب کر دیتی ہے' تمام الہامی اور روحانی طاقتوں کو زچ کر دیتی ہے' کیسی ضرورت ہے کہ دیکھتے دیکھتے انسان کو انسانوں کی بستی سے نکال کر جنگل میں چھوڑ دیتی ہے؟

پھر میرے ذہن میں ایک اور لہر آئی۔ میں نے کتنا احترام کیا تھا اس لڑکی کا' میں کس قدر شدید متاثر تھا اس لڑکی سے۔ کیا یہ سارا احترام محض اس لئے تھا کہ موقع ملے' تو اس کے ہونٹ اس کی مرضی کے بغیر چوم لوں۔۔۔۔۔۔؟

ہرگز نہیں' ہرگز نہیں! میرے ضمیر نے یہ منطق رد کر دی۔۔۔۔۔۔ بجا کہ یہ طاقت زندہ رہے' لیکن شعور کے زیر سایہ زندہ رہے۔ بجا کہ اس کا نام فطرت ہو' مگر یہ نہ ہو کہ ہوش آئے تو محض عبرت ہو!

مسئلہ ندامت کا ہوتا' تو میں شرمساری کی آخری حدود بھی چھو لیتا اور من کا بوجھ ہلکا کر لیتا' لیکن مسئلہ ندامت کا نہیں' مسئلہ اس کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو جانے کا تھا' اور یہ اتنا بڑا مسئلہ تھا کہ سب کچھ ختم ہو جاتا۔۔۔۔۔۔

بے بسی اور بے کسی' یاس و ناامیدی کی ایسی یلغار تھی کہ میں بے اختیار رو پڑا اور اس منور رات میں ایک چٹان پر اوندھے منہ گر پڑا۔ کھردری اور سخت چٹان نے آغوش مادر کا کام کیا۔۔۔۔۔ میرے پورے جسم میں سرد اعتدال کی لہر سی دوڑ گئی۔
میں دیر تک اس ٹھنڈی چٹان کو سینے سے لگائے لیٹا رہا اور دھیرے دھیرے روتا رہا۔۔۔۔۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ رونا جو نمائش کے لئے نہیں ہوتا' کتنا طاقتور ہوتا ہے اور اس سے اندر کی کیسی کیسی جذباتی محرومیوں کی تشفی ہو جاتی ہے۔
میرے چہرے کا سیدھا رخ چٹان سے لگا ہوا تھا۔ میری آنکھیں بند تھیں اور ان سے اشک مسلسل کی ہلکی سی دھار بہہ رہی تھی۔
عین اس لمحے ایک نرم و گداز ہاتھ نے میرے شانے کو آہستہ سے چھوا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو حیرت کی انتہا نہ رہی۔۔۔۔۔ میرے سامنے مطمئن لیکن مجوب اسل کھڑی تھی۔۔۔۔۔ وہ جو ہمہ وقتی مضطرب آنکھیں تھیں' اس لمحے امن اور سکون کی روشنی کہیں سے ادھار لائی تھیں' لیکن پھر بھی ان میں ایسی تاب تھی کہ میں نے آنکھیں جھکا لیں۔
وہ چپکے سے میرے پہلو میں بیٹھ گئی۔ میں بھی اٹھ بیٹھا تھا اور قدرت کی شان دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے نرم اور گرم سی خاموشی طاری رہی۔ پھر وہ دھیرے سے' بہت دھیرے سے بولی۔

"سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ شدت سے پیار کرنے والے اور سچائی کا دعویٰ کرنے والے' سب ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ دراصل ایک جیسا ہونا ہی ان کی سچائی ہوتی ہے۔ سب بوسے کی تلاش میں ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔!"
میں اس تمہید سے چونکا۔۔۔۔۔ وہ خاموش ہو گئی۔ میں بھی چپ بیٹھا رہا۔ وہ چاند کو ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگ گئی تھی۔ اس کی ٹھوڑی قدرے اوپر کو اٹھ گئی تھی۔ اس کے لب نیم وا تھے۔

"آدھی رات کو طلوع ہونے والا چاند کتنا منوز ہوتا ہے!" وہ جیسے اپنے آپ سے بولی...... "ہم لوگ کتنے بے خبر ہوتے ہیں!؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا...... میں اس وقت کمان کی طرح خم کھائے اس کی مرمریں گردن دیکھنے میں محو تھا۔

"میں نے آپ کو معاف کر دیا ہے!" اس نے اچانک چاند سے نظر ہٹا کر میری طرف دیکھا...... "وسیم صاحب' آپ نے بھی وہی کیا' جو سمیع نے کیا تھا' مگر وہ آپ سے زیادہ دلیر تھا۔ اس نے زبردستی میری عزت لوٹ لی تھی!"

"امل......؟" میں بے طرح چونکا اور گویا آدھا زمین میں دھنس گیا۔

"ہاں وسیم صاحب۔" وہ اطمینان سے بولی...... "آپ کو تو میں صرف پسند کرتی ہوں' اس سے پیار کرتی تھی اور اس سے شادی بھی ہو جانی تھی...... ایسی ہی ایک رات تھی کہ وہ آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ میں چیختی رہی' منع کرتی رہی' مگر وہ تو بالکل حیوان بن چکا تھا۔ محبت کا سارا کھیل منٹوں میں ختم ہو گیا تھا!"

چاند تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ امل نے بات جاری رکھی۔

"وسیم صاحب' صبح اخبار میں سمیع کی تصویر چھپ گئی تھی۔ اس نے خودکشی کر لی تھی......! میرا سارا غصہ اتر چکا تھا۔ کم بخت اتنا شرمسار تھا کہ صبح کا انتظار بھی نہ کر سکا۔ دراصل اس میں سامنا کرنے کی ہمت نہ رہی تھی۔ ورنہ کچھ بعید بھی نہ تھا کہ میں اسے معاف کر دیتی۔ کیونکہ نیت اور فطرت تو ہر مرد کی ایک ہی ہوتی ہے۔ پھر کیا ضرورت تھی کہ میں فرشتے کی تلاش میں سرگرداں رہتی۔"

یہ امل کا دوسرا روپ تھا......

"وسیم صاحب' میں آپ کو سمیع کی طرح پیار نہیں کرتی' مگر سمیع کے بعد آپ کو سب سے زیادہ پسند کرتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ آپ بھی سمیع کی راہ پر چل نکلیں...... میں آپ کو بچانے کے لئے چلی آئی۔"

چاند اب دوسری چوٹی پر سے گزر رہا تھا اور اب یہ چوٹی پہلی چوٹی کی نسبت زیادہ چمک رہی تھی۔ میں خاموش تھا' مگر امل کے اس نئے روپ نے میرے دل میں ہلچل برپا کر دی تھی۔

"وسیم صاحب۔" وہ بہت نرم لہجے میں بولی...... "اٹھائیس برس میں یہ دوسری رات ہے' جو بے حد غیر معمولی ہے۔ ان دو راتوں میں میں نے مرد سے نفرت بھی کی۔ محبت بھی کی۔ انہی دو راتوں میں میں نے پندار نفس کی فتح دیکھی اور انہی دو راتوں میں سب کچھ ہار بھی دیا!"

"آپ نے کچھ نہیں ہارا......" میں نے پہلی بار اسے جواب دیا۔

"نہیں نہیں' میں ہار چکی ہوں۔ سب کچھ ہار چکی ہوں۔ میں نے سمیع کو ہار دیا تھا' اس لئے دوڑی چلی آئی کہ کہیں آپ کو بھی ہار نہ دوں۔"

"مگر میں تو خود ہار گیا ہوں امل۔"

"نہیں' آپ ہارے نہیں جیتے ہیں۔ کیونکہ آپ نے اپنی فطرت کا مظاہرہ کیا ہے۔ آپ اپنے اصل سے انکار نہیں کر سکتے۔"

"لیکن میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنی اصل پر فتح پاؤں گا۔ میں اسے شعور کے تابع رکھوں گا!"

"وہ تو ہم کرتے ہی ہیں اور یہی تہذیب کا ثمر ہے۔ یہ ثمر پھیکا ہے۔ کڑوا ہے' مگر ہمارا مقدر ہے۔ ہم جھوٹ بولتے رہیں گے۔ کیونکہ اب اس جھوٹ کا نام سچ پڑ گیا ہے اور آپ کو اپنے دور کی سچائیوں کا ذکر ضرور کرنا چاہیے۔"

"ہاں...... میں اس سچائی کا ذکر ضرور کروں گا۔ میں جذبے کی شدت اور تندی سے بھرپور احساسات کا ذکر ضرور کروں گا۔ میں احساسات کی حقیقتوں کو بھی مانتا ہوں۔ میں جذبے اور احساس دونوں کی سرکشی کو تسلیم کرتا ہوں' مگر اسے بے مہار چھوڑنے کا قائل نہیں رہا۔ میں اسے تہذیب اور شعور کے سائے میں پروان چڑھتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔

میں جذبے کو سائنس کے ہم پلہ دیکھنا چاہتا ہوں' تاکہ کسی مسیح کو خودکشی کی ضرورت پیش نہ آئے اور نہ کسی وسیم کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔"

"مگر میں سمجھتی ہوں کہ جذبے اور سائنس کی درجہ بندی ضروری ہے۔ ورنہ انسان ایک دن مشین بن جائے گا۔"

"میں یہ نہیں کہتا۔ میں یہ نہیں کہتا۔ میں جذبے کو زندگی سے نکالنے کو نہیں کہتا۔ ممتا کا مقابلہ سائنس کیسے کر سکتی ہے' مگر بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں کہ سائنس کو مقدم سمجھا جائے گا اور ایسے مواقع ایک نہیں زندگی میں کئی بار آتے ہیں کہ آدمی دل سے نہیں' ذہن سے فیصلہ کرتا ہے۔"

"مثلاً ہٹلر نے فیصلہ کیا تھا کہ دنیا کو تہس نہس کر دے۔ ظاہر ہے یہ دل کا نہیں ذہن کا فیصلہ تھا۔ مشینوں کا فیصلہ تھا......؟"

"میں سیاست کی بات نہیں کرتا' جنس کی بات کر رہا ہوں۔ میرا آج کا تجربہ یہ ہے کہ جسمانی زندگی محض حیوانی زندگی ہے اور اسے دماغی زندگی پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ ورنہ آپ کو کیا ضرورت تھی کہ مجھے طمانچے رسید کرتیں۔"

امثل بولی...... یہ انا کے طمانچے تھے' جو غیرانا کے منہ پر لگے۔ میں نے آپ کو نہیں مارا' بلکہ اپنی اصلیت سے انکار کیا اور آپ کی حقیقت کو جھٹلایا۔ ورنہ دماغی زندگی ہے کیا چیز! دماغ سے آپ دکانداری کر سکتے ہیں' دماغ سے آپ حظ نہیں اٹھا سکتے۔ حظ آپ جسم اور جذبے سے ہی اٹھا سکتے ہیں۔"

"گویا میری پشیمانی غلط ہے اور جو کچھ میں نے کیا ہے' آپ اسے صحیح قرار دیتی ہیں؟"

"میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ زندگی کا نصب العین کیمیکل نہیں ہونا چاہیے۔ انسان مشین نہیں ہے اور نہ اسے مشین بنانے کی کوشش کو سراہا جانا چاہیے۔ رہی میری بات تو میں پاک باز عورت نہیں ہوں کہ کسی بات سے ڈروں اور نہ یہ کہ آپ کے بوسے سے میں ناپاک ہو جاؤں گی۔ یہ باتیں میرے عقیدے کو نقصان نہیں پہنچاتیں۔ میں نہ پاک

ہوں اور نہ ناپاک' بلکہ عورت ہوں۔ دوسری عورتوں کی طرح' مجھ میں کوئی سرخاب کے پر نہیں لگے اور نہ میں عام عورت سے بالاتر ہوں' بلکہ ان سے کمتر ہوں۔ کیونکہ وہ جو کچھ پیش کرتی ہیں' سچائی سے پیش کرتی ہیں۔ میں خلوص سے کسی کو کچھ پیش نہیں کر سکتی۔ میں پوری سپردگی کے ساتھ کسی کو دل نہیں دے سکتی۔ کیونکہ میں ہمیشہ تہائی محسوس کرتی ہوں!!"

"تو پھر اس خود فریبی کے کیا معنی کہ آپ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بچانے کے لئے چلی آئیں؟"

"مسیح کا خون کیا کم تھا کہ ایک اور قتل کا احساس من میں بسا لیتی۔"

"ایک طرف آپ کہتی ہیں کہ بوسے سے آپ ناپاک نہیں ہوتیں اور نہ آپ کے عقیدے کو نقصان پہنچتا ہے' دوسری طرف آپ بچانے کے اقدام کرتی ہیں اور قتل کے احساس سے خوف زدہ ہیں۔ کیا یہ دہرا رویہ نہیں ہے؟"

"وسیم صاحب' اگر میں ایک مرد کے ساتھ اکیلے سفر کر سکتی ہوں' اس کے ساتھ جنس پر باتیں کر سکتی ہوں اور احساس گناہ محسوس نہیں کرتی' تو اس کے بوسے سے بھی کوئی عقیدہ مجروح نہیں ہونا چاہیے' لیکن اگر اس بوسے میں میری رضامندی شامل نہیں ہے' تو پھر گویا میرے احتجاج کا حق محفوظ ہے' مگر اس حق کے معنی یہ کہاں ہیں کہ اس پر موت کا حکم صادر ہو۔"

"بہرکیف یہ ایک نظریاتی رویہ ہے' جو میرے نزدیک مہمل ہے اور میں اسے سچ نہیں مان سکتا!"

"اس لئے کہ آپ وہ سچ ہیں جسے سو جھوٹوں نے پروان چڑھایا ہے اور میں وہ جھوٹ ہوں' جسے سو سچائیوں نے جنم دیا ہے۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اسی رو میں بولی۔

"آپ جو محبت کو حق بجانب سمجھتے ہیں' آپ جو اکیلی لڑکی کے ساتھ سفر کو عیب نہیں

جانتے' آپ جو میرے بوسے کی تاک میں رہتے ہیں' آپ ہی ہیں' جو اقدار و اخلاق کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ آپ ہی ہیں' جو تہذیب اور شعور کے علمبردار بھی ہیں اور وہ آپ ہی ہیں' جو جذبے اور سائنس کی کشتیوں میں الگ الگ پاؤں رکھے سفر جاری رکھنا چاہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بچ گئی ہے!" اشی نے ایک اور حملہ کر دیا تھا اور میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔

"میری باتوں سے آپ حیران ہو جاتے ہیں۔" وہ مجھے بوکھلایا ہوا دیکھ کر بولی۔ "آپ لوگ فیصلے صادر کرتے ہیں اور اس پر اٹل ہو جاتے ہیں۔ چند روز کے بعد احساس ہوتا ہے کہ آپ کا نظریہ غلط ہے۔ پھر ایک اور نظریہ قائم کرتے ہیں۔ وہ بھی اٹل ہوتا ہے۔ اس طرح ساری زندگی گزر جاتی ہے اور آپ ہر دور میں خود کو سچائی کے نمائندے سمجھتے ہیں!"

اس کے ہر فقرے پر میں سکڑتا اور پھیلتا جا رہا تھا اور حسب معمول چاہ رہا تھا کہ وہ بولتی چلی جائے' تاکہ اس کے ہر ہر جملے کی روشنی میرے سینے میں پہنچتی رہے اور میرا شعور کند نہ ہونے پائے۔

"دیکھئے۔" اس نے ریسٹ ہاؤس کی طرف دیکھا' جہاں ڈچ جوڑا سو رہا تھا اور ان کا لیمپ بجھ چکا تھا۔۔۔۔۔ "آپ نے ڈچ جوڑے کو جس طرح کا پرچار اور تلقین کی تھی' اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ آپ اپنی فطرت پر غالب آ گئے ہیں اور پیغمبرانہ اوصاف نے آپ کا سینہ منور کر دیا ہے' لیکن ایسا نہ ہوا۔ انسان آخر انسان ہے۔ اسے اپنی فطرت بدلنے کا کتنا ہی شوق کیوں نہ ہو' خون کسی نہ کسی لمحے شعور کو مغلوب کر ہی لیتا ہے' جیسا کہ آج رات ہوا۔ آپ کتنی ہی تردید کریں' میں نہیں مانتی کہ آپ اپنے دل سے چور نکال سکتے ہیں۔۔۔۔۔ چلئے نکال دیجئے' عملاً اس کا ثبوت بھی دیجئے' مگر تمام تہذیب و تمدن کے باوجود' تمام روحانی اور اخلاقی برکتوں کے باوجود' کسی نہ کسی گوشے سے آپ کی فطرت چور نگاہوں سے جھانکتی رہے گی۔۔۔۔۔ تو پھر۔۔۔۔۔؟ پھر کیا فائدہ! کہ آپ کے باطن میں

چوری اور انہونی کے ڈھرلے آتے رہیں۔ بظاہر آپ کا ڈھانچہ سلامت ہو' مگر روح میں دراڑیں پڑ چکی ہوں اور آپ اسے پیوند لگاتے رہیں اور اعلان کرتے رہیں کہ آپ تندرست ہیں۔۔۔۔۔ جی نہیں' میں ایسے معاشرے کو تندرست نہیں سمجھتی!!"

مجھے ایسا لگا کہ اس کی زبان میں مقناطیس لگی ہوئی ہے' جو میرے خون میں چھپے ہوئے ذروں کو چن رہی ہے اور اسے ایک ایک کر کے میرے سامنے پھیلا رہی ہے اور میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ اپنی فطرت کی کہانی پڑھ رہا ہوں۔

وہ ٹیلہ جو برفانی چٹانوں سے عبارت تھا' ہمارے قریب سے گزر رہا تھا اور چاند کی روشنی میں چم چم کر رہا تھا۔۔۔۔۔ یہ ایسی رات تھی کہ فطرت نے اپنی مکمل رعنائیوں کے ساتھ تمام جاندار اور بے جان چیزوں کو اپنے سحر میں لے لیا تھا۔ ہم دونوں خاموش ہو گئے تھے' مگر چاند کا سفر جاری تھا۔ وہ برابر آگے بڑھ رہا تھا۔

اچانک ہم دونوں چونکے۔۔۔۔۔ کوئی تیزی سے ہماری طرف آ رہا تھا' مگر چاند اتنا روشن تھا کہ ہم نے اسے دور سے ہی پہچان لیا۔ یہ ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار تھا۔

لیکن اس سے رات کے دو بجے اسے ہم سے کیا کام تھا؟

تھوڑی دیر میں وہ ہانپتا کانپتا قریب آ گیا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"صاحب جی' خدا کا شکر ہے' آپ جاگ رہے ہیں' ورنہ مجھے گستاخی کرنا پڑتی اور آپ کی نیند خراب ہوتی!"

ہم حیرت سے اس کا منہ دیکھ رہے تھے۔ ہم اس کا مطلب نہیں سمجھے تھے۔

"صاحب جی۔" وہ گھبراتے ہوئے' ڈرتے ڈرتے بولا۔ "میری بیوی کے بچہ ہونے والا ہے۔ وہ دو گھنٹے سے تڑپ رہی ہے۔ کم بخت ایسی شرمیلی ہے کہ مجھے قریب پھٹکنے نہیں دیتی۔ گاؤں میں ایک نرس بھی نہیں ہے۔ اب میں کیا کرتا۔ آپ کا آسرا لے کر چلا آیا۔"

اشی تیزی سے کھڑی ہو گئی۔

"چلو میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ!"

"صاحب جی' آپ بھی چلیں۔" چوکیدار مجھ سے مخاطب ہوا۔ "بی بی جی اکیلی ہوں گی۔"

"ہاں چلئے نا" امل نے میری طرف دیکھا۔

تھوڑی دیر میں ہم گھاٹی پار کر کے گاؤں پہنچ گئے۔

چوکیدار کا گھر ایک کوٹھے اور مختصر سے برآمدے پر مشتمل تھا۔ اندر سے مدھم مدھم روشنی آ رہی تھی اور درد زہ میں مبتلا لڑکی کی آہیں اور کراہیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔۔۔۔ امل اندر چلی گئی' تو چوکیدار برآمدے سے کھاٹ کھینچ کر باہر لے آیا اور مجھے بیٹھنے کے لئے کہا۔

میں نے اسے بھی اپنے ساتھ بٹھانا چاہا' مگر وہ نہ مانا اور وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ انتہائی بے تاب اور بے چین تھا اور اس کی نظریں کوٹھڑی کے کھلے دروازے پر لگی ہوئی تھیں' جہاں سے اس کی بیوی کی سسکیوں اور دبی دبی چیخوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

اچانک وہ رو پڑا اور کہنے لگا۔

"صاحب جی' میری بیوی بہت چھوٹی ہے۔ اس کی عمر ابھی بچہ جننے کی نہیں ہے۔ بارہ سال بھی کوئی عمر ہوتی ہے۔ تبھی اس پر ترس آ رہا ہے' لیکن خدا کی مرضی ہے۔ بس اللہ اس کی حفاظت کرے!"

چوکیدار کی باتیں سن کر میں دنگ رہ گیا۔

ایک طرف بارہ سال کی زچہ اور دوسری طرف امل کی اس بارے میں بے خبری۔ وہ لاکھ ذہین سہی' مگر وہ دایہ تھی اور نہ ڈاکٹر۔۔۔۔ ایک ناتجربہ کار لڑکی کو ایسی باتوں سے کیا سروکار' پھر بھی میں چوکیدار کو دلاسا دیتا رہا اور اس کا حوصلہ بڑھاتا رہا۔۔۔۔ مگر جونہی لڑکی کی چیخ بلند ہوتی' چوکیدار لپک کر اٹھتا۔ شدت تاثر سے اس کی آنکھیں باہر کو ابل پڑتیں۔ اعصاب تن جاتے اور اس کی شکل بگڑ جاتی۔

میں اس کی پوری قوت سے بند کی ہوئی مٹھیوں کو دیکھتا اور تسلی کے انداز میں اس

کے شانے پر ہاتھ رکھتا اور بیٹھنے کے لئے کہتا۔

وہ میری طرف دیکھتا۔ اس کے چہرے کا کھچاؤ قدرے کم ہو جاتا۔ آنکھوں میں نرمی اور محبت کی کیفیت ابھر آتی اور وہ لرزتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ ٹھنڈی دھرتی پر بیٹھ جاتا اور کچھ دیر کے لئے سر جھکا لیتا۔

اس کی شدید تکلیف اور کرب کو دیکھ کر میں سوچ رہا تھا۔

کیا اسے اپنی بیوی سے بہت محبت ہے؟ کیا اس کی کم سنی اور کم سنی کی وجہ سے موت کا خطرہ اس کے حواس پر سوار ہے؟ اور یہ بھی کہ اگر وہ مرگئی تو دوسری بیوی اسے نصیب ہو گی یا نہیں؟ اور یا یہ کہ وہ انسانی ہمدردی کے ہاتھوں مجبور تھا۔۔۔۔ بہرحال وہ شہر کی بجائے پہاڑ کا کھرا آدمی تھا اور اس کے عمل اور ردعمل کی سچائی اور شدت میں کوئی تصنع والی بات نہیں تھی' بلکہ میں تو رشک کر رہا تھا۔۔۔۔ اس کی بیوی کتنی خوش نصیب تھی کہ اس کے غم اور فکر میں اس کا شوہر اس قدر تڑپ رہا تھا کہ بیوی کی تکلیف خود اس کی تکلیف بن گئی تھی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ اس دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا' شاید غلط کہتے ہیں۔ کیونکہ میں دیکھ رہا تھا اور کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ انسان کو ہمیشہ انسان کی ضرورت رہے گی!

چاند برابر آگے بڑھ رہا تھا۔ رات لمحہ لمحہ کٹ رہی تھی۔ خنکی دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھی۔۔۔۔ غنودگی کی لہریں آتیں اور میری پلکوں کو چھیڑ کر چلی جاتیں' مگر چوکیدار چوکس بیٹھا تھا۔ ایک نئی قسم کی شب بیداری سے اس کی آنکھیں جھلمل جھلمل کر رہی تھیں۔ اچانک رام چکور کی صدائے سحرخیزی سے ساری گھاٹی گونج اٹھی۔ چوکیدار نے میری طرف دیکھا۔۔۔۔ رام چکور کا صبح بیداری کا نغمہ' مجھے صبح کی اذان کی طرح الہامی لگا۔

چاند اب مغرب کی طرف ڈھلک گیا تھا۔ اس کے طویل سفر کی داستان اس کے زرد چہرے سے عیاں تھی۔ البتہ مشرقی افق سے سپیدہ سحر اس طرح طلوع ہو رہا تھا' جیسے

پہاڑوں کے اس طرف سے دودھ کے سمندر کی کوئی لہر آگئی ہو!

کوٹھڑی کے اندر خاموشی طاری تھی اور بہت دیر سے کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ سورج کی شعاعوں نے جسے ابھی نہیں چھوا تھا' وہ دھیمی دھیمی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی دھرتی کے سینے سے پھوٹ رہی تھی۔

اچانک ایک ننھی منی گڑیا کی صدا نے ہمیں چونکا دیا...... چوکیدار بجلی کے لپکے کی طرح تڑپا...... اور بجلی کی سی چکا چوند والی کیفیت اس کی آنکھوں میں لہرا گئی۔ اس کا اضطراب اور مسرت کی ملی جلی کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی...... وہ خوشی سے کانپ رہا تھا۔

عین اسی لمحے امل کوٹھڑی کے دروازے میں نمودار ہوئی...... مجھے ایسا لگا کہ اس کی روح میں گلاب کھل چکا ہے اور اس کھلے ہوئے گلاب کا پرتو اس کے چہرے کی تقدیس بن گیا ہے۔

وہ ایک ننھی منی سی جان کو ہاتھوں پر اٹھائے' سینے سے لگائے ہوئے تھی۔

چوکیدار اس کے پاس پہنچ گیا...... امل نے بچی اس کی گود میں دے دی۔ وہ چند لمحے غیر یقینی انداز میں' پھڑکتے نتھنوں کے ساتھ نومولود کو دیکھتا رہا...... جیسے یقین کرنا چاہتا ہو کہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ پھر اس نے بے اختیار ہو کر بچی کو سینے سے لگا لیا اور والہانہ انداز میں رخسار اس کے رخسار پر رکھ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

شاید اس کی شخصیت مکمل ہو چکی تھی۔

امل کے لبوں پر عمیق مسکان تھی۔ وہ شدید جذبے اور لگاوٹ کے ساتھ چوکیدار کی خود فراموشی' محبت اور مسرت سے محظوظ ہو رہی تھی۔

بچی زور زور سے چیخ رہی تھی۔ چوکیدار اسے سینے سے لگائے اندر چلا گیا۔ امل چند لمحے کھلے دروازے کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ مسکرائی' یہ مسکراہٹ نہایت لطیف مگر گہری تھی۔ پھر ویسی مسکراہٹ چہرے پر سجائے متانت سے

میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی...... اس کے چہرے پر رات بھر جاگنے اور تھکاوٹ کے کوئی آثار نہیں تھے۔

اس کی آنکھوں میں بلا کی کو ملتا تھی۔

یہ بالکل نئی امل تھی' جس نے غالباً آج ہی جنم لیا تھا اور شاید یہ پہلا موقع تھا کہ ہم نے ایک نئے اعتماد اور یقین کے ساتھ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں۔

اس کی مضطرب' ہمیشہ مضطرب رہنے والی آنکھوں میں بلا کا سکون تھا!

میرے سامنے ملکوتی تصور رکھنے والی دو آنکھیں دمک رہی تھیں۔

"وسیم صاحب" وہ نہایت یقین افروز لہجے میں بولی...... "آج ایک مریم نے عیسیٰ کی بجائے مریم کو جنم دیا ہے۔ بارہ سال کی بچی نے ایک معصوم بچی کو جنم دیا ہے۔ وہ لمحہ دیدنی تھا...... جب میں نے کچے کچے گوشت کی ننھی سی جان کو اس کے پہلو میں لٹایا تھا۔ اس کی روشن آنکھوں میں ممتا کے جام تھے اور اس کے زرد چہرے پر تخلیق کا نور تھا اور اس کی ننھی ننھی چھاتیوں میں شیر مادر کی خوشبو آ رہی تھی...... وسیم صاحب' میں نے گیا حقیقی منظر زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے۔"

امل کا لہجہ عجیب کیف میں ڈوبا ہوا تھا اور وہ آس پاس کی ہر شے میں جذب ہو گئی تھی۔

"وسیم صاحب" اس نے بات جاری رکھی۔ "عجیب تجربہ تھا۔ میں بیان نہیں کر سکتی' وہ کیسی کیفیت تھی جب بچہ ماں کی کوکھ سے پھسل کر میرے ہاتھوں میں آگیا تھا۔ ایک جیتا جاگتا انسان' جو چند لمحے پہلے نہیں تھا' اب میرے ہاتھوں میں چیخ رہا تھا...... شاید وہ سکون جو ماں کی کوکھ میں تھا' کھلی فضاؤں میں نہیں تھا...... لیکن میں اس لمحے کو نہیں بھول سکتی' جب میں نے اسے چپ کرانے کے لئے بے اختیار ہو کر سینے سے لگا لیا تھا۔ بے ساختگی کا یہی وہ لمحہ تھا کہ میں انسان کو خوش آمدید کہہ رہی تھی!"

سورج طلوع ہونے میں ابھی دیر تھی...... لیکن چاروں افق دودھیا روشنی کی لہریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پھیل گئی تھیں۔

"وسیم صاحب' میں بیان نہیں کر سکتی وہ کیسی ساعتیں تھیں۔ جب میں نے ایک ناف ماں کی کوکھ سے کاٹ کر الگ کر دی تھی۔ ننھی منی ماں نے اسی بدن سے ننھی سی جان کو خون پلا پلا کر زندگی بہم پہنچائی تھی اور جب کوکھ سے اس کا رشتہ ٹوٹ گیا تو اس کی ننھی ننھی چھاتیوں میں دودھ کے چشمے پھوٹ پڑے تھے۔۔۔۔ انسان کو پیدا کرنے اور اسے زندہ رکھنے کی یہ کتنی منظم ترتیب تھی۔

یہی وہ الہامی ساعتیں تھیں' جب خدا بہت قریب آ گیا تھا۔ میں اسے دیکھ نہیں سکتی تھی' مگر اسے محسوس کر رہی تھی۔ میری روح میں ہلچل مچی تھی۔ شاید خدا میری روح میں سما گیا تھا۔ کیونکہ میں اپنی روح کی توانائی کو پا رہی تھی۔ میرا سینہ بھر گیا تھا ایک عجیب و غریب سرور سے' ایک ان دیکھے نور سے!"

خود میرا سینہ بھی اس کی باتوں سے پرنور ہو گیا تھا۔۔۔۔ اب پو پھٹ رہی تھی۔ سیاہی چھٹ رہی تھی۔ صبح کاذب جا رہی تھی' صبح صادق آ رہی تھی۔ شاید یہی وہ سحر ہوتی ہے کہ لوگ خدا کے ظہور کا یقین کرتے ہیں۔

"وسیم صاحب!" اس کی آواز میں بلا کا پیار اور سپردگی تھی' اس نے اپنا خوبصورت سر میری چھاتی پر رکھ دیا۔۔۔۔ "وسیم صاحب' آج میں نے زندگی کو پا لیا ہے۔۔۔۔!! میں جان گئی ہوں کہ میں آپ سے محبت کر سکتی ہوں۔۔۔۔ آیئے واپس چلیں' غار کی طرف نہیں' ہجوم کی طرف۔ میں ایک انسان کو جنم دینا چاہتی ہوں۔ شاید وہ عرفان جو مجھے نہیں ملا' وہی لے کر آ رہا ہو۔۔۔۔!!!"

ختم شد





















Rs.300/-